سلسلۂ دار المصنفین
(۳۸)
مقالاتِ شبلی
(مذہبی)
جلد اول
مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
کے
تمام مذہبی مضامین کا مجموعہ جس کو مختلف رسالوں اور اخباروں سے یکجا کیا گیا ہے
باہتمام محمد اویس ندوی
در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع شد
۱۳۴۹ھ
۱۹۳۰ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العلمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلیٰ آلہ الطاہرین

مولانا شبلی مرحوم نے مستقل تصنیفات کے علاوہ مختلف عنوانات پر سینکڑون علمی و تاریخی ادبی و سیاسی مضامین لکھے تھے، جو ہنوز اخبارات و رسائل کے صفحات مین منتشر تھے، علم دوست اصحاب کا تقاضا تھا کہ ان پراگندہ موتیون کو ایک سلک مین منسلک کر دیا جائے کہ وہ ہر شخص کو یکجا میسر آسکین اور اہل علم اُن سے پوری طرح فائدہ اُٹھا سکین، اگرچہ مولانا مرحوم کے چند مضامین "رسائل شبلی" اور "مقالات شبلی" کے نام سے اُن کی زندگی ہی مین شائع ہو چکے تھے، لیکن یہ دونون مجموعے ناتمام ہین، اور صرف چند تاریخی و علمی مضامین پر مشتمل ہین، اس بنا پر یہ ارادہ کیا گیا کہ مختلف عنوانات کے تحت اُس عنوان پر اُن کے تمام مضامین ایک ایک مستقل جلد مین جمع کر دیے جائین، تاکہ اُن کے مضامین جن جن موضوع پر ہون وہ الگ الگ مرقع مین نظر آئین، اس خیال کو پیش نظر رکھکر ملک کے مختلف رسائل و اخبارات مثلاً معارف علی گڈھ، دکن ریویو، انسٹیٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، الندوہ، مسلم گزٹ، وغیرہ وغیرہ سے اُن کے تمام مضامین استقصار کے ساتھ نہایت تلاش و محنت سے جمع کئے گئے، اور مختلف موضوع کے لحاظ سے الگ الگ انکی تقسیم کیگئی، اور اُن کی اشاعت کا انتظام کیا گیا،

یہ تمام مضامین غالباً ۹ جلدون مین سما سکین، جنکے علٰحدہ علٰحدہ عنوانات حسب ذیل ہونگے:

مذہبی، تاریخی، علمی، ادبی، تنقیدی، تعلیمی، قومی، سیاسی اور آخری جلدوں کے خطبات اور تقریروں کے مجموعہ پر مشتمل ہوگی،

پیش نظر جلد اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، بقیہ جلدیں آیندہ بہ ترتیب شایع ہوتی رہینگی،

وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ،

سید سلیمان ندوی، ناظم دار المصنفین
اعظم گڈہ،

۲۷ شعبان ۱۳۴۵ھ

مذہبی، تاریخی، علمی، ادبی، تنقیدی، تعلیمی، قومی، سیاسی اور آخری جلدوں کے خطبات اور تقریروں کے مجموعہ پر مشتمل ہوگی،

پیش نظر جلد اس سلسلہ کی پہلی کڑی ہے، بقیہ جلدیں آیندہ بہ ترتیب شایع ہوتی رہینگی،

وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللهِ،

۲۷ شعبان ۱۳۴۹ھ

سید سلیمان ندوی، ناظم دار المصنفین
اعظم گڈھ،

تاریخ ترتیب قرآن

قرآن مجید کا نزول اور جمع و ترتیب

رسول اللہ صلعم کی عمر جس قدر زیادہ ہوتی جاتی تھی، اُسی قدر دنیوی تعلقات سے آپ کا جی ہٹتا جاتا تھا اور جستجوئے حق آپ کو بے تاب کئے دیتی تھی، یہاں تک کہ آپ آبادی چھوڑ کر پہاڑ اور صحرا میں پھرنے لگے، مکہ سے منا کو جاتے ہوئے بائیں ہاتھ تین میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے جس کو حرا کہتے ہیں، اس میں ایک غار تھا رسول اللہ صلعم نے معمول کر لیا کہ کئی کئی دن تک متصل اس میں رہتے، اور مراقبہ و مجاہدہ کرتے کھانا گھر سے پکوا کر ساتھ لاتے جب ہو چکتا تو گھر کو واپس جاتے، دو تین دن وہاں ٹھہرتے اور پھر واپس آجاتے، اس طرح پورا ایک مہینہ گذر گیا[1] اور اتفاق یہ کہ یہ رمضان کا مہینہ اور آپ کی عمر کا چالیسواں سال تھا، اخیر دفعہ آپ اسی غار میں تشریف رکھتے تھے کہ آپ کو فرشتۂ یزدانی نظر آیا، اس نے آپ سے کہا کہ "پڑھو" آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، فرشتہ نے آپ کو زور سے بغل میں بھینچا، پھر چھوڑ کر کہا کہ "پڑھ" آپ نے پھر وہی جواب دیا، اس طرح تین بار اتفاق ہوا، تیسری دفعہ کے بعد فرشتہ نے یہ آیتیں خود پڑھیں اور آپ سے پڑھنے کی فرمائش کی :-

اقرأ باسم ربك الذی خلق خلق الانسان من علق، اقرء و ربك الاكرم	خدا کے نام سے پڑھ جس نے خلقت پیدا کی، جس نے انسان کو لوتھڑے سے پیدا کیا، پڑھو، اور تیرا خدا بڑا کریم ہے،

---

[1] عینی جلد اول (صفحہ ۴۷) بحوالہ سیرۃ ابن اسحاق،

ابن اسحق کی روایت مین ہے کہ یہ واقعہ خواب مین واقع ہوا یعنی فرشتہ کا آنا اور آپ کو دبانا آنحضرت صلعم نے خواب مین دیکھا،

آپ اس واقعہ کے بعد گھر مین آئے، آپ کا دل دھڑک رہا تھا، حضرت خدیجہؓ سے کہا کہ مجھکو کچھ اڑھادو، دیر کے بعد جب سکون ہوا تو آپ نے تمام واقعات حضرت خدیجہؓ سے بیان فرمائے، اور کہا کہ مجھ کو ڈر ہے (دیکھئے کیا ہوتا ہے) خدیجہؓ نے کہا آپ مطمئن رہئے، خدا ہرگز آپ کو خوار نہ کریگا، آپ صلہ رحم کرتے ہین، ناداروں کی خبر لیتے ہین، مہمانون کی مہمان نوازی کرتے ہین، یہ کہکر خدیجہؓ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لوا گئین، ورقہ حضرت خدیجہؓ کے چچیرے بھائی تھے، جاہلیت مین عیسائی ہو گئے تھے اور چونکہ عبرانی زبان جانتے تھے، عبری زبان مین انجیل کا ترجمہ کیا کرتے تھے، آپ نے ورقہ کے سامنے سب ماجرا بیان کیا، ورقہ نے کہا یہ وہی ناموس (رازدار) ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا، کاش مین جوان ہوتا کہ جب قوم آپ کو نکالنا چاہتی تو مین آپ کے کام آسکتا، آپ نے پوچھا کہ کیا یہ لوگ مجھکو نکالدینگے، ورقہ نے کہا ہمیشہ ایسی حالتون مین لوگ دشمن بنجاتے ہین[1]،

اس کے بعد تین برس تک آپ پر کوئی وحی نہین آئی[2]، ایک دن آپ نے آسمان کی طرف سے ایک آواز سنی آنکھ اٹھاکر دیکھا تو وہی فرشتہ جو حرا مین نظر آیا تھا، آسمان اور زمین کے بیچ مین ایک کرسی پر بیٹھا ہوا نظر آیا، آپ پر رعب طاری ہوا، اسی حالت مین گھر واپس آئے، اور فرمایا کہ مجھکو کچھ اڑھادو اس وقت یہ آیتین آپ پر نازل ہوئین[3]۔

یا ایھا المدثر قم فانذر و ربک فکبر — اے کپڑون مین لپٹے ہوئے اٹھ لوگون کو ڈرا، خدا کی بڑائی کر

---

[1] عینی شرح بخاری مطبوعہ قسطنطنیہ جلد اول ص ۳۰ سطر ۳، [2] یہ پوری تفصیل قریباً حرف بحرف بخاری کے پہلے ہی صفحہ مین ہے، مگر تاہم طریقہ سے اس حدیث مین لحاظ کے قابل یہ بات ہے کہ حضرت عائشہؓ اس وقت تک آنحضرت صلعم سے عقد نکاح مین نہین آئی تھین بلکہ پیدا ہی نہین ہوئی تھین اس لئے یہ حدیث کسی اور سے سنی ہوگی، لیکن راوی کا نام نہین بتایا اس قسم کی حدیث کو محدثین کی اصطلاح مین مرسل کہتے ہین، لیکن محدثین کا یہ مذہب ہے کہ صحابی جب کوئی حدیث بے سند بیان کرتا ہو تو وہ معتبر ہوتی ہو کیونکہ اس نے آخر کسی صحابی سے سنا ہوگا، اور صحابہ سب ثقہ ہین، [3] عینی جلد اول صفحہ ۴۸، بحوالہ ابن اسحاق و تاریخ احمد بن حنبل،

فکبر وثیابک فطہر والرجز فاھجر — کپڑے پاک کر ڈال اور ناپاکی سے الگ ہو جا،

اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا، وحی کا نزول اکثر تو کسی خاص واقعہ اور ضرورت کے پیش آنے پر ہوتا تھا، اور کبھی یوں بھی ہوتا تھا اکثر تین تین چار چار آئتین ایک ساتھ اترتی تھیں کبھی کبھی ایسا بھی ہوا کہ دس دس آئتین ایک ساتھ اتریں[1] جب کوئی آیت اترتی تھی تو آپ کسی پڑھے لکھے صحابی کو بلوا کر وہ آیت لکھوا دیتے تھے،[2] اس زمانہ مین جن چیزون سے کاغذ کا کام لیا جاتا تھا حسب ذیل تھین :-

عسیب، کھجور کی شاخ جس سے پتے کو الگ کر لیتے تھے،

لخفہ، پتھر کی پتلی تختیان،

کتف، اونٹ یا بکری کی چوڑی ہڈیان،

ادیم، چمڑا،

قتب، پالان کی لکڑی،

چنانچہ کاغذ کے علاوہ ان تمام چیزون پر قرآن مجید لکھا جاتا تھا،

قرآن مجید کی جمع و ترتیب کے متعلق جو روایتین منقول ہین، ان سے یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ تک قرآن مجید کی سورتون اور آیتون مین کوئی ترتیب نہ تھی، وجوہ ذیل سے اس شبہہ کی تائید ہوتی ہے،

۱- عموماً روایتون مین ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ مین جب قرآن جمع کیا جانے لگا تو کھجور کے تختون، ٹھیکرون، اور ہڈیون پر قرآن کی جو آئتین لکھی ہوئی ملتی تھین، ان کو جمع کرتے تھے اور ان سے نقل لیتے تھے، اگر سورتین مرتب ہو چکی ہوتین تو اس ریزہ چینی کی کیا ضرورت تھی،

[1] اتقان نوع سادس عشر، [2] اتقان نوع ۱۰ بحوالہ ترمذی ونسائی وغیرہ،

ترمذی اور نسائی وغیرہ میں روایت ہے کہ عبد اللہ بن عباس نے حضرت عثمانؓ سے پوچھا کہ آپ نے سورۂ براۃ کو انفال کے بعد کیوں رکھا اور دونوں میں بسم اللہ کے ذریعہ سے حد فاصل کیوں نہیں قائم کی؟ حضرت عثمانؓ نے کہا، سورۂ انفال مدینہ میں سب سے پہلے اتری تھی، اور سورۂ براۃ سب سے اخیر سورہ ہے، لیکن دونوں کے واقعات ملتے جلتے ہیں، اس لئے میں سمجھا کہ دونوں ایک ہی سورہ ہیں، لیکن چونکہ آنحضرت صلعم نے اس کے متعلق کوئی تصریح نہیں فرمائی تھی، اس لئے میں نے دونوں کو پاس پاس لکھا، اور بیچ میں بسم اللہ نہیں لکھی،

اس روایت سے اس قدر قطعی ثابت ہے کہ سورۂ براۃ اور سورۂ انفال کا الگ الگ مستقل سورہ ہونا مشتبہ اور مشکوک ہے،

ابو داؤد نے روایت کی ہے، کہ حارث بن خزیمہ نے دو آیتیں پیش کیں کہ میں نے اُن کو آنحضرت صلعم کی زبان سے سنا تھا حضرت عمرؓ نے تصدیق کی اور کہا کہ اگر تین آیتیں ہوتیں تو ایک مستقل سورہ ہو جاتی، اس لئے اب یہ کرنا چاہئے، کہ جو سورۃ سب سے اخیر میں اتری ہو، اس کے آخر میں یہ آیتیں شامل کر دی جائیں[1]، اس روایت سے صاف ظاہر ہے، کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ تک سورتیں مرتب نہیں ہو چکی تھیں،

چونکہ یہ ایک مہتم بالشان بحث ہے اس لئے ہم کسی قدر تفصیل سے اس کو لکھنا چاہتے ہیں،

واقعہ یہ ہے کہ جب کوئی سورہ نازل ہونی شروع ہوتی تھی تو دو دو چار چار آیتیں موقع بموقع اترتی تھیں، آنحضرت صلعم ان آیتوں کو اسی سورہ میں داخل کراتے جاتے تھے، جب ایک سورۃ ختم ہو جاتی، تو علحدہ نام سے موسوم ہو جاتی تھی، اور دوسری سورہ شروع ہوتی تھی، کبھی ایک ساتھ دو سورتیں نازل ہونی شروع ہوتیں، اور آنحضرت صلعم دونوں سورتوں

[1] اتقان ذکر جمع و ترتیب قرآن،

کو الگ الگ لکھواتے جاتے تھے، اس طرح سے آپ کے زمانہ ہی مین سورتین مدون ہو چکی تھین،
لیکن باہم سورتون مین کوئی ترتیب نہ تھی، یہی کام تھا جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ مین انجام پایا،
یہ امر کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ مین سورتین مرتب ہو چکی تھین اور ان کے نام قرار پا چکے تھے عموماً
حدیثون سے ثابت ہے، حذیفہ کی حدیث مین ہے کہ آنحضرت صلعم نے نماز مین البقرہ، آل عمران
اور نساء پڑھی، صحیح بخاری مین ہے کہ آنحضرت صلعم نے مغرب کی نماز مین سورہ اعراف پڑھی
اسی طرح اور حدیثون مین بہ تصریح آیا ہے، کہ فلان فلان سورتین آنحضرت صلعم نماز مین
پڑھتے تھے،

یہ امر بھی قطعی ہے کہ قرآن مجید کا بڑا حصہ ایک مجموعہ کی شکل مین مدون ہو چکا تھا،
حاکم نے مستدرک مین لکھا ہے، کہ قرآن مجید تین مرتبہ مدون کیا گیا، اور سب سے پہلی تدوین
خود آنحضرت صلعم کے زمانہ مین ہوئی، حاکم نے زید بن ثابت سے ایک حدیث نقل کی ہے جسکی
سند بخاری اور مسلم کی شرط کے موافق ہے، اور جس کے الفاظ یہ ہین،

كنا عند رسول الله صلى الله عليه وسلم نؤلف القرآن من الرقاع،
یعنی ہم لوگ آنحضرت صلعم کے پاس قرآن مجید کو پرزون اور ٹکڑون سے لیکر جمع کرتے تھے[1]

یہی مجموعہ ہے جس کی نسبت قرآن مجید مین جا بجا صحیفہ، کتاب اور لوح کا لفظ آتا ہے،

رسول من الله يتلوا صحفا مطهرة فيها كتب قيمة
خدا کا پیغمبر جو پاک صیحفے پڑھتا ہے جنمین معقول احکام ہین،

وكتاب مسطور في رق منشور[2]
اور قسم ہو اس کتاب کی جو کھلے ہوئے کاغذ پر لکھی ہوئی ہو،

---

[1] اتقان، [2] رق چمڑے کو کہتے ہین جس کو قدیم زمانہ مین کاغذ کے طور پر استعمال کرتے تھے، منشور کے معنی پھیلے ہوئے کے ہین، جس سے یہ مراد ہے کہ کتاب ملفوف کی صورت مین نہین لکھی گئی ہو جو لپیٹ کر رکھی جاتی ہے، بلکہ کتاب کی صورت مین ہے، حیرت ہے کہ ان تصریحات کے ساتھ بھی اکثر مفسرون نے یہان کتاب سے لوح محفوظ یا نامہ اعمال مراد لیا ہے، لیکن کیا لوح محفوظ اور نامہ اعمال مین چمڑے کا کاغذ استعمال کیا گیا ہے، تاہم غنیمت ہو کہ بعض مفسرین نے صحیح معنی بھی لکھے ہین، تفسیر ابو السعود مین ہے المراد به الصحف الخ امام رازی نے بھی یہی معنی نقل کئے ہین،

اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَاءَ ذَكَرَهُ فِي صُحُفٍ	قرآن مجید نصیحت نامہ ہے، سو جس کا جی چاہے، اس کو پڑھے،
مُكَرَّمَةٍ مَرْفُوعَةٍ مُطَهَّرَةٍ بِأَيْدِي	وہ ایسے صحیفوں میں لکھا ہوا ہے، جو محترم ہیں، بلند پایہ ہیں،
سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ ،	پاک ہیں اور ایسے کاتبوں کے ہاتھ میں ہیں جو بزرگ اور نیک
(سورہ عبس)	کردار ہیں ،

خوش اعتقادوں کا خیال ہے کہ صحیفہ سے لوح محفوظ اور سفرہ سے فرشتے مراد ہیں یعنی قرآن مجید لوح محفوظ میں ہے، اور لوح محفوظ فرشتوں کے ہاتھ میں ہے، لیکن یہ صحیح نہیں، اس قدر تمام مفسروں کے نزدیک مسلم ہے، کہ سفرہ کے معنی کاتب یا سفیر کے ہیں، یہ ظاہر ہے کہ لوح محفوظ فرشتوں کا لکھا ہوا نہیں ہے، بلکہ اس پر جو لکھا ہے خود دست قدرت نے لکھا ہے، اس لئے یہ تو مراد نہیں ہو سکتا کہ لوح محفوظ ان فرشتوں کے ہاتھ میں ہے جنھوں نے اس کو لکھا ہے، یہ ہو سکتا ہے کہ لوح محفوظ کے حامل جو فرشتے ہیں ان کو لکھنا آتا ہے، لیکن کسی روایت میں کہیں آسمانی فرشتوں کے لکھنے کا ذکر نہیں آیا ہے، نہ کسی چیز کے حامل ہونے کے لئے فن کتابت کی ضرورت ہے،

سفرۃ کے معنی اگر سفیر کے لئے جائیں تو یہ ظاہر ہے کہ جو ملائکہ سفرائے وحی ہیں (حضرت جبرئیلؑ وغیرہ) لوح محفوظ ان کے ہاتھ میں نہیں، نہ وہ لوح محفوظ کے حامل ہیں، وہ انبیا کو زبانی وحی پہونچاتے ہیں، لوح محفوظ کے اوراق لیکر نہیں آتے،

غرض یہ ہے، اور صاف معنی یہی ہیں، کہ قرآن مجید صحیفوں میں لکھا ہوا ہے اور یہ صحیفے برگزیدہ اور پاک لوگوں یعنی صحابہ کے ہاتھ میں ہیں، تفسیر کبیر میں ہے :-

وَالسَّفَرَةُ الْكِرَامُ الْبَرَرَةُ هُمْ أَصْحَابُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَقِيلَ هُمُ الْقُرَّاءُ	سفرائے کرام آنحضرت صلعم کے صحابہ ہیں، اور بعض لوگوں نے کہا ہے، کہ حفاظ قرآن مراد ہیں،

خوش اعتقادی کی وجہ سے اگرچہ عام لوگون کا ذہن، لوح محفوظ کی طرف جاتا ہے،
لیکن حقیقت یہ ہے کہ آیتون کے سباق و سیاق سے صاف معلوم ہوتا ہو کہ صحیفہ سے یہی قرآن مجید مراد ہے
حافظ ابن حجر صحیح بخاری کی شرح مین لکھتے ہین (جلد ۹ صفحہ ۱۰)

وقد اعلم الله تعالیٰ فی القرآن بانہ مجموع فی الصحف فی قولہ یتلوا صحفا مطہرۃ
الآیۃ وکان القرآن مکتوبا فی الصحف لکن کانت متفرقۃ فجمعہا ابوبکر خدا نے قرآن مجید مین بتا دیا کہ قرآن صحیفون
مین مجتمع ہے (یعنی اس آیت مین یتلوا صحفا الخ) اور قرآن صحیفون مین لکھا ہوا موجود تھا لیکن
یکجا نہ تھا حضرت ابوبکرؓ نے یکجا کر دیا)

خدا نے جابجا قرآن مجید کے مدون اور محفوظ رہنے کو اہتمام کے ساتھ بیان کیا ہے،

انا انزلنا ہ بالحق وانا لہ لحافظون " ہم نے قرآن کو برحق اتارا ہے، اور ہم اس کی حفاظت کرینگے

ان علینا جمعہ وقرآنہ" ہم پر ہے قرآن کا جمع کرنا، اور اس کا پڑھکر سنانا،

یہ ظاہر ہے کہ جس چیز کی حفاظت اور تدوین کا ذکر ہے، وہ لوح محفوظ نہین بلکہ وہ قرآن
ہے، جو آنحضرت صلعم کے حکم سے قید کتابت مین آیا تھا، اور کاغذ وغیرہ پر لکھا گیا تھا،
خدا نے جب قرآن مجید کی حفاظت اور تدوین کا اہتمام سے ذکر کیا، تو حفاظت اور تدوین
کے اسباب ظاہری بھی ذکر کئے، یعنی یہ کہ وہ محفوظ اوراق مین ہے، ہر کس و ناکس اس کو چھونے
نہین پاتا، جن لوگون کے ہاتھ مین ہے وہ معزز اور مقدس لوگ ہین،

انہ لقرآن کریم فی کتاب مکنون[1] لا یمسہ وہ بزرگ قرآن ہے، محفوظ کتاب مین ہے، اس کو صرف
الا المطہرون (واقعہ) پاک لوگ چھونے پاتے ہین،

فی صحف مکرمۃ مرفوعۃ مطہرۃ بایدی وہ ایسے اوراق مین لکھا ہوا ہے جو بلند پایہ ہین، پاک ہین

[1] مکنون کے معنی تمام مفسرین نے محفوظ کے لکھے ہین،

سفر تک کراھ جبر تا ،　　　　　　　　　　　　نیکوکار بزرگ لوگون کے ہاتھ مین ہین،

آیات مذکورۂ بالا سے ثابت ہوتا ہے کہ

۱- قرآن مجید کے اجزا آنحضرت صلعم کے زمانہ مین قلم بند کیے گئے تھے،

۲- یہ اجزا چمڑے یا اور کسی قسم کے کاغذ پر لکھے گئے تھے،

۳- ان کی حفاظت کا خاص اہتمام تھا، اور بغیر طہارت کے لوگ ان کو ہاتھ نہین لگانے پاتے تھے،

با اینہمہ یہ نہین ہوا کہ یہ اجزا اس طرح مرتب ہوگئے تھے کہ ایک آیت بھی چھوٹنے نہ پائی ہو، چونکہ وحی کا سلسلہ وفات تک جاری رہا، اور یہ اجزا ہر وقت ساتھ نہین رہتے تھے، اس لئے یہ بھی ہوا کہ بعض آیتین جو اتر ین وہ کسی پرچہ یا ہڈی وغیرہ پر لکھ لی گئین، اور اس مجموعہ مین نہ شامل ہوسکین، الگ کسی پرچہ یا ہڈی وغیرہ پر لکھی رہ گئین،

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے زمانہ مین ایک ایک پرزہ اور ہڈی وغیرہ جو جمع کین استقصا اور احتیاط کی غرض سے کین، اس کا یہ مطلب نہین کہ قرآن مجید اس وقت تک صرف انھین پرزون پر تحریر تھا، حارث محاسبی لکھتے ہین :-

کتابۃ القرآن لیست بمحدثۃ فانہ صلی اللہ علیہ وسلم کان یامر بکتابتہ ولکنہ کان مفرقا فی الرقاع والاکتاف والعسب فانما امر الصدیق بنسخہا من مکان الی مکان مجتمعا (اتقان)	قرآن مجید کی کتابت کچھ نئی بات نہ تھی خود آنحضرت صلعم نے قرآن کے قلم بند کرنے کا حکم دیا تھا، لیکن آنحضرت صلعم کے زمانہ مین مختلف چیزون یعنی کاغذ، شانہ کی ہڈی کھجور کے تختہ پر لکھا ہوا تھا، حضرت ابوبکرؓ نے حکم دیا کہ سب ایک جا جمع کر دیا جائے،

غرض آنحضرت صلعم کے زمانہ مین جس حد تک تدوین ہوچکی تھی اسقدر تھی، حضرت ابوبکرؓ نے

اپنے زمانۂ خلافت میں حضرت عمرؓ کی تحریک سے قرآن کے تمام اجزا یکجا لکھوائے جس کی تفصیلی کیفیت حسب ذیل ہے:۔

سنہ ۱۲ نبوت میں جو حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا پہلا سال تھا حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئے اور کہا کہ یمامہ کی لڑائی میں اکثر حفاظ قرآن شہید ہوئے، اگر اور لڑائیوں میں اسی طرح حفاظ شہید ہوئے تو قرآن کا بہت سا حصہ جاتا رہے گا، حضرت ابوبکرؓ نے کہا میں وہ کام کیونکر کروں جو رسول اللہ صلعم نے نہیں کیا، حضرت عمرؓ نے کہا لیکن یہ اچھا کام ہے، غرض حضرت عمرؓ کے بار بار کہنے سے حضرت ابوبکرؓ کے ذہن میں بھی اس کی مصلحت آگئی، انھوں نے زید بن ثابتؓ کو جو کاتب وحی تھے، بلا کر اس کام پر مامور کیا، انھوں نے بھی پہلے عذر کیا، لیکن بالآخر وہ بھی متفق ہوگئے اور جہاں جہاں قرآن مجید کسی چیز پر لکھا ملتا تھا، سب کو یکجا کرنا شروع کیا۔

اختلاف مصاحف و قرات

حضرت عثمانؓ نے جس طرح قرآن مجید کو ترتیب دیا بعض صحابہ نے اس کے خلاف ترتیب دی تھی، اور وہ اپنی اسی ترتیب پر قائم رہے، یہاں تک کہ جب حضرت عثمانؓ کا حکم پہونچا کہ ان کی ترتیب کے خلاف جو نسخے پائے جائیں ضائع کر دیئے جائیں، تو ان لوگوں نے اس حکم کی اطاعت نہیں کی، اور بڑے استقلال سے ان کے حکم کو رد کیا، ان مصاحف کی تفصیل حسب ذیل ہے:۔

مصحف عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ بن مسعود ان چار صحابہ میں ہیں جن کی نسبت

ۓ بخاری کی روایت میں یہی لفظ ہے، لیکن یہ امر تمام محدثین اور مورخین کے نزدیک مسلم ہے، کہ قرآن مجید کل کا کل قلم بند ہو چکا تھا، بعض [illegible] لکھ دیا ہے کہ [illegible] کو زبانی یاد [illegible] قرآن مجید کا [illegible]

آنحضرت صلعم نے حکم دیا تھا کہ لوگ ان سے قرآن مجید لکھیں، انھوں نے اپنے اجتہاد کے موافق سورتوں
کی ترتیب کی تھی جو حضرت عثمان رض کی ترتیب کے مخالف تھی، فتح الباری شرح بخاری میں ہے :-

وان فیه دلالة علی ان تالیف مصحف ابن مسعود علی غیر تالیف العثمانی (جلد ۹ صفحہ ۳۰)

نسائی اور ابوداؤد میں روایت ہے کہ عبداللہ بن مسعود رض نے منبر پر چڑھ کر کہا اور تم لوگ مجھکو
یہ کیونکر حکم دیتے ہو کہ میں زید بن ثابت رض کی قرأت کے موافق قرآن پڑھوں، میں نے تو خود آنحضرت صلعم
کی زبان سے سیکھا ہے،

حافظ ابن حجر نے لکھا ہے، کہ اس کی ترتیب بھی ترتیب نزول کے موافق نہ تھی[1]، ابن الندیم نے
اس کی ترتیب حسب ذیل بیان کی ہے :-

بقرہ، نساء، آل عمران، المص، انعام، مائدہ، یونس، براءة، نحل، ہود، یوسف، بنی اسرائیل
انبیاء، مومنون، شعراء، صافات، احزاب، قصص، نور، انفال، مریم، عنکبوت، روم، الخ،
(کتاب الفہرست میں اخیر تک کی تمام سورتیں لکھدی ہیں)

ابن الندیم نے لکھا ہے کہ میں نے ابن مسعود کے متعدد قرآن دیکھے لیکن ان میں دو بھی باہم
متفق نہ تھے[2]،

مصحف علی، یہ مصحف حضرت علی نے ترتیب دیا تھا اور آیت نزول کی ترتیب ملحوظ رکھی تھی یعنی جو آیتیں
اور سورتیں جب ترتیب اتری تھیں وہی ترتیب قائم رکھی تھی، حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں،

ویقال ان مصحف علی کان علی ترتیب النزول اوله اقرأ ثم المدثر ثم ن والقلم، ثم المزمل ثم
تبت ثم التکویر ثم سبح وهکذا الی آخر المکی ثم المدنی (جلد ۹ صفحہ ۳۰)

ابن الندیم کتاب الفہرست میں لکھتے ہیں کہ میں نے ابویعلی حمزة الحسنی کے پاس ایک

[1] فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۳۸، [2] کتاب الفہرست صفحہ ۲۶،

قرآن دیکھا تھا جو ان کے خاندان میں متوارث چلا آتا تھا، اور حضرت علیؓ کے ہاتھ کا لکھا ہوا مصحف ابن الندیم کے زمانہ تک موجود تھا، اس لیے اس زمانہ تک اس نسخہ کا موجود ہونا ثابت ہے،

مصحف ابی بن کعبؓ، اس مصحف کا ذکر بھی حافظ ابن حجر اور سیوطی نے جا بجا کیا ہے، ابن الندیم نے کتاب الفہرست میں لکھا ہے کہ بصرہ سے دو فرسنگ کے فاصلہ پر ایک گاؤں تھا جس کو قریۃ الانصار کہتے تھے ابی بن کعبؓ نے یہیں بیٹھ کر قرآن کی ترتیب کی تھی،[1] اس کے بعد ابن الندیم نے تمام سورتوں کا نام ان کی ترتیب کے موافق لکھا ہے، اور لکھا ہے کہ ان کے قرآن میں کل آیتیں ۶۲۱۰ ہیں،

مصحف عائشہؓ، صحیح بخاری باب تالیف القرآن میں ہے کہ عراق سے ایک شخص حضرت عائشہؓ کے پاس آیا، اور کہا کہ ام المومنین! آپ اپنا قرآن لائیے تو میں اپنا نسخہ درست کر لوں؛ کیونکہ لوگ قرآن کو بے ترتیب پڑھتے ہیں، حضرت عائشہؓ نے کہا کسی سورۃ کے پہلے پیچھے پڑھنے میں کیا حرج ہے، (یعنی سورتوں میں کوئی خاص ترتیب ضروری نہیں)

اس کے بعد حضرت عائشہؓ نے اپنا نسخہ نکالا اور عراقی نے اس کے موافق آیتیں درست کیں، (صحیح بخاری) ممکن ہے یہ وہی قرآن ہو جو حضرت ابوبکرؓ نے مرتب کرایا تھا،

مصاحف کے اس اختلاف اور بعض غیر مستند روایتوں سے جو بڑی بڑی کتابوں میں مذکور ہیں، لوگوں کو یہ شبہہ ہوا ہے کہ قرآن مجید بھی توریت اور انجیل کی طرح بہت کچھ ادل بدل گیا ہے، ان شبہہ کرنے والوں کے دلائل یہ ہیں:۔

۱۔ حضرت ابوبکرؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، ابیؓ وغیرہ کے مصاحف میں جو اختلاف تھا وہ صرف ترتیب سور کی بنا پر نہیں ہو سکتا تھا، سورتوں کی ترتیب کوئی امر اہم نہ تھا جس کی بنا پر عبداللہ بن مسعودؓ

[1] کتاب الفہرست ص ۲۶،

اس قدر جان بازی پر آمادہ ہو جاتے،

۲- تمام اہل روایت متفقاً لکھتے ہین کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے قرآن مین دو سورتین (معوذتین) نہ تھین،

حافظ ابن حجر شرح بخاری مین لکھتے ہین،

قد صح عن ابن مسعود انکار ذلک فاخرج احمد وابن حبان عنه انه کان لا یکتب المعوذتین فی مصحفه،

(احمد بزار، طبرانی وغیرہ محدثین نے بسند صحیح روایت کی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ جس قرآن مین یہ دونون سورتین پاتے تھے مٹا دیتے تھے)

۳- طبری اور بیہقی نے بعض ایسی سورتین روایت کی ہین جو موجودہ قرآن مین مطلق نہین ہین[1]

مثلاً:- اللّٰهم انا نستعینك ونستغفرك ونثنی علیك ولا نكفرك ونخلع ونترك من یفجرك اللّٰهم ایاك نعبد ولك نصلی ونسجد والیك نسعی ونحفد نرجو رحمتك ونخشی نقمتك ان عذابك بالكافرین ملحق[2]

۴- شیعہ جو مسلمانون مین ایک گروہ اعظم ہے، اس بات کا قائل ہے کہ قرآن مین بہت کچھ حذف و اسقاط ہوا ہے،

۵- قرأتون کے اختلافات جو منقول ہین، ان مین ایسے اختلافات ہین جو معمولی اختلاف نہین بلکہ لفظ کے لفظ اور بعض جگہ جملے کے جملے بدل گئے ہین،

ان واقعات نے عیسائیون کو موقع دیا ہے، کہ وہ تحریف انجیل کی ندامت اس الزامی

---

[1] اتقان معرفۃ متواتر و مشہور الخ،

[2] اتقان معرفۃ متواتر و مشہور صفحہ ۷۶ مطبوعہ مصر مطبع میمنیہ ۱۳۱۷ھ،

جو اسباب سے شائع کیں۔

سب سے پہلے ہم کو شیعوں کے الزام کی طرف متوجہ ہونا چاہیے، حقیقت یہ ہے کہ شیعوں کی حالت اور ان کی روایت قرآن مجید کے محفوظ رہنے کی سب سے بڑی دلیل ہے، شیعہ وہ فرقہ ہے جو خلفائے ثلثہ کو سرے سے (نعوذ باللہ) کافر سمجھتا ہے، اور ان لوگوں کے ہاتھ سے جو کام انجام پایا ہو، اس پر کبھی اعتبار نہیں کرسکتا، یہ مسلم ہے کہ جامع قرآن حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ اور اس کو بزور حکومت شایع کرنے والے حضرت عثمانؓ تھے، یہ بھی مسلم ہے کہ حضرت علیؓ نے قرآن مجید مرتب کیا تھا جس کی ترتیب بالکل مختلف تھی، خود سنیوں میں سے طبرانی اور بیہقی وغیرہ محدثین نے یہ روایتیں نقل کیں (جیسا کہ ابھی اوپر نقل ہوچکیں) کہ بعض سورتیں قرآن مجید سے نکل گئیں اور بعض سورتوں کی بہت سی آیتیں جاتی رہیں، بایں ہمہ شیعوں نے کیا کہا؟ علامہ طبرسی جو مشہور اور مستند شیعی مفسر ہیں، تفسیر مجمع البیان میں لکھتے ہیں:۔

ومن ذلك الكلام في زيادة القرآن ونقصانه فانه لا يليق بالتفسير فاما الزيادة فمجمع على بطلانه واما النقصان منه فقد روى جماعة من اصحابنا وقوم من حشوية العامة ان في القرآن تغييرا ونقصانا والصحيح من مذهب اصحابنا خلافه وهو الذي نصره المرتضى قدس الله روحه و استوفى الكلام فيه غاية الاستيفاء في جواب المسائل الطبرسيات وذكر في مواضع

انھیں میں سے ایک بحث یہ ہے کہ قرآن مجید میں حذف یا اضافہ ہوا ہے یا نہیں؟ یہ بحث فن تفسیر سے متعلق نہیں یہ امر کہ قرآن میں کچھ اضافہ ہوگیا ہے، سب کے نزدیک باطل ہے، باقی نقصان تو ہمارے فرقہ میں سے ایک گروہ نے اور سنیوں میں حشویہ[1] نے روایت کی ہے کہ قرآن میں تغیر اور نقصان ہوگیا ہے، لیکن ہمارے فرقہ کا صحیح مذہب اس کے خلاف ہے، اور سید مرتضیٰ نے اسی کی تائید کی ہے، اور مسائل طبرسیات کے جواب میں اس پر

---

[1] حشویہ سے یہ لوگ کم درجہ کے محدثین کو مراد لیتے ہیں،

ان العلم بصحة نقل القرآن كالعلم بالبلدان
والحوادث الكبار والوقائع العظام و
الكتب المشهورة واشعار العرب المسطورة
فان العناية اشتدت والدواعي
توفرت على نقله وحراسته وبلغت الى حد
لم يبلغه فيما ذكرناه لان القرآن معجزة النبوة
ومأخذ العلوم الشرعية والاحكام الدينية
وعلماء المسلمين قد بلغوا في حفظه وحمايته
الغاية حتى عرفوا كل شيء اختلف فيه من اعرابه
وقراءته وحروفه وآياته فكيف يجوز ان
يكون مغيرا او منقوصا مع العناية الصادقة
والضبط الشديد ××× وقال ايضا
ان القرآن كان على عهد رسول الله مجموعا
مؤلفا على ما هو عليه الآن واستدل على
ذلك بان القرآن كان يدرس ويحفظ جميعه
في ذلك الزمان حتى عين على جماعة من
الصحابة في حفظهم له وانه كان يعرض
على النبي ويتلى عليه وان جماعة من الصحابة
مثل عبد الله بن مسعود وابي بن كعب وغيرهما

نہایت مفصل بحث کی ہے، سید مرتضیٰ نے متعدد موقعوں
پر لکھا ہے کہ قرآن کے صحت کا علم ویسا ہی ہے جیسا شہروں
کا علم اور بڑے بڑے واقعات اور مشہور کتابوں اور
عرب کے مدون اشعار کا علم، کیونکہ قرآن کی نقل
اور حفاظت کے اسباب نہایت کثرت سے تھے اور
اس حد تک پہونچے تھے کہ اور کسی چیز کے نسبت نہیں گئے
اس لئے کہ قرآن نبوت کا معجزہ اور علوم شرعیہ اور احکام مذہبیہ
کا ماخذ ہے، اور علمائے اسلام نے اس کی حفاظت اور
حمایت میں انتہا درجہ کی کوشش کی یہان تک کہ قرآن
کے اعراب، قرأت، حروف آیات کے اختلافات تک
انھون نے محفوظ رکھے، اس لئے کیونکر قیاس ہو سکتا
ہے کہ اس احتیاط شدید کے ہوتے اسمین نقصان یا تغیر آگیا ہے
سید مرتضیٰ نے یہ بھی کہا ہے کہ قرآن مجید آنحضرت صلعم
کے زمانہ میں ایسا ہی مکتوب اور مرتب تھا جیسا اب ہے اور اسکی
دلیل یہ ہے کہ قرآن اس زمانہ میں پڑھا جاتا تھا اور لوگ
اس کو حفظ کرتے تھے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کو سناتے تھے، اور متعدد صحابہ مثلاً عبد اللہ ابن
مسعودؓ، اور ابی بن کعبؓ، وغیرہ نے قرآن کو آنحضرت
صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے چند بار ختم کیا تھا

ختم القرآن على النبي عدة ختمات وكل ذلك يدل بأدنى تأمل على انه كان مجموعاً مرتباً غير مبتور ولا مبثوث وذكر ان من خالف في ذلك من الامامية والحشوية لا يعتد بخلافهم فان الخلاف في ذلك مضاف الى قوم من اصحاب الحديث نقلوا اخبارا ضعيفة ظنوا صحتها[1]

سید مرتضیٰ نے یہ بھی لکھا ہے کہ جو امامیہ یا حشویہ اس کے مخالف ہیں انکی مخالفت قابل اعتبار نہیں کیونکہ اس میں جن لوگوں نے خلاف کیا ہے وہ اہل حدیث میں سے ایک گروہ ہے، اور انھوں نے ضعیف روایتیں نقل کی ہیں،

طبرانی اور بیہقی وغیرہ نے جو روایتیں نقل کی ہیں جنمیں دعاے قنوت کو قرآن کی سورتوں میں داخل کیا ہے سرتاپا خرافات اور لغو ہیں، حیرت ہے کہ ایسے معزز محدثین اس قسم کی جھوٹی حدیثیں کیونکر اپنی کتابوں میں نقل کرتے تھے، اور جلال الدین سیوطی تو حاطب اللیل ہیں ہی، ان کو کسی قسم کی روایت سے کیا دریغ ہے،

طبرانی کی روایت میں یہ راوی ہیں، عباد بن یعقوب الاسدی، یحییٰ بن یعلی الاسلمی، ابن لھیعہ، ابو ہبیرہ، عبد اللہ بن زریر الغافقی، ان کی کیفیت یہ ہے کہ عباد بن یعقوب گو رواۃ بخاری میں ہیں، لیکن جیسا کہ میزان الاعتدال ذہبی میں ہے، غالی شیعہ، اور رؤس بدعت سے ہیں، اور یہ اصول حدیث میں طے ہو چکا ہے، کہ بدمذہب شخص جب کوئی ایسی روایت کرے جس سے اس کے مذہب کو تقویت پہونچتی ہو، تو نامعتبر ہوگی، یہ ظاہر ہے کہ اس روایت سے ان غالی شیعوں کے دعوی کی تائید ہوتی ہے، جو قرآن میں حذف و اضافہ کے قائل ہیں، یحییٰ بن اسلمی مضطرب الحدیث ہیں، اور حاتم نے ان کو ضعیف کہا ہے[2]، ابن لھیعہ بھی ضعیف الحدیث ہیں،

بیہقی کی روایت میں عبد الملک بن جریج ہیں، ان کو ذہبی نے اگرچہ نامور ثقات میں لکھا ہے، لیکن ساتھ ہی لکھا ہے کہ مدلس تھے، اور مدلس کی روایت عنعنہ کے ذریعہ سے ناقابل اعتبار

---

[1] تفسیر مجمع البیان طبع ایران جلد اول صفحہ ۹ [2] میزان الاعتدال،

ہوتی ہے، ذہبی کی تصریح سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ حضرت بھی شیعہ تھے، کیونکہ آپ نے ۰ معوذتین
سے متعہ کیا تھا، امام احمد حنبل کہتے ہیں کہ ابن جریج نے جو مرسل روایتیں کی ہیں ان میں بعض محض
جعلی ہیں، بیہقی کے دوسرے راوی عبید بن عمیر ہیں، اور ان کو میزان الاعتدال میں مجہول لکھا ہے
اسی طرح مستدرک وغیرہ کی یہ روایتیں کہ سورہ براءہ پہلے سورہ بقر کی برابر تھی، سب جھوٹ اور افترا
ہیں، مستدرک کے مصنف نیم شیعہ تھے، اس لئے اس قسم کی روایتوں میں ان کو مزہ آتا ہوگا، علامہ
ذہبی ان کی نسبت میزان الاعتدال میں لکھتے ہیں، یصحح فی مستدرکہ احادیث ساقطۃ ویکثر
من ذلک ثم هو شیعی مشهور، یعنی وہ اکثر ساقط الاعتبار حدیثیں نقل کرتے ہیں، اور
مشہور شیعی ہیں،

عبداللہؓ بن مسعودؓ کا معوذتین سے انکار کرنا اگرچہ شہرت پکڑ گیا ہے، اور حافظ ابن حجر کو
روایت پرستی کی بنا پر اس کی صحت پر اصرار ہے، لیکن اور تمام محققین اس کو افتراے محض سمجھتے
ہیں، امام نووی نے شرح مہذب میں لکھا ہے کہ عبداللہؓ بن مسعودؓ کی طرف اس قول کی نسبت
صحیح نہیں، علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ عبداللہؓ بن مسعودؓ کی نسبت یہ اتہام ہے، چنانچہ یہ تمام اقوال
سیوطی نے اتقان بحث متواتر و مشہور میں نقل کئے ہیں، لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ سورتیں انکے
نزدیک داخل قرآن نہ تھیں تو اس سے قرآن مجید کے تواتر اور قطعیت پر کیا اثر پڑ سکتا ہے؟ اس سے
صرف اس قدر نتیجہ نکل سکتا ہے، کہ انھوں نے یہ سورتیں آنحضرت صلعم سے نہیں سنی تھیں، اور اپنے
سماع کے سوا وہ اوروں کے سماع کو قطعی نہیں سمجھتے تھے، ان کو تو بڑی شکایت یہ بھی تھی، کہ
ان کے ہوتے قرآن مجید زید بن ثابتؓ سے کیوں لکھوایا گیا، چنانچہ صحیح ترمذی میں روایت ہے
کہ مسلمانو! میں تو قرآن کی کتابت سے معزول کیا گیا، اور وہ شخص (زید بن ثابتؓ) مقرر کیا گیا،
کہ جب میں اسلام لایا تو وہ ایک کافر کے صلب میں تھا، ابن ابی داؤد میں ہے کہ عبداللہؓ بن مسعودؓ

گئیں تھیں کہ وہ جنہوں نے آنحضرت صلعم کی زبان سے ستر سورتیں سیکھیں، اور زید بن ثابت بچے تھے لیکن جب خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن ثابتؓ کو کاتب وحی مقرر فرمایا تھا تو کسی کو ان کی قابلیت کے انکار کا کیا حق ہے؛

اس تمام بحث میں یہ مسئلہ البتہ مہتم بالشان ہے کہ اختلافِ قرأۃ کیا چیز ہے، اور ان میں جو اختلافات ہیں وہ کس حد تک ہیں، اور ان کا اثر کہاں تک پہونچا ہے؛

عرب کے مختلف قبائل میں الفاظ کے تلفظ، حروف، اعراب، اوزان میں اختلاف تھا، مثلاً ایک قبیلہ حتّیٰ کو عتّی کہتا تھا کوئی علامت مضارع کو فتحہ کی بجائے کسرہ سے پڑھتا تھا کسی قبیلہ میں مالک کو ملک کہتے تھے، اس طرح کے کثرت سے اختلافات تھے اور چونکہ ہر قبیلہ اپنے لب و لہجہ پر مجبور تھا اس لئے وہ اپنی ہی زبان کے موافق الفاظ ادا کر سکتے تھے، اسی بنا پر آنحضرت صلعم نے ارشاد فرمایا کہ نزل القرآن علی سبعة احرف یعنی قرآن سات حرفوں پر اترا ہے، محدثین نے تصریح کی ہے کہ سات سے عدد مخصوص مراد نہیں، بلکہ کثرت مراد ہے، یہ اختلافات قرأت جس نوع کے تھے ان کا اندازہ تفصیل ذیل سے ہوگا؛

چند اختلافات متعلق سورۂ فرقان

قرأت مشہور	قرأت غیر مشہور
نزّل الفرقان	انزل الفرقان
علیٰ عبدہٖ	علیٰ عبیدہٖ
تکون لہ جنّۃ	یکون لہ جنّۃ
ضَیِّقًا	ضَیْقًا
مقرّنین	مقرّنون

قرأت مشہور	قرأت غیر مشہور
ما یعبدون من دون اللہ	ما یعبدون من دوننا
سراجا	سرجا
قرۃ اعین	قرات اعین
سُجّدا	سجودا
لما تامرنا	لما تامرنا بہ
یجزون الغرفۃ	یجزون الجنۃ
فقد کذبتم	فقد کذب الکافرون

حافظ ابن حجر نے فتح الباری (جلد ۹ صفحہ ۲۰) میں اس قسم کے تمام اختلافات کا استقصا کیا ہے، ان میں سے زیادہ تر بلکہ قریب کل صرف اعراب یا اختلاف لغۃ کا فرق ہے، شاذ و نادر مترادف الفاظ کا اختلاف ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ ان اختلافات سے اصل معنی پر کیا اثر پڑ سکتا ہے، عرب میں سینکڑوں قبیلے تھے، اور ان کا لب و لہجہ مختلف تھا، صحابہ نے قرآن زبانی سیکھا تھا، لکھے ہوئے اجزا بہت کم تھے، عجم کے اختلاط سے لب و لہجہ میں اور تغیر ہوا، ان سب حالات کے ساتھ اس قدر اختلاف کا ہونا ضروری تھا، اور شارع نے خود اس میں مسامحت کی، لیکن اس سے اس دعوی کا زور مطلق نہیں گھٹ سکتا، کہ قرآن مجید کا ایک ایک حرف محفوظ ہے، اور آج تک دنیا میں کوئی کتاب اس طرح محفوظ اور غیر محرف نہیں رہی، اعلان عام کیا گیا کہ جس شخص کے پاس قرآن مجید کا کوئی ٹکڑا ہو، لیکر آئے، اس بات کا التزام کیا گیا کہ جو شخص کوئی آیت پیش کرتا تھا، اس پر دو راویوں کی بھی شہادت لیجاتی کہ انھوں نے آنحضرت صلعم کے زمانہ میں ان کو قلمبند دیکھا تھا[۱]، ایسے صحابہ

[۱] ابو داؤد

جن کو قرآن مجید کے اکثر حصے زبانی یاد تھے، نہایت کثرت سے تھے، وہ زبانی قرآن مجید کی آیتیں سناتے تھے، لیکن وہ اسی وقت قلمبند کی جاتی تھیں، جب وہ ان کے پاس یا کسی اور صحابی کے پاس قلم بند بھی ملتی تھیں، اتقان میں حافظ ابو شامہ کا قول نقل کیا ہے، کہ

وکان غرضھم ان لایکتب الا من عین ما کتب بین یدی النبی لا من مجرد الحفظ

ان کا مقصد یہ تھا کہ قرآن صرف حفظ کی بنا پر نہ لکھا جائے، بلکہ اس کی نقل کی جائے، جو آنحضرت صلعم کے سامنے قلم بند ہوا تھا،

غرض ایک ایک پرزہ ایک ایک ٹھیکری تک جس پر قرآن کی ایک آیت بھی لکھی گئی تھی جمع کیے گئے اور سب کو سامنے رکھکر حافظوں کی مدد سے حضرت عمرؓ اور زید بن ثابتؓ نے قرآن مجید کا ایک مکمل نسخہ طیار کیا، زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ صرف سورۂ توبہ کی دو آیتیں ایسی ملیں جو خزیمہ بن ثابت کے سوا اور کسی کے پاس نہ تھیں،

یہ بیان کسی قدر تشریح طلب ہے کہ "زید بن ثابت کہتے ہیں کہ صرف سورہ توبہ کی دو آیتیں ایسی ملیں جو خزیمہ بن ثابت کے سوا اور کسی کے پاس نہ تھیں،" واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں کے جزو قرآن ہونے میں کسی کو کلام نہ تھا، بات صرف اتنی تھی کہ اس وقت کی تفتیش میں یہ آیتیں ابو خزیمہ کے علاوہ اور کسی کے قرآن میں لکھی ہوئی نہیں ملیں، ورنہ خود زید بن ثابت و ابو خزیمہ و حضرت عمر (رضی اللہ عنہم) کو یہ آیتیں یاد تھیں، اور ان کے آیت قرآنی ہونے پر سب کو اتفاق تھا،[1]

یہ نسخہ جو تیار ہوا حضرت ابوبکرؓ کے خزانہ میں رہا، ان کے بعد حضرت عمرؓ کے قبضہ میں آیا، آنحضرت عمرؓ کے بعد ان کی صاحبزادی حضرت حفصہؓ کے پاس آیا، مروان بن حکم جب مدینہ منورہ کا حاکم مقرر ہو کر

[1] فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۳،

آیا، تو اس نے حضرت حفصہؓ سے یہ نسخہ مانگ بھیجا، انھوں نے انکار کیا، ان کے مرنے کے بعد مروان
نے عبد اللہ بن عمرؓ سے جبر منگوا کر اس کو چاک کر ڈالا (دیکھو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۱) میں یہ سند صحیح یہ واقعہ
نقل کیا ہے، بنو امیہ کے جو احسانات اسلام پر ہیں، ان میں ایک یہ بھی احسان عظیم ہے ×

حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ خلافت میں قرآن مجید کے حفظ و اشاعت کا نہایت اہتمام کیا، تمام
ممالک مفتوحہ میں قرآن مجید کا درس جاری کیا، اور معلموں اور قاریوں کی تنخواہیں مقرر کیں،
خانہ بدوش بدویوں میں قرآت کی جبری تعلیم جاری کی، پھر ایک شخص کو جس کا نام ابو سفیان تھا
چند آدمیوں کے ساتھ مامور کیا، کہ قبائل میں پھر کر ایک ایک شخص کا امتحان لے، اور جس کو قرآن
مجید کی کوئی آیت یاد نہ ہو، اس کو سزا دے، صحابہ میں سے پانچ بزرگ تھے جو مشہور حفاظ قرآن
تھے، معاذ بن جبلؓ، عبادہ بن صامتؓ، ابی بن کعبؓ، ابو ایوبؓ، ابو الدرداءؓ، حضرت عمرؓ نے ان سب
کو بلا کر کہا کہ شام کے مسلمانوں کو جا کر قرآن کی تعلیم دیجئے، ابو ایوبؓ اور ابی بن کعبؓ نے بیماری
اور ضعف کی وجہ سے معذوری ظاہر کی، باقی تین صاحبوں نے خوشی سے منظور کیا، یہ لوگ پہلے
حمص گئے، وہاں تعلیم جاری ہو گئی تو عبادہ نے وہیں قیام کیا، اور ابو درداء دمشق کو اور معاذ بن
جبلؓ بیت المقدس کو روانہ ہو گئے، علامہ ذہبی نے طبقات القراء میں لکھا ہے کہ ابو درداءؓ کی تعلیم
کا طریقہ یہ تھا کہ نماز صبح کے بعد جامع مسجد میں بیٹھ جاتے تھے، قرآن پڑھنے والے کثرت سے جمع ہوتے
تھے، دس دس آدمیوں کی ٹکڑیاں کر دی جاتی تھیں، اور ہر ٹکڑی پر ایک قاری مقرر کیا جاتا
تھا، جو شخص پورے قرآن کا حافظ ہو جاتا تھا ابو درداءؓ اس کو اپنا شاگرد خاص بناتے تھے،
ایک دن شمار کرایا تو معلوم ہوا کہ سولہ سو طالب العلم اس وقت حلقہ درس میں حاضر ہیں،

حضرت عمرؓ نے اشاعت قرآن کے لئے اور بہت سی تدبیریں اختیار کیں، عمال کو لکھ بھیجا

---

۱ سیرۃ عمر لابن جوزی ۲ اغانی جزو ۶ [illegible] طبقات ابن سعد [illegible]
ہے، کنز العمال جلد اول صفحہ ۲۸ میں ابن سعد کی یہ روایت مذکور ہے،

کہ جو لوگ قرآن سیکھیں ان کی تنخواہیں مقرر کر دی جائیں، ناظرہ خوانون کا تو شمار نہ تھا، حفاظ کی تعداد بھی ہزارون سے متجاوز ہو گئی، حضرت عمرؓ نے جب فوجی افسرون کو خط لکھا کہ حفاظ قرآن کو میرے پاس بھیجدو کہ مین ان کو تعلیم قرآن کے لئے جابجا بھیجون تو سعد وقاصؓ نے جواب مین لکھا کہ صرف میری فوج مین تین سو حافظ موجود ہین،

باایں ہمہ چونکہ قرآن کے نسخے نہین شایع کئے گئے تھے، ادھر اسلام روز بروز دور دراز ملک مین پھیلتا جاتا تھا، اور نئی نئی قومین اسلام مین داخل ہوتی جاتی تھین، اس لئے الفاظ کے اعراب تلفظ، وجوہ قرأت مین اختلاف ہوتا گیا، اور یہ اختلاف برابر بڑھتا گیا، یہان تک کہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ مین لوگون نے ان سے آکر شکایت کی کہ قرآن کی خبر لیجئے، ورنہ اس کی حالت بھی توریت اور انجیل کی حالت ہو جائے گی، حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ کا مرتب شدہ قرآن حضرت حفصہؓ (حضرت عمرؓ کی صاحبزادی) کے پاس تھا، حضرت عثمانؓ نے ان کے پاس سے منگوا بھیجا، اور زید بن ثابتؓ عبداللہ بن زبیرؓ، سعید بن العاصؓ، عبدالرحمن بن حارثؓ سے چار نسخے نقل کرا لئے، اور مختلف صوبون مین بھیجے گئے یہ کام ۲۵ھ مین انجام پذیر ہوا، ابن ابی داؤد کی روایت ہے کہ ۱۲ شخص کتابت کے کام پر مقرر کئے گئے تھے،

یہ عجیب بات ہے کہ حضرت عثمانؓ کا نام جامع القرآن مشہور ہو گیا ہے، حالانکہ ان کو قرآن مجید کے جمع و ترتیب مین کوئی دخل نہین، انھون نے جو کچھ کیا وہ صرف یہ تھا کہ حضرت ابوبکرؓ کے نسخہ کی چند نقلین کرائین اور مختلف صوبون مین بھیج دین کہ ان کے موافق قرآن پڑھا جائے اتنا البتہ کیا کہ اس وقت تک قرآن مجید مختلف قراءتون مین پڑھا جاتا تھا، (اس کی تفصیل آگے آئے گی) حضرت عثمانؓ نے قرأت مشہورہ کے موافق قرآن لکھوا کر باقی قراءتون کے موافق

لہ کنز العمال ۲ہ ایضاً جلد اول صفحہ ۲۷۱ ۳ہ بعض مورخین کی کتابون مین ہے کہ سات نسخے نقل کرائے تھے،

جہان کہین جو اجزا ملے وہ چاک کر دیئے، یا جلا ڈالے،

حضرت عثمانؓ کے نسبت یہ روایت مشہور تو ہے کہ قرآن کے متفرق و مختلف اجزا ان کے حکم سے جلا دیئے گئے، روایت کے الفاظ مین "یحرق" (حاے حطی) سے بیان کیا جاتا ہے مگر حافظ ابن حجر عسقلانی بڑے وثوق اور تصریح کے ساتھ لکھتے ہین کہ "فی روایۃ الاکثر "ان یخرق" بالخاء المعجمۃ وھو اثبت (یعنی اکثر روایتون مین "یحرق" کی جگہ جس سے جلانے کا ثبوت دیا جاتا ہے "یخرق" خاے نخذ سے وارد ہے، جس کے معنی یہ ہین کہ حضرت عثمانؓ نے حکم دیا کہ قرآن کے غیر مرتب نسخے خرقہ کی طرح لپیٹ کر رکھدیئے جائین یعنی اب ان سے کام نہ لیا جائے (ملاحظہ ہو فتح الباری جلد ۹ صفحہ ۱۶)

اسکے ساتھ یہ بھی کیا کہ حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ مین سورتون مین باہم کوئی ترتیب نہ تھی، بلکہ بلا خیال تقدیم و تاخیر تمام سورتین الگ الگ لکھوا کر یکجا رکھوا دی گئی تھین، حضرت عثمانؓ نے سورتون کے مطول و مختصر ہونے کی بنا پر ترتیب دیدی کہ وہی آج موجودہ قرآن مین ہے،

قال الحارث المحاسبی المشہور عند الناس ان جامع القرآن عثمان ولیس کذلک، انما حمل عثمان الناس علی القراءۃ بوجہ واحد

حارث محاسبی کہتے ہین کہ لوگون مین مشہور ہے کہ حضرت عثمانؓ جامع قرآن ہین لیکن ایسا نہین ہے، حضرت عثمانؓ نے صرف یہ کیا کہ لوگون کو ایک خاص قراءۃ پر مجبور کیا،

عینی شرح بخاری مین ہے (جلد ۹ ص ۳۰۲)

ان الصحف ھی الاوراق المحررۃ التی جمع فیھا القرآن فی عھد ابی بکرؓ وکانت سورا مفرقۃ کل سورۃ مرتبۃ بآیاتھا علی حدۃ لکن لم یرتب بعضھا اثر بعض فلما نسخت ورتب بعضھا

صحیفہ ان اوراق کا نام ہے جو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ مین لکھے گئے تھے، یہ متفرق سورتین تھین جن کی آیتین مرتب تھین لیکن خود سورتون مین باہم کوئی ترتیب نہ تھی، پھر جب ان کی نقل لی گئی اور سورتین آگے پیچھے رکھی گئین تو اس کا نام مصحف

اثر بعض صحابہ مصحفا واحد لیکن مصحفا کلا فی عہد عثمانؓ ہوا اور یہ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ہوا،

حضرت عثمانؓ نے جو مصاحف نقل کرا کے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ، بصرہ کوفہ، دمشق میں بھجوائے تھے، مدت تک موجود تھے، چنانچہ ان کی تفصیل جیسا کہ مقری نے نفح الطیب میں لکھی ہے (جلد اول صفحہ ۳۰۸ مطبوعہ مصر) حسب ذیل ہے:-

دمشق: اس مصحف کو ابو القاسم سبتی نے سنہ [illegible]ھ میں جامع دمشق کی مقصورہ میں دیکھا، عبد الملک کا بیان ہے کہ میں نے اس کو سنہ [illegible]ھ میں دیکھا، یہ مصحف میرے سفر قسطنطنیہ کے زمانہ تک دمشق میں موجود تھا، کئی برس ہوئے جب سلطان عبد الحمید خان کے زمانہ میں جامع مسجد جل گئی، تو یہ مصحف بھی جل گیا،

مدینہ منورہ: اس مصحف کا بھی سنہ [illegible]ھ تک پتہ چلتا ہے، اس نسخہ کی پشت پر یہ عبارت لکھی ہوئی تھی،

ھذا ما اجمع علیہ جماعۃ من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منھم زید بن ثابت و عبد اللہ ابن الزبیر و سعید بن العاص (اس کے بعد اور صحابہ کا نام تھا)

مکہ معظمہ: یہ بھی سنہ [illegible]ھ تک موجود تھا،

بصرہ یا کوفہ: یہ قرآن معلوم نہیں کس زمانہ میں قرطبہ پہونچا، پھر عبد المومن اس کو قرطبہ سے اپنے دار السلطنت میں بڑے تزک و احتشام سے لایا، سنہ [illegible]ھ میں وہ معتضد کے قبضہ میں آیا، اس کے بعد ابو الحسن نے جب تلمسان فتح کیا تو یہ نسخہ اس کے قبضہ میں آیا، اس کے مرنے پر پرتگیز میں پہونچا، وہاں سے ایک تاجر نے کسی طرح اسکو حاصل کیا، اور سنہ [illegible]ھ میں شہر فاس میں لایا، چنانچہ مدت تک خزانہ شاہی میں موجود تھا،

علامہ مقریزی نے کتاب الخطط میں جہاں قاضی فاضل (سلطان صلاح الدین کا وزیر

تھا) کے مدرسہ کا ذکر کیا ہے، لکھا ہے کہ اس کے کتب خانہ میں مصحف عثمانی کا نسخہ موجود تھا جسے قاضی فاضل نے تیس ہزار اشرفی میں خریدا تھا،

حضرت عثمانؓ نے اگرچہ قرآن مجید کی متعدد نقلیں شائع کیں، لیکن اس وقت تک قرآن میں اعراب (زیر و زبر) اور نقطے نہیں ہوتے تھے، اور قریباً ۴۰ برس تک یہی حال رہا، اہلِ عرب کو تو اس کی کچھ ضرورت نہ تھی، ان کی زبان تھی، وہ ہر حالت میں صحیح پڑھ سکتے تھے، اور پڑھتے تھے، لیکن عجم کے لیے بڑی دقت تھی، نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کا اعراب کچھ سے کچھ ہو چلا، یہ دیکھ کر حجاج بن یوسف نے اپنے کاتبوں کو حکم دیا کہ اعراب اور نقطے لگائیں، چنانچہ نصر بن عاصم یا یحییٰ بن یعمر نے یہ خدمت انجام دی[1]،

---

[1] ابن خلکان، تذکرۂ حجاج بن یوسف، کتاب الاوائل میں یہ ہے کہ نقطے ابوالاسود دوئلی نے لگائے تھے جو حضرت علیؓ کے شاگرد رشید تھے،

علوم القرآن

اس امر سے زیادہ کیا چیز حیرت انگیز ہو سکتی ہے، کہ مذہب اسلام کی روح وروان جو
کچھ کہو، قرآن ہے، تاہم آج کل مسلمانون کو جس قدر قرآن کے ساتھ بے اعتنائی ہے، کسی چیز
سے نہین، عربی کے موجودہ درس مین ہر علم وفن کی کتابین کثرت سے داخل ہین، لیکن فن تفسیر
کی صرف دو کتابین پڑھائی جاتی ہین، جلالین اور بیضاوی، جن مین سے پہلی اس قدر مختصر ہے کہ
اس کے الفاظ وحروف قرآن مجید کے الفاظ وحروف کے برابر برابر ہین، اور دوسری گو چندان
مختصر نہین، لیکن اس کے صرف ڈھائی پارے درس مین داخل ہین، جو کتاب کا پانچوان حصہ
بھی نہین،

منطق وفلسفہ کی مدت تحصیل پانچ برس ہے، اور اور علوم پر بھی ایک معتد بہ زمانہ صرف
ہوتا ہے، لیکن قرآن مجید اور تفسیر کی تحصیل کے لئے پورا سال بھر گوارا نہین کیا جاتا، عربی علوم
وفنون کی کتابین کثرت سے چھپ چھپ کر شایع ہو رہی ہین، اور خصوصاً فن حدیث کا سرمایہ تو
اس قدر وجود مین آگیا ہے، کہ اگلون کے وہم وخیال مین بھی نہ تھا، لیکن قرآن مجید کے متعلق ۔
ایک معمولی درسی تفسیرون کے سوا، آج تک کوئی کتاب شایع نہین ہوئی، یہ تو ظاہری
بے پروائی کی کیفیت ہے، معنوی حیثیت سے دیکھو تو اس سے بھی زیادہ افسوسناک حالت
ہے، تمام مسلمانون کے نزدیک قرآن مجید کا معجزہ ہونا اس کی فصاحت وبلاغت کے لحاظ سے
ہے، لیکن کیا ہمارے علما اس دعوی کو ثابت کر سکتے ہین، اگر ان سے پوچھا جائے کہ قرآن مجید
کی انشاپردازی کی کیا خصوصیات ہین، قرآن مجید نے بلاغت کے کیا کیا نئے اسلوب پیدا کئے،

شعرائے جاہلیت نے مدح و ذم، فخر و ثنا، شادی و غم، عزم و استقلال، نیکی و رحمدلی، جوش و اثر کے مضامین کو جس پایہ تک پہونچایا تھا، قرآن مجید نے انھین مضامین کو کس رتبہ تک پہونچا دیا؟ تو کیا ہزار دن طلبا مین سے ایک بھی ان سوالون کا معقول جواب دے سکے گا؟ ادب و بلاغت پر موقوف نہین، فقہ، اصول، علم کلام، سب کا ماخذ قرآن مجید ہے، لیکن ہمارے علما خود فیصلہ کرسکتے ہین کہ علوم مذکورہ کے مسائل کو انھون نے قرآن مجید سے سیکھا ہے، یا ہدایہ، وتلویح وعقائد نفسی سے

یہ شکایت نئی نہین، تقریبًا چھ سو برس سے یہی حالت ہے، اس سے صرف یہی نہین ہوا کہ قرآن مجید کے متعلق نئی تالیفات کا سلسلہ بند ہو گیا، بلکہ افسوس اور سخت افسوس یہ ہے، کہ قدما کی نادر اور بیش بہا تصنیفات ناپید ہو گئین، خاص قرآن مجید کے اعجاز پر قدما نے بہت سی کتابین لکھی تھین، جن مین سے آٹھ یا نو کتابون کا تذکرہ جلال الدین سیوطی نے اتقان مین کیا ہے، لیکن لوگون کی بد مذاقی سے، ان مین سے صرف باقلانی کی ایک کتاب رہ گئی ہے، جو اس باب مین معمولی درجہ کی تصنیف ہے، اگرچہ ابوبکر عربی اسی کو احسن الکتب کا خطاب دیتے ہین،

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ شروع اسلام سے آج تک قرآن مجید کے متعلق جو کچھ علمی سرمایہ مہیا کیا گیا، ان پر ایک مختصر ریویو کیا جائے جس سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوگا، کہ ہمارے اسلاف نے اور علوم کی طرح اس فن کو کس قدر وسیع کیا تھا، اور کیا کیا نکتہ آفرینیان کی تھین، دوسری طرف یہ ظاہر ہوگا کہ قدما نے گو اپنے زمانہ کے موافق تحقیقات و تدقیقات کا حق ادا کر دیا تھا، تاہم آج اور بہت سے نئے پہلوون سے ان مسائل پر بحث کی ضرورت ہے،

قرآن مجید جس وقت نازل ہو رہا تھا، اُس وقت جو لوگ موجود تھے، وہ اگرچہ اس کے مطالب و معانی کے سمجھنے مین کسی معلم یا استاد کے محتاج نہ تھے، تاہم بعض بعض مقامات مین جہان زیادہ اجمال ہوتا تھا، یا کوئی قصہ طلب بات ہوتی تھی، لوگ خود آنحضرت صلعم سے دریافت کر لیا

کرتے تھے، آنحضرت صلعم کے بعد فتوحات کی ترقی اور تمدن کی وسعت کی وجہ سے احکام مین نئی نئی صورتین پیش آنے لگیین، اور اس ضرورت سے قرآن مجید کی آیات احکامیہ پر غور و فکر کرنے کی ضرورت پڑی، صحابہ مین سے جو لوگ علم و فضل مین زیادہ ممتاز تھے، انھون نے اس طرف زیادہ توجہ کی، ان بزرگون مین سے حضرت علیؓ سب کے پیشرو تھے، ان کے بعد حضرت عبد اللہ بن عباسؓ عبد اللہ بن مسعودؓ، ابی بن کعبؓ، زید بن ثابتؓ، ابو موسیٰ اشعریؓ کا درجہ ہے، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کے حلقۂ درس نے نہایت وسعت حاصل کی اور سیکڑون ہزارون شاگرد پیدا ہو گئے، ان مین سے مجاہد، عطاء بن رباح، عکرمہ، سعید بن جبیر سب سے ممتاز تھے، ان بزرگون کے سوا جن لوگون نے فن تفسیر پر توجہ کی، وہ حسن بصری، عطاء بن سلمہ خراسانی، محمد بن کعب القرظی، ابو العالیہ، ضحاک بن مزاحم، قتادہ، زید بن اسلم، ابو مالک وغیرہ ہین، غالباً سب سے پہلے اس فن کی جس نے ابتدا کی وہ سعید بن جبیر تھے، عبد الملک بن مروان نے ان سے تفسیر لکھنے کی درخواست کی چنانچہ انھون نے اس کی فرمایش کے موافق تفسیر لکھکر دربار خلافت مین بھیجی اور اس کا نسخہ دفتر شاہی مین داخل کیا گیا، عطاء بن دینار کے نام سے جو تفسیر مشہور رہے، وہ درحقیقت یہی تفسیر ہے[1]،

اس طبقہ کے بعد ائمہ مجتہدین اور ان کے ہمعصرون مثلاً سفیان بن عیینہ، شعبہ، یزید بن ہارون، عبد الرزاق، ابوبکر بن ابی شیبہ وغیرہ نے تفسیرین لکھین، اس کے بعد عام رواج ہو گیا، اور سیکڑون ہزارون تفسیرین تصنیف ہو گئین، اور ہوتی رہین،

تفسیر کے علاوہ قرآن مجید کے خاص خاص مباحث پر جداگانہ اور مستقل تصنیفات کا سلسلہ شروع ہوا، اور یہ سلسلہ تفسیر سے بھی زیادہ مفید تھا، کسی نے صرف مسائل فقہیہ پر بحث کی کسی نے اسباب نزول پر کتاب لکھی، کسی نے صرف ان الفاظ کو جمع کیا، جو غیر زبان کے الفاظ ہین،

[1] یہ تفصیل میزان الاعتدال ذہبی تذکرہ عطاء بن دینار سے ماخوذ ہے،

کسی نے امثال قرانی کو یکجا کیا، کسی نے آیات مکررہ کے نکات بیان کیے، اس قسم کے مضامین کی تعداد ۸۰ کے قریب پہونچی، اور قریباً ہر ایک پر الگ الگ مستقل تصنیفیں لکھی گئیں[1]، ان مضامین میں سے بعض بعض پر تمام بڑے بڑے ائمہ فن نے طبع آزمائیاں کیں، اور ہزاروں کتابیں تیار ہوگئیں۔

یہ تصنیفات اگرچہ بے شمار ہیں، لیکن ان سب کو چند قسموں پر تقسیم کیا جا سکتا ہے،

(۱) **فقہی،** جس میں صرف ان آیتوں کو یکجا کیا ہے، جن سے کوئی فقہی مسئلہ مستنبط ہوتا ہے، مثلاً احکام القرآن اسمٰعیل بن اسحٰق، احکام القرآن ابوبکر رازی، احکام القرآن قاضی یحییٰ بن اکثم،

(۲) **ادبی،** ان تصنیفات میں قرآن مجید کا فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے معجزانہ بے نظیر ہونا ثابت کیا ہے، اسی سلسلہ میں وہ تصنیفات بھی داخل ہیں جو قرآن مجید کی حقیقۃ و مجاز، تشبیہات و استعارات، مکررات، وجوہ ترتیب، صنائع و بدائع وغیرہ وغیرہ پر لکھی گئیں،

(۳) **تاریخی،** قرآن مجید میں انبیاے سابقین اور بزرگوں کے جو قصے مذکور ہیں انکی تفصیل اور مزید حالات،

(۴) **نحوی،** جس میں قرآن مجید کے نحوی مسائل سے بحث کی ہے، مثلاً اعراب القرآن رازی وغیرہ،

(۵) **لغوی،** یعنی قرآن مجید کے الفاظ مفردہ کے معانی اور ان کی تحقیق مثلاً لغات القرآن ابوعبیدہ وغیرہ،

(۶) **کلامی،** جن آیتوں سے عقاید کے مسائل مستنبط ہوتے ہیں، ان پر بحث،

ان مضامین میں سے فقہی مباحث پر جو کچھ لکھا گیا، اس پر اضافہ کی بہت کم گنجایش جسکی وجہ یہ ہے، کہ اس بحث پر بڑے بڑے ائمہ فن نے طبع آزمائیاں کیں، اور چونکہ شروع ہی سے

[1] دیکھو اتقان فی علوم القرآن کا دیباچہ،

ان مسائل کے متعلق الگ الگ فرقے بن گئے تھے کسی فریق نے تدقیق وتحقیق کا دقیقہ اٹھا نہین رکھا، امام شافعی، قاضی یحییٰ بن اکثم، (استاد ترمذی) ابوبکر رازی، جس پایہ کے لوگ تھے، سب کو معلوم ہے، ابوبکر رازی کی تصنیف آج بھی موجود ہے، اور ہماری نظر سے گذر چکی ہے، اسی طرح لغات قرآن اور مسائل نحویہ پر جو کچھ لکھا گیا، اس سے بڑھکر نہین لکھا جا سکتا،

فصاحت وبلاغت کے متعلق نہایت کثرت سے کتابین لکھی گئین، جو اعجاز القرآن کے نام سے مشہور ہین، ان مین فصاحت وبلاغت کے تمام اقسام سے بحث کی ہے، سب سے پہلے غالباً جاحظ المتوفی ۲۵۵ھ نے اس موضوع پر لکھا، پھر محمد بن یزید واسطی، عبد القادر جرجانی، رمانی، خطابی زملکانی، امام رازی، ابن سراقہ، قاضی ابوبکر باقلانی نے بسیط اور مفصل کتابین لکھین، یہ کتابین آج بالکل ناپید ہین،

مین نے قسطنطنیہ اور مصر کے تمام کتب خانے دیکھے، لیکن ایک کتاب کا بھی پتہ نہ لگا، البتہ قاضی باقلانی کی تصنیف موجود ہے، اس کا نسخہ مین نے خدیو کے کتبخانہ سے لکھوا کر منگوایا تھا، اور اب وہ چھپ بھی گئی ہے، اس کتاب کی نسبت ابن العربی کا قول ہے، کہ اس بحث پر کوئی کتاب اس درجہ کی تصنیف نہین ہوئی، ابن العربی کی رائے پر اگر اعتماد کیا جائے تو اسلام کی علمی حالت پر سخت افسوس ہوگا، کیونکہ باقلانی کی کتاب گو انشا پردازی کے لحاظ سے بلند رتبہ ہے، لیکن اصل مضمون کی حیثیت سے محض ایک ملایانہ تصنیف ہے،

عبد القاہر جرجانی جو فن بلاغت کا موجد ہے، اس کی اعجاز القرآن ہم نے نہین دیکھی؛ لیکن اس کی دو کتابین دلائل الاعجاز اور اسرار البلاغہ جو خاص فن بلاغت مین ہین ہمارے پیش نظر ہین، ان کتابون مین اس نے جو نکتہ آفرینیان کی ہین، وہ حیرت انگیز ہین، اور اس لئے

---

[1] اتقان بحث اعجاز القرآن،

قیاس ہو سکتا ہے، کہ قرآن مجید پر اس نے جو کچھ لکھا ہوگا، بے مثل ہوگا، اسی طرح جاحظ کی تصنیف بھی بے نظیر ہوگی، لیکن چونکہ پانچ چھ سو برس سے قوم کا علمی مذاق بالکل پست ہوگیا ہے، اس لئے لوگ ابن العربی، یا فلانی ہی کی تصنیف کو بہترین تصانیف قرار دیتے ہین،

اعجاز القرآن کے سلسلے کے علاوہ اور بہت سی تصنیفات ہین، جن مین انشاپردازی کی خاص خاص قسمون سے بحث کی ہے، مثلاً ابن ابی الاصبع نے قرآن مجید کے صنائع و بدایع پر مستقل کتاب لکھی، عزالدین بن عبد السلام نے قرآن کے مجازات کو یکجا کیا، ابو الحسن ماوردی نے قرآن کی ضرب المثلین جمع کین، اور ان کی خوبیان دکھائین، علامہ سیوطی نے سورتون کے طریق ابتدا پر ایک رسالہ لکھا، جس کا نام الخواطر السوانح فی اسرار الفواتح ہے، ابن القیم نے کتاب التبیان اس بحث پر لکھی، کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید مین کثرت سے قسمین کیون کھائین ہین؛

قصص اور حقایق اشیاء کے متعلق تصنیفات کا جو سرمایہ ہے، وہ درحقیقت شرم کا باعث ہے، اور افسوس اور سخت افسوس ہو کہ تفسیر کے اجزا مین سے جو حصہ سب سے زیادہ عوام مین مقبول اور متداول ہے، اور سلسلہ بہ سلسلہ تمام اسلامی لٹریچر مین سرایت کر گیا ہے، وہ یہی حصہ ہے، انبیاء اور صلحاے سابقین کے افسانے جو یہودیون مین پھیلے ہوئے تھے، وہ نہایت مبالغہ آمیز اور دور از کار تھے، قرآن مجید مین نہایت اجمال کے ساتھ صرف ان واقعات کو بیان کیا گیا، جو فی نفسہ صحیح تھے، اور جن سے طبائع پر کوئی اخلاقی عمدہ اثر پڑتا تھا، ہمارے مفسرون نے قرآن مجید کو ایک متن قرار دیا، اور اس کی شرح مین وہ تمام بیہودہ افسانے شامل کر دیئے، جن کے سامنے بوستان خیال، کی بھی کچھ حقیقت نہین حقایق اشیاء کے متعلق جو کچھ قرآن مجید مین مذکور تھا، اسکے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا، چاہ بابل، کوہ قاف، سکندر ذو القرنین، یاجوج ماجوج وغیرہ وغیرہ کی نسبت جو روائتین مسلمانون مین پھیلی ہین، وہ انھین تفسیرون کی بدولت ہین، علامہ

ابن خلدون نے اس کے متعلق مقدمۂ تاریخ میں نہایت محققانہ مضمون لکھا ہے، ہم اس کی عبارت اس موقع پر بقدر ضرورت نقل کرتے ہیں:۔

وقد جمع المتقدمون في ذلك واوعوا
الا ان كتبهم ومنقولاتهم تشتمل على الغث
والسمين والمقبول والمردود، والسبب في ذلك
ان العرب لم يكونوا اهل كتاب ولا علم وانما
غلبت عليهم البداوة والامية، واذا تشوقوا
الى معرفة شيء مما تتشوق اليه النفوس البشرية
في اسباب المكونات وبدء الخليقة واسرار
الوجود فانما يسألون عنه اهل الكتاب
قبلهم ويستفيدونه منهم وهم اهل التورٰة
من اليهود ومن تبع دينهم من النصارى واهل
التورٰة الذين بين العرب يومئذ بادية مثلهم
ولا يعرفون من ذلك الا ما تعرفه العامة من
اهل الكتاب، فلما اسلموا بقوا على ما كان عندهم
مما لا تعلق له بالاحكام التي يحتاطون لها مثل
اخبار بدء الخليقة وما يرجع الى الحدثان والملاحم
وامثال ذلك وهؤلاء مثل كعب الاحبار ووهب
بن منبه وعبد الله بن سلام وامثالهم

اور اس باب میں متقدمین نے بڑا ذخیرہ جمع کیا، لیکن انکی
تصنیفات اور روایتوں میں نیک و بد مقبول و مردود،
سب کچھ شامل ہے، اس کی وجہ یہ ہے، کہ اہل عرب لکھے
پڑھے نہ تھے، اور ان پر بالکل بدویت اور جہالت غالب تھی
اور جب انکو ان اشیاء کی دریافت کا شوق ہوتا تھا، جو طبائع
بشری کا اقتضا ہے، مثلاً آفرینش عالم کے اسباب، دنیا کی
ابتدا، وجود کے اسرار، تو ان باتوں کو وہ لوگ یہودیوں
سے دریافت کرتے تھے یا ان عیسائیوں سے جو یہودیوں کے
مقلد تھے، اور اس زمانہ کے یہود ایسے ہی جاہل تھے جیسے
بادیہ نشین عرب، ان کو صرف وہی معلومات تھیں جو عوام اہل
کتاب کو ہوتی ہیں، پھر جب یہ لوگ اسلام لائے تو ان امور
کے متعلق جو احکام شرعی سے تعلق نہیں رکھتے تھے، مثلاً دنیا کا
آغاز، واقعات قدیمہ، اور قصص انبیا، ان کے خیالات وہی
رہے، جو پہلے سے تھے، ان اسلام لانے والوں میں کعب احبار
وہب بن منبہ، عبداللہ بن سلام وغیرہ تھے، اس لئے تمام
تفسیریں ان کی روایتوں سے بھر گئیں، اور اس قسم کے
امور میں مفسرین سہل انگاری کرتے ہیں، اس لئے ان

التفاسیر من المنقولات عندهم، وتساهل المفسرون ــــ لوگون نے تفسیر کی کتابون کو انھین روایتون سے بھر دیا

فی مثل ذلک وملؤا کتب التفسیر بهذه ــــ اور جیسا کہ ہم اوپر بیان کر گئے ہین ان روایتون کا ماخذ وہی

المنقولات واصلها کما قلنا عن اهل التوراة ــــ توراة والے تھے، جو صحرا نشین تھے، اور ان کو ان روایتون

الذین یسکنون البادیة ولا تحقیق عندهم بمعرفة ــــ کے متعلق کچھ تحقیق حاصل نہ تھی، لیکن چونکہ مذہبًا ان لوگون

ما ینقلونه من ذلک الا انهم بعد صیتهم وعظمت اقدارهم ــــ کا پایہ بلند تھا، اور قوم مین ان کو شہرت اور عظمت حاصل

لما کانوا علیه من المقامات فی الدین والملة فتلقیت بالقبول[1] ــــ تھی، اس لئے وہ روایتین قبول عام پاگئین،

علامہ ابن خلدون نے جو کچھ لکھا محدثانہ تحقیق بھی تمام تر اسی کی تائید کرتی ہے، انبیاء سابقین اور زمین و آسمان وغیرہ کی آفرینش کے متعلق جو کچھ تفسیرون مین مذکور ہے، وہ عمومًا قدمار مفسرین سے ماخوذ ہے، یعنی مجاہد، سدی، ضحاک، مقاتل بن سلیمان، کلبی، ان مین سے تین مقدم الذکر نے صحابہ کا زمانہ پایا تھا، اور ان سے روایتین حاصل کی تھین، مقاتل نے ۱۵۰ھ مین وفات پائی، کلبی بھی اسی دور کے مفسر ہین، نقلی مضامین کے متعلق آج جس قدر تفسیرین ہین سب انھین بزرگون سے ماخوذ ہین، امام شافعیؒ کا قول ہے کہ فن تفسیر مین تمام لوگ مقاتل کے وظیفہ خوار ہین[2]، سدی کی نسبت جلال الدین سیوطی نے کتاب الارشاد سے نقل کیا ہے کہ امثل التفاسیر تفسیر السدی یعنی تمام تفسیرون مین سدی کی تفسیر سب سے اچھی ہے، امام طبری کی تفسیر کے متعلق تمام علماء کا اتفاق ہے کہ صحت و تنقید مین لاجواب ہے، لیکن یہ تفسیر بھی زیادہ تر سدی اور ضحاک سے ماخوذ ہے، چنانچہ جلال الدین سیوطی نے اتقان باب ہشتاد و دہم مین تصریح کی ہے،

ان بزرگون کا یہ حال ہے کہ مجاہد کی تفسیر کی نسبت جب لوگون نے امام اعمش سے دریافت کیا کہ اس مین غلطیان کیون پائی جاتی ہین، تو انھون نے جواب دیا کہ وہ اہل کتاب سے

---

[1] مقدمہ ابن خلدون باب علوم القرآن، [2] میزان الاعتدال ذہبی،

ماخوذ ہے، ضحاک کی نسبت محدثین نے تصریح کی ہے، کہ ابن عباسؓ اور ابو ہریرہؓ وغیرہ سے انھون نے جو روایتین کی ہین، سب مخدوش ہین، یعنی ان کی صحت مین کلام ہے، اس کے ساتھ یحیی بن سعید قطان نے جو اسماء الرجال کے امام ہین تصریح کی ہے کہ ضحاک میرے نزدیک ضعیف الروایۃ ہین، سدی کا یہ حال ہے کہ امام شعبی سے کسی نے کہا کہ سدی کو قرآن کے علم کا حصہ ملا ہے، تو انھون نے کہا کہ قرآن کے جہل کا حصہ ملا ہے، مقاتل کی نسبت وکیع کا قول ہے کہ کذاب تھا، محدث نسائی فرماتے ہین کہ مقاتل جھوٹ بولا کرتا تھا، عبد اللہ بن المبارک فرماتے ہین کہ مقاتل کی تفسیر بہت اچھی تھی کاش وہ ثقہ بھی ہوتا، جوزجانی نے لکھا ہے کہ مقاتل نہایت دلیر دجال تھا، محدث ابن حبان نے لکھا ہے کہ مقاتل قرآن مجید کے متعلق یہود و نصاری سے وہ باتین سیکھا کرتا تھا جو ان کی روایتون کے مطابق ہوتی تھین، کلبی کی نسبت تو عام اتفاق ہے، کہ ان کی تفسیر دیکھنے کے قابل نہین، امام احمد بن حنبل، دارقطنی، امام بخاری، جوزجانی ابن معین سب نے تصریح کی ہے، کہ وہ ناقابل اعتبار تھا، ابن حبان کا قول ہے کہ کلبی کا کذب دروغ اس قدر ظاہر ہے، کہ اس مین کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہین[1]، ایک ضمنی تذکرہ مین ان بزرگون کی اس قدر پردہ دری شاید موزون نہ تھی لیکن ان لوگون نے اسلام کو جس قدر نقصان پہونچایا ہے، اس کا کم سے کم یہی صلہ تھا، انھین حضرات کی روایتین ہین، جن سے تفسیر کبیر، کشاف، بیضاوی، اور اور سیکڑون ہزارون کتابین مالا مال ہین مسلمانون مین آج جو عجائب پرستی، زود اعتقادی، اور غلط خیالی ایک خاصہ بن گئی ہے، انھین کی روایات اور منقولات کی بدولت ہے،

---

[1] ان لوگون کے یہ اقوال میزان الاعتدال ذہبی سے ماخوذ ہین،

اعجاز قرآن

فاتوا بسورۃ من مثلہ

تیرہ سو برس سے دنیاے اسلام مین یہ آواز گونج رہی ہے کہ قرآن کا جواب نہین ہو سکتا، سنی، شیعی، معتزلی، اشعری، ماتریدی سب اس مین متفق اللفظ ہین لیکن جب یہ سوال ہوتا ہی کہ قرآن کا اعجاز کس وصف کے لحاظ سے ہے، تو دفعۃً اختلاف پیدا ہوجاتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ قرآن مین پیشین گوئیان ہین، اور یہ بشر کا کام نہین کوئی کہتا ہے کہ قرآن کا جواب تو ہوسکتا ہے لیکن جب کوئی جواب لکھنے کا قصد کرتا ہے تو خدا اس کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے، کوئی کہتا ہے کہ قرآن لوگون کے مخفی ارادون کا حال بتا دیتا تھا، اور آخر اشاعرہ کی اس رازکشائی پر تمام عالم کا اتفاق ہوگیا کہ چونکہ فصاحت وبلاغت مین قرآن کا جواب نہین ہو سکتا، اس لئے وہ کلام الٰہی ہے،

ابھی ہم کو اس سے بحث نہین کہ کیا انشاپردازی اور زورِ تحریر بھی ایسی چیز ہے، جو خدا کا کارنامہ قرار پائے، بلکہ جس پر تعجب اور سخت تعجب ہے وہ یہ ہے، کہ تیرہ سو برس تک یہ گفت وشنید، یہ بحث ونزاع، یہ اختلاف آرا ہوتا رہا، لیکن کسی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس سوال کا جواب اسی سے پوچھنا تھا جس نے یہ دعوی کیا تھا، یہ دعویٰ خود قرآن ہی نے کیا ہے، اور خود وہی اس سوال کا جواب دے سکتا تھا،

ہم کو یہ دیکھنا چاہیئے کہ جب خدا قرآن کی نسبت یہ کہتا ہے کہ تمام عالم اس کی نظیر نہین لا سکتا تو جا بجا قرآن کے مدحیہ اوصاف کیا بیان کرتا ہے، خدا نے قرآن مجید کی نسبت نہایت کثرت

سے مختلف اوصاف بیان کئے ہیں، مثلاً:-

والقرآن الحکیم، — قسم ہے قرآن کی جو کہ حکیم ہے،

والقرآن ذی الذکر، — اور قرآن کی جو ناصح ہے،

کتاب احکمت آیاتہ، — ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں مضبوط ہیں،

کتاب ینطق بالحق، — ایسی کتاب ہے جو سچ بولتی ہے،

کتاب مبین، — روشن کتاب ہے،

بینات من الھدی، — رہنمائی کے لئے دلائل ہیں،

ھدی للمتقین، — پرہیزگاروں کی رہنما ہے،

جعلناہ نوراً نھدی بہ من نشاء — ہم نے اس کو نور بنایا ہے کہ جسکو چاہتے ہیں اسکے ذریعہ سے راستہ دکھاتے ہیں

ھدی ورحمۃ للمحسنین، — وہ نیک آدمیوں کے لئے ہدایت اور رحمت ہے،

تقشعر منہ جلود الذین یخشون ربھم — اس سے اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اپنے خدا سے ڈرتے ہیں،

کتاب فصلت آیاتہ قرآناً عربیاً لقوم یعلمون، — ایسی کتاب ہے جسکی آیتیں کھول کر بیان کی گئی ہیں عربی کا قرآن ہے

بشیراً و نذیراً، — خوشخبری دینے والا ہے اور ڈرانے والا ہے

یھدی الی الحق والی صراط مستقیم، — حق کی طرف اور سیدھے راستہ کی طرف راہ دکھاتا ہے،

تذکرۃ لمن یخشیٰ، — ڈرنے والے کے لئے نصیحت ہے،

غور کرو قرآن مجید کی فضیلت کے بیان میں اس کو ناصح، رہنما، بشیر، نذیر، نور، حکیم، واضح سب کہا لیکن فصاحت و بلاغت کا کہیں نام تک نہیں آیا، اور وہی چیز چھوڑ دی گئی جو (لوگوں کے نزدیک) مدار اعجاز ہے، کیا ہدایت اور حکمت کے لحاظ سے کوئی کتاب قرآن کا جواب ہو سکتی ہے، اگر نہیں ہو سکتی تو یہ اوصاف کیوں معجزہ نہ ہوں، اور وہ وصف معجزہ ہو جسکا ذکر تک قرآن میں نہیں

اس کے یہ معنی نہیں کہ فصاحت و بلاغت مین قرآن کا جواب ہو سکتا ہے، بے شبہہ نہیں ہو سکتا، اور قیامت تک نہیں ہو سکتا، لیکن کتاب آسمانی کا رہنمائے عالم ہونا معجزہ ہو سکتا ہے نہ کہ شاعری اور انشاپردازی، حضرت یوسف علیہ السلام بے شبہہ جمال ظاہری مین اپنا جواب نہیں رکھتے تھے لیکن پیغمبری کی حیثیت سے ان کے اوصاف کمال مین ان کی نفس قدسی کا ذکر آئے گا نہ ان کے خط و خال کا، لیکن ہم کو ان دلائل اور قیاسات کی بھی ضرورت نہیں، قرآن مجید مین صاف مذکور ہے کہ وہ ہدایت کے لحاظ سے معجزہ ہے، یعنی اس وصف مین (بجز کتاب آسمانی کے) کوئی کتاب اس کی نظیر نہین بن سکتی،

قل فاتوا بکتاب من عند اللّٰہ ھو اھدیٰ منھما اتبعہ ان کنتم صادقین، (قصص)

کہدو اے محمدؐ! کہ خدا کے یہان سے کوئی کتاب ان دونو کتابون (قرآن توریت) سے بڑھکر ہدایت کرنے والی لاؤ تو مین اس کا پیرو بنتا ہون، اگر تم سچے ہو،

ایک نکتہ یہان قابل لحاظ کے ہے اور وہ اس بحث کا فیصلہ قطعی ہے، معجزہ دو قسم کا ہو سکتا ہے، ایک جس سے براہ راست منصب نبوت کو تعلق ہو، ایک وہ جو بالذات نہین، بلکہ بواسطہ دلیل نبوت قرار پائے، مثلاً ایک پیغمبر دعویٰ کرتا ہے کہ مین پیغمبر ہون یعنی مجھکو خدا نے دنیا کی ہدایت کے لئے بھیجا ہے، لوگ پوچھتے ہین کہ پیغمبری کا ثبوت کیا ہے، وہ فرماتے ہین کہ مین لاٹھی کو سانپ بنا دیتا ہون، اور میری ہتھیلی چاند کی طرح چمکتی ہے، لوگ کہتے ہین کہ اس معجزہ کو ہدایت اور پیغمبری سے کیا تعلق ہے؟ وہ جواب دیتے ہین کہ مین جو معجزہ دکھاتا ہون خدا کے سوا کوئی شخص اس پر قادر نہین، اس لئے مین جو یہ معجزہ پیش کرتا ہون، تو خدا ہی کی طرف سے کرتا ہون اس بنا پر مین خدا کی طرف سے آیا ہون، اور جو شخص خدا کی طرف سے آتا ہے، وہ پیغمبر ہوتا ہے، اس استدلال مین معجزہ براہ راست نبوت سے تعلق نہین رکھتا،

ایک دوسرا شخص کہتا ہے، کہ میں پیغمبر ہون، لوگ پوچھتے ہین کہ کیون؟ وہ فرماتے ہین کہ مین جس قسم کی ہدایت اور لوگون کا تزکیہ نفس کر سکتا ہون، کوئی بشر نہین کر سکتا، اب اگر یہ دعویٰ صحیح ہے تو یہی دعوی براہ راست معجزہ بھی ہے، اور خاصہ نبوت بھی، معجزہ اس لیے ہے کہ جو چیز کوئی اور بشر نہ پیش کر سکے، وہ معجزہ ہوگی، اور خاصہ نبوت اس لئے کہ تزکیہ نفس ہی کا نام پیغمبری ہے، اس کو ایک اور صاف مثال مین سمجھو، ایک شخص کہتا ہے کہ مین فارسی زبان جانتا ہون اور دلیل یہ پیش کرتا ہون، کہ مین ایرانی ہون، اور ایرانی ضرور فارسی جانتا ہوگا، اس کے مقابلہ مین ایک دوسرا شخص یہی دعوی کرتا ہے، لیکن دعوی کو فارسی ہی زبان مین ادا کرتا ہے کہ من فارسی را خیلے خوب می دانم، یہ دعوی، دعویٰ بھی ہے، اور دلیل بھی،

قرآن مجید اگر فصاحت و بلاغت کے لحاظ سے معجزہ قرار دیا جائے تو ایسا معجزہ ہوگا جو نبوت کا خاصہ نہین کیونکہ انشا پردازی لازمہ نبوت نہین، لیکن اگر قرآن مجید کو تزکیہ نفس اور موعظت و حکمت کے لحاظ سے معجزہ کہا جائے تو یہ معجزہ بھی ہوگا اور خاصہ نبوت بھی، ھذا ھو الحق فماذا بعد الحق الا الضلال،

قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں؟

مخالفوں نے قرآن مجید پر جو نکتہ چینیاں کی ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے، اس اعتراض کے متعدد پہلو ہیں،

(۱) سب سے پہلا یہ کہ خود قرآن میں قسم کھانے کی برائیاں ہیں، ولا تجعلوا اللّٰہ عرضۃ لایمانکم خدا کو اپنی قسموں کا ہدف نہ بناؤ، ولا تطع کل حلاف زیادہ قسم کھانے والوں کا کہنا نہ مان،

(۲) آدمی جن چیزوں کی قسم کھاتا ہے یا اس کی عظمت وتعظیم کے لحاظ سے کھاتا ہے یا محبت اور شیفتگی کی وجہ سے،

قرآن مجید میں خدا نے جو قسمیں کھائی ہیں تعظیم اور عظمت کے لحاظ سے تو نہیں ہو سکتیں کیونکہ خدا سے بڑھکر کون ہے،

دوسرا احتمال ممکن تھا لیکن قرآن میں جن معمولی اور ادنیٰ چیزوں کی قسمیں کھائی ہیں، ان کے لحاظ سے یہ احتمال بھی نہیں ہو سکتا،

قرآن میں انجیر اور زیتون تک کی قسم موجود ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ خدا کو یہ میوے نہایت عزیز اور محبوب ہیں، اس لئے ان کی قسم کھائی،

اس بحث سے قطع نظر کرکے قسم کھانا فی نفسہ ایک سبکی کی بات ہے، قسم وہی کھاتا ہے جس کو اپنی نسبت یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ لوگ اس کی بات کو بے تکلف یقین کر لیں گے یہی وجہ ہے کہ بازاری آدمی بات بات پر قسم کھاتے ہیں، خواص ان سے کم اور ثقاۃ تو مطلق

قسم نہین کھاتے، ایران مین مثل ہے کہ گفتی باور نمودم، مکرر گفتی در شک افتادم، قسم خوردی دروغ دانستم،"

مفسرین نے اس شبہہ کے عجیب عجیب جواب دیئے ہین،

(۱) قسم کھانا، عرب کا عام طریقہ تھا اور جزو زبان بن گیا تھا، اس لئے جو کلام عرب کی زبان مین نازل ہوگا وہ اس سے بری نہین ہو سکتا،

(۲) آنحضرت صلعم جب عقائد اسلام کی صحت پر قرآن مجید کی آیتین پیش کرتے تھے، تو کفار کہتے تھے کہ یہ باتین درحقیقت غلط ہین، لیکن یہ قرآن کا عام فریب استدلال اور زور عبارت ہے کہ غلط کو صحیح ثابت کر دیتا ہے، اس شبہہ کے رفع کرنے کا اس کے سوا اور کوئی طریقہ نہ تھا، کہ قسم کھا کر ان کو یقین دلایا جائے،

(۳) جن چیزون مثلاً انجیر اور زیتون وغیرہ کو تم بے حقیقت سمجھتے ہو، درحقیقت عظیم الشان چیزین ہین، چنانچہ امام رازی وغیرہ نے فلسفیانہ دلائل سے زیتون اور انجیر کی خوبیان ثابت کی ہین،

یہ اور اسی قسم کے جوابات مخالف کو تو بالکل مطمئن نہین کر سکتے، اور موافق کے لئے اعتراض و جواب کی سرے سے ضرورت ہی نہین، اس کو کلام الٰہی کے آگے چون وچرا سے کیا غرض

مصرع مجھے تو خوب ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے،

مولوی حمید الدین صاحب جنکا ذکر الندوہ کے ایک پرچہ مین ایک خاص تقریب سے آچکا ہے، قرآن مجید کے حقائق و اسرار پر جو کتاب عربی زبان مین لکھ رہے ہین، اس کے بعض اجزاء آج کل ہم کو ہاتھ آئے، ان مین اس مسئلہ پر بھی بحث تھی انھون نے جو کچھ لکھا ہے، نہایت محققانہ اور ادیبانہ لکھا ہے، اس لئے ہم اس کا خلاصہ اس موقع

پر درج کرتے ہین،

اس عقدہ کے حل کرنے کے لئے پہلے قسم کی حقیقت اور اس لفظ کی تاریخ پر غور کرنا چاہئے
قسم کا استعمال اصل مین اس طرح شروع ہوا کہ جب کسی واقعہ کو بیان کرتے تھے تو
اس کی تصدیق و صحت کے لئے کسی شخص کی شہادت اور گواہی پیش کرتے تھے، اس طریقہ
کو جب زیادہ وسعت ہوئی تو انسان کے علاوہ حیوانات اور جمادات کی شہادت بھی استعمال کی
مین آنے لگی، مثلاً ہم اپنی زبان مین کہتے ہین "در و دیوار" اس بات کے شاہد ہین، فلان شخص
نے جس بہادری سے جنگ کی، میدان جنگ اس کی شہادت دے سکتا ہے، عربی زبان مین
اس کی سیکڑون مثالین ہین،

الخیل تشهد یوم داهر والقنا	داہر کی لڑائی کے دن گھوڑے اور نیزے گواہ تھے
ان السماء وان الریح شاهدة	والارض تشهد والایام والبلد
آسمان ہوا زمین	زمانہ، اور شہر، گواہ ہین
لقد جزیت بنی بدر ببغیهم	یوم الهباءة یوماً ماله قود
کریمے قبیلہ بنی بدر کو انکی بغاوت کی پاداش مین	وہ سزا دی جس کا بدلہ نہین ہو سکتا،

نابغہ کہتا ہے،

والخیل تعلم انا فی تجالدنا	عند الطعان اولو بوس وانعام
گھوڑے جانتے ہین کہ ہم لڑائی مین	سزا بھی دیتے ہین اور انعام بھی

عنترہ کا شعر ہے،

والخیل تعلم والفوارس اننی	فرقت جمعهم بطعنة فیصل،
گھوڑے اور سوار دونون جانتے ہین	کہ مین نے انکے جتھے کو ایک فیصلہ کرنیوالے وار سے توڑ دیا

اس طرح کی ہزارون مثالین ہین،

ان چیزون کی شہادت پیش کرنے کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ یہ چیزین زبان حال سے شہادت دے رہی ہین یعنی اگر ان کو بولنے کی قوت ہوتی تو بول اٹھتین کہ ہان یہ واقعہ سچ ہے،

چونکہ اس طریقہ اداسے واقعہ کا یقین دلانا مقصود ہوتا ہے، اس لئے یہ طریقہ رفتہ رفتہ قسم کے معنی مین مستعمل ہونے لگا یعنی کسی کی گواہی پیش کرنی، اور قسم کھانا ایک چیز ہو گئی،

عمرو بن معدیکرب کا شعر ہے،

واللہ یعلم ما ترکت قتالہم　　　خدا جانتا ہے کہ مین نے لڑنا نہین چھوڑا،

یہان "خدا جانتا ہے" کا لفظ قسم کے معنون مین آیا ہے یعنی خدا کی قسم مین نے لڑنا نہین چھوڑا، ہماری زبان مین عام طور پر قسم کے موقع پر کہتے ہین، "اللہ جانتا ہے، خدا شاہد ہے، خدا گواہ ہے" خود قرآن مجید مین گواہی کا لفظ قسم کے معنی مین مستعمل ہوا ہے، مثلاً ویدرءعنہا العذاب ان تشہد اربع شہادات باللہ انہ من الکاذبین،

قالوا نشہد انک لرسول اللہ واللہ یعلم انک لرسولہ واللہ یشہد ان المنافقین لکاذبون۔ اتخذوا ایمانہم جنۃ، پچھلی آیت کا لفظی ترجمہ یہ ہے،

"منافقین کہتے ہین کہ ہم گواہی دیتے ہین کہ بیشک تو خدا کا رسول ہے، اور خدا جانتا ہے کہ بیشک تو خدا کا رسول ہے، لیکن خدا گواہی دیتا ہے کہ منافق جھوٹے ہین، منافقون نے اپنی قسم کو سپر بنا لیا ہے، دیکھو اس آیت مین منافقین کی زبان سے جو لفظ نقل کیا وہ صرف یہ تھا کہ "ہم تمھارے پیغمبر ہونے کی گواہی دیتے ہین" پھر آگے چل کر فرمایا کہ منافقین اپنی قسم کو سپر بناتے ہین، حالانکہ منافقین نے قسم کا کوئی لفظ استعمال نہین کیا تھا بلکہ صرف گواہی دینے کا لفظ استعمال کیا تھا، اس سے معلوم ہوا کہ اسی گواہی کو خدا نے قسم قرار دیا،

عربی زبان نے جب زیادہ وسعت حاصل کی تو بعض بعض حرف قسم کے لئے خاص ہوگئے

مثلاً واؤ، ب، ت، عام محاورہ وہے و اللہ، باللہ، تاللہ،

اب قسم کے دو مفہوم ہین،

ایک یہ کہ جب کوئی واقعہ یا مسئلہ بیان کیا جائے تو اس پر کوئی شہادت پیش کیجائے چاہے

یہ شہادت ذی روح کی ہو یا اشیا کے زبانِ حال کی شہادت ہو،

دوسرے یہ کہ صرف ایک بات کی توثیق اور یقین دلانے کے لئے کسی بڑے شخص یا کسی

عزیز چیز کی قسم کھائی جائے، یہ دوسرا مفہوم قسم کا مجازی استعمال ہے جو رفتہ رفتہ پیدا ہوگیا

اصل مین قسم کے یہ معنی نہ تھے،

قرآن مجید مین جہان جہان قسم کا لفظ آیا ہے پہلے معنی کے لحاظ سے آیا ہے، خدا جب

اپنی قدرت وشان کا اظہار کرتا ہے تو آفتاب کی، چاند کی، ستارون کی دن رات کی قسم

کھاتا ہے جس کے یہ معنی ہین کہ یہ تمام چیزین، اس کے وجود اور عظمت وشان کی گواہی

دے رہی ہین، قرآن مجید مین خود اس کی تصریح موجود ہے، کہ قسم کا استعمال اسی معنی مین ہے

والفجر ولیال عشر والشفع والوتر — فجر اور دس راتین جفت اور طاق اور رات جب

واللیل اذا یسر هل فی ذالک قسم لذی حجر — چلنے پر ہو، ان باتون مین صاحب عقل کے لئے قسم ہے

قسم کا لفظ یہان صاف اسی معنی مین آیا ہے، خدا نے پہلے چند چیزین گنائین پھر فرمایا

کہ ان چیزون مین صاحب عقل کے لئے قسم ہے، یعنی یہ چیزین عقلمند کے نزدیک خدا کے وجود اور

قدرت کی شہادت دے رہی ہین،

خدا نے جا بجا مظاہر قدرت مثلاً آفتاب ماہتاب، دریا، ہوا، بادل، چرند پرند کو

آیت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے جس کے معنی نشانی کے ہین، یعنی یہ چیزین خدا کی قدرت کی

نشانیان ہین،

ان فی خلق السموات والارض و اختلاف	آسمان اور زمین کی پیدائش مین اور رات دن کے ادل بدل مین
اللیل و النہار والفلک التی تجری فی البحر	اور جہازون جو لوگون کے فائدہ کی چیزون کو لے کر دریا مین چلتے
بما ینفع الناس وما انزل اللہ من	ہین، اور آسمان سے جو پانی اتارا ہے، کہ جس سے مردہ زمین
السماء من ماء فاحیی بہ الارض	کو زندہ کر دیتا ہے، اور تمام چارپائے جو پھیلا دیئے ہین
من بعد موتہا وبث فیہا من کل دابۃ	اس مین اور ہواؤن کے چلنے مین اور بادل مین جو
وتصریف الریاح والسحاب المسخر بین	آسمان اور زمین کے بیچ مین مسخر ہے، جاننے والون کے
السماء والارض لآیات لقوم یعقلون	لئے نشانیان ہین،

اسی طرح قرآن مین نہایت کثرت سے تمام مظاہر قدرت کی نسبت نشانیون کا لفظ استعمال کیا ہے، اب غور کرو یہی چیزین جن کو اکثر موقعون پر نشانیان بتایا ہے، انھین چیزون کی جابجا قسم بھی کھائی ہے جس کے صاف یہ معنی ہین کہ یہ چیزین خدا کی قدرت کی گواہی دے رہی ہین، اور قسم کا یہ صحیح استعمال بھی ہے،

ایک بڑی غلطی اس وجہ سے پیدا ہوتی ہے، کہ عربی زبان مین قسم کے قریب المعنی اور جو الفاظ ہین ان مین لوگ امتیاز نہین کرتے عربی زبان مین اس قسم کے تین لفظ ہین، قسم یمین، حلف، عام لوگ ان سب الفاظ کو ہم معنی سمجھتے ہین، اور اس وجہ سے عظیم الشان غلطیان پیدا ہوتی ہین، حالانکہ ان سب الفاظ کے مفہوم الگ الگ ہین،

قسم کے معنی تو وہی ہین جو گذر چکے یعنی کسی واقعہ کی صحت کے لئے شہادت پیش کرنی قرآن مین جو قسمین مذکور ہین سب کے یہی معنی ہین کہ جن چیزون کی قسم کھائی ہے، وہ خدا کے ثبوت پر اس کے عظمت و شان پر، اس کی وسعت قدرت پر زبان حال سے گواہی دے رہی

ہین اچنانچہ سورۂ فجر مین صاف تصریح ہے، ھل فی ذالک قسم لذی حجر،

یمین کے لفظی معنی ہاتھ کے ہین، یہ لفظ عموماً معاہدات کی توثیق کے لیے مستعمل ہوتا ہے اور جس چیز پر یہ لفظ آتا ہے، اس کو ضامن دینا مقصود ہوتا ہے، لغت کی کتابون مین ہے،

ان الیمین اصلہا ضرب الیمین علی المتعاقدین — معاہدہ کرنے والے چونکہ ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہین یہ لفظ اسی سے نکلا ہے

امراؤ القیس کہتا ہے،

فقلت یمین اللہ ابرح قاعداً	ولو قطعوا راسی لدیک واوصالی
مین نے کہا خدا کا قسم کہ مین یہان سے نہ ٹلونگا	گو یہ لوگ میرا سر اور میرا بند بند میرے آگے کاٹ ڈالین

یہ لفظ جب خدا کے ساتھ مستعمل ہوتا ہے تو قسم کے ہم معنی ہوتا ہے، اس لئے یہ لفظ قرآن مجید مین خدا کی زبان سے کہین نہین مستعمل ہوا ہے،

حلف یہ لفظ دونون پچھلے لفظون سے زیادہ وسیع ہے لیکن اس کے مفہوم مین ذلت اور دنارت داخل ہے، اور اس کا استعمال بالکل اسی حیثیت سے ہوتا ہے، جس طرح آج کل عوام قسم کھاتے ہین،

نابغہ ذبیانی ایک مشہور شاعر گذرا ہے، اس کی نسبت لوگون نے **نعمان بن منذر** سے کہدیا تھا کہ وہ آپ کی بیوی پر عاشق ہے، بادشاہ سخت ناراض ہوگیا، اور نابغہ کو سزا دینی چاہی، نابغہ کو خبر ہوئی تو متعدد قصیدے معذرت مین لکھے، جنمین نہایت ذلیل اور عاجزانہ طریقہ سے اس جرم سے برأت ظاہر کی، اس قصیدہ کا ایک شعر ہے،

حلفت فلم اترک لنفسک ریبۃ	ولیس وراء اللہ للمرء مذہب
مین قسم کھاکر کہتا ہون تاکہ تیرے دل میں کچھ شبہہ نہ رہجائے	اور خدا سے بڑھکر انسان کے لئے اور کیا ہے،

اس شعر مین نابغہ نے **حلف** کا استعمال کیا ہے، اور اسی لئے وہ ذلیل الطبع اور پست ہمت

شخص خیال جاتا ہے، اگر حلف کی بجائے اقسمت کا لفظ ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی،
خدا نے قرآن مجید میں یہ لفظ اپنی نسبت کہیں نہیں استعمال کیا ہے، بلکہ حلاف کی ذلت
بیان کی ہے، چنانچہ فرمایا ولا تطع کل حلاف مہین،
سورہ براۃ میں سات جگہ یہ لفظ آیا ہے، لیکن ہر جگہ منافقوں کی زبان سے ہی، کیونکہ
منافقین ہمیشہ اسے ذلیل طریقہ سے قسم کھاتے تھے، سورۂ براۃ کے سوا اور جہاں یہ لفظ آیا
ہے، منافقین کی زبان سے آیا ہے،

قضا و قدر

اور

قرآن مجید

وہ مسائل جن کی گرہ فلسفہ اور مذہب دونوں میں سے ایک بھی نہ کھول سکا ان میں سے ایک یہ مسئلہ بھی ہے، فلسفہ کو مذہب پر تقدم کا دعوی ہے، اس لئے ہم کو پہلے اس سے پوچھنا چاہیے کہ وہ اس عقدہ کو کہاں تک حل کر سکا لیکن پہلے مقدمات ذیل کو ذہن نشین کر لینا چاہیے

(۱) ہر چیز کی فطرت خدا یا قدرت نے جس خاص طرح کی پیدا کی ہے، اس کے خلاف اس سے کوئی فعل سرزد نہیں ہو سکتا، جماد حرکت نہیں کر سکتا، نباتات بات نہیں کر سکتے، جانور فلسفہ و منطق نہیں سیکھ سکتے، آدمی روح مجرد نہیں بن سکتا، انسان کے افراد کی بھی مختلف فطرتیں ہیں، جو شخص فطرۃً شریر ہے نیک نہیں ہو سکتا، کودن ذہین نہیں بن سکتا، احمق عاقل نہیں کیا جا سکتا،

شاید تم کو یہ خیال ہو کہ تعلیم و تربیت سے اکثر لوگوں کی حالتیں بدل جاتی ہیں، شریر لڑکا نیک چلن ہو جاتا ہے، مسرف کفایت شعار بن جاتے ہیں، بدمزاج حلیم ہو جاتے ہیں، لیکن یہ بھی ان کی فطرت ہی کا اثر ہے یعنی ان کی فطرت ہی میں اصلاح اور ترقی کا مادہ ہوتا ہے جس نسبت سے یہ مادہ ہوتا ہے، اسی قدر وہ اصلاح پذیر ہو سکتے ہیں، لیکن جن کی فطرت میں اصلاح کا مادہ نہیں دیا ہے لیکن ایک خاص درجہ تک ہے، وہ اصلاح پذیر نہیں ہو سکتے

یا اس درجہ سے آگے نہین بڑھ سکتے،

(۲) جس چیز کو ہم ارادہ اور اختیار کہتے ہین یہ بھی مجبوری کی ایک صورت ہے، فرض کرو ایک شخص فطرۃً نفس پرست ہے، اس کو یہ موقع ہات آیا کہ تنہائی ہے، ایک دل فریب صورت سامنے ہے، اس کی طرف سے خود استدعا ہے، اس حالت مین یہ شخص اگر بدکاری کا ارادہ کرتا ہے، تو یہ ارادہ اس کے اختیار کی چیز نہین، عام لوگ کہا کرتے ہین کہ خواہش اور ارادہ ہماری اختیاری باتین ہین لیکن یہ ایک دقیق غلطی ہے، کسی کام کی خواہش کے جب تمام اسباب جمع ہو جائین گے، تو ممکن نہین کہ خواہش نہ پیدا ہو، اس لئے خواہش خود بھی ایک مجبوری کی بات ہے، ہمارا کسی چیز کو اختیار کرنا بھی دراصل ہمارے اختیار مین نہین،

جو شخص کسی کام پر مجبور ہے، یعنی وہ فعل اس سے مجبوراً سرزد ہوتا ہے، اس کی نسبت اس پر کچھ الزام نہین عاید کیا جا سکتا، کسی شخص کے ہاتھ مین اگر رعشہ ہو، اور وہ لکھ نہ سکے تو کوئی شخص اس کو نہ لکھنے پر ملامت نہین کر سکتا،

ان مقدمات کے ثابت ہونے کے بعد، اب فلسفہ سے پوچھنا چاہئے کہ انسان مختار ہے یا مجبور، یا دوسرے لفظون مین یون کہو کہ انسان جو نیکی یا بدی کرتا ہے، تو یہ اس کا اختیاری فعل ہے، یا اضطراری؟ اگر انسان خود مختار ہے تو مذکورۂ بالا مقدمات کا جن سے قطعاً ثابت ہوتا ہے، کہ انسان کا کوئی فعل اختیاری نہین، کیا جواب ہے، اور اگر مجبور ہے تو پھر کسی شخص کو کسی قسم کا الزام کیونکر دیا جا سکتا ہے، بدچلن شریر، دنی الطبع مفسدانگیز اشخاص کو ہم کس بنا پر برا کہہ سکتے ہین،

مذہب مین ہمیشہ سے دو فرقے ہوتے چلے آئے ہین، جبریہ، قدریہ، عام خیال ہے کہ یہ الفاظ اسلام نے پیدا کئے ہین، آج کل یوروپین قومین مسلمانون کے تنزل کی

بڑی وجہ یہ بتاتی ہین کہ **اسلام** جبریہ عقیدہ کی تعلیم کرتا ہے، اسی بنا پر مسلمانون کی زبان پر یہ الفاظ چڑھے ہوئے ہین، "جو کچھ کرتا ہے خدا کرتا ہے" "قسمت مین یہی لکھا تھا" "نوشتہ تقدیر کو کون مٹا سکتا ہے" یہی وجہ ہے کہ مسلمانون پر جو آفتین آتی ہین، بجائے اس کے کہ وہ مستعد ہو کر اس کا مقابلہ کرین، یہ کہہ کر رہ جاتے ہین کہ تقدیر کا کون مقابلہ کر سکتا ہے،

لیکن یہ ایک تاریخی غلطی ہے جس طرح اسلام مین قدریہ و جبریہ، دو فرقے ہین تمام اور مذاہب مین بھی ہمیشہ سے یہ دونون فرقے موجود تھے، اور جس طرح مسلمان تقدیر کے قائل ہین، عیسائیون مین بھی بڑے بڑے پیشوایان مذہب اس کے قائل رہتے آئے ہین، عیسائیون مین یہ فرقے لوائبولا اور ڈومینک کے نام سے موسوم تھے، اور ان دونون مین باہم سخت اختلاف اور نزاع تھی، سنہ ۱۵۹۸ع سے لیکر سترھوین صدی کے اخیر تک دونون فرقون مین سخت لڑائیان رہین، اور گو **پوپ** نے اس کی روک کے لئے بہت سے احکام صادر کئے، لیکن ان کا کچھ اثر نہ ہوا، اخیر زمانہ مین **بنیس** اور مولن مین جو اپنے اپنے فرقہ کے پیشوا تھے بڑی معرکہ آرائیان ہوئین **بنیس** سولھوین صدی عیسوی مین تھا، اور علم کلام کا درس دیتا تھا، اس نے ہیکل کے سامنے کھڑے ہو کر مولن کی کتاب کو مردود قرار دیا، اور ثابت کیا کہ یہ کتاب دراصل **بیلاگ** کے خیالات سے ماخوذ ہے، جو پانچوین صدی عیسوی مین تھا، اور جس کا یہ مذہب تھا کہ حضرت آدم نے جو گناہ کیا، وہ پہلے سے قضائے الٰہی مین نہ تھا اور اسی لئے وہ خود اس گناہ کے ذمہ دار تھے، **مولن** نے اس کے مقابلہ مین ثابت کیا کہ **بنیس** درحقیقت **کلفن** کا پیرو ہے، جس نے سولھوین صدی عیسوی مین پراٹسٹنٹ مذہب کی بنیاد قائم کی تھی، بالآخر یہ جھگڑے **پوپ** کے سامنے پیش کئے گئے، لیکن پوپ کوئی فیصلہ نہ کر سکا، **کلیمن** ہشتم سے لیکر **پولس** پنجم تک یہ مقدمہ یون ہی پڑا رہا، اسپین کے سفیر نے

ڈومینک فرقہ کی سفارش بھی کی لیکن پوپ نے کچھ فیصلہ نہ کیا، اور یہ اجازت دی کہ دونوں فرقے آزادی سے اپنے اپنے خیالات شایع کریں،

بینس بالکل جبر کا قائل تھا، وہ کہا کرتا تھا کہ خدا براہ راست تمام چیزوں کی علت ہے، اور جو کچھ ہوتا ہے اس کے حکم سے ہوتا ہے لیکن چونکہ اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا تھا کہ انسان میں ایک قوت اختیاری پائی جاتی ہے، اس لیے بنیس کے جانشینوں نے یہ قرار دیا کہ خدا انسان میں ارادہ پیدا کرتا ہے، اور ارادہ خود مختار ہے، اس لیے انسان اپنے ارادہ میں بالکل آزاد ہے،

بالآخر ایک تیسرا مذہب ایجاد ہوا یعنی یہ کہ خدا بھی فاعل مختار ہے، اور انسان بھی؛ اس مذہب کا موجد **بوسویہ** تھا اب تک اس مسئلہ کے متعلق صرف دو لفظ استعمال کئے جاتے تھے، تقدیر اور اختیار، بوسویہ نے تیسرا لفظ **تقدیر معلق** ایجاد کیا **بوسویہ** نے اس مسئلہ پر ایک مستقل کتاب لکھی جس میں اس نے انسان کا خود مختار ہونا ثابت کیا، وہ کہتا ہے کہ ایک سچی بات، دوسری سچی بات کو مٹا نہیں سکتی، اس سے ہرگز انکار نہیں ہو سکتا کہ خدا فاعل مطلق ہے، لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان کو بھی اپنے افعال کا اختیار حاصل ہے، بے شبہہ ان دونوں باتوں میں تناقض نظر آتا ہے، لیکن اس میں عقل کو دخل نہیں دینا چاہیے، کیونکہ یہ مسئلہ عقل انسانی کی حد سے باہر ہے، اس سلسلہ کے دونوں سرے ہاتھ میں لینے چاہئیں، لیکن جو کڑی ان دونوں سروں کو باہم ملاتی ہے، وہ ہماری سمجھ سے باہر ہے[1] (دیکھو رسالہ "الاسلام" مصنفہ پروفیسر ہنری دی کاستری فرانسیسی، مترجمہ)

[1] امام رازی نے مطالب عالیہ میں بالکل یہی تقریر کی ہے، لیکن امام صاحب بوسویہ سے پہلے تھے، اس لئے اسکو توارد دیکھنا چاہئے، اور اگر سرقہ ہو تو بوسویہ اس جرم کا مجرم ہوگا نہ امام رازی،

بزبان عربی مطبوعہ مصر فصل پنجم از صفحہ ۹۰ تا صفحہ ۱۹۱)

اسلام میں نہایت ابتدائی زمانہ سے یہ بحث شروع ہو گئی تھی، اگرچہ اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ قرآن مجید میں اس کے متعلق بظاہر دونوں قسم کی آیتیں آئی ہیں، لیکن اس کی طرف خیال رجوع ہونے کا سبب یہ ہوا کہ **بنو اُمیہ** کے زمانہ میں جو ظلم اور تعدی جاری تھی، اہل عرب اپنی فطری آزادی کی وجہ سے اس پر اعتراض کرتے تھے، اس کے جواب میں بنو امیہ کے طرفدار کہتے تھے کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے، خدا کی مرضی سے ہوتا ہے، اس لئے کسی کو دم نہیں مارنا چاہئے، **معبد جہنی** نے حضرت حسن بصری سے پوچھا کہ کیا بنو اُمیہ کا یہ عذر صحیح ہے، انھوں نے کہا یہ خدا کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں، معبد نے اس کے بعد علانیہ بغاوت کا علم بلند کیا اور جان سے مارا گیا، یہ پہلا دن تھا کہ اس مسئلہ کا اعلان ہوا،

چوتھی صدی کے آغاز میں امام ابوالحسن اشعری نے **جبر و قدر** کے درمیان میں ایک تیسرا طریقہ ایجاد کیا، اور اس کا نام کسب رکھا یعنی یہ کہ انسان اپنے افعال کا **کاسب** ہے، فاعل نہیں، انسان کو اپنے افعال پر قدرت حاصل ہے، لیکن یہ **قدرت** کچھ اثر نہیں رکھتی، قدرت کو تسلیم کرنا اور پھر یہ کہنا کہ قدرت کا کچھ اثر نہیں گویا یہ کہنا ہے کہ ایک چیز ہے اور پھر نہیں ہے، اسی بنا پر یہ فقرہ مشہور ہے کہ تین چیزیں علم کلام کے عجائبات میں سے ہیں، ان میں سے ایک امام اشعری کا کسب ہے، اسی بنا پر امام الحرمین نے اس مذہب سے بالکل انکار کیا چنانچہ اس کی تفصیل ابن القیم کی کتاب شفاء العلیل میں مذکور ہے،

قرآن مجید میں اس مسئلہ کے متعلق دونوں قسم کی آیتیں آئی ہیں، امام ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو جن آیتوں سے استدلال کرتے ہیں حسب ذیل ہیں،

---

[1] مقریزی ج دوم ص ۳۵۶ مطبوعہ مصر،

جن آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان کو کچھ اختیار نہیں،

لیس لک من الامر شیء،	تجھ کو کام میں کچھ اختیار نہیں،
قل کل من عند اللہ،	کہدے کہ سب خدا کی طرف سے ہے،
وما تشاؤن الا ان یشاء اللہ	اور تم کسی بات کی خواہش نہیں کر سکتے جب تک خدا نہ چاہے
واللہ خلقکم وما تعملون،	اور خدا نے تمکو بھی پیدا کیا ہے اور تمھارے اعمال کو بھی،
اللہ خالق کل شیء	خدا ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے
وان تصبہم حسنۃ یقولوا ہذہ من عند اللہ	اور انکو کچھ بھلائی پہونچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے
وان تصبہم سیئۃ یقولوا ہذہ من عندک	اور برائی پہونچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تیری طرف سے ہے کہدے کہ یہ
قل کل من عند اللہ	سب خدا کی طرف سے ہے،

جن آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ہی لوگوں کو گمراہ کرتا ہے اور ان سے برائی کراتا ہے

یضل بہ کثیرا ویہدی بہ کثیرا	خدا اس سے بہتوں کو گمراہ کرتا ہے اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے
ویضل اللہ الظالمین	اور خدا ظالموں کو گمراہ کرتا ہے،
کذلک یضل اللہ من ہو مسرف مرتاب	اسی طرح خدا اس شخص کو گمراہ کرتا ہے جو حد سے بڑھ جاتا ہے
واذا اردنا ان نہلک قریۃ امرنا مترفیہا ففسقوا فیہا،	اور جب ہم کسی گاؤں کو خراب کرنا چاہتے ہیں، تو وہاں کے دولتمندوں کو حکم دیتے ہیں اب وہ گناہ کرتے ہیں،

جن آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کافروں اور فاسقوں کو ہدایت کرنا نہیں چاہتا یا انکو ہدایت نہیں کرتا،

اللہ لا یہدی القوم الکافرین	خدا کافروں کو ہدایت نہیں کرتا،

اللہ لا یهدی القوم الفاسقین — خدا فاسقون کو ہدایت نہین کرتا،

واللہ لا یهدی القوم الکافرین — اور خدا کافرون کو ہدایت نہین کرتا،

ان اللہ لا یهدی القوم الظالمین — بیشبہہ، خدا ظالمون کو ہدایت نہین کرتا،

(اس مضمون کی آیتین نہایت کثرت سے ہین)

وہ آیتین جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا نے کافرون کو ایمان نہ لانے پر مجبور کر دیا ہے

ختم اللہ علی قلوبهم وعلی سمعهم وعلی ابصارهم غشاوة، — خدا نے اُن کے دلون اور کانون پر مہر کر دی ہے اور انکی آنکھ پر پردہ ہے،

وجعلنا قلوبهم قاسیة — اور ہم نے ان کے دلون کو سخت بنا دیا،

ونطبع علی قلوبهم فهم لا یسمعون — اور ہم انکے دلون پر مہر کر دیتے ہین اس لئے وہ نہین سنتے،

کذالک یطبع اللہ علی قلوب الکافرین — اسی طرح خدا کافرون کے دل پر مہر کر دیتا ہے،

فطبع علی قلوبهم فهم لا یفقهون، — تو خدا نے ان کے دلون پر مہر کر دی اس لئے وہ نہین سمجھتے،

وطبع اللہ علی قلوبهم فهم لا یعلمون، — اور خدا نے انکے دلون پر مہر کر دی اس لئے وہ نہین جانتے،

اولئک الذین طبع اللہ علی قلوبهم وسمعهم وابصارهم، — یہ وہ لوگ ہین کہ خدا نے انکے دلون پر، کانون پر، اور آنکھون پر مہر کر دی،

(اس مضمون کی اور بہت سی آیتین ہین)

وہ آیتین جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا اگر چاہتا تو سب کو ہدایت کرتا لیکن اس نے یہ چاہا ہی نہین،

ولو شاء اللہ لجمعهم علی الهدی — اگر خدا چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر متفق کر دیتا،

ولو شئنا لآتینا کل نفس هداها، — اور اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دیتے،

ولکن حق القول منی لاملأن جہنم من الجنۃ — لیکن ہماری یہ بات طے ہو گئی ہے کہ ہم دوزخ کو آدمیوں اور

والناس اجمعین۔ — جنوں سے بھر دینگے،

ولو شاء ربک لآمن من فی الارض کلهم جمیعا — اور اگر تیرا خدا چاہتا تو دنیا میں جس قدر آدمی ہیں سب ایمان لے آتے

ولقد ذرأنا لجہنم کثیرا من الجن والانس — اور ہم نے بہت سے آدمی اور جن دوزخ کے لئے پیدا کئے،

وہ آیتیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا ہی نے شیاطین اور بدکاروں کو اس کام پر مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں،

ولم تر انا ارسلنا الشیاطین علی الکافرین تؤزهم ازا — تو نے نہیں دیکھا کہ ہم نے شیطانوں کو کافروں پر مقرر کیا،

وجعلناهم ائمة یدعون الی النار — اور ہم نے انکو پیشوا بنایا ہو کہ لوگوں کو آگ (دوزخ) کی طرف بلاتے ہیں،

آیات مذکورہ بالا کے مقابلہ میں حسب ذیل آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا، گمراہ کرنا شیطان کا کام ہے، انسان اپنے افعال کا آپ ذمہ دار ہے،

یرید الشیطن ان یضلهم ضلالا بعیدا — شیطان چاہتا ہے کہ ان کو بہت زیادہ گمراہ کر دے،

من ضل فانما یضل علیها، — جو شخص گمراہ ہوتا ہے تو اپنے کئے سے ہوتا ہے،

ولقد اضل منکم جبلا کثیرا افلم تکونوا تعقلون، — شیطان نے تم میں سے اکثروں کو گمراہ کیا تو کیا تم کو عقل نہ تھی،

ان الله لا یظلم الناس شیئا ولکن الناس انفسهم یظلمون، — خدا لوگوں پر مطلق ظلم نہیں کرتا، لیکن لوگ خود اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں،

لها ما کسبت وعلیها ما اکتسبت — انسان کو جو کچھ نفع وضرر ہوتا ہے اپنے فعل کی بدولت پہنچتا ہے

اولما اصابتکم مصیبة قد اصبتم مثلیها قلتم انی هذا قل هو من عند انفسکم — کیا جب تم پر کوئی ایسی مصیبت آئی جیسی پہلے بھی پہنچ چکی ہے، تو تم کہتے ہو کہ یہ کہاں سے آئی کہدو کہ یہ تمہاری ذات

مَا أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ وَمَا أَصَابَكَ مِنْ سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَفْسِكَ

تجھ کو جو بھلائی پہونچتی ہے، وہ خدا کی طرف سے ہے اور جو برائی پہونچتی ہے وہ تیرے نفس کی وجہ سے،

إِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوا مَا بِأَنْفُسِهِمْ

خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جبتک وہ خود اپنی حالت نہ بدلے،

مَا أَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ أَيْدِيكُمْ

تم پر جو مصیبت آتی ہے تو تمھارے کئے کی وجہ سے آتی ہے،

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

خشکی اور تری مین فساد پھیل گیا لوگونکے کرتوت کی وجہ سے

وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ

خدا اپنے بندون کے لئے کفر کو نہین پسند کرتا،

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ

خدا بری بات کا حکم نہین دیتا،

وَقَالَ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُونِهِ مِنْ شَيْءٍ

اور مشرکین کہتے ہین کہ اگر خدا چاہتا تو ہم خدا کے سوا اور کسی چیز کی عبادت نہ کرتے،

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللّٰهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا

مشرکین یہ کہین گے کہ اگر خدا چاہتا تو نہ ہم شرک کرتے نہ ہمارے باپ دادا،

دونون قسم کی آیتین بظاہر برابر کا درجہ رکھتی ہین، ایک آیت مین صاف تصریح ہو کہ خدا بری بات کا حکم نہین دیتا، دوسری آیت مین ہے، کہ جب ہم کسی مقام کو برباد کرنا چاہتے ہین، تو وہان کے دولتمندون کو حکم دیتے ہین کہ وہ گناہ کرین، ایک آیت مین ہے کہ جو مصیبت آتی ہے تمھاری وجہ سے آتی ہے، دوسری آیت مین ہے کہ یہ نہ کہو بلکہ سب خدا کی طرف سے ہے، ان آیتون پر اچھی طرح غور نہ کرنے سے جبریہ و قدریہ دو فرقے پیدا کر دیئے اشاعرہ نے دونون پہلوؤن کو ملانا چاہا لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ تیسرا طریقہ جو انھون نے اختیار کیا، وہ دونون سے بدتر تھا، اسی بنا پر امام رازی نے صاف صاف جبر کا طریقہ اختیار کیا، چنانچہ تفسیر کبیر مین

اُن تمام آیتون کی تاویل کی ہے، جس سے انسان کا مختار ہونا ثابت ہوتا ہے،

ایک نکتہ یہان، خاص طرح پر یاد رکھنے کے قابل ہے، تم نے دیکھ لیا کہ آیتین دونون قسم کی موجود ہین، اور ہر قسم کی آیت اپنے مفہوم پر گویا نص قطعی ہے، اس لئے اگر صرف نصوص قرآنی پر نظر ہو، تو جبر و قدر، دونون مذہب مین سے جون ساچاہے، انسان اختیار کر سکتا ہے، بلکہ سچ یہ ہے کہ دونون قسم کی آیتین بظاہر، اس قدر مساوی الدرجہ ہین کہ انسان کسی پہلو کو چھوڑ نہین سکتا، باوجود اس کے دو مخالف گروہ جو پیدا ہوئے، اور دونون نے اپنے فریق مخالف کو کافر قرار دیا، اس کی کیا وجہ ہو سکتی ہے؟ یہ دراصل اُس اختلافِ طبائع کا اثر ہے، جو انسان کے مختلف افراد مین پایا جاتا ہے، بعض آدمی بالطبع کاہل، پست ہمت، ضعیف الارادہ ہوتے ہین، اس لئے اُن کا میلانِ طبع وہ سہارے ڈھونڈھتا ہے، جن سے انسان کا مجبور و لاچار ہونا ثابت ہے، بخلاف اس کے جو اشخاص فطرۃً عالی حوصلہ، بلند ہمت راسخ العزم قوی الارادہ ہوتے ہین، ان کی نگاہین اُن باتون پر پڑتی ہین، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ انسان تمام دنیا کا حکمران ہے، اور اپنے عزم اور ارادہ سے چاہے تو تمام عالم کے مرقعہ کو دفعۃً الٹ پلٹ کر دے،

سب سے پہلے اس پر غور کرنا چاہئے کہ قرآن مجید کی مختلف آیتون مین بظاہر جو تعارض معلوم ہوتا ہے، اس کی کیا حقیقت ہے،

(۱) قرآن مجید مین جہان جہان خدا کی مشیت یا حکم اور ارادہ کا ذکر ہے، اسکی دو قسمین ہین **فطری** اور **شرعی**، خدا نے جن چیزون کی جو فطرت بنائی ہے اس کو بھی حکم اور ارادہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے،

انما امرہ اذا اراد شیئا ان یقول لہ   اس کا حال یہ ہو کہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہو تو اس سے

کن فیکون، کہتا ہے ہوجا اور وہ ہوجاتی ہے،

یہ ظاہر ہے کہ خلقت اشیاء کے وقت خدا یہ لفظ بولا نہیں کرتا،

وکان امر اللہ مفعولا ۔ وہ خدا کا حکم ہو کر رہتا ہے،

یہ وہی فطری حکم ہے جو خواہ مخواہ ہو کر رہتا ہے، ورنہ خدا کے شرعی احکام تو اکثر لوگ بجا نہیں لاتے اور اس کی تعمیل کا واقع ہونا ضرور نہیں،

واذا اردنا ان نھلک قریۃ جب ہم کسی گاؤں کو برباد کرنا چاہتے ہیں، تو وہاں کے

امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا لوگوں کو حکم دیتے ہیں، کہ وہ فسق کریں،

یہ بھی وہی فطری حکم ہے، یعنی جب کوئی مقام تباہ ہوتا ہے، تو وہاں کے لوگوں کی طبیعتوں میں بدکاری کا مادہ پیدا کیا جاتا ہے، اس لئے وہ گناہ کے مرتکب ہوتے ہیں، اور اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے،

انا ارسلنا الشیٰطین علی الکافرین ہم نے شیطانوں کو کافروں پر مقرر کیا ہے، کہ وہ ان کو

تؤزھم ازا، برانگیختہ کریں،

یہاں بھی یہ مراد نہیں کہ خدا شیطانوں کو حکم دیتا ہے، کہ جاؤ اور کافروں کو گناہ کی ترغیب دو، بلکہ مقصود یہ ہے کہ خدا نے کافروں کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ ان میں برائی کا مادہ شروع ہی سے موجود ہوتا ہے،

ایک آیت میں ہے کہ خدا نے زمین اور آسمان سے کہا کہ خوشی یا زبردستی جس طرح سے ہو حاضر ہو، دونوں نے کہا کہ ہم خوشی سے حاضر ہیں، یہ بھی اسی فطری حالت کا بیان ہے یعنی آسمان اور زمین کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ ان سے وہی حرکات سرزد ہوتے ہیں جو ان کی فطرت کا اقتضا ہے،

محدث ابن القیم نے اپنی کتاب شفاء العلیل (مطبوعہ مصر صفحہ ۲۰۰) مین ایک خاص باب باندھا ہے جس کی سرخی یہ ہے،

الباب التاسع والعشرون	انتیسوان باب، اس بیان مین کہ خدا
فی انقسام القضاء والحکم و	کا فیصلہ، حکم، ارادہ، کتابت، امر، اجازت
الارادۃ والکتابۃ والامر والاذن	کسی چیز کو مقدر کرنا، بات کرنا،
والجعل والکلمات والبعث والارسال	سمجھنا، حرام کرنا، پیدا کرنا ان سب کی دو قسمین
والتحریم والانشاء الی کونی متعلق بخلقہ	ہین، ایک کونی (فطری) جو فطرت سے متعلق ہے، اور
والی دینی متعلق بامرہ	دوسری شرعی جو احکام سے متعلق ہے،

محدث موصوف نے اس باب مین **قرآن مجید** کی ان تمام آیتون کا استقصا کیا ہے، جن مین یہ الفاظ (ارادہ حکم وغیرہ) فطرت اور اصل خلقت کے معنی مین آئے ہین، چنانچہ ہم نے جو آیتین اوپر نقل کین، بجز اخیر آیت کے باقی تمام محدث موصوف نے بھی نقل کی ہین، اور بتایا ہے کہ ان سے صرف فطری اور خلقی حالت مراد ہے،

جن آیتون مین یہ مذکور ہے کہ خدا بدکارون کو برائی کا حکم دیتا ہے، اس سے فطری حالت مراد ہے، اور جن آیتون مین یہ مضمون ہے کہ خدا کسی شخص کو برائی کا حکم نہین دیتا اس سے شرعی حکم مراد ہے، اس بنا پر ان دونون آیتون مین کسی طرح کا تعارض نہین؛ باقی یہ امر کہ خدا نے ایسی فطرت کیون بنائی جس سے برائی سرزد ہو، اس کا جواب آگے آئے گا،

(۲) خدا نے تمام عالم مین علۃ ومعلول کا سلسلہ قایم کیا ہے، **اشاعرہ** گو اس اصول کے منکر ہین، لیکن ان کے سوا تمام حنفیہ اور محدثین وغیرہ اسی کے قایل ہین، **محدث ابن القیم**

نے شفاء العلیل میں اس مضمون کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے، اور ثابت کیا ہے کہ اس سلسلہ کا انکار کرنا بداہت اور شریعت دونوں کا انکار کرنا ہے چنانچہ لکھتے ہیں،

عربی	ترجمہ
فانکار الاسباب والقوی والطبائع جحد للضروریات وقدح فی العقول والفطر ومکابرۃ للحس وجحد للشرع	تو سلسلۂ اسباب اور قوی اور اشیاء کی طبیعت کا انکار کرنا بداہت کا انکار ہے، اور عقل اور فطرت پر اعتراض کرنا ہے، اور محسوسات اور شریعت کا انکار کرنا ہے،

ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں :-

عربی	ترجمہ
بل الموجودات کلها اسباب ومسببات والشرع کله اسباب ومسببات ۔۔۔ والقرآن مملوء من اثبات الاسباب	بلکہ تمام موجودات اسباب اور مسببات ہیں، اور شریعت تمامتر اسباب اور مسببات ہیں، اور قرآن اسباب کے اثبات سے بھرا ہوا ہے،

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :-

عربی	ترجمہ
ولو تتبعنا ما یفید اثبات الاسباب من القرآن والسنة لزاد علی عشرة آلاف موضع ولم نقل ذلک مبالغة بل حقیقة ویکفی الحس والعقل والنظر[1]،	اور اگر ہم ان تصریحات کا تفحص کریں جن سے قرآن مجید اور حدیث سے سلسلۂ اسباب کا ثبوت ہوتا ہے، تو دس ہزار سے زیادہ تصریحات نکلیں گی، اور ہم نے یہ بات مبالغۃً نہیں کہی بلکہ واقعی کہی، اور حس اور عقل اور نظر کی گواہی کافی ہے،

لیکن یہ تمام سلسلۂ اسباب خود قائم نہیں ہوگیا، بلکہ خدا نے قائم کیا ہے، اب ان متعارض آیتوں پر لحاظ کرو جنہیں انسان کے افعال کو کہیں خود انسان کی طرف منسوب کیا ہے، اور کہیں یہ کہا ہے کہ سب خدا کے افعال ہیں، انسان کی طرف افعال کا منسوب کرنا، اسی

[1] شفاء العلیل ص ۱۸۸ و ۱۸۹،

سلسلۂ اسباب کے لحاظ سے ہے، انسان مین خدا نے ارادہ اور خواہش کی قوت پیدا کی ہے، یہ خواہش انسان کو کام کرنے پر آمادہ کرتی ہے، اور اس کام کا سبب ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ تمام سلسلۂ اسباب خود خدا کا قایم کیا ہوا ہے اس لئے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ افعال انسانی کی علت خدا ہی ہے، اسی بنا پر قرآن مجید مین کہا ہے کہ

ولا تشاؤن الا ان یشاء اللہ، تم کسی چیز کی خواہش نہین کرسکتے جب تک کہ خدا نہ چاہے

اس آیت کا یہ مطلب ہے، کہ اگر خدا نے انسان کی فطرت مین خواہش کی قوت نہ رکھی ہوتی، اور خدا انسان کا صاحب ارادہ ہونا نہ چاہتا تو انسان مین خواہش کا مادہ ہی نہ ہوتا، اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے، کہ خدا نہ چاہتا تو انسان کسی چیز کو چاہ بھی نہین سکتا،

ان دونون پہلوؤن کی تصریح کرنے کی ضرورت یہ تھی کہ اسلام سے پہلے افعال انسانی کی نسبت دو خیال تھے؛ ایک یہ کہ خدا کوئی چیز نہین، انسان خود بخود سلسلۂ فطرت کے اقتضا سے پیدا ہوا، اور ہر قسم کی قوتین خود بخود اس کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئین، انھین قوتون کی بنا پر اس سے افعال صادر ہوتے ہین، اور ان افعال کا وہ خود خالق ہے،

اس کے مقابل دوسرا فرقہ تھا جس کا یہ مذہب تھا، کہ انسان مجبور محض ہے، وہ خود کچھ نہین کرتا، اور نہ کر سکتا، بلکہ اس سے خدا کراتا ہے،

اسلام نے ان دونون خیالون کو غلط ثابت کرنا چاہا، اس لئے ضرور تھا کہ جہان وہ یہ بتائے کہ انسان اپنے افعال کا خالق ہے، اور اپنے ہر فعل کا ذمہ دار ہے، ساتھ ہی یہ بھی بتائے کہ انسان خود بخود نہین پیدا ہوا، بلکہ اس کو، اور اس مین جس قدر قوتین موجود ہین، سب خدا نے پیدا کین، اس بنا پر یہ کہنا صحیح ہے کہ کل من عند اللہ یعنی سب خدا کی طرف سے ہے،

(۳) انسانون کی فطرت خدا نے مختلف طور کی پیدا کی ہے، بعض فطرۃً شریر، بدکار، ضدی اور گردن کش ہوتے ہین، اس فطرت کو قرآن مجید مین ان الفاظ سے بیان کیا ہے کہ خدا نے ان کے دلون پر مہر کر دی ہے، انکی آنکھون پر پردہ ڈال دیا ہے، ان کے آگے اور پیچھے دیوارین کھڑی کر دی ہین، وہ اندھے بہرے اور گونگے ہین،

بعض کی فطرت اس طرح کی بنائی ہے کہ ابتدا مین اگر وہ برائی سے بچنا چاہین تو بچ جائین لیکن جب وہ احتیاط نہین کرتے اور اپنے آپ کو بری صحبتون مین ڈال دیتے ہین، تو برائی کا مادہ جڑ پکڑ جاتا ہے، اور رفتہ رفتہ وہ پکے شریر اور بدکار بنجاتے ہین، یہان تک کہ اب اگر وہ برائی سے اپنے آپ کو روکنا بھی چاہین، تو نہین روک سکتے، اس قسم کی فطرت کو قرآن مجید مین ان الفاظ سے تعبیر کیا ہے،

فی قلوبھم مرض فزادھم اللہ مرضا.	انکے دل مین بیماری تھی تو خدا نے ان کی بیماری کو اور بڑھا دیا۔
فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم.	تو جب وہ ٹیڑھے ہوئے تو خدا نے بھی ان کو ٹیڑھا کر دیا،
بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون.	بلکہ جو کچھ انھون نے کیا تھا وہ ان کے دل پر چھا گیا،
بل طبع اللہ علیھا بکفرھم،	بلکہ خدا نے ان کے کفر کی وجہ سے ان کے دل پر مہر کر دی.

نیکی کی فطرت کا بھی یہی حال ہے، یعنی بعض فطرۃً نیک اور ہمہ تن نیک ہوتے ہین، بعض مین نیکی کا معمولی مادہ ہوتا ہے، لیکن اچھی صحبت اور تعلیم و تربیت سے ترقی کرتا ہے، اس دوسری فطرت کو قرآن مجید مین اس طرح تعبیر کیا ہے:-

والذین اھتدوا زادھم ھدی	اور جو لوگ ہدایت پر چلتے ہین تو خدا ان کی ہدایت کو اور بڑھا دیتا ہے،
قولوا قولا سدیدا یصلح لکم اعمالکم	تم ٹھیک بات کہو تو خدا تمھارے کام کو ٹھیک کر دیگا،

(۴) خدا نے تمام اشیاء کو خاص خاص فطرت پر پیدا کیا ہے، اور کوئی چیز اپنی فطرت سے بدل نہیں سکتی یعنی جس چیز کی جو فطرت ہے ضرور اس سے ظہور مین آئیگی، اس کو قرآن مجید مین مختلف طریقون سے بیان کیا ہے،

لا تبدیل لخلق اللہ،	خدا کی خلقت مین تبدیلی نہین،
ما تری فی خلق الرحمٰن من تفاوت،	تو خدا کی خلقت مین ناہمواری نہ دیکھے گا،
ربنا الذی اعطی کل شیٔ خلقہ ثم ھدیٰ،	ہمارا خدا وہ ہے جس نے ہر شے کو پیدا کیا، پھر اسکو راستہ دکھایا
لن تجد لسنۃ اللہ تحویلا،	تو خدا کے طریقہ اور عادت مین ادل بدل نہ پائے گا،
لن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا،	تو خدا کے طریقہ اور عادت مین تبدیلی نہ پائے گا،
انا کل شیٔ خلقناہ بقدر،	ہم نے ہر چیز کو ایک اندازہ خاص سے پیدا کیا،

قرآن مجید مین جابجا یہ جو بیان کیا ہے، کہ اگر ہم چاہتے تو ہر شخص کو ہدایت دیدیتے، ہم چاہتے تو تمام دنیا کا ایک ہی مذہب ہوتا، اس سے یہ مطلب نہین کہ موجودہ فطرت کے ساتھ ہر شخص ہدایت پا سکتا، اور تمام دنیا کا ایک مذہب ہوجاتا، کیونکہ آیات مذکورۂ بالا سے ثابت ہوا کہ خدا نے جس چیز کی جو فطرت بنادی ہے، اس کے خلاف نہین ہوسکتا، اس لئے موجودہ حالت مین انسانی فطرت کا جو اقتضا ہے یعنی مختلف العقیدہ اور مختلف الافعال ہونا یہ بدل نہین سکتا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہم اگر چاہتے تو انسانون کی جو فطرت ہے، اس کے خلاف دوسری فطرت پر اس کو بناتے اور اس حالت مین سب کا ایک مذہب پر ہونا ممکن تھا،

غرض قرآن مجید مین یہ مسئلہ قطعی طور پر بیان کیا گیا ہے، کہ تمام چیزین اپنی اپنی فطرت کے موافق کام کر رہی ہین، اور جس کی فطرت کا جو اثر ہے اس سے خواہ مخواہ ظہور مین آتا ہے، اسکے ساتھ (جیسا کہ اوپر گذر چکا) تمام عالم مین علۃ و معلول اور سبب و مسبب کا سلسلہ بھی قایم ہے،

ان دونوں اصول کی بنا پر، انسان سے جو افعال سرزد ہوتے ہیں، اور ان کی بنا پر انسان کو جو عذاب و ثواب ہوگا یہ سب خود فطرت کا اقتضا ہے، انسان سے نیک و بد افعال کا سرزد ہونا اس کی فطرت کا اقتضا ہے، اور ان دونوں افعال کی بنا پر عذاب و ثواب کا وقوع میں آنا بھی خود ان افعال کی فطرت کا نتیجہ ہے، خدا نے فطرت کو پیدا کیا، لیکن پھر فطرت اپنے آثار ات کو پیدا کرتی ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ خدا نے زہر پیدا کیا ہے، اور زہر میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ جو زہر کھاتا ہے مرجاتا ہے، اب جو شخص زہر کھاتا ہے، وہ خود زہر کے اثر سے مرتا ہے، امام غزالی عذاب و ثواب کی حقیقت کے متعلق مضمون بہ علی غیر اہلہ میں لکھتے ہیں:-

اما العقاب علی ترک الامر و ارتکاب النھی فلیس العقاب من اللہ تعالیٰ غضباً و انتقاماً و مثال ذلک ان من غادر لم یوطئ عاقبہ اللہ تعالیٰ بعدم الولد و من ترک الاکل و الشرب عاقبہ بالجوع و العطش فکذلک نسبۃ الطاعات و المعاصی الی آلام الآخرۃ و لذاتھا من غیر فرق فالسوال عن انہ لم تفضی المعصیۃ الی العقاب کالسوال فی انہ لم یھلک الحیوان عن السم و لم یودی السم الی الھلاک۔	احکام کے چھوڑنے اور منہیات کے کرنے پر عذاب کا ہونا، تو یہ اس بنا پر نہیں کہ خدا کو غصہ آتا ہے اور وہ انتقام لیتا ہے، بلکہ اس کی مثال یہ ہے کہ جو شخص عورت کے ساتھ ہم بستری نہ کریگا خدا اس کو اولاد نہ دیگا، اور جو شخص کھانا پینا چھوڑ دیگا، خدا اس کو بھوک اور پیاس کا عذاب دیگا، عبادت اور گناہ سے قیامت میں جو عذاب و ثواب ہوگا اس کی بعینہ یہی مثال ہے، اس بنا پر یہ پوچھنا کہ گناہ پر عذاب کیوں ہوتا ہے، گویا یہ پوچھنا ہے کہ جاندار زہر سے کیوں مرجاتا ہے، اور زہر کیوں مار ڈالتا ہے،

غرض یہ سب اسی قانون فطرت کے سلسلہ مین داخل ہے، انسان کی فطرت ایسی بنائی گئی ہے کہ وہ نیکی اور بدی کرتا ہے، اور نیکی و بدی کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اس سے انسان کی روح کو آرام اور تکلیف پہونچتی ہے، اسی کا نام عذاب و ثواب ہے، قرآن مجید مین اسی نکتہ کو یون ادا کیا ہے، ویستعجلونک بالعذاب و ان جہنم لمحیطۃ بالکفرین، یعنی کفار تجھ سے کہتے ہین کہ عذاب جلدی لاؤ حالانکہ دوزخ ان کو ہر طرف سے چھائے ہوئے ہے،

(۵) اوپر کی تقریر سے اس بحث کے متعلق اگرچہ اور شبہات رفع ہوگئے لیکن اصلی گرہ اب تک نہین کھلی، تمام اعتراضات اس مرکز پر آکر جمع ہوتے ہین، کہ پھر خدا نے ایسی فطرت ہی کیون بنائی جس سے برائی سرزد ہو، کیا یہ ممکن نہ تھا کہ انسان فطرۃً ایسا بنایا جاتا کہ اس سے برائی سرزد ہی نہ ہوتی،

اس عقدہ کے حل کرنے کے لئے اس بات پر غور کرو کہ اگر ایک چیز مین بہت سے فائدے ہون اور کچھ نقصان بھی ہو، تو تم کیا کروگے؟ کیا اس کو بالکل چھوڑ دوگے، یا اس بنا پر اختیار کروگے کہ گو تھوڑا سا نقصان ہے لیکن فائدے بہت زیادہ ہین، تمام دنیا کا کاروبار اسی اصول پر چل رہا ہے، اولاد سے زیادہ انسان کو کیا چیز عزیز ہے لیکن اولاد کی پرورش اور پرداخت مین کن کن مصیبتون کا سامنا ہے، خود انسان کی زندگی جو اس کو سب سے زیادہ عزیز ہے کس قدر مصائب سے بھری ہوئی ہے، تاہم اُن مسرتون اور خوشیون کے مقابلہ مین جو انسان کو زندگی کی وجہ سے یا اولاد سے حاصل ہوتی ہین، یہ تکلیفین ناقابل اعتبار ہین، آگ سے ہمارے سیکڑون کام نکلتے ہین، کیا ہم اس کو اس بنا پر چھوڑ سکتے ہین، کہ اس سے کبھی کبھی ہمارے کپڑون مین آگ بھی لگ جاتی ہے،

انسان کی فطرت کے متعلق چار احتمال پیدا ہوسکتے تھے، اول انسان بنایا جاتا جو محض

نیکی ہوتا ہے، تین بدی ہوتا، نیکی کا مادہ اس مین زیادہ ہوتا، بدی کا مادہ زیادہ ہوتا، دوسری اور چوتھی قسم حکمت اور انصاف کے خلاف تھی، اس لئے خدا نے اس قسم کی فطرت نہین بنائی، پہلی اور تیسری قسم عین حکمت تھی، اس لئے انسان اسی فطرت کے موافق پیدا کیا گیا۔

شاید تم کو خیال ہو کہ بعض انسان ہمہ تن شرارت ہوتے ہین، اس لئے ان کا پیدا کرنا، خلاف حکمت ہے لیکن یہ غلطی ہے، جس کو تم ہمہ تن شرارت کہتے ہو، اس کے ان تمام افعال و اقوال پر نظر ڈالو، جو اس سے رات دن سرزد ہوتے ہین، ان مین بہت سے بہت فی صدی دس کام برے ہون گے، جو شخص بے انتہا جھوٹ بولنے کا عادی ہے، وہ بھی دن رات مین بمشکل دس پانچ جھوٹ بولتا ہوگا،

غرض انسان، بلکہ دنیا مین جتنی چیزین ہین، ان مین مضرت و نقصان فائدہ کے مقابلہ مین بہت کم ہے، اس لئے اگر ان چیزون کو سرے سے نہ پیدا کیا جاتا تو تھوڑے سے نقصان کے لئے بہت سے فائدون کو ترک کرنا ہوتا، اور یہ حکمت و مصلحت کے بالکل خلاف ہے، محدث ابن قیم نے اس بحث کو نہایت تفصیل سے لکھا ہے، ان کے چند فقرے یہ ہین،

ومن تامل هذا الوجود علم ان الخير فيه
غالب وان الامراض وان كثرت فالصحة
اكثر منها واللذات اكثر من الآلام و
العافية اعظم من البلاء × × × و
مثال ذلك النار فان في وجودها منافع
كثيرة وفيها مفاسد لكن اذا قابلنا
بين مصالحها ومفاسدها لم تكن لمفاسدها

اور جو شخص عالم موجودات پر غور کریگا، اس کو معلوم
ہوگا کہ اس مین بھلائی کا پلہ بھاری ہے، بیماریان گو
بہت ہین، لیکن صحت کے اعتبار سے کم ہین، تکلیفون
کے مقابلہ مین لذتین زیادہ ہین، آرام کے مقابلہ مین
بلائین کم ہین، اس کی مثال آگ ہے، آگ مین بہت سے
فائدے ہین، اور نقصانات بھی ہین لیکن فائدون
کے مقابلہ مین نقصانات کی کچھ حقیقت نہین بارش

نسبتها الی مصالحها کذلک المطر والبرد	ہوا گرمی، سردی، سب کا یہی حال ہے، غرض عالم سفلی میں
والحر والبرودة وبالجملة فعناصر هذا العالم	جس قدر عناصر ہیں ان میں نفع اور نقصان دونوں ملے
السفلي خيرها ممتزج بشرها ولكن الخير غالب[1]	ہوئے ہیں، لیکن نفع کا پلہ بھاری ہے،

تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ عالم سلسلۂ اسباب پر قائم ہے، سبب کے ساتھ مسبب کا وجود ضروری ہے، سلسلۂ اسباب خدا نے پیدا کیا ہے، انسان کا ارادہ اور خواہش بھی منجملہ اسباب کے ہے، اس بنا پر انسان اپنے افعال کا سبب اور خالق ہے، لیکن علۃ العلل ہونے کے لحاظ سے ان افعال کا خالق بھی خدا ہی ہے، انسان جو افعال کرتا ہے، اپنی فطرت کے لحاظ سے کرتا ہے، اور ان افعال کے جو لازمی نتائج ہیں یعنی عذاب و ثواب وہ خود بخود اسی سلسلۂ اسباب کی بنا پر وجود میں آتے ہیں، انسان کی فطرت میں خدا نے برائی کا مادہ بھی رکھا ہے، اور ایسا کرنا حکمت کا اقتضا تھا، ان اصول کے سمجھنے کے بعد تمام اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں، اور یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید نے اس بحث کو ہر پہلو کے لحاظ سے فیصل کر دیا ہے،

---

[1] شفاء العلیل ص ۲۸۱،

یورپ

اور

قرآن کے عدیم الصحتہ ہونیکا دعویٰ

لنڈن ٹائمز کے ایک آرٹیکل مورخہ ۲۵ اپریل ۱۴ء مین دعویٰ کیا گیا ہے کہ قرآن مجید کے چند ایسے نہایت قدیم اجزا ہاتھ آگئے ہین جو موجودہ قرآن شریف سے مختلف العبارۃ ہین، اور جنکی صحت پر موجودہ قرآن سے زیادہ اعتبار کیا جا سکتا ہے، قرآن مجید نے اہل کتاب کو جو سب سے بڑا طعنہ دیا تھا، وہ اس کا شیوۂ تحریف تھا، جس کی بدولت توراۃ اور انجیل ہمیشہ تغیر و تبدل کے مختلف قالب بدلتی رہین، اور جس کی بدولت آج یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ یہ آسمانی صحایف صحت کے لحاظ سے زمینی کتابون کے ساتھ بھی برابری کا دعویٰ کر سکتے ہین یا نہین؟

دشمن کے لیے جواب کا سب سے آسان طریقہ برابر کا جواب ہے، لیکن باوجود اس کے کہ عیسائیون نے قرآن مجید پر ہر طرح کے اعتراضات کئے یہان تک کہ یورپ کے بہت سے مستشرقین کو قرآن مجید کی کمال بلاغت سے بھی انکار رہے تاہم آج تک دعویٰ نہین کیا ہے کہ موجودہ قرآن مجید کے سوا قرآن مجید کا کوئی اور بھی نسخہ ہے، جو اس قرآن سے مختلف ہے،

مذکورہ الصدر آرٹیکل پر ابھی کچھ لکھنا قبل از وقت ہے، اس لئے کہ اس آرٹیکل مین ظاہر کیا گیا ہے، کہ کیمبرج یونیورسٹی پریس چند روز مین یہ مسودات شایع کر دیگا، اس لئے جب تک وہ مسودات شایع نہ ہو جائین تفصیلی طور سے اس کے متعلق بحث نہین ہو سکتی، شایع ہونے

کے بعد آسانی سے یہ فیصلہ ہو سکے گا کہ وہ مسودات کس زمانہ کے ہیں؟ اور ان کی صحت پر کہان تک اعتبار کیا جاسکتا ہے؟ اعتبار کے کیا وجوہ ہیں؟ قدامت کی کیا کیا شہادتیں ہیں؟ کس قسم کے اختلافات ہیں، ؟ ان مسودات پر عیسائیون کا دست تصرف کہان تک پہونچا ہے؟
تاہم جس قدر اس آرٹیکل کے متعلق ابھی سے بحث کیجا سکتی ہے اس کے لئے سب سے پہلے اسکے مندرجہ بیانات کا خلاصہ لکھدینا چاہئے، اور وہ حسب ذیل ہے،

(۱) جو حصص قرآن مجید کے دستیاب ہوئے ہین، ان پر علاوہ قرآن کے اور تحریرین بھی ہین، جن کی تفصیل یہ ہے، کہ قدیم زمانہ مین جب سامان نوشت وخواند کمیاب تھے تو اکثر پرانی قلمی کتابون پر جو بے کار سمجھ لیجایا کرتی تھین، دوسری ضروری تحریرون کا اندراج ہوجایا کرتا تھا، اور اس طور پر ایک ہی ورق مین مختلف کتابین موجود ہوتی تھین، ٹائمز کی عبارت اگرچہ صاف نہین ہے لیکن اس سے مترشح ہوتا ہے کہ کیمبرج کے مذکورہ اوراق مین تین مختلف کتابین مختلف زمانہ کی لکھی ہوئی موجود ہین، ان مین سب سے قدیم تحریر جیسا کہ ٹائمز سے مستنبط ہوتا ہے، پرونی قونجیلیم، اور ٹرنی زٹیس میری کی عبارات ہین جو سریانی زبان مین ہین، دوسری عبارت جو دراصل مذکورۂ بالا تحریر کے بعد اور اس کے اوپر لکھی گئی ہے، قرآن شریف کی عبارت ہے، تیسری تحریر جو اس کے بعد کی ہے، وہ عیسائی مقدسین کی بعض تحریرون کا اقتباس ہے، اور یہ عبارت بھی عربی زبان مین ہے، اسطور پر گویا ایک سطح پر تلے اوپر تین مختلف تحریرین موجود ہین جو ایک دوسرے کو کسی قدر ڈھکے ہوئے ہین، اور اس طرح اوپر کی تحریر کی وجہ سے نیچے کی عبارت دھندلی پڑگئی ہے،

(۲) ان مسودات کو ٹائمز ساتوین صدی کے آخر یا آٹھوین صدی کی ابتدا

کا بتاتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلی تحریر یعنی سریانی زبان کی دو کتابین اسی زمانہ کی لکھی ہوئی ہین،

(۳) تیسری تحریر یعنی عیسائی مقدسین کی عربی عبارت کے طرز تحریر کے متعلق عیسائی برٹش میوزیم کے ماہرین کی راے ہے کہ وہ نوین صدی کی لکھی ہوئی ہے،

(۴) ڈاکٹر منگانا نے ثابت کیا ہے، کہ اوراق مذکورہ تین یا زائد ماخذون سے حاصل کئے گئے ہین، جنمین سے بعض ماخذ اس وقت سے پہلے کے ہین، جب حضرت زید بن ثابتؓ نے مروجہ نسخۂ قرآن کو ترتیب دیا تھا،

(۵) ڈاکٹر منگانا نے ۴۵ صفحے مطالعہ کئے ہین، اور ان مین کم ازکم موجودہ قرآن سے ۵۳ اختلافات پائے ہین، اور چار ایسی آیتین ہین جو موجودہ قرآن مین نہین، لیکن ان صفحات مین ہین،

(۶) ڈاکٹر منگانا کے نزدیک ان صفحات کا بیشتر حصہ زیدؓ کے مرتب کردہ قرآن سے ترقی یافتہ ہے، مثلاً قرآن مین جو آیت ہے (بَاسَ کُنَا حَوْلَہٗ) اس کے بجائے ان صفحات مین جو الفاظ ہین انکا ترجمہ یہ ہے، جیسا کہ "حرم کے گرد ہم جھکے"

بیانات مذکورۂ بالا مین چند اُمور قابل لحاظ ہین،

(۱) جن لوگون نے یورپ کے پچھلے زمانہ کی تاریخ پڑھی ہے، اور عیسائیون کی حیرت انگیز تصنیفات کے واقعات مطالعہ کئے ہین جن کی تفصیلات پروفیسر ہنری دی کاسٹری (فرنچ مصنف) کی کتاب مین موجود ہین، جس کا ترجمہ عربی زبان مین مصر سے شائع ہو چکا ہے، وہ آسانی سے سمجھ سکتے ہین، کہ مسلمانون کی کوئی مذہبی کتاب عیسائیون کے ہاتھ مین اگر ہر قسم کی ناجائز کوششون سے کہان تک محفوظ رہ سکتی ہے، ہم نے وہ تحریرین دیکھی ہین

جن کی نسبت یہ ظاہر کیا جاتا ہے، کہ آنحضرت صلعم نے عیسائیوں کے لیے لکھی ہیں، اور وہ بعینہ محفوظ ہیں، ان تحریروں کے فوٹو شایع کیے گئے ہیں، اور ان کا اصلی مخرج عیسائیوں کی قدیم خانقاہیں یا گرجا بیان کیے گئے ہیں، ان میں سے ایک تحریر بھی اصلی اور واقعی نہیں ہے، اور فن حدیث کا معمولی صاحب مذاق بھی ان کے جعلی ہونے کو ایک نظر معلوم کر سکتا ہے، تاہم یورپ کے مستشرقین ان کو صحیح اور اصلی نوشتہ خیال کرتے ہیں،

(۲) جو آیت اختلافات کے ثبوت میں پیش کی ہے، افسوس ہے کہ اصلی عربی عبارت نقل نہیں کی ہے، بلکہ اس کا ترجمہ لکھا ہے یعنی جب کہ حرم کے گرد ہم جھکے، قرآن مجید میں جو الفاظ ہیں اس کا ترجمہ یہ ہے "جس کو ہم نے برکت دی" اس بنا پر ڈاکٹر منگانا یہ دعوی کرتے ہیں کہ مفروضہ قرآن موجودہ قرآن سے مخالف ہے، ڈاکٹر صاحب اگر اصل عربی عبارت نقل کرتے تو ہم آسانی سے اس کی نسبت کوئی راے قایم کر سکتے تھے، تاہم یہ قیاس ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے قرآن مجید میں "بَارَكْنَا" کا جو لفظ ہے اس کا ترجمہ غلط کیا ہے، قرآن مجید کی رسم خط میں "بَارَكْنَا" کا لفظ بغیر الف کے لکھا جاتا ہے یعنی "برکنا" قدیم زمانہ میں قرآن مجید پر زیر و زبر مد وغیرہ نہیں ہوتے تھے، زیر و زبر لکھنا حجاج بن یوسف کے زمانہ سے شروع ہوا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ کسی قدیم نسخے میں "بارکنا" کا لفظ اس طرح لکھا ہو کہ اس پر الف ممدودہ نہ ہو اور اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اسکو برکنا، پڑھا ہو جس کے معنی بیٹھنے اور لیٹنے اور جھکنے کے ہو سکتے ہیں، اور اس بنا پر بجائے برکت کے اس کا ترجمہ جھکنا کر دیا،

(۳) جو شخص یہ دعوی کرتا ہے کہ اوراق مذکورہ کا ماخذ حضرت زید بن ثابت رض کے زمانہ سے پہلے کا ہے، وہ اس کے ثبوت میں کیا دلائل پیش کر سکتا ہے، ؟ کیا ان اوراق

پر کتابت کی تاریخ لکھی ہے، جو کیا کاغذ کی کہنگی یا خط کی شان سے کتابت کا ٹھیک زمانہ متعین ہو سکتا ہے؟ کیا ڈاکٹر منگانا یا اور کوئی صاحب ان اصول شہادت کے معیار سے اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے پر آمادہ ہیں؟ ان تمام امور کو معلوم کرنے کے لئے ہمیں اوراق مذکورہ کی اشاعت کا انتظار کرنا چاہئے،

قرآن مجید کی تدوین کی کیفیت

اس موقع پر ہم مختصر اور سادہ طور پر قرآن کے مرتب و مدون ہونے کے واقعات درج کرتے ہیں، جن سے اس مسئلہ پر روشنی پڑ سکتی ہے، کہ ڈاکٹر منگانا کی تحقیق کہاں تک صحیح ہو سکتی ہے؟

جس زمانہ میں قرآن مجید نازل ہوا، تمام عرب میں اشعار اور خطبات کی زبان محفوظ رکھنے کا عام رواج تھا، آج شعرائے جاہلیت کے بیسیوں دیوان موجود ہیں جو بنوامیہ کے ابتدائی عہد تک مطلق قلمبند نہیں ہوئے تھے، (مثلاً دیوان امرأ القیس، دیوان سموٴل بن عادیا، دیوان زہیر بن ابی سلمی، دیوان نابغہ ذبیانی، دیوان علقمۃ الفحل، دیوان حاتم طائی وغیرہ) یہ تمام دیوان اسلام سے پہلے کے ہیں، اور اسلام کے بعد بھی یہ ایک مدت تک درج تحریر نہیں ہوئے، لیکن سیکڑوں ہزاروں اشخاص ان کو زبانی محفوظ رکھتے تھے، اور جب قلمبند ہوئے تو اس صحت کے ساتھ قلم بند ہوئے کہ بجز شاذ مثالوں کے اختلاف نسخ کی بھی نوبت نہیں آئی، جو قومیں لکھی پڑھی نہیں ہوتیں ان کے حافظے عموماً نہایت قوی ہوتے ہیں، اور عرب اس خصوصیت میں تمام قوموں سے اور بھی زیادہ ممتاز تھے،

آنحضرت صلعم پر جب قرآن نازل ہونا شروع ہوا تو پہلے بہت چھوٹی چھوٹی سورتیں

اثر ین جو لوگ اسلام کے حلقہ مین داخل ہوتے تھے ان کا پہلا کام قرآن مجید کی نازل شدہ آیتون اور سورتون کا محفوظ رکھنا ہوتا تھا کثرت سے ایسے صحابہ تھے جن کو پورا قرآن محفوظ تھا جنگ یمامہ مین جو صحابہ شہید ہوئے ان مین ستر ایسے تھے جن کو پورا قرآن مجید یاد تھا حضرت عبد اللہ بن مسعود کا بیان ہے، کہ مین نے ستر سورتین خود رسول اللہ صلعم سے سیکھی تھین،

قرآن مجید کا پڑھنا پڑھانا سب سے بڑھکر ثواب کا کام ہے، بخاری مین روایت ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ تم مین وہ شخص رتبہ مین سب سے بڑھکر ہے جو قرآن سیکھے، یا سکھائے" اس بنا پر ہر مسلمان نہایت اہتمام اور شوق سے قرآن مجید سیکھتا اور سکھلاتا تھا، حضرت عبد اللہ ابن عباسؓ نے دس برس کی عمر مین سورہ حجرات سے لیکر اخیر قرآن تک آنحضرت صلعم کے زمانہ مین یاد کر لیا تھا،

ایک غریب شخص نے آنحضرت صلعم کے سامنے ایک عورت سے شادی کرنی چاہی، آپ نے دریافت فرمایا تمھارے پاس مہر مین دینے کے لئے کیا ہے؟ انھون نے کہا کچھ نہین، فرمایا تم کو کچھ قرآن زبانی یاد ہے، بولے ہان فلان فلان سورتین یاد ہین، آپ نے فرمایا تو یہی سورتین بجائے مہر کے ہین، اور مین اسی پر تمھارا نکاح پڑھائے دیتا ہون (صحیح بخاری مین یہ واقعہ بہ تفصیل مذکور ہے)

غرض عرب کی قوت حافظہ، قرآن مجید کے یاد رکھنے کی فضیلت، آنحضرت صلعم کی ترغیب و تاکید، قرآن مجید کی عبارت کی دلآویزی، تعلیم قرآن کا اہتمام، یہ سب اسباب ایسے تھے جن کی وجہ سے خود آنحضرت صلعم ہی کے زمانہ مین پورا قرآن مجید یا اس کا بڑا حصہ سیکڑون اشخاص کو یاد تھا،

تحریر و کتابت

باایں ہمہ صرف زبانی حفظ پر اکتفا نہیں کیا گیا، بلکہ جب قرآن مجید نازل ہوتا تھا تو آنحضرت صلعم صحابہ کو حکم دیتے تھے، اور وہ قلم بند کر لیتے تھے، مکۂ معظمہ میں گو لکھنے کا رواج اس وقت تک کم تھا تاہم آنحضرت صلعم کی بعثت سے پہلے خاص مکہ میں ۱۷ شخص اس فن کے ماہر تھے، ان میں خلفاے راشدین بھی تھے، جب آنحضرت صلعم مدینہ منورہ چلے آئے، اور جنگ بدر میں قریش کے چند لکھے پڑھے آدمی (جو اس وقت تک کافر تھے) گرفتار ہوئے تو آنحضرت صلعم نے ان لوگوں کو حکم دیا کہ مدینہ میں لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں، اور یہی ان کا زرفدیہ ہوگا، یعنی اس کے بعد وہ رہا کر دیئے جائیں گے، چنانچہ حضرت زید بن ثابتؓ نے جو مشہور کاتب وحی تھے اسی طریقہ سے لکھنا پڑھنا سیکھا تھا،

بہر حال مدینہ منورہ میں لکھنا پڑھنا عام طور پر رائج ہو گیا، یہاں تک کہ حضرت زیدؓ نے آنحضرت صلعم کے ارشاد سے عبرانی اور لاطینی زبان بھی سیکھ لی،

اب تحریر کا اس قدر رواج ہو گیا تھا کہ قرآن مجید کے علاوہ بعض صحابہ (حضرت عبد اللہ بن عمروؓ) آنحضرت صلعم کے ارشادات بھی قلمبند کر لیا کرتے تھے، حضرت ابو ہریرہؓ تمام صحابہ میں سب سے زیادہ کثیر الروایۃ ہیں، لیکن بخاری میں ان کا قول مذکور ہے، کہ عبد اللہ بن عمروؓ مجھ سے بھی زیادہ کثیر الروایۃ ہیں، جس کی وجہ یہ ہے کہ میں لکھتا نہ تھا، اور وہ آنحضرت صلعم سے جو سنتے تھے، اسی وقت لکھ بھی لیا کرتے تھے،"

غرض آنحضرت صلعم کی زندگی ہی میں پورا قرآن مجید قلمبند ہو چکا تھا، البتہ کسی ایک مجموعہ میں جمع نہیں ہوا تھا، اور سورتوں میں باہم کوئی ترتیب قرار نہیں پائی تھی، لیکن ہر سورۃ

کی تمام آیتین مرتب قلمبند ہو چکی تھیں، قرآن مجید کے مدون اور مرتب ہونے کی تاریخ یہ ہے کہ آنحضرت صلعم کی وفات کے بعد جب غزوہ یمامہ مین اکثر حفاظ قرآن نے شہادت پائی تو حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکرؓ سے کہا کہ قرآن جمع کرا دیجئے، حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کو جو آنحضرت صلعم کی خدمت مین کتابت وحی کا کام کیا کرتے تھے، بلا کر یہ خدمت سپرد کی، حضرت زیدؓ نے غایت اہتمام سے اس کام کو انجام دیا، جہان جہان تحریری اجزا تھے ڈھونڈ ڈھونڈھ کر مہیا کئے، یہان تک کہ ہڈیون، پتھر کے ٹکڑون، اور کھجور کے تختون پر لکھے ہوئے اجزا بہم پہونچائے، یہ التزام کیا کہ تحریر کے ساتھ زبانی شہادت بھی لیتے تھے یعنی وہ تحریری عبارتین لوگون کو زبانی بھی یاد ہے، یا نہین؟ اس طرح پورا قرآن مجید مرتب ہوا سورتون کی ترتیب ان کے نازل ہونے کے زمانہ کے لحاظ سے نہین رکھی بلکہ زیادہ تر سورتون کے مطول و مختصر ہونے کا لحاظ رکھا یعنی بڑی سورتین پہلے رکھی گئین، متوسط ان کے بعد، اور مختصر سب اخیر، یہ نسخہ حضرت حفصہؓ (آنحضرت صلعم کی حرم محترم اور حضرت عمرؓ کی صاحبزادی) کے گھر مین رکھوا دیا گیا، حضرت عثمانؓ کے زمانہ مین جب قرآن مجید کی کثرت سے نقلین شایع ہونے لگین تو اختلاف نسخ پیدا ہوا، اس بنا پر حضرت حفصہؓ کے مکان سے وہ نسخہ منگوا کر متعدد نقلین کرائین، اور اسلام کے بڑے بڑے صوبون مین بھجوا دین، کہ تمام نسخے ان کے مطابق نقل کئے جائین، حضرت عثمانؓ نے یہ بھی حکم دیا جیسا کہ صحیح بخاری مین مذکور ہے، کہ جو نسخے اس نسخے کے مطابق نہ ہون وہ ضایع کر دیئے جائین، صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہین، وارسل الى كل افق بمصحف مما نسخوا وامر بما سواه من القرآن فى كل صحيفة او مصحف ان يحرق، (صحیح بخاری باب جمع القرآن) ترجمہ:- اور جو نسخے تیار ہوئے وہ ہر افق (صدر مقامات) مین بھجوا دیئے، اور حکم دیا کہ ان کے سوا

کسی صحیفے مین جو لے وہ جلا دیا جائے،

واقعات مذکورہ سے جو اہم نتایج حاصل ہوتے ہین حسب ذیل ہین:-

(۱) قرآن مجید خود آنحضرت صلعم کے زمانہ مین بہت سے صحابہؓ کو زبانی یاد تھا،

(۲) قرآن مجید کا ایک جملہ بھی ایسا باقی نہین رہا جو آنحضرت صلعم کے زمانہ مین قلمبند کر دیا گیا ہو

(۳) حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زید بن ثابتؓ کے اہتمام سے قرآن مجید کا جو نسخہ مرتب کرایا وہ تحریری نوشتون سے مرتب ہوا تھا جس کی تصدیق اُن لوگون سے بھی کرائی جاتی تھی، جو قرآن مجید کے کلًا یا جزءًا حافظ تھے،

آنحضرت صلعم کے زمانہ مین تمام سورتین مرتب ہو چکی تھین اور ان کے الگ الگ نام قایم ہو چکے تھے، البتہ سورتون مین باہم تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے ترتیب نہین دیگئی تھی، یہ ترتیب حضرت زید بن ثابتؓ نے قائم کی،

(۵) جو نسخے ایسے تھے جنین کاتبون کی غلطی سے کچھ تغیر ہو گیا تھا حضرت عثمانؓ نے ان سب کو جلوا دیا،

نتایج مذکورہ کے بعد اب سوال یہ ہے کہ ڈاکٹر منگانا جن ماخذون کو حضرت زیدؓ اور حضرت عثمانؓ سے پہلے کا بتاتے ہین، ان کی صحت کے کیا دلائل پیش کر سکتے ہین؟ جب یہ ثابت ہے کہ حضرت زیدؓ نے انتہائے تفحص، اہتمام و تلاش، اور تمام صحابہؓ کی متفقہ کوشش سے مدون کیا تھا، جب یہ ثابت ہے، کہ حضرت عثمانؓ نے وہ تمام مصاحف ضایع کر دیئے جو حضرت زید بن ثابتؓ کے نسخون کے مطابق نہ تھے جب قرآن مجید کا ایک ایک حرف ابتدا سے آج تک یہ تواتر محفوظ چلا آیا تو کیا ایک ورڈاکٹر منگانا،، کا بلا دلیل استنباط تمام عظیم الشان شہادتون کے مقابلہ مین ایک ذرہ بھی وقعت رکھتا ہے

ہم نے اس مضمون کو نہایت اختصار کیساتھ لکھا ہے جب کیمبرج پریس اپنے کاغذات شایع کریگا، اسوقت ہم اسکو بتا دینگے کہ قرآن مجید ہزارون دلائل سے بھی انجیل نہین بن سکتا،

مسائل فقہیہ زمانہ کی ضرورتون کا اثر

ہمارے مخالفون نے سیکڑون بار کہا ہے، اور اب بھی کہتے ہین، کہ اسلام کا قانون (مسائل فقہیہ) دست شل ہے، جس کو کسی طرح جنبش نہین ہو سکتی، یعنی اس مین ترقی کی کوئی گنجائش نہین اور اس وجہ سے وہ کسی طرح زمانہ کی ضرورتون کا ساتھ نہین دے سکتا،

ہم اس کے متعلق اگر کچھ کہنا چاہتے ہین تو مخالفین کہتے ہین، کہ یہ آج کل کے خیالات کا اثر ہے، ورنہ قدمائے اسلام کے نزدیک مسائل فقیہ مین کسی اصلاح اور تغیر کی گنجایش نہین اس بنا پر ہم اس کے متعلق کچھ کہنا نہین چاہتے، بلکہ یہ دیکھتے ہین کہ سلف نے خاص اس مضمون پر کیا لکھا ہے،

فقہائے متاخرین مین سے علامہ شامی کو جو شہرت اور حسن قبول حاصل ہوا، کم کسی کو ہوا ہوگا، انھون نے خاص اس بحث پر ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام نشر العرف فی بناء بعض الاحکام علی العرف ہے، یہ رسالہ اور بہت سے رسالون کے ساتھ سنہ ۱۳۰۱ھ مین بمقام دمشق چھاپا گیا ہے، اس رسالہ مین علامہ موصوف نے نہایت تفصیل سے اس مسئلہ پر بحث کی ہے ہم اوسکے جستہ جستہ مقامات اس موقع پر نقل کرتے ہین:—

اعلم ان المسائل الفقہیۃ اما ان تکون	جاننا چاہیے کہ مسائل فقہیہ یا صریح نص سے ثابت ہون گے
ثابتۃ بصریح نص وھی الفصل الاول	ان مسائل کو ہم نے پہلی فصل مین بیان کیا، یا اجتہاد اور
واما تکون ثابتۃ بضرب اجتھاد	راے سے ثابت ہون گے، ان مین سے اکثر مسائل ایسے ہوتے

وسائر وكثير منها ما يبينه المجتهد على
ما كان في عرف زمانه بحيث لو كان في
زمان العرف الحادث لقال بخلاف ما
قاله اولاً ولهذا قالوا في شروط
الاجتهاد انه لا بد فيه من معرفة عادات
الناس فكثير من الاحكام تختلف باختلاف
الزمان لتغير عرف اهله او لحدوث
ضرورة او فساد اهل الزمان بحيث
لو بقي الحكم على ما كان عليه اولاً للزم
منه المشقة والضرر بالناس و
لخالف قواعد الشريعة المبنية على
التخفيف والتيسير ودفع الضرر
والفساد لبقاء العالم على اتم نظام و
احسن احكام ولهذا ترى مشايخ المذهب
خالفوا ما نص عليه المجتهد في مواضع
كثيرة بناها على ما كان في زمانه
لعلمهم بانه لو كان في زمنهم لقال
بما قالوا به[1]،

ہیں جنکو مجتہد نے اپنے زمانے کے رواج کے موافق قایم
کیا تھا، اس طرح کہ اگر وہ (یعنی مجتہد) آج کے زمانے میں
موجود ہوتا تو اپنے ہی قول کے خلاف کہتا، اسی بناپر اجتہاد
کے شرائط میں لوگوں نے اس کو بھی داخل کیا ہے، کہ
مجتہد لوگوں کے رسم ورواج سے واقفیت رکھتا ہو، کیونکہ
اکثر احکام زمانہ کے اختلاف سے بدل جاتے ہیں، بوجہ اسکے
کہ رواج بدل گیا، یا کوئی نئی ضرورت پیدا ہوگئی یا زمانہ
کے لوگ بدروش ہوگئے، اس صورت میں اگر وہ پہلا حکم باقی
رہے، تو اس سے لوگوں کو تکلیف اور ضرر پہونچے اور
شریعت کے ان قواعد کی مخالفت لازم آئے جنکی بنیاد آسانی
اور دفع ضرر پر ہے، تاکہ دنیا نہایت اعلیٰ درجہ کے نظم
ونسق پر قایم رہے، اسی بناپر تم دیکھتے ہو کہ مشایخ مذہب
نے اکثر موقعوں پر مجتہد کی منصوصات سے اختلاف
کیا ہے، جن کی بنیاد مجتہد کے زمانہ کے حالات
کے موافق تھی، کیونکہ مشایخ کو یہ معلوم ہے، کہ
اگر آج خود مجتہد موجود ہوتا تو وہی کہتا جو
انھوں نے کہا،

[1] رسالۂ مذکور صفحہ ۸،

اس کے بعد مصنف نے بہت سی مثالیں دی ہیں، جنہیں زمانہ کی رسم و عادت کی وجہ سے احکام بدل گئے، ان میں سے چند یہ ہیں :-

پہلے مجتہدین کا یہ فتویٰ تھا کہ قرآن مجید کی تعلیم پر معاوضہ لینا جائز نہیں، اب فقہا نے اس کے جواز کا فتویٰ دیدیا،

امام ابو حنیفہ کا یہ مذہب تھا، کہ گواہ کا ظاہر میں ثقہ ہونا کافی ہے، امام ابو یوسف اور امام محمد نے ظاہری عدالت کو ناکافی قرار دیا کیونکہ امام ابو حنیفہ کے زمانہ میں اکثر لوگ ثقہ اور عادل ہوتے تھے، اس لئے ظاہری عدالت کافی تھی، لیکن پھر وہ حالت نہیں رہی،

پہلے وصی کو یتیم کے مال میں مضاربت کا حق حاصل تھا، متاخرین نے اس کو ناجائز قرار دیا، آنحضرت صلعم کے زمانہ میں عورتیں مسجد میں نماز کے لئے حاضر ہوتی تھیں متاخرین نے منع کر دیا،

مزارعت، معاملت، وقف میں امام ابو حنیفہ کا قول معمول بہ نہیں ہے، بلکہ امام ابو یوسف اور امام محمد کے قول پر فتویٰ ہے،

بیع بالوفا پہلے ناجائز تھی، پھر جائز قرار دیدی گئی،

اس قسم کی قریبًا سو مثالیں مصنف نے پیش کی ہیں جنہیں زمانہ کے اختلاف حالت کی وجہ سے احکام فقہی بدل گئے ہیں،

اس کے بعد مصنف نے یہ سوال قایم کیا ہے، کہ اب اس زمانہ میں احکام کا بدلنا جائز ہے یا نہیں، چنانچہ لکھتے ہیں :-

فان قلت العرف یتغیر و یختلف باختلاف الزمان فلو طرء عرف جدید — اگر تم یہ کہو کہ رواج تو زمانہ کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے، تو اب اگر کوئی نیا رواج پیدا ہو تو ہمارے

هل للمفتي في مثل ما ذكرنا ان يفتي على وفقه ويخالف المنصوص وكذا هل للحاكم الآن العمل بالقرائن قلت مبنى هذه الرسالة على هذه المسئلة فاعلم ان المتأخرين الذين خالفوا المنصوص في كتب المذهب في المسائل السابقة لم يخالفوه الا لتغير الزمان والعرف وعلمهم ان صاحب المذهب لو كان في زمنهم لقال بما قالوا،

زمانہ کے مفتی کو اس کے موافق فتویٰ دینا اور منصوصات کی مخالفت کرنا جائز ہے، یا نہیں؟ اور اسی طرح آج کل حاکم وقت کو قرائن پر عمل کرنا جائز ہے یا نہیں؟ تو میں کہتا ہوں، کہ اس رسالے کی بنیاد یہی مسئلہ ہے، تم کو جاننا چاہئے، کہ متاخرین نے ان تصریحات سے جو قدیم کتابوں میں تھیں اختلاف جو کیا، اسی بنا پر کیا، کہ اب زمانہ اور رواج بدل گیا ہے، اور اگر آج خود مجتہد موجود ہوتے تو وہی کہتے جو ہم کہتے ہیں،

علامہ موصوف نے ایک اور رسالے میں جس کا نام شرح المنظومہ ہے، اس مسئلہ کو ضمناً لکھا ہے، اس میں لکھتے ہیں:-

وفي القنية ليس للمفتي ولا للقاضي ان يحكما على ظاهر المذهب ويتركا العرف انتهى ونقله منها في خزانة الروايات وهذا صريح فيما قلنا من ان المفتي لا يفتي بخلاف عرف اهل زمانه،

اور قنیہ میں مذکور ہے، کہ مفتی اور قاضی کو یہ جائز نہیں، کہ ظاہر مذہب پر حکم دے، اور رواج کو چھوڑ دے، اور اسی کتاب سے خزانۃ الروایات میں یہ قول نقل کیا ہے، اور یہ صریح ہمارے اس قول کے موافق ہے، کہ مفتی کو اپنے زمانے کے رواج کے مخالف حکم نہیں دینا چاہئے،

یہاں فوراً یہ شبہہ پیدا ہوگا، کہ اگر شریعت کے احکام زمانے کے اختلاف سے بدل سکتے ہیں، تو اس کی حد کیا قرار پائی گی، یہ سلسلہ بڑھتے بڑھتے خود فرائض مذہبی تک

پہونچ سکتا ہے، کیا زمانے کے اختلاف سے فرائض اور ارکان بھی بدل سکتے ہیں، یہ شبہ علامہ شامی نے اپنے رسالے میں ذکر کر کے جواب دیا ہے،

فنقول في جواب هذا الاشكال اعلم ان العرف نوعان خاص وعام وكل منهما اما ان يوافق الدليل الشرعي والمنصوص عليه في كتب ظاهر الرواية اولا فان وافقهما فلا كلام والا فاما ان يخالف الدليل الشرعي او المنصوص عليه في المذهب فنذكر ذلك في بابين الباب الاول اذا خالف العرف الدليل الشرعي فان خالفه من كل وجه بان لزم منه ترك النص فلا شك في رده كتعارف الناس كثيرا من المحرمات من الربا وشرب الخمر ولبس الحرير والذهب وغير ذلك مما ورد تحريمه نصا وان لم يخالفه من كل وجه بان ورد الدليل عاما والعرف خالفه في بعض افراده او كان الدليل قياسا فان العرف معتبر ان كان عاما فان العرف العام يصلح مخصصا كما مر عن

تو ہم اس اعتراض کے جواب میں کہیں گے کہ عرف کی دو قسمیں ہیں، عام وخاص، اور ان دونوں کی بھی دو صورتیں ہیں، یا تصریحات ظاہر الروایہ یعنی امام محمدؒ کی تصانیف ستہ کے موافق ہونگی یا نہیں اگر موافق ہو تو کچھ پوچھنا ہی نہیں، اور اگر مخالف ہو تو ہم اس کو دو بابوں میں لکھتے ہیں، پہلا باب جب کہ رواج دلیل شرعی کے مخالف ہو، اس صورت میں اگر ہر طرح سے دلیل شرعی کے مخالف ہو جس سے نص شریعت کا ترک کرنا لازم آئے، تو اس کے باطل ہونے میں کوئی شبہ نہیں مثلاً اکثر لوگوں نے بہت سے محرمات کا معمول کر لیا ہی، مثلاً شراب سود حریر اور زری کا استعمال جن کی حرمت صاف نص میں آئی ہے، اور اگر کلیۃً نص صریح کا مخالف نہ ہو مثلاً یہ کہ دلیل عام ہو، اور رواج ایک خاص صورت سے متعلق ہو، یا یہ کہ دلیل کوئی نص نہ ہو بلکہ قیاس ہو، تو اس صورت میں رواج کا اعتبار کیا جائے، بشرطیکہ رواج عام ہو، اور اس صورت

العرف ویترك به القیاس: الخ	مین رواج، دلیل شرعی کا مخصص واقع ہو سکے گا، جیسا کہ تحریر (ایک کتاب کا نام ہے) کے حوالہ سے گذر چکا ہے، اور رواج عام کے مقابلہ مین قیاس ترک کر دیا جائے گا،

علامہ موصوف نے اس مسئلہ کو ایک جزئی صورت مین سمجھایا ہے، وہ یہ کہ مثلاً حدیث مین وارد ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس شرط پر آٹا پیسنے کو دے کہ اجرت کے بدلے تہائی آٹا اس کا ہوگا، تو ناجائز ہے اس سے مستنبط ہوتا ہے، کہ مثلاً اگر کوئی شخص کسی جولاہے کو اس شرط پر سوت دے کہ وہ اس کا کپڑا بن دے اور اجرت کے معاوضہ مین ایک تہائی کپڑا لے لے، تو یہ معاملہ ناجائز ہوگا، لیکن چونکہ بلخ مین یہ طریقہ عموماً معمول ہے، اس لئے بلخ کے فقہا نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا، اور یہ قرار دیا، کہ رواج کی بنا پر حدیث مین تخصیص کر دی جائے گی یعنی حدیث صرف آٹے کی صورت تک محدود رہے گی، علامہ کے خاص الفاظ ہین :-

ومشائخ بلخ کنصیر بن یحیی ومحمد بن سلمة وغیرهما کانوا یجیزون هذه الاجارة فی الثیاب لتعامل اهل بلدهم والتعامل حجة یترك به القیاس ویخص به الاثر،	اور بلخ کے اکثر مشائخ مثلاً نصیر بن یحیی، و محمد بن سلمہ وغیرہ اس معاملہ کو کپڑے مین جائز قرار دیتے تھے، کیونکہ ان کے شہر مین یہ عام رواج تھا، اور رواج کے مقابلہ مین قیاس ترک کر دیا جاتا ہے اور حدیث مین تخصیص کر لی جاتی ہے،

ان تصریحات کے بعد کون کہہ سکتا ہے، کہ فقہ اسلامی مین ترقی، اور اقتضائے ضروریات کی موافقت کی قابلیت نہین، آج کل معاملات کے متعلق سیکڑون ہزارون

جزئیات جو پیدا ہو گئے ہیں، ان کو اگر جائز یا حرام کہا جاتا ہے، تو اس بنا پر کہ ان کو کسی قدیم کلیہ کے تحت میں داخل کر لیا جاتا ہے، ورنہ یہ ظاہر ہے، کہ یہ جزئیات اس زمانے میں موجود نہ تھے، لیکن علامہ شامی نے سیکڑوں روایتوں کی اسناد سے ثابت کر دیا ہے، کہ عام رواج کی بنا پر کلیات کا حکم خاص کر دیا جاتا ہے،

PDF created with pdfFactory Pro trial version www.pdffactory.com

وقفِ اولاد
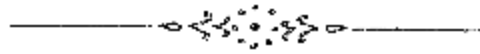
وقفِ اولاد کی تحریک جو اخبارون کے ذریعہ سے عام طور پر مشتہر ہو چکی ہے، اگرچہ اس کی نسبت تمام ملک مین نہایت سرگرمی اور جوش سے موافقت اور تائید کی صدا اُٹھی لیکن بہت کم لوگون کو معلوم ہے کہ اصل واقعہ کیا ہے؟ شریعت اسلامی کا کیا مسئلہ تھا؟ حکام **پریوی کونسل** نے اس کو کیونکر باطل کیا؟ اور کس غلط فہمی کی بناپر باطل کیا؟ اس کے متعلق اب کیا کوشش ہو رہی ہے؟ اور کس حد تک ہو چکی ہے؟ اور آیندہ کیا کیا کرنا ہے؟

اصل یہ ہے کہ شریعت اسلام کا ایک یہ مسئلہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی جائداد کو خدا کی راہ مین فقرا اور غربا کے لئے اس طرح مخصوص کر دے کہ اصل جائداد ہمیشہ محفوظ رہیگی؛ اور اس کا منافع فقرا و غربا کو ملتا رہیگا، تو اس معاملہ کا نام **وقف** ہو گا، اور وہ جائداد ہمیشہ محفوظ رہیگی، یعنی نہ فروخت ہو سکے گی نہ ہبہ ہو سکے گی، نہ وارثون کو وراثت مین مل سکے گی، البتہ اس کا منافع فقرا کو ملتا رہے گا،

وقف کی یہ صورت تمام اور مذہبون مین بھی موجود ہے، لیکن تمام اور مذاہب نے وقف کو غیرون اور بیگانون کے لئے محدود رکھا ہے،

لیکن اسلام نے اس کو اور وسعت دی ہے، اسلام نے یہ قرار دیا کہ اپنی آپ امداد کرنا، اپنی آل اور اولاد کی پرورش کرنا، انسان کا اصلی فرض ہے، اور ایسا فرض ہے جسکے ادا کرنے پر انسان کو ثواب حاصل ہوتا ہے، اس بناپر اسلام نے **وقف** کو اولاد و اعزہ تک وسعت دی، یعنی اگر کوئی شخص صرف اپنی اولاد پر کوئی جائداد وقف کرے تو یہ وقف

بھی جائز اور نافذ ہوگا، لیکن جب موقوفہ جائدادون کے متعلق وارثون مین نزاعین پیدا ہوئین، اور مقدمات انگریزی عدالتون مین گئے تو حکام انگریزی نے وقف کو ناجائز قرار دیا کیونکہ انگریزی خیرات (چیرٹی) کا لفظ فقرا اور بیگانون کے لئے مخصوص ہے، اپنی اولاد کو کچھ دینا خیرات مین داخل نہین ہے، حکام انگریزی کے سامنے وکلا نے فقہ اسلام کی مستند روایتین پیش کین، لیکن انھون نے اس پر اصرار کیا، کہ خیرات کے معنی وہی لئے جائینگے جو انگریزی قانون مین ہین، چنانچہ جسٹس ٹریولین نے ایک مقدمہ[1] کے فیصلہ مین یہ الفاظ لکھے،

"مین لفظ خیرات کو انگریزی لفظ ہی کے مفہوم کے موافق سمجھتا ہون اور اس مفہوم کے موافق انگریزی عدالتون مین اور انگریزی ترجمون مین اس کا استعمال ہوتا ہے، مجھ سے چاہا جاتا ہے کہ مین لفظ **خیرات** کے مفہوم کو مسلمانون کے مفہوم کے موافق سمجھون یعنی ایک دوسری زبان کا لفظ استعمال کرون جس کا مفہوم اس زبان کے مفہوم کے خلاف ہو"

اس کے بعد کثرت سے مقدمات دائر ہوئے، لیکن حکام نے اپنی رائے سے تجاوز نہ کیا، ایک مقدمہ مین جو از طرف میر محمد اسمٰعیل خان بنام منشی چرن گھوش تھا، مولوی امیر علی صاحب جج بھی شریک فیصلہ تھے، انھون نے نہایت مستند حوالون سے اس مسئلہ کو ثابت کیا، یہ مقدمہ پریوی کونسل تک گیا، لیکن حکام پریوی کونسل نے وقف کو تسلیم نہین کیا، پھر متعدد مقدمات پریوی کونسل تک گئے اور حکام اسی اپنی رائے پر قایم رہے، سب سے زیادہ مفصل اور مدلل فیصلہ اس باب مین وہ ہے جو حکام نے بمقدمہ ابوالفتح محمد اسحاق بنام رسمیا چودھری ۲۳ نومبر ۱۸۹۴ء کو صادر کیا، اور جو انڈین لارپورٹ جلد ۲۲ صفحہ ۶۱ مین درج ہے،

---

[1] انڈین لارپورٹ جلد ۲ کلکتہ از صفحہ ۲۰۷،

اس فیصلہ کا اقتباس ہم اس غرض سے لکھتے ہیں کہ یہ معلوم ہو کہ حکام پریوی کونسل نے کس بناپر وقف اولاد کو ناجائز قرار دیا ہے حکام کے نزدیک وقف اولاد کے ناجائز ہونے کی وجوہ ذیل ہیں،

(۱) اپنی اولاد پر وقف کرنا کوئی ایثار نفس اور فیاضی نہیں ہے، اولاد کو دینا گویا جائداد کو خود اپنے ہاتھ میں رکھنا اور حفاظت جائداد کا بندوبست ہے، چنانچہ حکام پریوی کونسل مقدمہ مذکور میں لکھتے ہیں:-

"یہ خیال کرنا مقنن اعظم (یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کی نسبت بیجا ہوگا، کہ مقنن موصوف نے اس کے ذریعہ سے ایسے ہبہ جات کو پسند کیا ہے، جن کے ذریعہ سے واہب نے کچھ نفس کشی نہ کی ہو، جس میں وہ ایک ہات سے اس شے کو واپس لیتا ہے، جو ظاہراً معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دوسرے ہاتھ سے دی، اور جو ذریعہ جمع کرنے اور ازدیاد جائداد خاندان کا ہے"

(۲) شریعت اسلام میں ہبہ مشروط ناجائز ہے، مثلاً اگر کوئی شخص یوں ہبہ کرے کہ میری جائداد فلاں شخص کو ملے اس شرط پر کہ وہ اس کو منتقل نہ کر سکے گا، پھر اس کے مرنے پر اس کی اولاد کو ملے گی، لیکن اسی شرط پر کہ وہ اس کو منتقل نہ کرسکے گا اور اسی طرح یہ ہبہ اولاد در اولاد تک قایم رہے گا، تو یہ ہبہ ناجائز ہوگا جب اس قسم کا ہبہ ناجائز ہے تو وقف کی بھی یہی صورت ہے، وہ کیونکر جائز ہوگا، حکام پریوی کونسل کے الفاظ یہ ہیں:-

"حکام ممدوح نے اثنائے بحث میں دریافت کیا کہ کیا وجہ ہے کہ از روے عام قانون اسلام کے اقل درجہ جیسا کہ ہند میں معلوم ہے سادہ ہبہ جات منجانب معمولی اشخاص کے بہ حق اولاد بعید جو ہنوز نہیں پیدا ہوئی یعنی متواتر نا قابل انتقال حقوق حین حیاتی ممنوع ہیں، آیا یہ تصور کرنا چاہئے کہ وہی انتقالات جو اس صورت میں ناجائز ہیں جب کہ معمولی الفاظ ہبہ کے

استعمال کئے جائین جائز ہو جاسکتے ہین، اگرچہ کہ کتب مذکورہ صرف یہ کہہ دیتے ہین کہ وہ بطور وقف کے فقراء کے نام پر ترک کئے گئے، ان سوالات کا کوئی جواب نہین دیا گیا، نہ جواب دینے کی کوشش کی گئی، نہ حکام عالی مقام کو کوئی جواب معلوم ہوتا ہے۔

(مقدمہ ابو الفتح محمد اسحاق صفحہ انگریزی ۳۳۲)

مولوی امیر علی صاحب جج نے نہایت مفصل اور مستند طریقہ سے وقف اولاد کو ثابت کیا۔ انھون نے وہ تمام حدیثین نقل کین جن مین آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اپنی اولاد کو دینا بھی صدقہ اور خیرات کرنا ہے، لیکن حکام پریوی کونسل کہتے ہین کہ اس قسم کی حدیثین اخلاقی باتین ہین، جو مناسب موقعون پر کہی جاتی ہین لیکن یہ کوئی قانونی اور فقہی مسئلہ نہین بن سکتا۔ حکام موصوف کے اصلی الفاظ یہ ہین:۔

"حکام عالی مقام نے تا حد اپنی بہترین لیاقت کے متحقق اور متعلق کرنے اس شرع محمدی کے کوشش کی جو ہند مین معلوم ہے، اور جس پر وہان عمل کیا جاتا ہے، لیکن ممدوح کو یہ نہین معلوم ہوتا کہ قطعی اور (جیسا کہ حکام ممدوح کو معلوم ہوتا ہے) بیجا متعلق کرنا حد بتھاے اصول کا جو نبی کے منہ سے سنی گئین مطابق اس قانون کے ہے۔ ممکن ہے کہ یہ حدیثین مناسب موقعون پر نہایت عمدہ ہون" (مقدمہ مذکور صفحہ انگریزی ۳۴۳)

مولوی امیر علی صاحب نے وقف اولاد کی جو مثالین خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے صحابہ کے زمانہ مین عمل مین آئی تھین، اپنے فیصلہ مین پیش کین لیکن حکام پریوی کونسل نے ان کو کافی نہ سمجھا۔ حکام کے اصلی الفاظ یہ ہین:۔

"نسبت نظائر کے حکام عالی مقام کو بہت زیادہ مفصل حالات معلوم ہونے چاہئین قبل اس کے کہ وہ تجویز کر سکین، کہ آیا وہ متعلق بھی ہون گے، یا نہین حکام ممدوح

سننے مین کہ ہبہ کیا گیا، اور وہ بحال رکھا گیا، لیکن بابت ولادت جائداد کے، اس کے

سوا اور کچھ انھون نے نہین سنا کہ مقدمہ محولہ مین یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکان مذکور خاص

طور پر مقدس سمجھا جاتا تھا، ان کو کچھ حال خاندان یا واقف کا معلوم نہین،

(مقدمہ ابوالفتح صفحہ انگریزی ۱۴۳)

حاصل یہ کہ حکام پریوی کونسل کی اور انگلش قوم کی کسی طرح سمجھ مین نہین آسکتا

کہ خود اپنی اولاد کو دینا، ثواب اور خیرات کا کام کیونکر ہوسکتا ہے، اور جب وہ خیرات

نہین تو وقف کیونکر ہوسکتا ہے،

خان بہادر مولوی محمد یوسف صاحب وکیل کلکتہ نے اس بارہ مین نہایت قابل قدر

کوشش کی، انھون نے ایک مطول رسالہ انگریزی زبان مین لکھا، اور بحیثیت پریسیڈنٹ

محمڈن ایسوسی ایشن بنگال وایسرائے کی خدمت مین بھیجا، لیکن اولاً تو رسالہ نہایت طول

طویل اور حشو و زوائد پر مشتمل تھا، اور ایک ہی مضمون کا بار بار اعادہ کیا گیا تھا،

ثانیاً وہ رسالہ پیش ایسے طریقہ سے کیا گیا کہ بجز محدود و برلے نام ایسوسی ایشن کے

ہندوستان کی اسلامی جماعت اور اخبارات کو خبر تک نہ ہوئی،

ثالثاً یہ قاعدہ مقررہ ہے کہ پریوی کونسل اپنے کسی فیصلہ کو منسوخ نہین کرتی، نہ اسکے

فیصلہ مین وایسرائے اور گورنمنٹ کوئی مداخلت کرسکتی،

غرض وجوہ مذکورۂ بالا سے ناکامی ہوئی،

اب ہم کو کیا کرنا چاہئے، | (۱) ایک وقف ایسوسی ایشن یعنی وقف کی ایک کمیٹی قائم ہو

جس کے ممبر تمام اضلاع ہندوستان کے سربرآوردہ مسلمان، تعلقہ دار، زمیندار، عہدہ داران

ؔ وقف کو ہبہ کے لفظ سے تعبیر کیا ہے،

سرکاری، وکلار، وغیرہ وغیرہ ہون،

(۲) ایک فتویٰ تمام ہندوستان کے علماء کے دستخط سے مزین ہوکر تیار کرایا جائے،

(۳) ایک رسالہ لکھا جائے جس مین احادیث اور روایات فقہیہ سے وقف اولاد کو ثابت کیا جائے،

(۴) ایک عرضداشت مرتب ہوکر تمام ہندوستان کے مسلمانون سے اس پر دستخط کرائے جائین، اور وہ مع رسالہ وفتوی مذکورۂ بالا کے حضور وایسرائے کی خدمت مین بھیجی جائے، جس کا مضمون یہ ہوکہ،

تمام مسلمانان ہندوستان اس تعبیر کو خلاف قانون اسلام سمجھتے ہین جو پریوی کونسل نے وقف اولاد کے مسئلہ مین کی ہے، اس لئے

ہم مسلمانون کی درخواست ہے کہ گورنمنٹ ایک جدید قانون وقف اولاد کے متعلق حسب شریعت اسلام بنادے، جیساکہ ہندو بیوگان کی نسبت حضور وایسرائے نے ہندوؤن کی درخواست پر ایک قانون موسومہ قانون نکاح بیوگان بنادیاہے،

غرض جب تک تمام مسلمانون کی متفقہ آواز سے گورنمنٹ پر یہ نہ ثابت ہوگا کہ پریوی کونسل کا فیصلہ مسلمانون کے مذہب اور شریعت کے خلاف ہے اس بارہ مین کچھ کامیابی نہین ہوسکتی،

رسالہ کا مسودہ الندوہ مین اطلاع عام کیلئے شایع کیا جاتاہے، اور اس پر جو حضرات کسی قسم کی رائے دینا چاہین، خاکسار کو تحریر فرمائین، یہ رسالہ تمام علما کی خدمت مین منظوری کے لئے مرسل ہوگا، اور ان کے دستخط اس پر ثبت کرائے جائینگے،

چونکہ انگریزی عدالتون نے بالعموم وقف علی الاولاد کو جو شریعت اسلام کا ایک مسلمہ مسئلہ ہے متعدد فیصلون کے ذریعہ سے ناجائز اور باطل قرار دیدیا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ خود اسلامی شریعت مین یہ مسئلہ ناجائز ہے اس لئے یہ رسالہ تحریر کیا جاتا ہے، جس سے دو امر ظاہر کرنا مقصود ہے،

(۱) اولاد پر جائداد کا وقف کرنا حدیث اور فقہ دونون سے ثابت ہے اور مسلمانون کے تمام فرقے اس مین متفق الرائے ہین،

(۲) حکام انگریزی بالخصوص پریوی کونسل نے کس بنا پر اس مسئلہ کے سمجھنے مین غلطی کی ہے،

وقف اولاد کا مسئلہ اصول مفصلۂ ذیل پر مبنی ہے،

پہلا اصول شریعت اسلامی مین خیرات اور صدقہ غیرون پر محدود نہین بلکہ خود اپنے اہل وعیال کو دینا بھی صدقہ اور خیرات (چیرٹی) ہے،

قرآن مجید مین ہے،

لیس البران تولوا وجوھکم قبل المشرق	یہ نیکی نہین ہے کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیرد
والمغرب ولکن البر من آمن باللّٰہ	لیکن نیکی یہ ہے کہ جو شخص خدا پر اور قیامت پر اور فرشتون
والیوم الآخر والملئکۃ والکتب و	پر اور کتاب پر اور انبیا پر ایمان لائے، اور خدا کی
النبیین وآتی المال علی حبہ ذوی القربیٰ	محبت مین اپنا مال رشتہ دارون کو، اور یتیمون کو
والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین	اور مسکینون کو اور مسافر کو اور سائل کو اور آزاد
وفی الرقاب (سورۂ بقرہ رکوع ۲۲)	کرنے کے لئے دے،

ایک اور آیت مین ہے:-

يسئلونك ماذا ينفقون، قل ما انفقتم — لوگ تجھسے پوچھتے ہین کہ کیا خیرات کرین، کہدے
من خير فللوالدين والاقربين واليتامى — کہ جو خیرات کرو، تو والدین کو دو، اور رشتہ دارون
والمساكين وابن السبيل، — کو اور یتیمون کو اور مسکینون کو اور مسافرون کو،

قرآن مجید کی یہ آیت جب نازل ہوئی،

لن تنالوا البر حتى تنفقوا مما تحبون، — تم ثواب نہین پا سکتے جب تک اس چیزمین سے خیرات نہ کرو
جو تم کو محبوب ہے،

تو ابوطلحہؓ آنحضرت صلعم کے پاس آئے اور کہا یا رسول اللہ صلعم خدا کہتا ہے کہ جب تک محبوب چیز خیرات نہ کرو گے نیکی نہ ملے گی، تو مجھ کو اپنی تمام جائدادون مین سے بیرحا رہبت زیادہ محبوب ہے، مین اس کو صدقہ دینا چاہتا ہون، آنحضرت صلعم نے فرمایا تو بہتر یہ ہے کہ اپنے عزیزون پر صدقہ کرو، چنانچہ ابوطلحہؓ نے یہ جائداد اپنے اقارب اور خاص اپنے چچازاد بھائیون پر صدقہ کی، یہ حدیث صحیح بخاری مین ہے جو قرآن مجید کے بعد سب سے زیادہ مستند کتاب ہے،

اصل الفاظ بخاری کے یہ ہین :-

قال انس فلما نزلت لن تنالوا البر — انسؓ کا بیان ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی
حتى تنفقوا مما تحبون قام ابوطلحہ فقال — کہ تم کو ثواب نہ حاصل ہوگا جب تک تم اپنا محبوب مال
يا رسول الله ان الله يقول لن تنالوا — خیرات نہ کرو، تو ابوطلحہؓ کھڑے ہوئے اور کہا کہ یا رسول اللہ
البر حتى تنفقوا مما تحبون وان احب اموالی — خدا یہ کہتا ہے، اور مجھکو سب سے زیادہ عزیز میری بیرحا
الی بیرحاء وانها صدقة لله ارجو برها — کی جائداد ہے، تو وہ خدا کی راہ مین صدقہ ہے،
وذخرها عند الله فضعها حيث اراك — مین اس کے ثواب کا اور خدا کے ہان ذخیرہ ہونے کا
الله فقال بخ ذلك مال رابح اوراٰيح — امیدوار ہون تو آپ اسکو جس طرح چاہئے صرف

شئت ابن سلمة وقد سمعت ما قلت وانی اری ان تجعلها فی الاقربین (بخاری باب الوقف)

کیجیے آنحضرت صلعم نے فرمایا سبحان اللہ یہ تو بکار آمد جائداد ہے دریا چلتی ہوئی چیز ہے ابن سلمہ کو شک ہے کہ ان دو لفظوں میں سے آنحضرت صلعم نے کیا فرمایا تھا میں نے سنا جو تم نے کہا اور میری رائے ہے کہ تم اس جائداد کو عزیزوں پر وقف کر دو۔ (بخاری باب الوقف)

صحیح مسلم میں ہے،

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دینار انفقتہ فی سبیل اللہ ودینار انفقتہ فی رقبۃ ودینار تصدقت بہ علی مسکین ودینار انفقتہ علی اھلک اعظمھا اجرا الذی انفقتہ علی اھلک (صحیح مسلم کتاب الزکوۃ والصدقہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو روپیہ تم نے خدا کی راہ میں صرف کیا اور کسی گرفتار کے چھڑانے میں صرف کیا اور جو مسکین پر صرف کیا اور جو اپنی بیوی بچہ پر صرف کیا ان میں خدا کے ہاں سب سے زیادہ جس کا اجر ملے گا وہ وہ ہے جو بال بچہ پر تم نے صرف کیا (صحیح مسلم کتاب الزکوۃ)

صحیح بخاری میں ہے،

خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی وابدء بمن تعول (مشکوۃ)

اچھی خیرات وہ ہے جو اہل وعیال کے خرچ سے فارغ ہو کر کیجائے، اور شروع عیال سے کرو،

بخاری ومسلم میں ہے،

عن ام سلمۃ قال قلت یا رسول اللہ لی اجر ان انفق علی بنی ابی سلمۃ انما ھم بنی فقال انفقی علیھم فلک اجر ما انفقت

ام سلمہ کہتی ہیں کہ میں نے کہا یا رسول اللہ اگر میں ابو سلمہ کے بیٹوں پر صرف کروں تو کیا مجھ کو کچھ ثواب ملیگا وہ تو میرے بیٹے ہی ہیں، آپ نے فرمایا ہاں ان کو

علیھم   صرف کرو، تم کو اس کا ثواب ملے گا،

بخاری اور مسلم میں ہے کہ عبد اللہ بن مسعودؓ کی بیوی زینب کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلعم نے فرمایا اے بی بیو، خیرات دو، گو اپنے زیور ہی سے سہی، یہ سنکر مین اپنے شوہر کے پاس گئی، اور کہا کہ تم مفلس آدمی ہو، اور رسول اللہ صلعم نے ہم لوگون کو خیرات کرنے کا حکم دیا ہے، تو تم جا کر آنحضرت صلعم سے پوچھو کہ تم کو دینا خیرات مین داخل ہے، یا نہین؟ اگر نہ ہو تو مین اور ون کو خیرات دون، عبد اللہ نے کہا نہین تم ہی جاؤ، زینب گئین، اتفاق سے دروازہ پر ایک اور بیوی ملین، اور ان کو بھی یہی پوچھنا تھا، اتنے مین بلالؓ باہر نکلے، مین نے بلالؓ سے کہا جا کر آنحضرت صلعم سے پوچھو کہ دو عورتین یہ پوچھ رہی ہین کہ اگر وہ اپنے شوہر کو اور یتیمون کو جو ان کے زیر تربیت ہین خیرات دین تو یہ خیرات مین داخل ہوگا یا نہین، زینب نے یہ بھی کہدیا کہ ہمارا نام نہ بتانا، بلالؓ نے جا کر پوچھا، آنحضرت صلعم نے عورتون کا نام پوچھا، بلالؓ نے کہا ایک زینب ہین، اور ایک انصاری عورت ہے، آنحضرت صلعم نے فرمایا کون سی زینب؟ بلالؓ نے کہا عبد اللہ کی بیوی، آپ نے فرمایا، ان کو دو ثواب ہون گے، ایک رشتہ کا اور ایک خیرات کا، (یہ صحیح مسلم کے الفاظ کا ترجمہ ہے،)

صحیح ترمذی اور ابن ماجہ اور نسائی مین ہے،

الصدقة علی المسکین صدقة وھی علی ذی الرحم ثنتان صدقة وصلة   مسکین کو صدقہ دینا صرف صدقہ ہے، اور قرابتدار کو دینا صدقہ بھی ہے، اور صلہ رحم بھی،

بخاری اور مسلم مین ہے،

اذا انفق المسلم نفقة علی اھلہ وھو   جب مسلمان اپنے بال بچون پر صرف کرتا ہے اور ثواب

یحتسبھا کانت لہ صدقۃ — سمجھ کر کرتا ہے تو یہ خیرات ہے،

ان تمام احادیث سے ثابت ہے کہ اسلام کا یہ اصول ہے کہ خیرات اور صدقہ جس طرح غیر لوگوں کو دینا ثواب ہے، اسی طرح اپنی اولاد عزیز اور اقارب کو دینا بھی ثواب ہے، اسلام کا اصول یہ ہے کہ اپنے بال بچے بھی عام سوسائٹی کے افراد ہین، اس لئے ان کی مدد کرنا بھی بنی نوع انسان کی مدد کرنا ہے، اور اس لئے ثواب ہے، انگریزی مین بھی مثل ہے کہ خیرات گھر سے شروع ہوتی ہے،

دوسرا اصول اسلام نے خیرات کے دو طریقے قرار دیئے ہین، ایک یہ کہ اصل چیز خیرات مین دیدی جائے، دوسرے یہ کہ اصل چیز محفوظ رہے، اور اس کا منافع یا آمدنی خیرات مین صرف ہوتی رہے، اس دوسری قسم کا نام **وقف** ہے،

وقف کا یہ حکم ہے کہ اصل شے نہ کسی کی ملک ہوسکتی، نہ فروخت ہوسکتی، نہ منتقل ہوسکتی۔

وقف کی یہ حقیقت خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعین فرمادی تھی، حضرت عمرؓ کو خیبر مین ایک نخلستان ہات آیا، انھون نے آنحضرت صلعم سے عرض کیا کہ مین خیرات کرنا چاہتا ہون، کس طریقہ سے کرون؟ آپ نے فرمایا اصل محفوظ رہے، یعنی نہ بک سکے، نہ ہبہ ہوسکے، نہ اس مین وراثت جاری ہو؛

یہ واقعہ بخاری مین متعدد طریقون سے بالتفصیل مذکور ہے، آنحضرت صلعم کے الفاظ یہ ہین :-

تصدق باصلہ لایباع ولا یوھب — اصل کو اس طرح خیرات مین دو کہ وہ نہ بک سکے، نہ ولا یورث ولکن ینفق ثمرہ — کیا جاسکے، نہ اسمین وراثت جاری ہو، بلکہ اس کا پھل لوگون کو ملا کرے،

اگرچہ یہ وقف، غربا اور مسافرون اور مہمانون وغیرہ کے لئے مخصوص تھا تاہم رشتہ دار اور قرابت دار بھی اس مین داخل تھے، چنانچہ بخاری کے یہ الفاظ ہین،

فی الفقراء و القربیٰ و فی الرقاب و فی سبیل اللہ و الضیف و ابن السبیل،

تیسرا اصول، فقہ اسلام کا تمام تر مدار نیت پر ہے، یعنی ایک ہی چیز کسی شخص کو دوستانہ یا ہبہ کی نیت سے دیجائے تو اس کے اور احکام ہون گے اور اگر یہ نیت کر لیجائے کہ خدا کی راہ مین دیگئی، تو اس کے احکام بالکل بدل جائین گے، مثلاً ایسی چیز کا دینا سیدون اور دولتمندون کو ناجائز ہوگا، حالانکہ ہبہ کرنا ہر شخص کے لئے جائز ہے،

وقف کا مسئلہ انھین اصول مذکورۂ بالا کی بنیاد پر ہے، چنانچہ خود آنحضرت صلعم کے زمانہ مین اس قسم کے وقفون کی بنیاد پڑی، اور اس وقت سے آج تک یہ سلسلہ برابر قایم رہا،

صحابہؓ نے اولاد پر وقف کیا تھا	فتح القدیر حاشیہ ہدایہ مین یہ سند نقل کیا ہے،

ان الزبیر بن العوام وقف داراً لہ علی المردودۃ من بناتہ ، زبیر بن عوامؓ نے اپنا ایک مکان اپنی مطلقہ لڑکیون پر وقف کیا،

فتح القدیر[1] مین حاکم کی سند سے روایت ہے کہ ابتدا ے اسلام مین آنحضرت صلعم جس مکان مین رہتے تھے، اور جو صفا کے پاس تھا، اس کو اس کے مالک ارقم نے اپنے بیٹون پر وقف کردیا تھا، وقف نامہ کے الفاظ یہ تھے،

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ھذا ما قضی الارقم ... لاتباع ولا تورث ، یہ وہ وقف ہے جو ارقم نے قائم کیا ... وہ نہ بیچا جائیگا نہ اس مین وراثت جاری ہوگی،

اسی فتح القدیر مین بیہقی کی کتاب الخلافیات سے نقل کیا ہے،

[1] فتح القدیر ہدایہ کی شرح ہے اور نہایت معتبر کتاب ہے،

تصدق ابو بکر بداره بمكة على ولده فهي الى اليوم، وتصدق سعد بن ابي وقاص بداره بالمدينة وبداره بمصر على ولده فذلك الى اليوم، وعمرو بن العاص بالوهط من الطائف وداره بمكة والمدينة على ولده فذلك الى اليوم[1]

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اپنے مکان کو جو مکہ میں تھا، اپنی اولاد پر وقف کیا چنانچہ وہ اب تک قایم ہے، سعد بن ابی وقاص نے اپنے مدینہ کے مکان کو اور مصر کے مکان کو اپنے بیٹوں پر وقف کیا جو اب تک قائم ہے، عمرو بن العاصؓ نے طائف اور مکہ اور مدینہ کے مکانات کو وقف کیا چنانچہ وہ اب تک قایم ہے،

عینی شرح ہدایہ میں ہے:-

وفي الخلافيات للبيهقي قال ابو بكر عبد الله بن الزبير الحميدي تصدق ابو بكر بداره بمكة على ولده فهي الى اليوم وتصدق عمر بربعة عند المروة بالاستة على ولده فهي الى اليوم وتصدق علي رضي الله عنه بارضه وداره بمصر وباموال بالمدينة على ولده فذلك الى اليوم وتصدق سعد بن ابي وقاص رضي الله عنه بربعة عند المروة وبداره بالمدينة وبداره بمصر

بیہقی نے خلافیات میں لکھا ہے کہ ابوبکر عبداللہ بن الزبیر حمیدی نے کہا کہ حضرت ابوبکر نے اپنے مکان کو جو مکہ میں تھا اپنے بیٹوں پر صدقہ کیا، اور وہ اب تک ہے، اور حضرت عمرؓ نے ایک جائداد کو جو مروہ میں تھی مع آلات کے اپنے بیٹوں پر وقف کیا، سو وہ اب تک ہے، اور حضرت علیؓ نے مصر کے مکان اور آراضی اور مدینہ کی جائداد کو اپنی اولاد پر وقف کیا جو اب تک موجود ہے، اور سعد بن ابی وقاص نے مروہ کے پاس ایک جائداد کو اور مدینہ اور مصر کے مکانات کو اپنی اولاد پر وقف کیا، تو وہ اب تک

[1] یہ سب عبارتیں فتح القدیر کے صفحہ ۴۱۴ جلد دوم مطبوعہ نولکشور لکھنؤ میں ہیں،

علی ولدہ فذالک الی الیوم | قائم ہے،

(عینی جلد دوم صفحہ ۲۹۹) | (عینی شرح ہدایہ جلد دوم صفحہ ۲۹۹ مطبوعہ لکھنو)

صحیح بخاری مین ہے، باب الوقف مین،

وتصدق الزبیر بدورہ وقال للمردودۃ من بناتی ان تسکن | اور زبیرؓ نے اپنے مکانات اپنی ان لڑکیون پر وقف کیے جو مطلقہ ہون،

وجعل ابن عمر نصیبہ من دار عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سکنی لذوی الحاجۃ من آل عبد اللہ، | اور عبد اللہ بن عمرؓ نے اپنا وہ حصہ جو حضرت عمرؓ کی جائداد سے ملا تھا، اپنی محتاج اولاد پر وقف کیا،

جن بزرگون نے یہ وقف کئے تھے یعنی ارقمؓ حضرت ابوبکر صدیقؓ حضرت عمرؓ سعدؓ بن ابی وقاصؓ عمرو بن العاصؓ، زبیرؓ، حضرت علیؓ، عبد اللہ بن عمرؓ، یہ سب آنحضرت صلعم کے مشہور اصحاب ہین، تعجب ہے کہ باوجود اس کے حکام پریوی کونسل[1] کہتے ہین کہ جو نظائر پیش کئے گئے ہین وہ مبہم اور زیادہ تعیین طلب ہین، اور ہم کو ان وقف کرنے والون کا حال معلوم نہین جن بزرگون کے نام اوپر گذرے، اسلام کی تاریخ مین ان سے زیادہ کوئی نام آور نہین، جو جائدادین وقف کین ان کے موقعے اور پتے بتا دیے گئے ہین، اور چوتھی صدی ہجری تک کے محدثین نے لکھا کہ آج تک یہ اوقاف قائم ہین،

فقہ مین وقف اولاد، اسی بنا پر فقہ مین وقف اولاد کا خاص باب ہے، اور اس کے متعلق ہر قسم کے تفصیلی احکام درج ہین،

فتاوی قاضی خان مین جو نہایت معتبر کتاب فقہ حنفی کی ہے، لکھا ہے،

[1] اس فیصلہ پر پریوی کونسل کا حوالہ آگے آئیگا،

رجل قال ارضی ھذہ صدقۃ	ایک شخص نے کہا میری یہ زمین میری اولاد پر
موقوفۃ علی ولدی کانت الغلۃ لولد	صدقہ اور وقف ہے، تو زمین کا محاصل صلبی
صلبہ یستوی فیہ الذکر والانثی،	اولادکو ملے گا، اس مین مرد عورت سب برابر ہونگے
××× واذا جاز ھذہ الوقف فمادام	××× اور جب یہ وقف جائز ہوا تو جب تک
یوجد واحد من ولد الصلب کانت	ایک شخص بھی صلبی اولاد سے موجود رہے گا منافع
الغلۃ لہ لاغیرہ وان لم یبق واحد	اسی کو ملے گا، اور کسی کو نہین، اور اگر پہلی پشت کا
من البطن الاول تصرف الغلۃ	کوئی شخص موجود نہ رہجائے تو فقیرون کو
الی الفقراء (فاضیخان فصل فی الوقف علی الاولاد)	ملے گا،

فتاوی عالمگیری باب الوقف مین ہے۔

وان قال علی ولدی وولد ولدی وولد	اور اگر کہا کہ جائداد میری اولاد اور اولاد اولاد
ولد ولدی ذکر البطون الثلثۃ فانہ	اور ان کی اولاد اولاد یعنی تیسری پشت کا
تصرف الغلۃ الی اولاد اولادہ ابدًا ماتناسلوا	بھی ذکر کیا، تو جائداد کا منافع ہمیشہ خاندان
لا تصرف الی الفقراء مابقی احد یکون	کو ملتا رہیگا، جب تک اولاد کی نسل چلتی رہے،
الوقف علیھم وعلی من اسفل منھم	اور فقیرون کو کچھ نہین ملے گا، جب تک خاندان
الاقرب والابعد فیھم سواء،	مین ایک شخص بھی باقی رہے گا، اس کو اور اس کے
(کتاب الوقف عالمگیری الفصل الثانی	نیچے والون کو منافع ملے گا، قریب اور بعید آپس
فی الوقف علی نفسہ واولادہ ونسلہ)	سب برابر ہون گے،

درمختار مین ہے،

ولو ذکر البطن الثالث عم نسلہ و	اور اگر تیسری پشت کو بھی اضافہ کیا تو تمام

ولیستوی الاقرب والابعد	نسل کو عام ہوگا، قریب و بعید سب شامل
(در مختار فصل فیما یتعلق بوقف الاولاد)	ہوں گے،

چونکہ یہ مسئلہ بلا اختلاف تمام فقہا نے تصریحاً لکھا ہے، اس لئے زیادہ عبارتیں ہم نے نقل نہیں کیں،

مفتی بہ قاضی ابو یوسف اور امام محمدؒ کی رائے ہے، اس موقع پر بطور ایک قاعدہ کے یہ ظاہر کردینا بھی ضرور ہے کہ وقف کے احکام جو بیان ہوئے، وہ قاضی ابو یوسف اور امام محمدؒ اور تمام دیگر فقہاء کی رائے کے موافق ہیں، امام ابو حنیفہ سرے سے وقف کے قائل نہیں یعنی ان کے نزدیک وقف میں واقف کی ملکیت ساقط نہیں ہوتی، اور واقف جب چاہے وقف سے رجوع کر سکتا ہے، لیکن تمام فقہا نے تصریح کی ہے، کہ امام ابو حنیفہ کے قول پر فتویٰ نہیں ہے، بلکہ قاضی ابو یوسف صاحب اور امام محمد صاحب کے قول پر فتویٰ ہے،

فتاوے عالمگیری میں ہے:-

وفی العیون والیتیمۃ ان الفتوی علی قولھما،	اور عیون اور یتیمہ (کتابوں کا نام ہے) میں ہے کہ فتوی دونوں صاحبوں (قاضی ابو یوسف و امام محمدؒ) کے قول پر ہے

فتاوی قاضی خان میں ہے،

والناس لم یاخذوا بقول ابی حنیفۃ فی ھذا للآثار المشہورۃ عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والصحابۃ،	اور لوگوں نے اس بارہ میں ابو حنیفہؒ کے قول کو اختیار نہیں کیا بوجہ ان مشہور روایتوں کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ سے مروی ہیں،

در مختار میں ہے،

فلا يجوز له ابطاله ولا يورث عنه وعليه الفتوى،

تو وقف کرنیوالے کو وقف کا باطل کرنا جائز نہیں اور نہ شے موقوفہ میں وراثت جاری ہو سکتی ہے اور اسی پر فتویٰ ہے

فتح القدیر[1] حاشیہ ہدایہ میں ہے،

والحق ترجيح قول عامة العلماء بلزومه لان الاحاديث والآثار متظافرة على ذلك قولا كما صح من قوله عليه الصلوة والسلام لا يباع ولا يورث الخ وتكرر هذا في احاديث كثيرة واستمر عمل الامة من الصحابة والتابعين ومن بعدهم على ذلك اولها صدقة رسول الله

اور حق یہ ہے کہ عام علما جو وقف کے لازم ہونیکے قائل ہیں، انھی کے قول کو ترجیح ہے کیونکہ حدیثیں اور روایتیں ایسی چلے میں جیسا کہ آنحضرت صلعم کا یہ قول صحیح طور سے ثابت ہے کہ جائداد موقوفہ نہ فروخت ہوسکیگی نہ اسمیں وراثت جاری ہوگی، اور متعدد حدیثوں میں ایسا آیا ہے، اور تمام امت محمدیہ کا صحابہ سے لے کر تابعین اور مابعد کے لوگوں کا اس پر عمل رہا، پہلا وقف خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا،

ثم صدقة ابي بكر ثم عمر وعثمان وعلي والزبير ومعاذ بن جبل وزيد بن ثابت وعائشة واسماء اختها وام سلمة وام حبيبة وصفية بنت حيي وسعد بن ابي وقاص وخالد بن الوليد وجابر بن عبد الله وعقبة بن عامر ابي اروى الدوسي وعبد الله بن الزبير

پھر ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ، زبیرؓ، معاذ بن جبلؓ، زید بن ثابتؓ، عائشہؓ اور انکی بہن اسماءؓ، اور ام سلمہؓ اور ام حبیبہؓ اور صفیہؓ بنت حیی، اور سعد بن ابی وقاصؓ، اور خالدؓ بن الولید، اور جابر بن عبد اللہؓ، اور عقبہؓ بن عامر، اور ابی اروی الدوسی، اور عبد اللہؓ بن الزبیرؓ ان سب نے وقف کیا، یہ سب

[1] فتح القدیر مطبوعہ لکھنؤ جلد ۲ صفحہ ۳۰۸،

رضی اللہ عنہم کل ھولاء من الصحابۃ ثم التابعین	لوگ صحابہ بین ہین اور انکے بالعد کے لوگون کا یہ عمل رہا
بعدہم کلھا بروایات وتوارث الناس جمیعون ذلک	اور تمام لوگ اس کو کرتے آئے ہین،

بحر الرائق شرح کنز الدقائق مصنفہ علامہ ابن نجیم مین ہے،

وقد اکثر الخصاف من الاستدلال لھما	اور خصاف نے قاضی ابو یوسف اور امام محمد کے
بوقوف النبی صلی اللہ علیہ وسلم والصحابۃ	مذہب کے موافق بہت سے وقفون سے استدلال کیا ہو
رضی اللہ عنھم وقد کان ابو یوسف	آنحضرت صلعم نے اور صحابہ نے وقف کئے پہلے قاضی
مع الامام حتی حج مع الرشید فـ	ابو یوسف بھی امام ابو حنیفہ کے ہم خیال تھے لیکن جب
رای وقوف الصحابۃ رضی اللہ عنہم	انھون نے ہارون الرشید کیساتھ حج کیا، اور مدینہ میں جاکر
بالمدینۃ ونواحیھا فرجع وافتی	وہان اور اسکے اطراف مین صحابہ کے اوقاف دیکھے
بلزومہ ولقد استبعد محمد قول	تو انکی رائے بدل گئی اور فتوی دیا کہ وقف لازم ہے اور
ابی حنیفۃ فی الکتاب لھذا وسماہ	امام محمد نے اپنی کتاب مین امام ابو حنیفہ کے قول پر بہت
تحکما علی الناس[1]،	تعجب کیا ہو اور کہا ہو کہ یہ زبردستی ہو،

پریوی کونسل کے شبہات کا جواب

اصول ہاے مذکورۂ بالا کے بیان کرنے کے بعد ہم پریوی کونسل کے ان شبہات کی طرف متوجہ ہوتے ہین جنکی بنا پر انھون نے وقف اولاد کو ناجائز سمجھا ہو،

جناب مولوی امیر علی صاحب جسٹس نے اپنے فیصلہ مندرجہ انڈین لارپورٹ سلسلہ کلکتہ جلد ۲۰ صفحہ ۱۰۴ مین متعدد روایتین وقف اولاد کے جائز ہونے کے متعلق نقل کی تھین لیکن حکام پریوی کونسل نے ان کے متعلق یہ لکھا ہے:-

[1] بحر الرائق مطبوعہ مصر طبع اول مطبع علمیہ صفحہ ۲۰۴،

"راسے اس مقنن ذی علم شرع محمدی کی جیسا کہ حکام عالیمقام سمجھتے ہین ایسے اقوال پر مبنی
ہے جو اصول ذہنی تھے" اور ایسے نظائر پر جو بہت غیر مکمل طور پر بیان کئے گئے ہین مثلاً
حاکم موصوف نے حوالہ ایک نصیحت کا جو پیغمبر یعنی محمدؐ کا دیا ہے جس کا یہ مضمون ہے کہ نیکی کی راہ سے
دینا اپنے خاندان کو اس غرض سے کہ وہ محتاج نہ ہون زیادہ تر کار ثواب بہ نسبت فقرا،
کے ہے" نہایت اعلی صدقہ وہ ہے کہ جو کوئی شخص اپنے خاندان کو دے" اور بطور نظیر کے
حاکم موصوف نے ذکر ہبہ ایک مکان کا کیا ہے کہ جو وقف یا صدقہ مین دیدیا گیا تھا
اور جس کی آمدنی اولادسی ارکان واہب کو عطا کی گئی تھی"، حاکم موصوف کی دیگر قدیم
اسناد اسی قسم کی ہین،

نسبت نظائر کے حکام عالیمقام کو بہت زیادہ مفصل حالات معلوم ہونے چاہئین قبل
اس کے کہ وہ یہ تجویز کرسکین کہ آیا وہ متعلق بھی ہونگے یا نہین احکام ممدوح سنتے ہین کہ ہبہ
کیا گیا اور وہ بحال رکھا گیا لیکن بابت حالات جائداد کے سوا اس کے اور کچھ انھون نے
نہین سنا کہ مقدمہ محولہ مین یہ معلوم ہوتا ہے کہ مکان مذکور خاص طور پر مقدس سمجھا
جاتا تھا، ان کو کچھ حال خاندان یا واقف کا نہین معلوم"

نسبت ان حدیثون کے جو بطور اصلی اصول شرع محمدی کے بیان کی گئی ہین"
واضح ہو کہ حکام عالیمقام نے یہ امر فراموش نہین کیا کہ کس حد تک شرع اور مذہب
فرقہ ہاے اہلِ اسلام مین باہم مخلوط ہین، لیکن حکام ممدوح نے اثناے بحث مین دریافت
کیا کہ کیا وجہ ہے کہ از روے عام قانون اسلام کے اقل درجہ جیسا کہ ہند مین معلوم
ہوتا ہے، سادہ ہبہ جات بجانب معمولی اشخاص کے بحق بعید اولاد کے جو ہنوز پیدا
نہین ہوئی یعنی متواتر ناقابل انتقال حقوق حین حیاتی ممنوع ہین، اور آیا یہ تصور

کرنا چاہئے کہ وہی انتقالات جو اس صورت مین ناجائز ہین جب کہ معمولی الفاظ ہبہ کے استعمال کئے جائین، جائز ہوجاتے ہین، اگر صرف ہبہ کنندہ یہ کہدے کہ وہ بطور وقف کے خدا کے نام پر یا واسطے غربا کئے گئے، ان سوالات کا کوئی جواب نہین دیا گیا، نہ جواب دینے کی کوشش کی گئی نہ حکام عالیمقام کو کوئی جواب معلوم ہوتا ہے"

یہ صحیح ہے کہ واہب کا حق قطعی جائداد مذکور مین کم ہوجاتا ہے، اور حق حین حیاتی رہجاتا ہے، یعنی وقف نامہ کی وجہ سے وہ متولی یا مہتمم تصور کیا جاتا ہے، لیکن وہ اس حیثیت مین تاحیات رہتا ہے، اس کو اختیار ہے کہ آمدنی کو مطابق اپنی مرضی کے صرف کرے اور کوئی اس سے حساب نہ طلب کریگا، اس قدر تبدیلی حالت ملکیت مین بالکل مطابق اس تدبیر کے ہے، کہ خاندان مین مداومت قائم کیجائے اور بلا شک واسطے فوراً تکمیل ایسے ارادہ کے ضروری ہے،

حکام عالیمقام نے تاحد اپنی بہترین لیاقت کے تحقیق اور معلوم کرنے اس شرع محمدی کی کوشش کی، جو ہند مین معلوم ہے، اور جس پر وہان عمل کیا جاتا ہے، لیکن حکام ممدوح کو یہ نہین معلوم ہوتا کہ قطعی اور جیسا کہ حکام ممدوح کو معلوم ہوتا ہے بیجا تعلق کرنا حدیثیے اصولی کا جو نبی کے منہ سے سنی گئین، مطابق اس قانون کے ہے، ممکن ہے کہ یہ حدیثین منشا موقع پر نہایت عمدہ ہون، جہان تک کہ حکام عالیمقام کو معلوم ہے، ممکن ہے کہ ان حدیثون کا یہ اثر ہو کہ ان سے قاعدہ اور دستور وقف کی ترمیم ہوئی جیسا کہ جج ذیعلم نے تحریر کیا ہے کہ انکی یہ تاثیر تھی،

لیکن یہ خیال کرنا مقنن اعظم (محمد رسول اللہ صلعم) کی نسبت بیجا ہوگا، کہ مقنن موصوف نے اس کے ذریعہ سے ایسے ہبہ جات کو پسند کیا ہے، جن کے ذریعہ سے واہب نے کچھ نفس کشی

زندگی بھر حسین نے ایک ہاتھ سے اس شے کو واپس لیتا ہے، جو ظاہرا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے دوسرے ہاتھ سے دی، اور جو ذریعہ جمع کرنے آمدنی اور ازدیاد جائداد و خاندان ہے اور جنکی رو سے وہ اشخاص جو مہتمان ہوں موسوم کئے گئے ہیں مطالبہ ساہیکے بہ احتیاط محفوظ رکھے گئے ہیں۔[1]

عبارت مذکورۂ بالا سے معلوم ہو سکتا ہے کہ تین اسباب سے پریوی کونسل نے وقف علی الاولاد کے مسئلہ کو ناجائز قرار دیا ہے، حسب ذیل ہیں :-

(۱) اپنی اولاد کو دینا، ثواب اور خیرات کا کام کیونکر ہو سکتا ہے، اس کے متعلق ہم پہلے اصول میں بہ تفصیل لکھ آئے ہیں کہ اسلام نے اولاد اور خاندان کی پرورش کو ثواب کا کام قرار دیا ہے، اور عقل بھی اس کی مقتضی ہے کہ یہ ثواب کا کام قرار دیا جائے،

(۲) وقف اولاد کے متعلق شارع اسلام سے جو روایتیں منقول ہیں، اور جنکا تذکرہ مولوی امیر علی صاحب جسٹس نے اپنے فیصلہ میں کیا ہے، وہ مبہم اور زیادہ توضیح اور ثبوت طلب ہیں، لیکن ہم نے **صحابہ** کے وقف اولاد کے متعلق تفصیلی روایتیں مع حوالوں کے نقل کر دی ہیں،

(۳) شریعت اسلام نے ہبہ مشروط، اور ہبہ میں حیاتی، اور ہبہ ناقابل انتقال کو ناجائز قرار دیا ہے یعنی اگر کوئی شخص کوئی جائداد اس طرح ہبہ کرنا چاہے کہ موہوب لہ صرف اپنی زندگی تک اس سے متمتع ہو سکے اس کے بعد اس کی اولاد اور اولاد اولاد کو اسی طرح حین حیاتی حق حاصل ہوتا رہے، تو یہ ہبہ فقہ اسلام کی رو سے ناجائز ہوگا،

[1] دیکھو مقدمہ ابوالفتح محمد اسحاق وغیرہ مدعیان بنام رساں مایا دھر چودھری وغیرہ مدعا علیہم مندرجہ جلد ۲۲ ترجمہ انڈین لا رپورٹ مطبوعہ جولائی ۱۸۹۵ء سلسلہ کلکتہ مطبع نظائر قانون ہند مندرجہ صفحہ ۶۳ انگریزی از صفحہ ۶۰ تا ۶۳

جب یہ مسلم ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ یہی طریقۂ انتقال صرف اس وجہ سے جائز ہو جائے کہ ہبہ کے بجائے اس کو وقف کہدیا جائے کیا لفظ کے بدلنے سے حقیقت بدل جاتی ہے لیکن یہ شبہہ بھی صحیح نہیں ہے، ہبہ اور وقف بالکل مختلف چیزیں ہیں، اور ان کے احکام بالکل مختلف ہیں، ہم اوپر بیان کر آئے ہیں کہ شریعت اسلام میں احکام کا مدار نیت پر ہے، اگر ایک شخص کوئی چیز کسی کو ہبۃً دینا چاہے، تو بلا کسی قید کے دیسکتا ہے، لیکن اگر اسی کا نام وہ زکوٰۃ رکھدے جو خیرات کی ایک قسم ہے، تو بہت سی شرطیں لازم ہو جائینگی، مثلاً یہ کہ جس کو وہ چیز دیجائے وہ دولتمند نہ ہو، پیغمبر کے خاندان سے نہ ہو، کھانے کمانے کے قابل نہ ہو،

فقہ اسلام میں ہبہ اس کا نام ہے کہ کوئی چیز کسی شخص کو قطعاً دیدیجائے کہ وہ جو چاہے کرے، اس صورت میں چونکہ یہ احتمال ہے کہ موہوب لہ اس کو جائز یا ناجائز طور پر بالکل صرف کر ڈالے اور اس سے کوئی مستقل اور مستمرہ مدد کسی کو حاصل نہ ہو، اس لئے یہ کوئی ثواب کا کام نہیں قرار دیا گیا، بخلاف اس کے وقف کے یہ معنی ہیں کہ مستقل اور مستمر طور پر ایک گروہ کی پرورش اور بقاے زندگی کا سامان کیا جائے، اس طرح کہ یہ ذریعۂ معاش کوئی شخص منقطع نہ کرنے پائے، اس لئے ایسی تدبیر جس سے ایک گروہ انسانی کی پرورش کا ایک مستقل اور پائدار سلسلہ قایم ہو، اور باقی رہے، یقیناً بنی نوع انسان کی بھلائی کا کام ہے، اور داخل ثواب ہے،

وقف میں موقوف لہ بہت سے شرائط کا پابند ہے، وہ جائداد کو منتقل نہیں کر سکتا، جائداد کے منافع کو بیجا نہیں صرف کر سکتا، جو مصارف وقف میں متعین ہو چکے ہیں، ان میں ادل بدل اور تغیر نہیں کر سکتا، اگر موقوف لہ وقف کا بیجا استعمال کرے

تو ہر مسلمان کو حق حاصل ہے کہ عدالت مین اس پر دعوی کرے اور قاضی اس کو تمام ایسے تصرفات سے باز رکھے گا،

اس صورت مین یہ ظاہر ہے کہ ہبہ اور **وقف** بالکل مختلف چیزین ہین، اور انکے احکام مین فرق کا ہونا لازمی ہے،

جب تمام مذکورۂ بالا حدیثون اور فقہی روایتون [illegible] ہوگیا کہ اسلام مین اولاد پر **وقف** کرنا جائز اور واجب النفاذ ہے، تو پریوی [illegible]سل کو اسلام ہی کے مطابق وقف کے مسئلہ پر عمل کرنا چاہئے، کیونکہ گورنمنٹ انگریزی کا یہ اصول ہے کہ وہ کسی قوم کے مذہبی احکام مین کوئی مداخلت نہین کرتی"

پردہ اور اسلام

یورپ کی عامیانہ تقلید نے ملک مین جو نئے مباحث پیدا کر دیئے ہین، ان مین ایک یہ مسئلہ بھی ہے، اگر اس مسئلہ پر صرف عقلی پہلو سے بحث کیجاتی تو ہم کو دخل معقولات کی کوئی ضرورت نہ تھی، لیکن ساتھ ہی یہ دعوی کیا جاتا ہے کہ خود مذہب اسلام مین پردہ کا حکم نہین، اور اس سے بڑھکر یہ کہ قرون اولی مین پردہ کا رواج بھی نہ تھا، نئے تعلیمیافتہ گروہ کے سب سے مشہور اور مستند مصنف (مولوی امیر علی) نے ۱۸۹۹ء مین رسالہ "نائنٹینتھ سنچری" مین مسلمان عورتون کے عنوان سے ایک مضمون لکھا تھا جسمین وہ تحریر فرماتے ہین :-

"یہ لمبا برقع، نقاب، اور خمار سلجوقیون کے آخری زمانہ مین شایع ہوا، اور جس قسم کا پردہ آج کل مسلمانان ہند مین رائج ہے خلفا کے زمانہ مین اس کا کہین نام و نشان نہ تھا بلکہ برعکس اس کے اعلی طبقہ کی عورتین بلا برقع کے مردون کے سامنے آتی تھین، ساتوین صدی ہجری کے وسط مین جب خلفا ضعیف ہوئے، اور تاتاریون نے اسلامی حکومت کو درہم و برہم کیا تو اس وقت علمار مین اس پر نزاع ہوئی کہ عورتین اپنے ہاتھ منہ اور پاؤن اجنبیون کے سامنے کھول سکتی ہین یا نہین،

اس موقع پر عبرت کے قابل یہ امر ہے کہ اسلام کی تاریخ اور اسلام کے مسائل کی تعبیر کرنے والے دو گروہ ہو سکتے تھے، علمائے قدیم اور جدید تعلیم یافتہ، علمار کا یہ حال

ہے، کہ ان کو زمانہ کی موجودہ زبان مین بولنا نہین آتا، جدید تعلیمیافتہ لوگون کے مبلغ علم کا اس عبارت سے اندازہ ہوسکتاہے، جو ابھی اوپر گذرچکی، لیکن بدقسمتی سے یہی دوسرا گروہ قومی لٹریچر پر قبضہ کرتا جاتا ہے، اور چونکہ غیر قومون کے کانون مین صرف اسی گروہ کی آواز پہونچتی ہے، اس لئے مسائل اور تاریخ اسلام کے متعلق آیندہ زمانہ مین اسی گروہ کی آواز اسلام کی آواز سمجھی جائیگی، ہم اس مضمون مین صرف تاریخی پہلو سے بحث کرتے ہین، اور یہ دکھانا چاہتے ہین کہ عرب مین اسلام سے پہلے پردہ کی کیا حالت تھی، پھر تمام اسلامی دنیا مین پردہ کے متعلق کیا طریق عمل رہا،

مدت ہوئی ہم نے اس مضمون کے پہلے حصے پر ایک بسیط مضمون لکھا تھا، پہلے اس کو بعینہٖ اس مقام پر درج کرتے ہین،

اس سے انکار نہین ہوسکتا کہ قدرت نے مرد اور عورت کو بعض خصوصیتون مین ایک دوسرے سے ممتاز پیدا کیا ہے، لیکن تمدن نے ان قدرتی خصوصیتون کے علاوہ اور بھی بہت سے امتیاز قائم کر دیئے ہین، جو ہر قوم، ہر فرقہ، ہر ملک مین جدا جدا صورتون مین نظر آتے ہین، دنیا کے نہایت ابتدائی زمانہ مین غالباً مردون اور عورتون کے لباس، وضع، طور، طریقے بالکل یکسان رہے ہونگے، اور بجز قدرتی خصوصیتون کے کوئی چیز ان کو ایک دوسرے سے جدا نہ کرسکتی ہوگی، لیکن تمدن کو جس قدر وسعت ہوتی گئی، اسی قدر یہ باہمی امتیازات بڑھتے گئے، رفتہ رفتہ یہان تک نوبت پہونچی کہ آج دونون کے طریق تمدن اور معاشرت مین بہت کم چیزین باقی رہ گئین جو مشترک کہی جاسکتی ہین،

دنیا کی ابتدائی تاریخ بالکل تاریکی کی حالت مین ہے، قدیم سے قدیم زمانہ جس کے

تاریخی حالات معلوم ہوسکے ہین، دو تین ہزار برس سے زیادہ نہین، یہ وہ زمانہ ہے، جب موجودہ تفرقون کی بنیاد پڑ چکی تھی، اور دونون فریق کے اصول زندگی مین بہت سی ممتاز خصوصیتین پیدا ہو چکی تھین، اس لئے آج یہ پتہ لگانا قریبًا ناممکن ہے کہ اول کن اسباب سے یہ تفرقے قایم ہوئے، اور جس زمانہ کو ہم اپنے علم تاریخ کی ابتدا قرار دیتے ہین اس وقت تک کیونکر ان تفرقون نے وسعت حاصل کر لی تھی،

اگر ہم بتانا چاہین کہ انسان کو ستر عورت کا خیال کیونکر ہوا، اور مردون، اور عورتون مین اس کے مختلف حدود کس بنا پر قرار دیئے گئے، تو ہم کوئی کافی وجہ نہین بتا سکینگے، اسی طرح اور خصوصیتون کی نسبت بھی ہم کچھ جواب نہین دیسکتے، اس لئے نہایت قدیم تفرقون کی تاریخ قایم کرنی، اور ان کے وجوہ و اسباب پر غور کرنا تو بے فائدہ ہے، البتہ جو امور زمانہ مابعد مین پیدا ہوئے، ان کے متعلق تحقیقات کی کوشش کرنی بیجا نہین ہے،

پردہ کی دو قسمین قرار دیجا سکتی ہین،

(۱) چہرہ اور تمام اعضا کا ڈھکنا،

(۲) مردون کی مجلسون اور صحبتون مین شریک ہونا،

پہلی قسم کا پردہ عرب مین اسلام سے پہلے موجود تھا، اور زیادہ تر تمدنی ضرورتین اس کے ایجاد کا باعث تھین، اول اول جب اس رسم کی ابتدا ہوئی تو عورتون کیساتھ مخصوص نہ تھی، کیونکہ زیادہ تر اس کو تمدنی ضرورتون نے پیدا کیا تھا، اور وہ مرد اور عورت سے یکسان متعلق تھین، غالبًا سب سے پہلے قبیلۂ حمیر مین جو یمن کے رہنے والے اور وہان کے حاکم تھے یہ طریقہ جاری ہوا، اسپین مین حمیر کے ایک خاندان کی حکومت قائم ہوگئی

تھی، جو ملثمین کہلاتے تھے، اس خاندان نے نہایت زور اور قوت کے ساتھ حکومت کی اور بہت سی فتوحات حاصل کین لیکن چہرہ پر ہمیشہ نقاب ڈالے رہتے تھے، اور اسوجہ سے ملثمین کہلاتے تھے، انہین یوسف بن تاشفین بڑی ہیبت وجبروت کا بادشاہ ہوا،

علامہ ابن خلکان نے اسی کے ترجمہ مین اس رسم کے قائم ہونے کی وجہ لکھی ہے :-

وسبب ذلك على ما قيل ان حمير	یعنی اس کا سبب جیسا کہ کہا گیا ہے یہ ہے کہ قبیلہ
كانت تتلثم لشدة الحر والبرد	حمیر گرمی اور سردی کی وجہ سے چہرون پر نقاب ڈالے
تفعله الخواص منهم فكثر ذلك	رہتے تھے، پہلے خواص ایسا کرتے تھے پھر اس کو اس قدر
حتى تفعله عامتهم،	ترقی ہوئی کہ تمام قبیلہ مین اس کا رواج ہوگیا،

علامہ موصوف نے ایک اور سبب بھی لکھا ہے، وہ یہ کہ قبیلہ حمیر کی مخالف ایک قوم تھی، جس کا معمول تھا کہ جب حمیر والے کسی ضرورت سے باہر جاتے تھے، تو یہ لوگ انکے گھرون پر حملہ کرتے تھے، اور عورتون کو گرفتار کر لیجاتے تھے، مجبور ہو کر اہل حمیر نے یہ تدبیر سوچی کہ ایک دفعہ عورتین مردانہ لباس پہنکر باہر چلی گئین، اور مرد چہرون پر نقاب ڈال کر گھرون مین رہے، دشمنون نے معمول کے موافق حملہ کیا، یہ لوگ نقاب ڈالے ہوئے نکلے، اور نہایت دلیری سے لڑ کر دشمنون کو قتل کر ڈالا، چونکہ یہ فتح نقاب کے پردہ مین نصیب ہوئی تھی، اس لئے یادگار کے طور پر یہ رسم قائم کر لیگئی، یہان تک کہ اسلام کے بعد بھی اس قبیلہ کے مرد اور عورت یکسان نقاب پوش رہتے تھے، ایک شاعر نے لکھا ہے :-

لما حووا احراز كل فضيلة　　　غلب الحياء عليهم فتلثموا

بعض اور اتفاقی امور سے یہ طریقہ اختیار کیا گیا، مثلاً جو لوگ حسین اور خوشرو

ہوتے تھے، اس خیال سے کہ نظر بد سے محفوظ رہیں، چہرہ پر نقاب ڈال کر باہر نکلا کرتے تھے، اس کی مثالیں زمانۂ اسلام میں بھی ملتی ہیں،

مقنع کندی جو دولت بنو امیہ کا مشہور شاعر ہے، اسی خیال سے ہمیشہ نقاب ڈال کر باہر نکلتا تھا[1]، رفتہ رفتہ یہ طریقہ زیادہ تر مروج ہوگیا، اور بڑے مجمعون مین اکثر لوگ برقع پہنکر شریک ہوتے تھے، چنانچہ بازار عکاظ میں جو عرب کی حوصلہ افزائیون کا مشہور دنگل تھا، اہل عرب عموماً چہرون پر نقاب ڈال کر آتے تھے، علامہ احمد ابن ابی یعقوب جو نہایت قدیم زمانہ کا مورخ ہے، اپنی تاریخ میں لکھتا ہے، کہ:-

وکانت العرب تحضر سوق عکاظ	یعنی اہل عرب عکاظ کے بازار مین آتے تھے اور
وعلی وجوھہا البراقع فیقال	انکے چہرون پر برقع پڑے ہوتے تھے، کہتے ہین کہ اول
ان اول عربی کشف قناعہ ظریف	جس عربی نے برقع اتارا وہ ظریف بن غنم تھا، اس کے
بن غنم العنبری ففعلت العرب مثل فعلہ[2]	بعد اورون نے بھی اس کی تقلید کی،

گو بعض وقتون مین خاص اسباب اس طریقہ کے اختیار کرنے کے باعث ہوئے لیکن اصل مین جس چیز نے اس طریقہ کی بنیاد قایم کی تھی، وہ دو امر تھے:

(۱) جسمانی حفاظت جس کا ذکر حمیر کے ذکر مین ہوچکا، حمیر مین تو عام و خاص سب اس طریقہ کو برتنے لگے تھے لیکن اور قبائل مین یہ طریقہ امرا اور اعیان کے ساتھ مخصوص تھا، کیونکہ اس قسم کے تکلف اور آرام طلبی کی خواہش صرف امیرون ہی کو ہوسکتی تھی، رفتہ رفتہ ضرورت کی قید اٹھ گئی، اور صرف اس خیال سے کہ نقاب اور برقع امرا کا امتیازی لباس ہے، بے وجہ اور بے ضرورت بھی اس کا استعمال ہونے لگا،

---

[1] کتاب الاغانی ترجمہ مقنع کندی، [2] تاریخ یعقوبی مطبوعہ یورپ جلد دوم صفحہ ۳۱۵،

(۲) امتیاز اور خصوصیت کا خیال، یہ خیال عجیب تدریج کے ساتھ قائم ہوا اہل عرب محض ابتدائی زمانہ مین تو امیر و غریب سب ایک سی حالت مین رہتے تھے، لیکن جس قدر تمدن کو ترقی ہوتی گئی، اسی نسبت سے امتیازات قایم ہوتے گئے، ان مین سب سے مقدم یہ تھا کہ امرا اور سردار ان قوم کے دربار عام نہ ہونے چاہئین، چنانچہ جاہلیت ہی کے زمانہ مین دربان اور حاجب کے عہدے قائم ہو چکے تھے، اور سلاطین، اور سرداران قبائل کے دروازون پر اس قسم کی روک ٹوک ہوتی تھی، رفتہ رفتہ یہ خیال یہان تک بڑھا کہ بادشاہ دربار مین بھی بیٹھے تو اس کے جمال کی دولت عام نہ ہونے پائے، چنانچہ بعض سلاطین عرب صرف اسی خیال سے برقع کا استعمال کرتے تھے،

عباسیون کی خلافت مین ایک زمانہ تک جو یہ طریقہ تھا کہ خلیفۂ وقت ایک پردہ کی اوٹ مین بیٹھتا تھا، اور تمام شاہی احکام پردہ کی اوٹ سے صادر ہوتے تھے، اس مین اسی خیال کا پرتو پایا جاتا ہے،

جس زمانہ مین اس طریقہ کی ابتدا ہوئی، اس وقت تو عورتین اس رسم کیساتھ مخصوص نہ تھین، لیکن مردون سے یہ التزام بالالتزام نبھ نہ سکا، چنانچہ جب عکاظ مین ظریف بن غنم نے چہرہ سے نقاب ہٹائی تو تمام عرب اس کے مقلد بنکر اس قید سے آزاد ہو گئے، کبھی کبھی کسی نے شوقیہ یا فخر کے لحاظ سے استعمال کیا تو وہ رواج عام کے خلاف سمجھا گیا، البتہ عورتون مین یہ رسم اسلام کے زمانہ تک باقی رہی، جس کو اسلام نے اور بھی باقاعدہ اور لازمی کر دیا، جس شخص نے عرب جاہلیت کے حالات غور سے پڑھے ہین، وہ تو اس سے انکار نہین کر سکتا، لیکن چونکہ عام خیال یہ ہے کہ پردہ کا رواج اسلام کے زمانہ سے پیدا ہوا، اس لئے ہم متعدد قطعی شہادتین پیش کرتے ہین، جن سے

ثابت ہوگا، کہ اس قسم کا پردہ اسلام سے پہلے بھی موجود تھا،

عرب جاہلیت کے حالات معلوم کرنے کے لئے سب سے عمدہ اور مستند ذریعہ شعرائے جاہلیت کے اشعار ہین، اس لئے اس دعوے کے ثبوت مین ہم جاہلیت کے متعدد اشعار نقل کرتے ہین،

ربیع بن زیاد عبسی جو جاہلیت کا ایک مشہور شاعر ہے، مالک بن زہیر کے مرثیہ مین کہتا ہے،

من کان مسروراً بمقتل مالک ۔۔۔ فلیأت نسوتنا بوجه نهار

جو شخص مالک کے قتل سے خوش ہوا ہو ۔۔۔ وہ ہماری عورتون کو دن مین آکے دیکھے

یجد النساء حواسراً یندبنه ۔۔۔ یلطمن اوجههن بالاسحار

وہ دیکھے گا کہ عورتین برہنہ سر نوحہ کر رہی ہین ۔۔۔ اور اپنے چہرون پر صبح کو دوہتڑ مار رہی ہین

قد کن یخبأن الوجوه تستراً ۔۔۔ فالیوم حین برزن للنظار

وہ شرم اور ناموس سے ہمیشہ اپنا چہرہ چھپایا کرتی تھین، لیکن آج غیر معمولی طور سے دیکھنے والون کے سامنے بے پردہ ہوئی ہین،

علامہ تبریزی نے تستراً کی شرح مین لکھا ہے، عفةً وحیاءً، یعنی وہ عفت اور شرم کی وجہ سے چہرہ چھپایا کرتی تھین،

عمرو معدیکرب ایک سخت واقعہ جنگ کے ذکر مین لکھتا ہے،

و بدت لمیس کانها ۔۔۔ بدر السماء اذا تبدا

اور لمیس کا چہرہ کھل گیا، ۔۔۔ گویا چاند نکل آیا ہے،

عمرو معدیکرب اگرچہ مخضرمی شاعر ہے، یعنی اس نے اسلام کا زمانہ بھی پایا تھا، لیکن یہ اشعار اسلام کے قبل کے ہین،

ایک اور جاہلی شاعر جس کا نام سبرۃ بن عمر فقعسی ہے، اپنے دشمنوں پر طعن کرتا ہے اور کہتا ہے،

ونسوتکم فی الروع بادٍ وجوھھا　　یخلن اماءً والاماء حرائر

یعنی لڑائی میں تمہاری عورتوں کے چہرے کھل گئے تھے　　اور اس وجہ سے وہ لونڈیاں معلوم ہوتی تھیں حالانکہ وہ بیویاں تھیں

نابغہ ذبیانی جو زمانہ جاہلیت کا مشہور شاعر ہے، نعمان بن منذر کا بڑا مقرب اور درباری تھا، ایک دفعہ نعمان کی ملاقات کو گیا، اتفاق سے وہاں نعمان کی بیوی جسکا نام متجردہ تھا بیٹھی تھی، نابغہ دفعۃً جا پڑا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی، اضطراب میں دوپٹہ گر گیا، متجردہ نے فوراً ہاتھوں سے چہرہ کو چھپا لیا، نابغہ کو یہ ادا نہایت پسند آئی اس پر اس نے ایک قصیدہ لکھا جسمیں اس واقعہ کو اس طرح ذکر کیا ہے،

سقط النصیف ولم ترد اسقاطہ　　فتناولتہ واتقتنا بالید

ڈوپٹہ گر گیا، اور اس نے قصداً نہیں گرایا　　اس نے دوپٹہ کو سنبھالا اور ہاتھ سے پردہ کیا

ایک اور شاعر عوف نامی یہ ذکر کرکے کہ بھوک کی شدت سے عورتیں نکل آئیں، اور باہر جہاں کھانا پک رہا تھا چولھے کے پاس بیٹھ گئیں، لکھتا ہے،

وکانوا قعوداً حولھا یرقبونھا　　وکانت فتاۃ الحی ممن ینیرھا

صبرنا لہا لا یجعل الستر دونہا　　اذا اخمد النیران لاح بشیرھا

حقیقت یہ ہے کہ اہلِ عرب نے زمانہ جاہلیت میں لباس کے متعلق بہت ترقی کر لی تھی، اگرچہ یہ ترقیاں صرف امرا اور سرداران قبائل تک محدود تھیں لیکن جن لوگوں میں تھیں پوری تہذیب و شائستگی کے ساتھ تھیں، عورتوں کے لئے

۱؎ یہ اور ما قبل کے اشعار حماسہ میں موجود ہیں ۲؎ اغانی ترجمہ نابغہ ذبیانی ،

لباس کے جو اقسام اس وقت تک ایجاد ہو چکے تھے وہ جسم کے ہر حصہ کے لئے بخوبی پردہ پوش تھے، لباسون کا یہ تنوع زیادہ تر فخر و امتیاز کی بنا پر تھا، اور یہی وجہ تھی کہ عوام کا طبقہ اس سے محروم تھا جہانتک ہماری تحقیق ہے، عورتون کے لباس کے متعلق دولت بنو امیہ اور عباسیہ کے عہد مین کوئی معتدبہ اضافہ نہین ہوا، یعنی زمانۂ جاہلیت مین جس قدر لباس ایجاد ہو چکے تھے، اس سے زیادہ اقسام پیدا نہین ہوسکے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پردہ اور ستر بدن کا خیال جاہلیۃ ہی مین خوب زور پکڑ چکا تھا، عورتین مختلف وضع کے کپڑے استعمال کرتی تھین، جنکی قسمین سات آٹھ سے کم نہ تھین اور اسی اعتبار سے ان کے مختلف نام تھے، مثلاً درع، اتب، قرقل، صدار، مجول، شوذر، خیعل، ان مین باہم بہت خفیف فرق ہوتا تھا، ان کی وضع محرم، کمری، فتوحی اور قمیص سے ملتی جلتی تھی، اشعار جاہلیت مین قریباً یہ سب نام ملتے ہین، لیکن بلحاظ تطویل ہم ان اشعار کو قلم انداز کرتے ہین، قصابہ، مقنع وغیرہ بھی استعمال کئے جاتے تھے

ان کپڑون کی ترتیب یہ تھی، کہ سب سے پہلے ایک رومال سر پر باندھا جاتا تھا، جس سے سر کے دونون اگلے اور پچھلے حصے چھپ جاتے تھے لیکن بیچ کا حصہ کھلا رہتا تھا، اس کو تخنق کہتے تھے، اس کے بعد ایک اور رومال باندھتے، جس سے یہ مقصود ہوتا تھا، کہ بالون مین تیل لگا ہو تو اس مین جذب ہو کر رہجائے، اور دوپٹہ مین نہ لگنے پائے، اس کا نام غفارہ تھا، غفارہ کے اوپر مختلف طول وعرض کے دوپٹے استعمال کئے جاتے تھے، جن کے یہ نام ہین، صدار، خمار، نصیف، مقنعہ، معجر، ردا، خمار نہایت چھوٹا ہوتا تھا، اس سے بڑا نصیف اور نصیف سے بڑا مقنعہ و ہکذا، خمار وغیرہ کو اکثر اس انداز سے اوڑھتی تھین کہ چہرہ کا اکثر حصہ چھپ جاتا تھا، اسی بنا

پر شاعر کا قول ہے،

سقط النصیف ولم ترد اسقاطہ　　فتناولتہ واتقتنا بالیسد،

مخضب کان العنام من لطافہ　　عنم یکاد من اللطافۃ یعقد

لیکن خاص چہرہ کی حفاظت کے لئے برقع ہوتا تھا، جس کی مختلف قسمین تھین،
جو صرف آنکھ تک کا ہوتا تھا، اس کو وصواص کہتے تھے، اس سے نیچا نقاب کہلاتا تھا،
نقاب سے نیچا لفام، اور اس سے نیچا لثام کے نام سے موسوم تھا، لفام کی حد ہونٹون سے
متجاوز نہ تھی، سب سے بڑا نقاب جو چہرہ بلکہ سینہ کو بھی چھپاتا تھا، اس کو جبۃ کہتے تھے، نقاب
کے یہ تمام اقسام جاہلیت مین پیدا ہو چکے تھے، اور استعمال کئے جاتے تھے، اشعار ذیل سے
اس کی تصدیق ہوتی ہے،

ابرین محاسنا وکنن اخریٰ　　وتقبن الوصاوص للعیون

یضیٔ لنا کالبدر تحت غمامۃ　　وقد سرل عن غر الثنایا لفامہا

غرض لباس کا پردہ تمام عرب مین جاری تھا، اور بجز عوام اور کنیزون کے
تمام عورتین اس کی پابند تھین،

بعض بعض مثالین اس رسم کے خلاف ملتی ہین، مگر وہ نہایت شاذ ہین، لیکن
دوسری قسم کا پردہ یعنی عورتون کا مردون کی سوسائٹیون مین شریک نہ ہوسکنا
زمانۂ جاہلیت مین بالکل نہ تھا، عورتین عموماً مجلسون، بازارون، لڑائیون مین
شریک ہوتی تھین، بازار عکاظ مین جہان شعرا طبع آزمائیان کرتے تھے، شاعرہ
عورتین جاتی تھین، اور ان کے مستقل دربار قائم ہوتے تھے، وہ عام مجمع مین قصیدے
پڑھتی تھین، اور تحسین و آفرین کے صلے حاصل کرتی تھین،

ایک بار خنسا جو مرثیہ کہنے مین تمام عرب مین اپنا نظیر نہین رکھتی تھی، عکاظ مین گئی اور نابغہ ذبیانی کے سامنے جو اس وقت استاد الشعرا تھا، اپنا قصیدہ پڑھا، نابغہ نے کہا افسوس! ابھی ایک شخص کو مین اشعر العرب کا خطاب دیچکا ہون، ورنہ تجھ کو یہ خطاب دیتا، تاہم کہتا ہون کہ تو عورتون مین سب سے بڑی شاعرہ ہے، خنسا نے کہا، نہین بلکہ مین "اشعر الرجال والنسا ہون"

عام قاعدہ تھا کہ کسی گاؤن مین کسی شاعر کا گذر ہوتا تھا تو وہان کی تمام عورتین اس کے پاس آتی تھین اور شعر پڑھنے کی فرمایش کرتی تھین، اور چونکہ وہ عموماً سخن فہم ہوتی تھین، شعرا بھی بڑے ذوق سے ان کو اپنے اشعار سناتے تھے، غرض مشاعرہ، منافرہ، میلے، بازار، دنگل، میدان جنگ، کوئی ایسا مجمع اور مجلس نہ تھی، جسمین عورتین بے تکلف شریک نہ ہوتی ہون،

یہ زمانہ جاہلیت کا حال تھا، اسلام کے زمانہ سے نیا دور شروع ہوا، اس عہد مین جو تغیرات اور اصلاحین ہوئین انکی تفصیل حسب ذیل ہے،

اسلام نے سب سے پہلی اصلاح یہ کی کہ جاہلیت مین کرتون کے گریبان بہت چوڑے ہوتے تھے، جن سے سینے نظر آتے تھے، اس پر ذوقعدہ ۵ھ مین یہ آیت نازل ہوئی،

ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن،	اور چاہئے کہ وہ اپنے دوپٹے اپنے گریبانون پر ڈال لیا کرین

عینی نے بخاری کی شرح مین اس موقع پر لکھا ہے،

وذلک لان جیوبھن کانت واسعۃ	یہ آیت اس لئے نازل ہوئی کہ ان کے گریبان چوڑے
تبدو منھا نحورھن وصدورھن	ہوتے تھے جن سے ان کے سینے اور اس کے اطراف
وماحوالیھا وکن لیدلن الخمرھن	نظر آتے تھے، اور وہ دوپٹون کو پشت کی طرف

وسیاؤهن فتبقی مکشوفة فأمرن بان یدنیها من قدامهن حتی یغطینها،

ڈالتی تھین، اس لئے سینے کھلے رہجاتے تھے، اس لئے انکو حکم ہوا کہ سامنے ڈالین تاکہ سینہ چھپ جائے،

نقاب اور برقع کا طریقہ اگرچہ جیسا کہ ہم پہلے لکھ آئے ہین، پہلے سے جاری تھا، لیکن مدینہ منورہ مین یہود کے اختلاط کی وجہ سے اس کا رواج کم ہو چلا تھا، اکثر عورتین کھلے منہ نکلتی تھین، اس پر یہ آیت اتری،

یاأیها النبی قل لازواجك وبنٰتك ونساء المؤمنین یدنین علیهن من جلابیبهن،

اے پیغمبر! اپنی بیویون اور بیٹیون اور مسلمان بیویون سے کہدو کہ اپنے اوپر اپنی چادرین ڈال لیا کرین (یعنی چادرون سے اپنا منہ چھپا لیا کرین)

اس آیت کے متعلق تین حیثیت سے بحث ہو سکتی ہے،

آیت کا شانِ نزول کیا ہے؟

آیت کے معنی کیا ہین؟

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ کا طریق عمل کیا رہا؟

شان نزول کے متعلق تفسیر ابن کثیر مین جو محدثانہ تفسیر ہے، یہ تصریح ہے،

کان ناس من فساق اهل المدینة یخرجون باللیل حین یختلط الظلام الی طریق المدینة فیعرضون للنساء وکانت مساکن اهل المدینة ضیقة فاذا کان اللیل خرج النساء الی الطرق یقضین حاجتهن فکان اولئك

مدینہ مین بدمعاشون کا ایک گروہ تھا، جو رات کی تاریکی مین نکلتا تھا، اور عورتون کو چھیڑتا تھا، مدینہ کے مکانات چھوٹے اور تنگ تھے، رات کو جب عورتین قضائے حاجت کے لئے گھرون سے نکلتی تھین تو یہ بدمعاش ان سے برا ارادہ کرتے تھے، جس عورت

الفساق يبتغون ذلك منهن فاذا راوا المرأة عليها جلباب قالوا هذه حرة فكفوا عنها واذا راوا المرأة ليس عليها جلباب قالوا هذه امة فوثبوا عليها،

کو دیکھتے تھے کہ چادر مین چھپی ہوئی ہے اسکو شریف زادی سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے، ورنہ کہتے تھے کہ یہ لونڈی ہے، اور اس پر حملہ کرتے تھے،

طبقات ابن سعد جو نہایت قدیم یعنی تیسری صدی کی تصنیف ہے، اسمین بھی یہی شان نزول لکھا ہے، چنانچہ اس کے الفاظ یہ ہین:۔

كان رجل من المنافقين يتعرض لنساء المؤمنين يؤذيهن فاذا قيل له قال كنت احسبها امة فامرهن الله ان يخالفن زي الاماء ويدنين عليهن من جلابيبهن تخمر وجهها الا احدى عينيها

ایک منافق تھا جو مسلمان عورتوں کو چھیڑتا تھا تو جب اس سے کہا جاتا تھا تو کہتا تھا کہ مین نے اسکو لونڈی سمجھا تھا، اس بنا پر خدا نے حکم دیا کہ لونڈیون کی وضع نہ بنائین اور اپنے اوپر چادرین ڈال لین اسطرح کہ بجز ایک آنکھ کے باقی سب چہرہ چھپ جائے

تفسیر کشاف مین ہے:۔

فامرن ان يخالفن بزيهن عن زي الاماء بلبس الاردية والملاحف وستر الرؤس والوجوه،

اس لئے انکو حکم ہوا کہ لونڈیون کی وضع سے الگ وضع اختیار کرین یعنی چادرین اور برقع استعمال کرین، اور سر اور چہرہ چھپائین،

ان تصریحات مین ایک خاص امر یاد رکھنا چاہئے، وہ یہ کہ ابن کثیر کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے، کہ بیبیون اور لونڈیون کے لباس اور وضع مین فرق تھا، اور وہ یہ تھا کہ بیبیان چادرون سے چہرہ چھپاتی تھین، اور لونڈیان کھلے منہ نکلتی تھین،

اشعار جاہلیت سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، چنانچہ شاعر کہتا ہے :-

ونسوتکم فی الروع باد وجوھھا	یخلن اماء والاماء حرائر
تمھاری عورتوں کے چہرے لڑائی میں کھل گئے تھے	اسلئے وہ لونڈیاں معلوم ہوتی تھیں حالانکہ وہ لونڈیاں نہ تھیں

ابن کثیر کی عبارت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی یہ فرق قائم تھا اور اسی وجہ سے جب کوئی بی بی کھلے منہ نکلتی تھی تو بدمعاشوں کو ان کے چھیڑنے کے لئے یہ عذر ہاتھ آتا تھا کہ ہم نے ان کو لونڈی سمجھا تھا،

آیت کے معنی کے متعلق دو لفظ بحث طلب ہیں، جلباب اور ادنار، جلباب کے معنی میں اگرچہ متاخرین نے بہت سے اقوال نقل کئے ہیں لیکن محقق یہ ہے کہ جلباب ایک قسم کا برقع یا چادر تھی، جو تمام کپڑوں سے زیادہ وسیع ہوتی تھی، اور اس لئے سب کے اوپر استعمال کیجاتی تھی، جس طرح آج کل ترکی خاتونیں فراجہ استعمال کرتی ہیں، تفسیر عماد بن کثیر میں ہے،

والجلباب ھو الرداء فوق الخمار	جلباب چادر کو کہتے ہیں جو خمار کے اوپر استعمال
قالہ ابن مسعود وعبیدۃ والحسن	کیجاتی ہے، عبداللہ بن مسعود، عبیدہ، حسن بصری،
البصری وسعید بن جبیر وابراھیم	سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، عطاء خراسانی وغیرہ نے
النخعی وعطاء الخراسانی وغیر واحد	جلباب کے یہی معنی بیان کئے ہیں،

دوسرا لفظ جو بحث طلب ہے، وہ ادنار ہے، ادنار جلباب کے معنی تمام مستند مفسرین نے جو فن لغت کے بھی امام ہیں، منہ چھپانے کے لکھے ہیں،

حضرت عبداللہ بن عباس جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی، اور تمام صحابہ میں فن تفسیر کے اعتبار سے ممتاز ہیں، ان کا قول تفسیر ابن کثیر میں علی بن طلحہ سے

کی روایت سے نقل کیا ہے کہ

امر اللّٰہ نساء المومنین اذا خرجن من بیوتہن فی حاجۃ ان یغطین وجوہہن من فوق رؤسہن بالجلباب ویبدین عینا واحدۃ،

خدا نے مسلمان عورتون کو حکم دیا کہ جب گھر سے کسی کام کو نکلین تو سر سے چادر اوڑھکر چہرون کو چھپا لین اور ایک آنکھ کھلی رکھین،

تفسیر معالم التنزیل مین اس آیت کی تفسیر مین لکھا ہے:-

قال ابن عباس و ابو عبیدۃ امر نساء المومنین ان یغطین رؤسہن و وجوہہن بالجلابیب الا عینا واحدۃ

ابن عباس اور عبیدہ کا قول ہے کہ خدا نے مسلمان عورتون کو حکم دیا کہ چادر سے اپنا سر اور چہرہ چھپا لین بجز ایک آنکھ کے،

طبقات ابن سعد مین[1] ہے:-

محمد بن عمر عن ابی یسرۃ عن ابی صخر عن ابن کعب القرظی قال کان رجل من المنافقین یتعرض لنساء المومنین یوذیہن فاذا قیل لہ قال کنت احسبہا امۃ فامرہن اللّٰہ ان یخالفن زی الاماء ویدنین علیہن من جلابیبہن تخمر وجہہا الا احدی عینیہا،

محمدؒ بن عمر نے ابو یسرہ سے انھون نے ابو صخر سے انھون نے ابن کعب قرظی سے روایت کی ہے، کہ مدینہ مین ایک منافق تھا جو مسلمان خاتونون کو چھیڑ کرتا تھا، اور جب اس کو ٹوکا جاتا تھا تو کہتا تھا کہ مین نے لونڈی سمجھا تھا، تو خدا نے حکم دیا کہ لونڈیون کی وضع ترک کرین، اور اپنے اوپر اسطرح سے چادر ڈال لین کہ چہرہ چھپ جائے، بجز ایک آنکھ کے،

[1] جلد ہشتم صفحہ ۱۲۷ مطبوعہ یورپ،

تفسیر کشاف مین ادنا رجلباب کی یہ تفسیر کی ہے ۔

یرخینھا علیھن و یغطین بھا د   چادر کو اپنے اوپر ڈال لین اور چہرہ
وجوھن ،   کو چھپا لین،

حضرت عبداللہ بن عباس، ابو عبیدہ، ابن کعب قرظی، بغوی، ابن کثیر اور زمخشری اس درجہ کے لوگ ہین، کہ ان کے مقابلہ مین اگر کسی مخالف کا قول ہوتا بھی تو اس کی کیا وقعت ہوسکتی، لیکن جہان تک ہم کو معلوم ہے شاذونادر کے سوا تمام اہل لغت اور مفسرین نے یہی معنی بیان کئے ہین،

اس صورت مین صرف شاہ ولی اللہ صاحب کے مبہم ترجمہ سے ایسے معرکۃ الآرا مسئلہ مین استدلال کرنا کس قدر تعجب انگیز ہے،

پردہ کے متعلق تمام دنیا مین مسلمانون کا جو طریق عمل رہا، وہ یہ تھا کہ کبھی کسی زمانہ مین عورتین بغیر برقع اور نقاب کے باہر نہین نکلتی تھین، اور بجز کسی خاص حالت کے نامحرمون سے ہمیشہ منہ چھپاتی تھین، یہان تک کہ یہ امر معاشرت کا سب سے بڑا مقدم مسئلہ بنگیا تھا،

تصدیق اس کی واقعات ذیل سے ہوگی،

ایک دفعہ مغیرہ بن شعبہ نے آنحضرت صلعم سے اپنا ارادہ ظاہر کیا کہ مین فلان عورت سے شادی کرنی چاہتا ہون، آپ نے فرمایا کہ پہلے جاکر اس کو دیکھ آؤ، انھون نے جاکر اس عورت کے والدین سے اپنا ارادہ ظاہر کیا، اور آنحضرت صلعم کا پیغام سنایا، صحابہؓ جسقدر آنحضرت صلعم کے حکم کی اطاعت کرتے تھے، محتاج بیان نہین، تاہم والدین کو ناگوار ہوا کہ لڑکی ان کے سامنے آئے، اور وہ اس پر نظر ڈال سکین

لڑکی پردہ مین سے یہ باتین سن رہی تھی، بولی کہ اگر آنحضرت صلعم نے حکم دیا ہے، تو تم مجھکو آکر دیکھ لو، ورنہ مین تم کو خدا کی قسم دلاتی ہون، کہ ایسا نہ کرنا، یہ واقعہ سنن ابن ماجہ باب النکاح مین مذکور ہے،

محمدؐ بن سلمہ ایک صحابی تھے، انھون نے ایک عورت سے شادی کرنی چاہی اور اس لئے چاہا کہ چوری چھپے کسی طرح عورت کو دیکھ لین، لیکن موقع نہین ملتا تھا، یہان تک کہ ایک دن وہ عورت اپنے باغ مین گئی، انھون نے موقع پاکر اس کو دیکھ لیا، لوگون کو معلوم ہوا تو نہایت تعجب سے لوگون نے ان سے کہا کہ آپ صحابی ہوکر ایسا کام کرتے ہین، انھون نے کہا کہ مین نے آنحضرتؐ سے سنا ہے کہ جب کسی عورت سے شادی کا ارادہ ہو تو اس مین کچھ مضائقہ نہین، کہ پہلے اسکو دیکھ لیا جائے (سنن ابن ماجہ باب النکاح)

صاحب اغانی نے اخطل کے تذکرہ مین لکھا ہے، کہ ایک دفعہ اخطل، سعید بن ایاس کا مہمان ہوا، سعید نے بڑے تپاک سے مہانداری کی، یہان تک کہ اس کی دونون لڑکیان جنکا نام زعوم و امامہ تھا، اخطل کی خدمت گذاری مین مصروف رہین، دوسری دفعہ جب اخطل کو یہ موقع پیش آیا، تو یہ لڑکیان جوان ہوچکی تھین، اس لئے اخطل کے سامنے نہ آئین، اغانی کے خاص الفاظ یہ ہین :-

ثم نزل علیہ ثانیۃ وقد کبرتا فحجبتا فسأل عنھا وقال فاین ابنتای فاخبر بکبرھما،	اخطل دوبارہ سعید کا مہمان ہوا تو لڑکیان بڑی ہوچکی تھین، اسلئے انھون نے پردہ کیا، اخطل نے پوچھا کہ تیری لڑکیان کہان ہین، سعید نے کہا اب

وہ بالغ ہوگئی ہیں،

پردہ کا اس قدر عام رواج ہوگیا تھا کہ جب کبھی کوئی واقعہ اس کے خلاف پیش آیا ہے، تو مورخین اور واقعہ نگاروں نے ایک مستثنیٰ واقعہ کی طرح اس کا ذکر کیا ہے، ابن بطوطہ نے سفرنامہ میں جہاں ترکوں کا ذکر کیا ہے، ایک عورت کا ذکر کرکے لکھتا ہے:۔

وھی بادیۃ الوجہ لان	اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا، کیونکہ ترکی عورتیں
نساء الاتراک لا یحتجبن	پردہ نہیں کرتیں،

صاحب اغانی نے اخطل کے تذکرہ میں ایک ضمنی موقع پر لکھا ہے:۔

وکان اھل البدو اذ ذاک	اس زمانہ میں صحرانشین عربوں میں مرد عورتوں
یحدثون رجالھم الی النسا	کی صحبتوں میں شریک ہوتے تھے، اور
لا یرون بذالک باسا	ان سے بات چیت کرتے تھے، اور اس کو
	معیوب نہیں خیال کرتے تھے،

اسی کتاب میں جمیل کے تذکرہ میں جو ایک بدوی شاعر تھا، لکھا ہے،

ان جمیل بن معمر خرج فی یوم عید	جمیل بن معمر ایک دفعہ عید کے دن نکلا، اس
والنساء اذ ذاک یتزین ویبدو	زمانہ میں عید کے دن، عورتیں آراستہ
بعضھن لبعض ویبدون للرجال	ہو کر، ایک دوسرے سے ملتی تھیں، اور مردوں
فی کل عید،	کے سامنے آتی تھیں،

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے، کہ عورتوں کا پردہ کرنا اور منہ چھپانا مسلمانوں کی عام معاشرت تھی، اس کے خلاف کوئی واقعہ ہے، تو

وہ خاص کسی قوم یا کسی خاص زمانہ سے تعلق رکھتا ہے، اور کتابوں مین لطور ایک مستثنیٰ واقعہ کے ذکر کیا جاتا ہے،

اس موقع پر ہم دوبارہ اپنے قومی نامور مصنف (مولوی امیر علی) کے ان الفاظ پر توجہ دلاتے ہین کہ

"خلفا کے زمانہ تک اعلیٰ طبقہ کی عورتین بلا برقع کے مردون کے سامنے آتی تھین"

ذلك مبلغهم من العلم

الاسلام

یہ ایک کتاب کا نام ہے جو فرانس کے نامور فاضل کانٹ ہنری دی کاستری نے
فرنچ زبان مین لکھی ہے، اور جس کا ترجمہ احمد فتحی بک زغلول مصر کے ایک مصنف نے
۱۸۹۸ء مین شایع کیا، مصنف نے اس کتاب مین سبب تصنیف بیان کرنے کے بعد
جناب رسالت پناہ صلعم کی مختصر سوانح عمری لکھی ہے، اور اس کے بعد اُن تمام مسائل
سے بحث کی ہے جنپر یورپ کے مصنفین ہمیشہ نکتہ چینی کرتے رہتے ہین، مثلاً جنت کا
جسمانی ہونا، غلامی کا جواز، تعدد ازدواج وغیرہ وغیرہ، اخیر مین ان روایتون کو
لکھا ہے، جو عہد وسطیٰ مین تمام یورپ مین مسلمانون کی نسبت پھیلی ہوئی تھین اور
جنمین مسلمانون کی نسبت عجیب وغریب افترا پردازیان کی گئی تھین،

اس کتاب سے ایک بڑا مشکل مسئلہ حل ہوتا ہے، ہم کو ایک مدت تک یہ
سخت استعجاب رہا کہ یورپ نے اگرچہ فن تاریخ مین بے انتہا ترقی کی ہے، اس کے
ساتھ چونکہ اسلامی آبادیون کا بڑا حصہ اُن کے قبضہ مین آگیا ہے، اور عربی زبان
کی سیکڑون ہزارون کتابین یورپ کی زبانون مین ترجمہ ہو گئی ہین، اس لیے مسلمانون
کے خیالات وعقائد سے ان کو مطلع ہونے کا پورا موقع حاصل ہے، باوجود ان تمام
باتون کے یورپ کے مورخین جب مسلمانون کے متعلق کوئی کتاب یا رسالہ یا مضمون
لکھتے ہین، تو ایسی بے سروپا باتین لکھ جاتے ہین، جنکو دیکھ کر انسان دفعةً متحیر ہو جاتا ہے،

اس کتاب مین مصنف نے نہایت تفصیل سے دکھلایا ہے کہ یورپ مین مسلمانون کے متعلق کس طرح متعصبانہ غلط خیالات پیدا ہوئے، یہ خیالات کس طرح بڑھتے اور پھیلتے گئے، پیشوایان مذہبی نے کس طرح ان خیالات کو تمام ملک مین مذہبی حیثیت سے پھیلایا اور یہ یورپ کے تمام لٹریچر کا عنصر بنا دیا، قومی گیتون مین یہی خیالات گائے جاتے تھے، معرکہ جنگ مین یہ خیالات رجز کے طور پر ادا کئے جاتے تھے، کسی شخص کے عیسائی بنانے کیوقت یہی خیالات عقائد کے طور پر سکھلائے جاتے تھے،

یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جو چیز قومی روایتون اور مذہبی تلقینات کے ذریعہ سے کسی قوم کے دل و دماغ مین سرایت کر جاتی ہے، اس کا نکلنا قریبًا محال ہو جاتا ہے، اگرچہ یورپ مین مذہب کا زور اب کم ہو گیا ہے، اور اس لئے قیاس یہ تھا کہ یہ خیالات اب مٹ جاتے لیکن حقیقت یہ ہے کہ بدقسمتی سے یورپ مین مذہب کی جگہ پالٹیکس نے لے لی ہے، اس لئے یہ خیالات اب مذہبًا نہین بلکہ پالٹیکس کی ضرورت سے قایم رکھے جاتے ہین، اس قدر فرق ہے کہ اب وہ اس رنگ سے ادا کئے جاتے ہین کہ تعصب کا گمان نہ ہونے پائے،

بہرحال کتاب فی نفسہ نہایت دلچسپ ہے، اور ہم چاہتے ہین کہ اس کے ضروری حصے ہمارے پرچہ کے ذریعہ سے اردو زبان مین آجائین،

مصنف نے کتاب کا دیباچہ بھی نہایت دلچسپ لکھا ہے، اس لئے پہلے ہم اسی سے ابتدا کرتے ہین ا۔

رسالہ "اسلام" کا ترجمہ

ایک دن مین جوران کے صوبہ مین جو زرقوم اور سحر کے بیچ مین واقع ہے دشت نورڈ تھا، خاندان یعقوب کے ۳۰ جوان، گھوڑون پر سوار میرے پیچھے پیچھے آرہے تھے، ان

سوارون کی متعدد ٹکریان ہو گئی تھین کیونکہ گھوڑون کی تند مزاجی ان کو با قاعدہ اور منتظم نہین
رہنے دیتی تھی، اگلی صف کا گھوڑا پچھلی صف سے ذراسا بھی چھو جاتا تو بپھر جاتا اور پیچھے مڑ کر بڑے
زور سے دولتیان جھاڑتا لیکن تھوڑی دیر کے بعد اس کا غصہ فرو ہو جاتا، اور حسب
معمول چلنے لگتا، سب کے آگے آگے ایک تندمزاج جوان ایک قوی ہیکل نقرہ گھوڑے پر
سوار تھا جس کو دیکھ کر ایک سدہ منا گھوڑا بھی اپنی شوخی کو ضبط نہ کر سکتا تھا، یہ جوان
نہایت نیچے سرون مین کچھ اشعار گاتا جاتا تھا جس سے تمام مجمع پر ایک کیفیت طاری
تھی اور جو زیادہ تر میری ہی مدح مین تھے، ان سب کے بیچ مین مین اس سلطان
ذی اقتدار کے مانند تھا جس کے رکاب بوسون مین سے ہر ایک چاہتا ہو کہ اُن
آداب خدمت کے بجا لانے مین دوسرے سے آگے نکل جائے، جس نے مشرقی قومون
کو ان معاملات مین اخلاقی تنزل سے تھام رکھا ہے، مین ان اشعار کو کان لگا کر
گھنٹون تک سنتا رہا، اور بعض اشعار مین نے یاد بھی کر لئے، یہ تمام اشعار مسلسل رجز
تھے، جن کے معنی منفرداً سمجھ مین نہین آتے تھے، کچھ نہین معلوم ہوتا تھا کہ کون مادح
ہے، کون ممدوح، کون مخاطب ہے، کون متکلم، غرض ہم یورپین لوگون کو انکا سمجھنا
بالکل دشوار تھا،

اس وقت میری عمر ۲۲ برس کی تھی، جاڑون کا زمانہ اور نہایت خوشگوار دن
تھا، جس کی گرمی سے بدن مین نشاط پیدا ہوتا تھا، اور روشنی نہایت تیز تھی، خوشبو
راہ گیرون کو بدمست کئے دیتی تھی، اور سونگھنے والے کو معلوم ہوتا تھا کہ وہ لذائذ زندگی
کے انتہائی درجہ سے متمتع ہو رہا ہے، اس حالت مین مجھ پر ایک اور احساس طاری تھا
یعنی اس معشوق کا تصور جس کا نام ان سوارون کی زبانون پر صبح و شام جاری

رہتا تھا،

ہم اسی حالت مین چلے جارہے تھے کہ ہمارا شاعر دفعۃً چپ ہوگیا، اور ذرا سخت آواز سے (میری طرف مخاطب ہوکر) بولا کہ جناب! اب نماز عصر کا وقت آگیا، اس آواز کے ساتھ تمام سوار گھوڑون سے اتر پڑے اور صف باندھکر کھڑے ہوگئے، مسلمانون مین جماعت کی نماز کو تنہا نماز پر شرف حاصل ہے، جیسا کہ ہم عیسائیون مین بھی ہے مین جماعت سے ذرا ہٹ کر کھڑا ہوگیا، اور دل مین کہتا تھا کہ زمین پھٹ جاتی تو مین سما جاتا، ان جوانون کے تسلے، نماز کی مختلف حرکتون سے کبھی پیچ کھاتے اور کبھی کھل جاتے تھے، وہ نہایت بلند آواز سے بار بار اللہ اکبر کہتے تھے، اور یہ پرجلال آواز میرے دل مین وہ اثر کرتی تھی، کہ موحدین اور متکلمین کی تحریرون نے کبھی نہین کیا تھا، میرے دل پر شرم اور انفعال کا وہ اثر تھا، جس کے ادا کرنے کے لئے مجھ کو کوئی لفظ نہین ملتا، یہ گروہ جو ابھی میرے سامنے گردن جھکا رہا تھا، صاف محسوس کرنے لگا کہ نماز نے ان کو دفعۃً مجھ سے بہت زیادہ معزز اور بلند مرتبہ کر دیا ہے، اور اگر اسوقت مین اپنے دل کے کہنے پر چلتا تو بیساختہ چلا اٹھتا کہ مین بھی خدا کا معترف ہون، مجھ کو بھی نماز کا ادا کرنا آتا ہے"

حقیقت مین وہ عجیب و لفریب سمان تھا، وہ اپنے معمولی لباس کے ساتھ کس باقاعدگی سے نماز ادا کر رہے تھے، اور ان کے پہلو مین گھوڑے اس طرح چپ چاپ کھڑے تھے کہ گویا نماز کے ادب نے ان کو سرنگون کر دیا ہے، گھوڑون کا یہ درجہ ہے کہ رسول اللہ صلعم کمال محبت کی وجہ سے جبرئیل کی ہدایت کے موافق انکے منہ کو اپنی ردا سے پوچھتے تھے،

اس وسیع میدان مین صرف ایک مین تھا جو تنگ فوجی لباس مین تھا جو انسان کو شکنجہ مین کس دیتا ہے، اور جس سے کسی قسم کی شان کا اظہار نہین ہوتا، میری حالت سے بیدینی ٹپک رہی تھی، حالانکہ مین اس وقت ایسے مقام مین تھا جو مذہب کا مولد و منشا رہے، اس عبادت گذار گروہ کے آگے جو اپنے خدا کے آگے بار بار نہایت خشوع سے نماز کے فرایض اس دل سے بجا لا رہا تھا جو سچائی اور ایمان سے لبریز تھا، مین بالکل ایک جماد یا کنا معلوم ہوتا تھا، اس حالت مین مجھکو توراۃ کی وہ آیت یاد آئی کہ خدا سام کے خیمہ مین سکونت کریگا، اور یافث کی اولاد کو ترقی دیگا، یہ دونون گروہ اس وقت یکجا تھے، یعنی وہ نماز گذار جو سام کی اولاد سے تھے، اور جو اپنے مذہب اور اُس خدا پر نثار تھے، جو ابراہیم کے خیمہ مین داخل ہوا تھا، اور مین جو یافث کی اولاد ہون اور جس کا شہرہ صرف فتوحات اور لڑائیون پر موقوف ہے،

غرض جب منزل ختم ہو گئی، اور مین فرودگاہ پر واپس آیا تو جو خیالات میرے دل مین آئے تھے ان کو قلمبند کرنے لگا، اس وقت مین محسوس کر رہا تھا کہ مجھکو اسلام کی حلاوت اپنی طرف کھینچ رہی ہے گویا مین نے اس سے پہلے کبھی کسی صحرا مین کسی قوم کو عبادت بجالاتے دیکھا ہی نہین تھا، مجھکو اس وقت عیسائیون کے خیمے یاد آگئے، جہان صرف عورتون کی پرستش کیجاتی ہے، اور اس خیال سے مجھکو یورپ کی بد دینی پر غصہ آگیا،

یہ میری عمر کا وہ زمانہ تھا جب عقل، مشکلات کا حل کرنا نہایت آسان سمجھتی ہے، اور جب انسان تمام چیزون کو سطحی نگاہ سے دیکھتا ہے، جب کہ محض خیالی نکتہ چینی اور تحقیق کا منصب حاصل کرتا ہے، اور جبکہ انسان کے اعتقادات بے قید ہو جاتے

ہین، یہ وہ عمر ہے کہ اگر اس عمر کے آدمی انصاف سے کام لیتے تو تصنیف و تالیف کو
ہات تک نہ لگاتے، میرا خیال تھا کہ مذہب کی شان، مذہب کی سچائی کی خود ایک بہت
بڑی دلیل ہے، مین اسلام کے متعلق کچھ لکھنے لگا اور مجھکو کچھ خبر نہ تھی کہ قلم اس وقت
بالکل دل کے قابو مین ہے،

کتاب کے شایع کرنے سے پہلے مجھکو یہ بتانا ضرور ہے، کہ مجھکو اسلام کے متعلق
کچھ لکھنے کا کیا خاص حق حاصل ہے، مین نے مدت تک اہل عرب کے ساتھ زندگی
بسر کی ہے، اور مشرقیون کے مزاج اور طبیعت کے دریافت کرنے مین اکثر مصروف
رہا ہون، میرا طریقہ وہی ہے، جو الجزائر کے مستعمرین کا ہے، اور اسی بنا پر مین سب سے
پہلے معزز مستشرقون سے بہ ادب و نیاز یہ درخواست کرتا ہون کہ مجھکو ان لوگون
کی فہرست مین نہ داخل کرین جنکا یہ حال ہے کہ وہ عرب کا رخ کرتے ہین، اور چند روز
کی سیاحت مین ادھر ادھر کی گپین سنکر اسلام کے متعلق لکھنے بیٹھ جاتے ہین، اس لئے
انکی تحریر محض شاعرانہ ہوتی ہے، یہان تک کہ مانسیو لوازون بھی اس قسم کی لغزش
سے نہ بچ سکا، اس کا قلم سبک سر ہوکر تخیلات کی کشش مین آگیا، اس کو مشرق کی
ہر چیز بھلی معلوم ہوتی تھی، اس کی رائین اسلام کے متعلق ایک فسانہ گو کی رائین ہین،
نہ کہ حکیمانہ اور محققانہ، مین اسکی طرح خواہ مخواہ اسلام کی شان بڑھانا نہین چاہتا،
لیکن چونکہ مین دیکھتا ہون کہ موجودہ زمانہ مین یہ ایک بڑا اہتم بالشان مسئلہ بنگیا
ہے، یہان تک کہ خاص ان مباحث کے لئے پیرس مین ایک علمی میگزین جاری
ہوا، جسکا یہ نتیجہ ہوا کہ صلیب پرست عیسائی مسجد بنانے کی غرض سے مسلمانون کو مالی
امداد دے رہے ہین، اس بنا پر مین نے اس موقع کو اس بات کے لئے غنیمت جانا

کہ ہم لوگون کے دماغ مین پیغمبرِ عرب اور مذہب اسلام کے متعلق جو غلط خیالات جم گئے ہین، ان سے لوگون کو متنبہ کرون،

یہ ایک نہایت مشکل کام ہے، کیونکہ یہ مسلم ہے، کہ لا یرسخ فی الاعتقاد اکثر من خطاء الاعتقاد، میرا یہی خیال ہی، کہ عیسائیون کی شایستہ قومون کے لئے صرف یہی کافی نہین کہ وہ اپنی مسلمان رعایا کے مذہب کی عزت کرین بلکہ ان کا یہ بھی فرض ہے، کہ اس مذہب کی حقیقت سے بخوبی واقف ہون ہمکو ان قصون کے سننے سے ہنسی آتی ہے، جن مین یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسلمان عیسائیون سے کس قدر عناد رکھتے ہین، اس وقت ہم کہتے ہین کہ مسلمان متعصب اور جاہل قوم ہین، اور اس عناد پروری مین ان کو معذور سمجھنا چاہئے، لیکن اسی طرح عیسائی بھی مسلمانون سے نفرت رکھتے ہین اور انصاف سے کام نہین لیتے،

مذہب اسلام کے متعلق سب سے زیادہ غلط اوہام جو ہم لوگون مین پھیل گئے ہین، وہ خاص پیغمبر صلعم کی ذات کی نسبت ہین، اس لئے مین نے ارادہ کیا کہ سب سے پہلے مین پیغمبر صلعم کی ذات اور انکی اخلاقی حالت کے متعلق بحث کرون، مجھکو امید ہی کہ یہی بحث انکی سچائی اور دیانت داری کی ایک عمدہ دلیل ثابت ہوگی، جس پر قریبًا تمام مذاہب کے مورخین اور بڑے پکے عیسائی متفق اللفظ ہین،

پہلی فصل

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی

تلمسان کے ایک طالب العلم سے مین مذہبی مباحثات کیا کرتا تھا، وہ جب مناظرہ

سے گریز کرنا چاہتا تھا تو کہتا تھا کہ عیسائی تو کہتے ہین کہ خدا کی اولاد ہے، اور محمدؐ جادو گر تھے، اس کے یہ الفاظ حقارت سے لبریز ہوتے تھے، جس طرح کسی بت پرست سے اسکی حالت پر ترس کھا کر خطاب کیا جائے، حالانکہ یہ طالب العلم میرا بہت ادب کرتا تھا اور مجھ سے بہت دوستانہ تعلقات رکھتا تھا، اس کا خیال تھا کہ جس طرح محمدؐ (رسول اللہ) کا ساحر ہونا افترائے محض ہے، اسی طرح تثلیث کا اعتقاد بھی محض تہمت ہے، اور یہ کہ ایسی قوم سے جو اس قسم کی لغو باتون کی قائل ہو گفتگو کرنا بھی عبث ہے،

لیکن اگر مسلمانون کو وہ قصے معلوم ہون جو عیسائیون مین قرون وسطیٰ کے زمانہ مین مشہور رہتے، اور اُن گیتون سے اطلاع ہو جو عیسائیون مین گائے جاتے تھے تو معلوم نہین مسلمانون کو کس قدر حیرت ہوگی، بارہوین صدی عیسوی کے قبل تک جس قدر گیت ہم لوگون مین پھیلے ہوئے تھے گویا سب ایک دماغ کے نتیجے تھے، یہی گیت ہین جنکی بدولت کروسیڈ کی لڑائیان برپا ہوئین، ان سب کا موضوع مسلمانون سے سخت تنفر پیدا کرنا تھا، جس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمانون کے مذہب سے لوگ بالکل جاہل تھے، انھین گیتون نے اُن بیہودہ ردایتون کو دلون مین راسخ کر دیا، اور انھین کی بدولت یہ غلط فہمیان قایم ہوگئین، جنمین سے اکثر آج بھی قائم ہین،

ان گیتون کے گانے والے عموناً یقین رکھتے تھے کہ مسلمان مشرک اور بت پرست ہین، اور وہ تین خدا کے قائل ہین، جن کے درجے مختلف ہین، ایک کا نام ماہوم یا ماہون یا ماقومیٹ یا ماہومیٹ ہے، دوسرا ابلین، تیسرا ترفاجان، ان لوگون کا خیال تھا کہ محمد صلعم نے اپنے دین مین، اپنے آپ کو بھی خدا قرار دیا تھا، لطف یہ ہے کہ محمد صلعم (جو درحقیقت بت کے دشمن اور بتون کے برباد کرنیوالے تھے) نے اپنی صورت

کا ایک زرین بت بنایا تھا، اور لوگون سے اس کی پوجا کراتے تھے، جیسا کہ ترفنجیون کا
اعتقاد تھا، یہ لوگ بیان کرتے ہین کہ جب عیسائیون نے مسلمانون پر فتح پائی، اور ان کو
سرقسطہ کی دیوار تک ہٹالے گئے تو مسلمانون نے جا کر اپنے تمام بت جنکو وہ پوجتے تھے،
توڑ ڈالے، چنانچہ عہد وسطیٰ کے ایک مشد کا بیان ہے کہ مسلمانون کا خدا اپلین ایک غار
مین تھا، مسلمانون نے اس پر پتھر برسائے، اور خوب دل کھول کر اسکو گالیان دین،
پھر سولی پر چڑھایا، اور خوب پامال کیا، اور مارے ڈنڈون کے اس کے ریزے
ریزے کر دیئے،

ماہومد کو جو دوسرا خدا تھا، ایک گڑھے مین پھینک دیا، یہان تک کہ سور اور کتے
ان کو نوچتے اور روندتے تھے، اس طرح کی اہانت کبھی کسی خدا کی نہین ہوئی تھی لیکن
مسلمانون نے پھر توبہ کی اور اپنے خداؤن سے معافی چاہی، اور ان کی مرمت و اصلاح
کی، اسی بنا پر امپر رکارلوس جب سرقوطہ مین داخل ہوا تو اس نے حکم دیا کہ یہ سارے
بت برباد کر دیئے جائین، چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے، کہ امپررنے فرنج کو حکم دیا کہ وہ شہر
کے تمام گلی کوچون مین پھرے اور مسجدون اور جامع مسجدون مین گھس کر آہنین
گرزون سے ماہومد اور اور تمام بتون کو توڑ ڈالے، رلیشار نے بھی اپنے اشعار مین یہ
روایت بیان کی ہے، یہ اشعار فی نفسہ بہت اچھے ہین لیکن سرتاپا تہمت اور افترا ہین،
ان مین خدا سے یہ دعا مانگی ہے کہ ماہوم کی پرستش کرنے والے برباد ہو جائین، پھر ترفا
ملک کو جنگ مقدس کی ترغیب دی ہے، اور ان کو ان الفاظ مین نصیحت کی ہے،
"اٹھو اور ماہومید، ترفاجیان کو برباد کر دو، ان کو آگ مین ڈال دو اور خدا کے
آگے ہم قربانی پیش کرو، ان شعرا کا خیال تھا کہ ماہوم کا بت نہایت اعلیٰ درجہ کی

کاریگری کے ساتھ قیمتی پتھروں اور جواہرات سے بنایا جاتا تھا، چنانچہ اگر کوئی شخص رولاں کے اشعار پڑھے تو عجب نہیں کہ قسم کھانے پر تیار ہو جائے کہ شاعر چشم دید واقعات بیان کر رہا ہے، ان اشعار میں بیان کیا ہے کہ یہ بت خالص سونے چاندی کے تھے اور اگر تم ان کو دیکھتے تو تم کو یقین آجاتا کہ ان سے بڑھکر خوبصورت، شاندار، لطیف الصنعۃ پُر رعب ہونا عقل میں نہیں آسکتا، ماہوم بالکل خالص چاندی اور سونے کا بنا ہوا تھا، اور اس کی چمک دمک سے آنکھیں خیرہ ہوئی جاتی تھیں، وہ ایک ہاتھی پر دھرا ہوا تھا، جس کا ہودج اعلیٰ سے اعلیٰ کاریگری کا بنا ہوا تھا، وہ اندر سے خالی تھا، اور اس وجہ سے اس کی چمک پھوٹ کر نکلتی تھی، اس میں نہایت قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے، اور اس کا اندر کا حصہ چمک کی وجہ سے باہر سے نظر آتا تھا، یہ ایک ایسی کاریگری تھی جو بالکل بے نظیر تھی، چونکہ دیوتاؤں کا قاعدہ ہے، کہ مشکل کے وقت وہی بھیجتے ہیں، اس لئے جب مسلمانوں نے ایک معرکہ میں شکست کھائی تو ان کے سردار نے مکہ میں مدد مانگنے کے لئے قاصد بھیجا، اس وقت ان کا دیوتا ماہومد بڑی شان وشوکت سے دمامہ ونقارہ کے ساتھ آیا، جس کی گونج دور دور تک جاتی تھی، بعض بانسری بجاتے آتے تھے، اور بعضوں کے ہاتھ میں چاندی کی جھانجھ تھی، اور یہ سب کے سب ماہومد کے گرداگرد ناچتے اور بڑے زور سے گاتے آتے تھے، اس ساز وسامان کے ساتھ فرودگاہ میں پہونچے، جہاں خلیفۂ اسلام ان کا انتظار کر رہا تھا، جب خلیفہ نے ماہومد کو دیکھا تو نہایت خضوع اور ادب کے ساتھ کھڑا ہوگیا، اور بندگی بجالایا،

اس کے بعد ریشار نے بیان کیا ہے، کہ یہ بت پرست کیونکر اس مجوف بت سے جس کے اندر کی چیزیں باہر سے نظر آتی تھیں، دعائیں مانگتے تھے، ریشار کا بیان ہے کہ اس بت

کے اندر جادوگرون نے ایک عفریت کو بند کیا تھا، وہ اچھلتا کودتا تھا، اور پھر اس نے مسلمانون سے مخاطب ہوکر باتین کین،،

عیسائی شعرا اس (فرضی) بت سے نہایت عداوت رکھتے تھے، چنانچہ جس طرح صلیب عیسائیون کی مذہبی علامت ہے، ان لوگون نے اس بت کو مسلمانون کی علامت قرار دیا، چنانچہ بودوان نے یونیتو کے متعلق جو نظم لکھی ہے، اس مین لکھا ہے کہ جب یونیتو نے سلطان صلاح الدین کے سامنے اسلام قبول کرنا چاہا تو کہا کہ اگر محمدؐ کا بت میرے سامنے لایا جائے تو مین اس کی عبادت بجا لاؤن چنانچہ جب وہ لایا گیا، تو یونیتو سجدہ مین گر پڑا"

ایک اور نظم سے جو اسی نظم کا تتمہ ہے، ظاہر ہوتا ہے، کہ مسلمانون کے دو خدا اور بھی ہین، بارالون اور رجو بین، اتنا فرق ہے کہ وہ پہلے تین خدا بہ طور سردار کے ہین، اس نظم مین بیان ہے کہ جب ایک عیسائی سردار نے مسلمانون کی فوج کو جو مکہ سے چلی تھی، شکست دی تو مسلمان نہایت بدحواس ہوئے، وہ چیختے چلاتے شور مچاتے دوڑتے پھرتے تھے، اور نہایت زور سے پکارتے تھے، کہ دہائی ترفان کی دہائی ماہوم کی،

معہذا، ایک اور نظم جو اسی زمانہ کی ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ماہوم (؟) کسی بت کا نام نہ تھا، یہ نظم بشپ الگزنڈر دیوین کی ہے، جو اس نے ۱۲۰۰ء مین لکھی تھی، یہ نظم ایک مسلمان کے خیالات سے ماخوذ ہے، جو عیسائی ہوگیا تھا، تمام لوگ اس نظم کو بالکل سچا اور صحیح تاریخی واقعہ خیال کرتے تھے، اس کا مضمون یہ ہے "یہ امر طے شدہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔[1]۔۔۔ کو فریب، خیانت، دھوکا دینا خوب آتا تھا" (نعوذ باللہ) اسکے بعد شاعر نے محمد (رسول اللہ)

[1] جہان جہان اس طرح نقطے دیدیئے گئے ہین، وہان نہایت بیہودہ الفاظ آنحضرت صلعم کی نسبت تھے، اسلیے مین انکو نقل نہ کرسکا۔

کو ایک ایسے سردار سے تشبیہ دی ہے جس کے گرد اس کے پیرو جمع ہین، اور وہ اپنے مذہب کو سادہ طریقہ سے تعلیم کر رہا ہے یہان تک کہ لوگون کو اس پر اس سے زیادہ اعتقاد ہو گیا جتنا کہ روما کے امام پر ہوا تھا"

ان بیہودہ اقوال کے نقل کرنے مین مین نے زیادہ تطویل کی جسکی وجہ یہ ہے کہ انگریز مذکور کی تاریخ نے ان بیہودہ روایتون کو مسدود نہین کیا، بلکہ ان کا اثر دلون مین اب بھی موجود ہے، اور اسی وجہ سے پیغمبر اسلام اور قرآن کے متعلق آج بھی لوگون کی نہایت مختلف رائین ہین، اگر کوئی شخص یہ پوچھے کہ یہ شعراء، ان قصون کو کیا درحقیقت سچ سمجھتے تھے تو مین تارسنڈ والون کی طرح جواب مین ہان بھی کہونگا، و نہین بھی، کیونکہ یہ قطعی ہے کہ چونکہ مسلمان اور عیسائی باہم ملتے جلتے رہتے تھے، اس لئے مذہب اسلام کی حقیقت سے واقف ہونا مشکل نہ تھا لیکن وہ درحقیقت یہ چاہتے ہی نہ تھے، کہ اپنے اشعار مین تاریخی سچے واقعات بیان کرین، ان کا مقصد صرف عیسائیون مین بغض اور نفرت کی روح کا پھونکنا تھا اسلئے ان کو ضرورت تھی کہ مسلمانون اور اُنکے پیغمبر اور انکے مذہب کے ایسے اوصاف بیان کرین جو ان لوگون کے مذاق اور معلومات کے موافق ہون جنکے سامنے یہ اشعار پڑھے جاتے تھے،

ان شعرائے قطع نظر کرکے جب ہم زمانہ مابعد کی ان مشکلین کی تصنیفات پڑھتے ہین جن کی رائین اعتدال کی طرف مائل ہوتی ہین، تو یہ تصنیفات بھی خرافات اور سب وشتم سے مملو نظر آتی ہین طرہ یہ کہ گروہ مصلح یعنی پروٹسٹنٹ کا تعصب اور زیادہ بڑھا ہوا ہے، چنانچہ بیلنڈر نے محمد (رسول اللہ) کو (نعوذ باللہ) . . . . سے تشبیہ دی ہے، اور قرآن و شریعت اسلام کو بھی انھین لفظون سے یاد کیا ہے، ہم کو اس دعوے پر

دلیل لانے کی ضرورت نہین، بلکہ صرف یہ کہنا کافی ہے کہ ناظرین کو اپنی توجہ ریلانڈ کی کتاب کے دیباچہ کی طرف مبذول کرنی چاہیئے، یہ کتاب ۱۷۲۱ء مین چھپی ہے، اور اس کا موضوع یہ ہے" مذہب اسلام کے متعلق لوگون کو کیون بہت کم واقفیت ہے"

مصنف مذکور کہتا ہے کہ ارباب بحث کو اگر یہ مقصود ہو کہ کسی مذہب یا طریقہ پر ذلت و عار کا داغ لگائین تو ان کو صرف یہ کہنا چاہیئے کہ وہ مذہب محمدؐ (رسول اللہ صلعم) کی طرف منسوب ہے، بشپ ودن مارتینو الفنسو فیقا الدو نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "کلیسائے مقدس و رزین کا چراغ" ہے، اس کتاب مین وہ لکھتا ہے، کہ محمدؐ (صلعم) کی کتاب کو پڑھنا نہین چاہیئے بلکہ انسان کا یہ فرض ہے کہ اس کے ساتھ استہزا کرے اور آگ مین جلا دے، اس کو محفوظ رکھنا جانورون کا کام ہے" بعضون کی یہ راے ہے، کہ جلانا نہین چاہیئے لیکن ایسے لغو مزخرفات کے یاد کرنے مین انسان کو اپنا وقت صرف نہ کرنا چاہیئے جو ایک .... آدمی کے خیالات ہین،

یہ رائین تو قرآن مجید اور بانی اسلامؐ کے متعلق ہین، باقی مسلمان تو ان کو ان تصنیفات مین ان الفاظ سے یاد کیا گیا ہے، پلید، بست، گدھے، خر صحرائی، قابل نفرت وہ لوگ جنکا یہ کام ہے کہ رات کو اپنا گھر عورتون سے بھر لیتے ہین، اور صبح کو ان کو طلاق دیدیتے ہین" اور اگر تم کو گالیون کا خزانہ دیکھنا ہو تو ایک عیسائی کی کتاب دیکھو جسکا نام بروشار ہے، اس کتاب کا نام رہنماے سفر ہے، مصنف نے یہ کتاب امیر فلپ روقالو کی خدمت مین ۱۳۳۲ء مین پیش کی تھی، اسمین اس نے بیان کیا ہے کہ کروسیڈ کی لڑائیان کن اسباب سے ظہور مین آئین، چنانچہ کہتا ہے، کہ کون ہے، جو یہ دیکھکر آنسو نہ بہائے گا کہ جو زمین ہماری میراث نہین، ان پر اس قوم نے قبضہ کر لیا ہے،

جن کے نہ خدا ہے، نہ مذہب نہ شریعت نہ اقرار نہ رحم، یہ لوگ دنی اور کمینہ ہین، اور
سچائی اور صفائی نیکی اور عدل کے دشمن ہین، خدا کے منکر ہین، عیسائیون پر جبر کرتے ہین،
نہایت کثرت سے شادیان کرتے ہین، لڑکون سے بدکاری کرتے ہین، بے زبان جانورون
پر ظلم کرتے ہین، فطرت انسانی کے مخالف ہین، فضائل کے قاتل ہین، اخلاق کے
مارڈالنے والے ہین، گناہون اور برائیون مین مستغرق ہین، شیطان کے دوست
ہین، کمینہ باتون کے حامی ہین، کینہ ور ہین، پست خیال ہین، ان کے افعال بتذل،
زندگی پست، باتین فحش، معاشرت حقیر اور جانورانہ ہے، ان کے ارادے اور حوصلے
جب مائل ہوتے ہین تو صرف حیوانانہ خواہشون کی طرف مائل ہوتے ہین، یہ وہ لوگ
ہین جنھون نے ہم لوگون کو ان مقامات سے نکال دیا، اور چھوٹی سی جگہ مین بھی
جہان ہم رہتے ہین ہم کو ستاتے ہین، ہمارے ساتھ اور ہمارے مذہب کے ساتھ مسخراپن
کرتے ہین، انھین لوگون نے خدا کے گھر کو برباد کر دیا، اور اس پاک شہر پر قابض
ہو گئے، جو ہماری شریعت کا فرودگاہ ہے، اور ان پاک مقامات کو نجس کر دیا"
اس قسم کے خیالات عیسائیون مین ایک مدت تک پھیلے رہے، یہان تک کہ
اور رسیٹ پریڈو نے ۱۷۲۳ء مین ایک کتاب (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) کے حالات مین
تصنیف کی، اور اس کے دیباچہ مین اس تصنیف کا مقصد یہ بیان کیا، اس کتاب
کی تصنیف کا مقصد اس آدمی کی سوانحعمری کے لکھنے کے ذریعہ سے، عیسائی حکیمانہ
مقصد کی خدمت گزاری ہے، ان مصنفون نے درحقیقت اپنا مقصد تاریخ نگاری نہین
قرار دیا بلکہ ان کا مقصد جیسا کہ خود ان کا بیان ہے، عیسائی مذہب کی خدمتگزاری
ہے، یہ لوگ اپنے مبتذل دلائل کی تائید مین جو ہتھیار استعمال کرتے تھے، وہ محض

دشنام دہی اور سخت کلامی تھی، اس کے ساتھ روایت اور نقل مین جس قدر تحریف ہو سکتی تھی کر سکتے تھے، صرف دا ماسین نے یہ قصد کیا کہ ان عام تصنیفات کی مخالفت کرے، جس کی وجہ یہ تھی، کہ وہ شام مین پلا تھا، اور خلفاے اسلام کا مقرب تھا چنانچہ اس نے مذہب اسلام کے رد مین جو کچھ لکھا بلا تعصب لکھا، اس نے یہ راے ظاہر کی کہ اسلام عیسائی ہی مذہب کی بگڑی ہوئی صورت ہے، جیسا کہ ارلیوس کا خیال تھا، با این ہمہ یورپ پر اسکی تصنیف کا کچھ اثر نہ ہوا، اور ان کے جو بیہودہ خیالات پیغمبر اسلام اور قرآن کی نسبت تھے اسی طرح قایم رہے، پیشوایان مذہب (یعنی پادری اور بشپ وغیرہ) بھی انھین خیالات کو قوت دیتے تھے اور لوگون کے ذہن مین بٹھاتے تھے اسی پالٹیکس کا نیتجہ ہے کہ لوگ اسلام کے ساتھ سخن آرائی کرتے ہین، ان خیالات کی اشاعت نے یورپون کو مذہبی لڑائیون سے بے نیاز کر دیا چنانچہ لاطینی چرچ آٹھوین صدی مین اور کامون مین مشغول تھا، کیونکہ شرقی چرچ دو ضرر رسان مصیبتون مین گھرا ہوا تھا ایک یہ کہ ایک ہی روح کے دو جسم بن گئے، دوسرے یہ کہ ایک روح تھی اور ایک ہی جسم بھی تھا

اسلام کے متعلق آزادانہ اور غیر متعصبانہ بحث ہمارے زمانہ سے آغاز ہوئی، کیونکہ انیسوین صدی مین لوگون نے اس مسئلہ کو ایک محقق کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن کے متعلق مختلف رائین قائم ہو گئین، کچھ لوگ قرآن کے فریفتہ ہو گئے اور بعضون نے نکتہ چینی کی، تاہم اس دوسری قسم کے لوگون مین اب بھی قدیم خیالات کی بو آتی ہے، مانسیو درختی نے عرب کا سفرنامہ ۱۸۸۸ء مین شایع کیا، اسمین پیغمبر اسلام کی نسبت لکھتا ہے کہ وہ ...... تھے لیکن انکو یہ خیال نہین رہا، کہ اب یہ الفاظ کسی دعوی کی صحت کے دلیل نہین ہو سکتے،

پہلی بحث جو پیدا ہوئی وہ یہ تھی کہ پیغمبر اسلام صلعم اپنی رسالت مین سچے تھے یا نہین، حالانکہ
ہم کہہ چکے ہین، کہ یہ امر مستشرقین اور متکلمین سب کے نزدیک مسلم ہے، یہ بھی ظاہر ہے کہ اس مسئلہ کو قرآن
کے منزل من اللہ ہونے سے کوئی تعلق نہین ہے، کیونکہ پیغمبر کی سچائی ثابت کرنے کے لئے صرف
اس قدر ثابت کرنا کافی ہے، کہ ان کو اپنی نبوت پر پورا الیقین تھا اور وہ اپنے آپ کو سچا پیغمبر
سمجھتے تھے، باقی آپ کی پیغمبری کا مقصد، توخداے واحد کی پرستش کا قایم کرنا تھا، بجائے اُس
بت پرستی کے جو آپ کے قبیلہ مین ابتدا سے قائم تھی، اس کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت اسمعیل پر
جب سارہ خفا ہوئین اور اپنے گھر سے نکال دیا تو وہ عرب کو چلے آئے اور اپنے باپ ابراہیم کے
مذہب کو عرب مین شایع کیا، لیکن عرب مین اس مذہب کا اثر بالکل ایک خیال سا رہ گیا
تھا، کیونکہ عرب مین ایسے لوگ نہ تھے جو یاد دلاتے رہتے کہ ابراہیم کا خدا اعالی رتبہ خدا اپنے
اور شرکت کو گوارا نہین کرتا، بخلاف اس کے بنو اسرائیل مین ایسے لوگ ہمیشہ پیدا ہوتے رہے
بہرحال وہ اسماعیلی مذہب روز بروز زائل ہوتا گیا، اور بجائے اس کے ان خداؤن کی
پرستش قایم ہوتی گئی جن کی پرستش اور قومون مین ہوتی تھی، یہان تک کہ اسمٰعیلی مذہب بالکل
فنا ہوگیا، اس کے بعد بعض قبائل عرب مین جو شام کے ہمسایہ تھے، یہودیت کا رواج ہوا
لیکن عیسوی مذہب نے ان مقامات مین ظہور نہین کیا چنانچہ تیث نے جو چوتھی صدی عیسوی
مین بصرہ کا بشپ تھا خود اقرار کیا ہے کہ عرب کی خانہ بدوش زندگی عیسوی مذہب کو پھیلنے
نہین دیتی،

عرب مین ساتوین صدی تک مذہب کی یہ حالت رہی، اس زمانہ کی نسبت مصنفون
نے اپنے اپنے مذاق کے موافق مختلف خیالات ظاہر کئے ہین، اور جیسا کہ میرا اعتقاد ہے آگ
بنا پر ان کے اقوال عرب اور اہل عرب کی حالت اور اعتبار کے متعلق باہم متناقض ہین،

مانسیو رنیان کا بیان ہے کہ تمدن کی تمام تاریخ مین عرب جاہلیت کے زمانہ سے زیادہ کوئی خوبصورت منظر نہین ہے، اس کی یہ بھی راے ہے کہ یہ قبائل یہودی یا عیسائی مذہب رکھتے تھے اور ایک عظیم الشان مذہبی اشتعال کے لئے تیار تھے لیکن مانسیو بارتیلی سینٹ ہلیر کہتا ہے کہ اگر یہ صحیح ہے کہ ان لوگون مین ایک کامل تمدن پایا جاتا تھا تو وہ اس قسم کی اخلاقی تعلیم کے کیون محتاج ہوتے جس کے سننے سے بدن پر رونگٹے کھڑے ہوتے ہین مثلاً :-

حرمت علیکم امھاتکم وبناتکم واخواتکم	تم پر تمھاری مائین حرام ہین اور بیٹیان اور بہنین
وعماتکم وخالاتکم وبنات الاخ وبنات	اور پھوپھیان اور خالائین اور بھتیجیان، اور
الاخت	بھانجیان،

اس مصنف کی یہ راے ہے کہ اہل عرب ایک وحشی قوم تھی اور ان کی حالت قریباً ویسی ہی تھی جیسی یہودیون کی اس زمانہ مین جب حضرت موسیٰؑ مبعوث ہوئے تھے اور اسی قسم کے احکام لائے تھے،

ان دونون رایون مین کسی کے ترجیح دینے پر غور کرنا نہین چاہتا لیکن میری رائے ہے اگر دونون مین افراط و تفریط ہے، عرب کی قوم پیغمبرؐ سے پہلے گو بت پرست تھی، اور وحدانیت کا اعتقاد خال خال بعض طبیعتون مین پیدا ہو چلا تھا، اس کے اعتقاد والے حنیفی کہلاتے تھے جو ابراہیمی مذہب کے پیرو تھے، باقی عیسائی تو ان کے بہت کثرت سے فرقے تھے۔ اور سب کے سب کسی خدا کے قائل تھے پیغمبر نے حنیفون کے مذہب کو ایک سطحی حالت مین پایا تھا، لیکن چونکہ ان کی فطرت مذہب سے لبریز تھی، اس لئے یہی خیال ان کے دل مین اعتقاد بن گیا، اور ایسا اعتقاد کہ اس کی نظیر اس سے پہلے بہت کم پائی گئی تھی، یہ وہی مضبوط اعتقاد تھا جس نے انسانی نوع مین ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا، اور یہ بالکل غلطی ہے کہ ہم دین حنیفی

کے سوا اور کسی مذہب مین اس مذہب کے تیم الفیض سبدر کی جستجو کرین، کیونکہ محمدؐ پڑھے لکھے نہ تھے، بلکہ جیسا کہ خود انھون نے بار بار اقرار کیا ہے بالکل ان پڑھ تھے، اور اس وصف مین ان کے معاصرین مین سے کسی نے ان سے معارضہ نہین کیا، اور یہ ظاہر ہے کہ بلاد مشرق مین یہ امر بالکل ناممکن ہے کہ کوئی شخص اس طرح علم حاصل کرے کہ کسی کو خبر نہ ہو، کیونکہ مشرقیون کی زندگی پردہ خفا مین نہین رہتی، اس کے علاوہ اس زمانہ مین پڑھنا لکھنا ان ممالک مین بالکل معدوم تھا، اور ایک شخص کے سوا جس کا ذکر ڈپی تاسے نے اپنی کتاب مطبوعہ ۱۸۶۳ء مین کیا ہے، کوئی شخص مکہ مین پڑھا لکھا نہ تھا، اسی طرح اس قرینہ کی بنا پر کہ حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تجارت کے کام کے لئے انتخاب کیا تھا، یہ نتیجہ نکالنا کہ اگر آپ پڑھے لکھے نہ تھے تو وہ تجارت کا کام ان کو کیونکر سپرد کرتین، صحیح نہین، عرب اور غیر عرب قومون مین عموماً تجار کے ہان ان کے ایجنٹ اور نائب ان پڑھ ہوتے ہین، اور باوجود اس کے اورون کی بہ نسبت زیادہ دیانتدار ہوتے ہین،

غرض بیانات سابقہ سے ظاہر ہے کہ محمد (صلعم) نے نہ کوئی آسمانی کتاب پڑھی تھی اور نہ مذہب کے متعلق مذاہب سابقہ سے رہنمائی حاصل کی تھی، اگرچہ الگزنڈر دویون کا یہ بیان ہے، کہ وہ عیسوی مذہب سے قرأت اور کتابت دونون طریقہ پر واقف تھے،

بے شبہہ ان ماخذون کا پتہ لگانا جن سے یہ ثابت ہو کہ آپ نے عیسوی یہودی یا ستارہ پرستون کے عقائد کو زبانی سیکھا تھا، نہایت مفید ہوگا، کیونکہ قرآن اور توراۃ مین اکثر جگہ توافق پایا جاتا ہے، تاہم یہ بحث دوسرے درجہ کی بحث ہو گی، کیونکہ اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ قرآن مجید دیگر کتب آسمانی سے ماخوذ ہے تاہم یہ مشکل بحال خود باقی رہے گی، کہ آپ مین یہ مذہبی روح کہان سے آئی، اور وحدانیت کا ایسا مضبوط خیال کیونکر دل مین آیا، جو ان کے کم

روح پرچھا گیا ہم کو یہ بھی معلوم ہے کہ اظہار نبوت سے پہلے ان پر بڑی سختیان گذرین، اور انکو بہت سے مصائب جھیلنے پڑے، کیونکہ خدا نے ان کی فطرت ہی مذہب کے لئے بنائی تھی، اور یہی وجہ تھی کہ سب کو چھوڑکر انھون نے عزلت اختیار کی تاکہ بت پرستی اور تعدد آلہہ کی بدعت مین مبتلا نہ ہونا پڑے، جس کو عیسائیون نے خود ایجاد کیا تھا، ان دونون مذہبون کی نفرت ان کے دل مین بیٹھ گئی تھی، ان مذہبون کا وجود کانٹے کی طرح ان کے دل مین کھٹکتا تھا اس غرض سے کہ جو عظیم الشان تفکر یعنی وحدانیت کا خیال ان کے دل مین اتر گیا تھا محض اسی سے سروکار رکھین، کوہ حرا مین گوشہ نشینی اختیار کی یہان بیٹھ کر ان کے خیال نے دریاے فکر مین نہایت آزادی کے ساتھ جولانیان شروع کین، اس کے ساتھ وہ ہمیشہ عبادت اور تہجد مین مشغول رہتے تھے، اسی حالت مین کئی دن گذر گئے، ان مقامات کی راتین نہایت مفرح اور خوشگوار ہوتی ہین، یہان تک کہ عوام مین مشہور ہے کہ ملائکہ خدا سے اجازت مانگتے ہین کہ آسمان سے اتر کر وہ ایک دن ان راتون کے سمان کا لطف اٹھائین،

اللہ اکبر! معلوم نہین یہ چہل سالہ شدید الذہن جوان جس کا شمار ان مشرقی لوگون مین ہے جو قوت ادراک اور حدت تخیل مین فرد ہین، اور جنکا یہ کام نہین کہ منصوبے ہی گھڑا کرین اس وقت کیا سوچ رہا تھا، وہ ہر بار یہی کہتا تھا اور برابر کہے جاتا تھا "خدا ایک ہے" "خدا ایک ہے" یہ وہ الفاظ ہین، جنکو اس کے بعد تمام مسلمان ہمیشہ دہرایا کئے، اور جن کو ہم عیسائیون نے اس وجہ سے فراموش کردیا کہ توحید کے خیال سے ہم بہت دور پڑ گئے ہین،

پیغمبر کا خیال برابر اسی دُھن مین مشغول رہا، یہان تک کہ یہی خیال مختلف صورتون مین جلوہ گر ہوکر ان کے سامنے آیا، لم یلد ولم یولد ولم یکن لہ کفواً احد، عربی زبان مین مترادف الفاظ کی کثرت نے محمد صلعم کو اس بلند خیال کے بار بار ادا کرنے مین بہت مدد دی

جس کو وہ ظاہر کرنا چاہتے تھے اور انھین انکار اور اسی طرز پرستش سے اسلام کا یہ جملہ پیدا
ہوا کہ لا الٰہ الا اللہ یہی اصلی اعتقاد ہے، اُس یکتا خدا بے نیاز کا جو عیوب سے پاک ہے عقل
کا اس اعتقاد کو خیال مین لانا آسانی ممکن ہے، یہ ایک ایسا قوی اعتقاد ہے جس پر مسلمان ہمیشہ
یقین کرتے آئے ہین اور جس کی وجہ سے وہ تمام اور قبایل اور اقوام سے ممتاز ہین، در حقیقت انھی
کے ایمان کو ایمان کہا جا سکتا ہے، جیسا کہ انکا خود دعوی بھی ہے، یہ بالکل نا ممکن ہے کہ یہ
اعتقاد محمد صلعم کو توراۃ اور انجیل سے پہونچا ہو، کیونکہ وہ اگر ان کتابون کو پڑھتے تو اٹھا کر
پھینکدیتے، کیونکہ وہ دیکھتے کہ اسمین تثلیث موجود ہے، جو ان کی فطرت اور ان کے مذاق
طبعی کے خلاف ہے، ایسے اعتقاد کا دفعۃً انکی زبان سے ظاہر ہونا، ان کی زندگی کا بڑا
مظہر ہے، اور فی نفسہ یہی آپکی پیغمبری اور آپ کی دیانت فی النبوت کی دلیل اعظم ہے،

قرآن کی وحی کا مسئلہ اور بھی زیادہ مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہے، کیونکہ ارباب بحث اسکو
معقول طور پر حل نہین کر سکے، عقل بالکل حیرت زدہ ہے کہ اس قسم کا کلام اس شخص کی
زبان سے کیونکر ادا ہوا جو بالکل ان پڑھ تھا، تمام مشرق نے اقرار کیا ہے، کہ یہ وہ کلام
ہے کہ نوع انسانی لفظاً و معناً ہر اعتبار سے اسکی نظیر پیش کرنے سے عاجز ہے، یہ وہی کلام
ہے، کہ جب عتبہ بن ربیعہ نے اس کو سنا تو اس کے حسن پر حیرت زدہ رہگیا، یہ وہی کلام
ہے جسکی بلند انشا پردازی نے عمر بن خطابؓ کو مطمئن کر دیا، اور وہ خدا کے معترف ہوگئے
یہ وہی کلام ہے، کہ جب یحیٰی کی ولادت کے متعلق اس کے جملے جعفر ابن ابی طالب نے نجاشی
کے سامنے پڑھے تو اس کی آنکھون سے آنسو جاری ہوگئے، اور بیتاب چلا اٹھا کہ یہ کلام اسی
سر چشمہ سے نکلا ہے، جس سے عیسیٰ کا کلام نکلا تھا،

عربون کی صلح پسندی اور بے تعصبی۔

جب عرب ایمان قبول کر چکا، اور لوگون کے دل اسلام سے منور ہو چکے، تو اب اسلام دنیا کو ایک دوسرے لباس مین نظر آیا یعنی نرمی، اور آزادی خیالات، یا تو قرآن مین تہدید آمیز آئتین نازل ہوتی تھین یا اب پے در پے اس قسم کے احکام آنے لگے۔

لا اکراہ فی الدین، قد تبین الرشد من الغی،	مذہب مین زبردستی نہین راستی گمراہی سے صاف الگ ہے،
ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم،	یہ لوگ خدا کے سوا جن لوگون کو پکارتے ہین (یعنی معبودان باطل) انکو گالی نہ دو ورنہ بہانت سے وہ بھی خدا کو گالی دین گے،
واصبر علی ما یقولون واھجرھم ھجرا جمیلا،	اے محمدؐ! ان کی باتون پر صبر کر اور ان سے کنارہ کر معقول طریقہ سے،

عرب کے اسلام لانے کے بعد پیغمبر صلعم کی تعلیمات اسی طرح کی تھین اور آپ کے خلفا نے بھی اسی کی تقلید کی، اس بنا پر ہم کو رابنسن کے اس قول کے ساتھ متفق ہونا پڑتا ہے، کہ صرف محمد صلعم ہی کے پیروون مین یہ بات پائی جاتی ہے، کہ انھون نے جوش مذہب اور حسن سلوک کو ساتھ ساتھ رکھا، یہ جوش مذہب عرب کی فتوحات کا سبب ہوا، لیکن اس قسم کے سبب مین کوئی ہرج نہین،

جب اسلام کی کامیاب فوجون نے شام پر چھاپہ مارا، اور بجلی کی طرح شمالی افریقیہ

پر بحر احمر سے لیکر، اٹلانٹک تک چلیں، تو قرآن اپنے دو نون شہرون کو پھیلائے ہوئے، ان کے پیچھے پیچھے تھا، اس بنا پر اسلامی فوج کے طریق عمل مین کہین ظلم کا نشان نظر نہین آتا، بجز ان امور کے جن سے مفر نہین ہو سکتا، مسلمانون نے کسی قوم کو اس بنا پر قتل نہین کیا، کہ وہ اسلام لانے سے انکار کرتے تھے، اگر ہم بربریون اور مسلمانون کی حملہ آوری کا مقابلہ کرین، تو ہم مانین گے کہ مسلمان نقصان کم پہونچاتے تھے، اور نرمی زیادہ کرتے تھے، مسلمانون کو جن قومون سے سابقہ پڑا، انھون نے انکو تین باتون کا اختیار دیا، اسلام، یا جزیہ، یا جنگ، ابوبکر صدیقؓ نے خالدؓ کو جب شام کی طرف بھیجا تو یہی ہدایت کی، یہ احکام عموماً عمل مین آتے تھے، لیکن بت پرست اس سے مستثنیٰ تھے، کیونکہ ان کے ساتھ اور طرح کا برتاؤ کیا جاتا تھا جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہین[1]،

بہتر ہوگا کہ ہم اس موقع پر، ابوبکر صدیقؓ کے احکام اور زبور کی پانچوین کتاب مین جو مدائن کے محاصرہ اور کلدانیون کے معاملہ کے متعلق ہے، موازنہ کرین، زبور مین ہے:-

"جب تو کسی شہر کا محاصرہ کرے، تو ان پر امان پیش کرے، اگر وہ لوگ امان قبول کرین، تو سب لوگ محفوظ رہین گے، لیکن اگر وہ لوگ انکار اور دشمنی کا اظہار کرین تو ان کا سخت محاصرہ کر، اور فتح حاصل ہونے کے بعد ہر شخص (مرد) کو قتل کر دے"

مسلمانون کو افریقہ اور ایشیا مین عیسائیون کی طرف سے بہت مقابلہ پیش آیا، جس کے بعد وہ نئے مذہب کی طرف مائل ہو گئے،

ایسے باعظمت کلیساؤن کا جیسے کہ کارتھج کے کلیسا تھے، اسلام کے زیر اثر آجانا ایک ایسا واقعہ ہے، جس کی وجہ ایک زمانۂ دراز سے لوگ یہ بیان کرتے ہین، کہ اسلام

---

[1] یہ مصنف کی غلطی ہے، اسلام نے بت پرستون کو بھی یہی اختیارات دیئے ہین،

نے تعصب اور سختی کا برتاؤ کیا، لیکن خود اس زمانہ کے معاصرین اس کی وجہ اقتضائے زمانہ کے موافق یہ بیان کرتے ہین، کہ عیسائی خدا کے غضب کے مستوجب تھے اس لئے خدا نے انکی کجروی کی سزا دی، عیسائی عابدون مین سے بعضون نے اس خیال کی تائید مین لوگون کو توبہ کی ترغیب دلانی چاہی، انھون نے نہایت مبالغہ سے کام لیا، اور عیسائیون پر سخت داروگیر کی اور لوگون کو یہ یقین دلانا چاہا، کہ اسلامی فوجین ایک آلہ ہین، جن کے ذریعہ سے خدا نے عیسائیون پر عذاب نازل کیا ہی؛

چونکہ اسلامی فتوحات اور کلیسا کا باہمی اختلاف، دونون واقعات ایک ہی زمانہ مین پیش آئے، اس لئے اگر مورخون نے دونون کو ایک ساتھ ملادیا، تو ان پر نکتہ چینی نہین ہوسکتی، خود فاتحین بھی قبول اسلام اور اطاعت وحکومت مین فرق نہین کرتے تھے لیکن یہ امر عموماً غلط مانا جاتا ہے، کہ ان دونون واقعات مین سے ایک کو دوسرے کا معلول قرار دیا جائے، ان دونون واقعات مین نہایت خفیف اثر پذیری کا تعلق ہے، جس طرح فتوحات اسلام نے عیسائیون کو ترک مذہب پر آمادہ کیا، اسی طرح کلیساؤن کے باہمی اختلاف نے اسلامی فتوحات کے لئے راستے صاف کردیئے؛

بشپ **آریوس** نے حضرت عیسیٰؑ کے خدا ہونے سے انکار کیا تھا، اس بنا پر اس نے گویا پیغمبر عرب کے لئے فوج طلایہ کا کام دیا، کیونکہ اس سے اسلام کے لئے راستہ صاف ہوگیا، کیونکہ اسلام بھی حضرت عیسیٰؑ کے متعلق یہی کہتا ہے، کہ وہ محمد (صلعم) کے قبل آخر الانبیا تھے؛؛ [1]؛؛ یہ گویا خرق عادت تھا، کہ اسکندریہ کا بشپ جس کا نام آریوس تھا، عیسائی مذہب کے مقابلہ کے لئے کھڑا ہوا، یہان تک کہ اس مذہب کی بنیادین متزلزل ہوگئین، اور تمام عیسائیون پر

[1] یہان تقریباً دو تین سطرون کا ترجمہ چھوڑ دیا گیا ہی جسکی وجہ یہ ہی کہ انکے معنی میری سمجھ مین نہین آئے،

ناامیدی سی چھا گئی، مقدس جیروم نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا، کہ "عالم کون اس بات سے حیرت زدہ ہے، کہ تمام لوگ کافر ہو گئے ہین، اور اب کسی کا یہ عقیدہ نہین رہا، کہ باپ (خدا) نے بیٹے کا جسم اختیار کر لیا تھا"

اگرچہ ان عیسائیون نے جو تبّس کے پیرو تھے، اس مذہب جدید کو دبالیا، تاہم افریقہ اور ایشیا کے کلیساؤن مین سخت اختلاف پیدا ہو گیا، اسلام جب لمبے لمبے قدم بڑھاتا آیا تو ان لوگون (پیروان آریوس) نے اسکو کوئی نیا مذہب نہین سمجھا، بلکہ عیسائی مذہب سمجھ کر اسکو قبول کر لیا

اسلام کی وسعت کا ایک اور بھی سبب ہے، یعنی قسطنطنیہ کی جابرانہ حکومت، یہ سلطنت انتہا درجہ کی ظالم تھی، حکام کا ظلم اس حد تک پہونچ گیا تھا کہ لوگ جان سے عاجز آگئے تھے، جب اسلام کا قدم آیا، تو لوگون نے اسلام کے سایہ مین پناہ لی، کیونکہ جو شخص اسلام لاتا تھا، وہ ٹیکسون اور تاوانون سے بچ جاتا تھا، اور مال مسلوبہ اسکو واپس مل جاتا تھا، جو لوگ اسلام نہین قبول کرتے تھے ان سے بھی یہی برتاؤ کیا جاتا تھا صرف جزیہ ان سے لیا جاتا تھا جس کی مقدار نہایت کم ہوتی تھی، یعنی آمدنی کا دسوان یا بارھوان حصہ (یہ غلط ہے، جزیہ کی مقدار بڑے سے بڑے دولتمند کے لئے بھی کبھی ۴۸ درہم سے زیادہ نہین ہوسکتی تھی، جزیہ کی یہ انتہائی تعداد تھی، آمدنی کے حصہ سے اسکو کوئی نسبت نہ تھی، مترجم)

اسلام کے سایہ مین عیسائی مطمئن ہو گئے، دعاۃ اسلام مین کوئی شخص ان کے مذہب سے متعرض نہین ہوتا تھا، اور دراصل عیسائی اور مرتدون مین کوئی فرق نہین کیا جاتا تھا، یہ برتاؤ وہ تھا، جس کا خود قرآن نے حکم دیا تھا، اور خلفائے اولین اس پر کاربند تھے، یہودی اور عیسائی ذمی کہلاتے تھے غیر مذہب والون کی تین قسمین تھین، ذمی، مستامن، حربی، ذمی اس کو کہتے تھے جو اسلام کے زیر حکومت ہو، اور جزیہ ادا کرتا ہو، اس کو یہ

حقوق حاصل تھے، کہ وہ اپنے مذہب کے مطابق اپنے خدا کی عبادت کر سکتا تھا، اس کو اسلام پر مجبور نہین کیا جاتا تھا، وہ قوانین سلطنت کا پابند ہوتا تھا، اور شخصی قانون مثلاً نکاح، طلاق وراثت مین اس کے مذہب کے موافق عمل کیا جاتا تھا، البتہ جب کسی معاملہ مین اسکا فریق ثانی مسلمان ہوتا تھا تو مذہب اسلام کے مطابق عمل ہوتا تھا،

یہ سخت غلطی ہے کہ ذمی کے لفظ سے دنی اور بزدل کے معنی مراد لئے جائین، درحقیقت اس لفظ کے معنی امان یافتہ کے ہین،

مستامن اُس شخص کو کہتے ہین، جو سفر مین ہو، اور احکام سلطنت و قوانین حکومت کے زیر حمایت زندگی بسر کرتا ہو،

حربی وہ ہے، جو اس ملک مین رہتا ہے جو علانیہ اسلام کا دشمن اور حریف جنگ ہے، یا جہان مسلمانون کو امن نہین، ایسا شخص جب اسلامی شہر مین آئے، اور آمادۂ جنگ ہو تو وہ قتل کر دیا جائیگا، مگر اس حالت مین کہ اسلام قبول کرے، اس حالت کے سوا، باقی سب مستامن ہین، بشرطیکہ جزیہ ادا کرین حضرت علیؓ کا قول ہے، کہ جزیہ اس لئے ہے، کہ ذمی کی جان و مال مسلمانون کے جان و مال کے برابر ہو جائے،

اس نرمی اور حسن معاملت کی وجہ سے اسلام کو ترقی ہوئی کیونکہ ممالک مشرقی کے سلاطین کے ظلم نے تمام لوگون کو بیزار کر دیا تھا، اور لوگ ان سے سخت نفرت کرنے لگے تھے،

اب اگر ہم ابتداے فتح کے زمانہ کو چھوڑ کر اس زمانہ کی طرف آئین، جب کہ اسلام کی حکومت نے استقلال حاصل کر لیا، تو ہم کو صاف نظر آئیگا، کہ اسلام، مشرقی عیسائیون کے مقابلہ مین کہین زیادہ نرم خو اور صلح جو تھا،

عرب نے عیسائی رسوم مذہبی کا کبھی معارضہ نہین کیا، اہل روما نہایت آزادی سے

اُن پیشوایان مذہبی سے خط کتابت جاری رکھتے تھے، جو اُن کے ہی حاکم تھے ۱۰۵۳ء مین پوپ نے جس کا نام لیون تھا، افریقہ کے عیسائیون کو ایک خط لکھا جسمین تاکید کی تھی، کہ کارتھیج کے بشپ کو لارڈ بشپ تسلیم کرین، اس زمانہ مین مسلمانون اور عیسائیون مین کامل اتحاد تھا یہان تک کہ گریگیورس ہفتم نے ۵ ستمبر ۱۰۷۶ء مین عیسائیون کو ایک خط لکھا جسمین انکو ملامت کی تھی، کہ انھون نے بشپ کے دربار مین مسلمانون کی شکایت کیون پیش کی،

اس غیر معمولی صلح جوئی کے ساتھ بھی جو مسلمان فاتحون کی طرف سے مفتوحین کے مقابلے مین عمل مین آتی تھی، عیسائی مذہب نہایت کمزور ہوتا جاتا تھا، یہان تک کہ شمالی افریقہ سے یہ مذہب بالکل معدوم ہوگیا، حالانکہ اسلام مین دعوتِ اسلام کے لئے کوئی فرقہ مخصوص نہ تھا جیسا کہ عیسائیون مین ہے، اگر اسلام مین بھی داعیان مذہب ہوتے تو ہم کو اسلام کی ترقی کے سبب کے دریافت کرنے مین کوئی مشکل پیش نہ آتی کیونکہ ہم دیکھتے ہین کہ شارلمین اپنی لڑائیون مین ہمیشہ پادریون اور رہبانون کا ایک گروہ ساتھ رکھتا تھا، کہ جس طرح وہ خود اپنی ان فوجون سے شہرون کو فتح کرتا پھرتا تھا جو قیامت انگیز لڑائیان لڑتی تھین اسی طرح پادری لوگون کے قلوب اور طبایع کو مسخر کرلین، لیکن اسلام مین نہ کوئی مذہبی انجمن ہے، نہ رسول ہین، نہ احبار ہین، نہ راہب ہین جو فوجون کے ساتھ ساتھ رہین، کوئی شخص تلوار یا زبان کے ذریعہ سے اسلام لانے پر مجبور نہین کیا گیا، بلکہ اسلام نے خود لوگون کے دلون مین گھر کرلیا، اور یہ اس اثر کا نتیجہ تھا، جو قرآن کی دلآویزی اور فریبندگی کا خاصہ ہے،

بے شبہہ ان لوگون نے بھی اسلام قبول کیا، جنکی غرض دنیاوی تمتع تھی، لیکن انکی تعداد ان لوگون کے مقابلہ مین بہت کم ہے، جو دلی اور سچی خواہش سے اسلام لائے،

قبول اسلام مین اس لئے بڑی آسانی ہوئی کہ مذہب اسلام ایک سیدھاسادھا مذہب ہے، جس کیلئے کلمۂ توحید پڑھنا کافی ہے، ان باتون کے ساتھ بھی یہ نظر نہین آتا، کہ استقلال حکومت کے بعد عیسائیون کے کسی گروہ نے دفعۃً واحدۃً اسلام قبول کیا ہو، بلکہ یہ ضروری تھا، کہ جو شخص اسلام لانا چاہے وہ قاضی کے ہاتھ پر اسلام لائے، اور ایک محضر لکھے، جسمین یہ تصریح ہو کہ وہ سچے اعتقاد سے بغیر کسی دباؤ اور خوف کے اسلام قبول کرتا ہے، کیونکہ کوئی شخص تبدیل مذہب پر مجبور نہین کیا جا سکتا، (یہ محضر ضمیمہ سوم مین درج ہے)

دولت بنوامیہ کے زمانے مین، نہایت کثرت سے عیسائیون نے اسلام قبول کرنا شروع کیا، یہان تک کہ خود خلفانے اس ترقی کو اس لحاظ سے پسند نہین کیا، کہ بیت المال کی آمدنی کو نقصان پہونچتا تھا، چنانچہ امیر معاویہؓ کے زمانہ مین مصر مین جزیہ کی آمدنی حضرت عثمانؓ کے زمانے کی نسبت سے آدھی رہگئی تھی، اس بنا پر خلفائے قبول اسلام کی وسعت کو اس طریقے سے تنگ کر دینا چاہا، کہ نومسلم بھی جزیہ سے معاف نہ کئے جائین، چنانچہ حیان نے عمر بن عبد العزیزؒ کو خط لکھا کہ اگر یہی حالت رہی تو اس ملک کے تمام عیسائی مسلمان ہوجائینگے، اور نتیجہ یہ ہوگا کہ خزانہ شاہی کو سخت نقصان پہونچیگا، لیکن عمر بن عبد العزیزؒ نے خط پڑھکر ایک شخص کو حکم دیا، کہ حیان کے پاس جاکر اس کو تیس درے لگائے، اور اس سے کہے کہ اس سے بڑھکر کیا سعادت ہوگی، کہ تمام عیسائی مسلمان ہوجائین، خدا نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اسلئے بھیجا تھا کہ وہ اسلام کی تبلیغ کرین نہ اس لئے کہ خراج اور ٹیکس لگائین،

مسلمان اگر بیت المال کے خالی ہوجانے سے خوف کرتے تھے، تو یہ کچھ تعجب کی بات نہین الجزائر (مقبوضۂ فرانس) مین ٹیکس کا بار زیادہ تر مسلمانون پر ڈالا جاتا ہے، فرض کرو، کہ تمام مسلمان عیسائی ہوجائین، اور ان کو وہ تمام حقوق دیدیئے جائین جو عیسائیون کو حاصل ہین،

تو آمدنی کے گھٹ جانے سے ہکو سخت پریشانی ہوگی،

اسپین مین مسلمانون نے عیسائیون کے ساتھ اور بھی زیادہ نرمی کا برتاؤ کیا، یہان تک کہ انکی جو حالت قدیم جرمنیون کی سلطنت کے زمانے مین تھی، اس سے کہین بڑھکر وہ خوش حال ہوگئے، پروفیسر دوزی کہتا ہے کہ مسلمانون کی فتح نے اسپین کو کچھ نقصان نہین پہونچایا، ابتدائے فتح کے زمانہ مین جو برہمی اور اضطراب پیدا ہوا تھا، وہ استقلال سلطنت کے بعد جاتا رہا، مسلمانون نے تمام باشندون کے مذہب، شریعت، اور عدالت کو قایم رکھا، انکو ملکی عہدے دیے یہانتک کہ بعض خود خلفا کے دربار مین ملازم تھے، اکثر ون کو فوجی عہدے دیئے گئے، اس رحیمانہ سیاست نے اسپین کے عقلا کو مسلمانون کی طرف مائل کر دیا، یہان تک کہ مسلمانون اور عیسائیون مین کثرت سے نکاح اور رشتہ داریان ہوگئین، سیکڑون عیسائی اپنے مذہب پر قائم رہنے کیساتھ عرب کی تہذیب و تمدن کے دلدادہ ہوگئے، یہان تک کہ انھون نے عربی زبان اور عربی علوم و فنون کی تحصیل شروع کی، بشپ اور پادری انکو ملامت کرتے تھے کہ وہ گرجا کے گیت چھوڑتے جاتے اور مسلمانون کا شعار اختیار کرتے جاتے ہین،

اس زمانہ مین مذہبی آزادی انتہا درجہ کو پہنچ گئی تھی، اسی بنا پر جب یورپ نے یہودیون پر جبر کرنا چاہا، تو انھون نے خلفائے اندلس کے سائے مین پناہ لی، بخلاف اس کے جب چارلس نے سرقوسہ پر قبضہ کیا، تو حکم دیا کہ یہودیون اور مسلمانون کی تمام عبادتگاہین برباد کردیجائین، ہم کو معلوم ہے، کہ صلیبی لڑائیون کے زمانہ مین عیسائی جہان پہونچے انھون نے مسلمانون اور یہودیون کو ایک طرف سے قتل کر دیا، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہی کہ یہودیون نے اگر کوئی اپنا ملجا و ماوی پایا، تو مسلمانون ہی کو پایا، اور آج دنیا مین جو یہودی موجود ہین، یہ مسلمانون ہی کی عنایت ہی، ہنڈیکر شائلین نے اسکی وجہ یہ بیان کی ہے کہ مسلمان

اور یہودی نسب مین، زبان مین، مذہب مین متحد ہین، یہ غلط ہے،

مسلمانون نے اندلس کے عیسائیون سے صرف جزیہ طلب کیا، جو معمول عام تھا،
اس موقع پر ایک لطیفہ کا بیان کرنا موزون ہوگا، جس کو ایک عرب مورخ نے لکھا ہے،
اور جس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ جزیہ کے بارے مین ان کا کیا خیال تھا، اور یہ کہ مسلمانون
اور عیسائیون مین کیسے تعلقات تھے،

دولتِ فرانس اور اسلام

اسلام اپنی قوت اور زندگی پر یہ استدلال پیش کرتا ہے کہ اس نے وسط **افریقہ**،
حبش کے شرقی حصہ سوڈان، سرِ **نیاق** ان تمام مقامات مین بت پرست قومون کو قرآن کے
علم کے نیچے مجتمع کر دیا، جو اس کی عجیب و غریب طاقت اور حیرت انگیز رفتار کی دلیل ہے، بچا سا
برس ہوئے ان ممالک مین **مہدی** اور امام **جنوب** کی سلطنتین اس نمونہ کے موافق قائم ہوئی
ہین، جو مذہبی حکومت کی تصویر ہے، اور جس کو پیغمبر اسلام نے پیش نظر رکھا تھا، اسی طرح
اس کے مقابل جانب ایک اور تیسری حکومت شمالی افریقہ مین قائم ہوئی ہے، جو عیسوی مذہب
کے حملون کا کامیابی سے مقابلہ کر رہی ہے، یعنی مراکو کی سلطنت گو اس ملک کی بعض قومین
اس سلطنت کی مطیع نہین ہین، تاہم اگر کوئی آفت آئی تو کچھ شبہہ نہین کہ تمام مغرب مین
یہ سلطنت حامی اسلام ثابت ہوگی،

یہ وہ ممالک ہین، جہان مذہب اور پالٹکس دونون کی باگ ایک شخص کے ہاتھ
مین ہے، جیسا کہ قرآن کی تعلیم ہے، یہ وہ ممالک ہین، جن کے لئے اہل مکہ نے دار السلام کا
لقب خاص کر دیا ہے، اور یہ وہ لقب ہے، جس کی ہوس مصر اور ٹرک کے دل مین ہے،

لیکن بے فائدہ، کیونکہ ان مقامات مین اصلی مذہب کو مغربی تمدن نے غبار آلود کر دیا ہی لیکن ابھی ہم ان ممالک کی حالت سے بحث نہین کرتے بلکہ ہم صرف الجیریا، اور فرنچ افریقہ سے بحث کرتے ہین، جہان عیسوی مذہب اور عیسوی سلطنت اسلام سے ٹکر لڑ رہی ہے، یہ وہ ممالک ہین جس کو مسلمان دار الحرب یعنی دار الجہاد کہتے ہین، یہان اسلام کی جو حالت ہے، اس کے متعلق تین حیثیتون سے بحث ہو سکتی ہے،

کیا انجیل نے قرآن مین کوئی تبدیلی پیدا کی ہے،

اور اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ اسلام ہمیشہ اپنی حالت کو قائم رکھے گا، تو یہ سوال ہے کہ آیا عیسائیون اور مسلمانون مین کسی قسم کا ربط پیدا ہوا ہے، جس سے آیندہ یہ امید ہو کہ دونون مین امتزاج تام پیدا ہو جائیگا،

اور کیا یہ خوف ہمیشہ قایم رہے گا، کہ مسلمان کسی دن جہاد پر آمادہ ہو کر ان ممالک پر چڑھ نہ آجائین،

پہلے سوال کا جواب یہ ہے، کہ کوئی مسلمان اپنا مذہب چھوڑ کر دوسرے مذہب کی طرف مائل نہین ہو سکتا، مسلمانون کے خیال مین بھی یہ بات نہین آسکتی، یہان تک کہ ان کو اپنی زبان مین کوئی لفظ نہین ملتا، جس کے ذریعہ سے وہ ایسے شخص کے اوصاف بیان کر سکین، جن مسلمانون نے فرنچ وضع اختیار کر لی ہے، چونکہ اس مین بھی ارتداد کی بو ہے، اس لئے مسلمان ان کی نسبت بھی متحیر ہین، کہ ان کو کس نام سے پکارین، چنانچہ انھون نے مجبوراً فرنچ زبان کا ایک لفظ انتخاب کیا ہے، جس کو وہ ان لوگون کے حق مین استعمال کرتے ہین،

یہ لفظ متورنی ہے، جس کے معنی مرتد کے ہین، اگر کوئی عیسائی کسی مسلمان کو عیسائی بنانا چاہے، تو اس وقت کی کیفیت کا بیان کرنا سخت مشکل ہے، اس کا اندازہ کسی قدر اس حالت

ہین ہوسکتا ہے، جب کسی عیسائی کو بت پرست بنانے کا ارادہ کیا جائے لیکن یہ شبہ بھی پوری نہین، مسلمان کا عیسائی ہونا اس وجہ سے سخت مشکل ہے، کہ وہ عیسائیون کو سخت ذلیل سمجھتا ہے، اس کو اپنے موحد ہونے پر بے انتہا ناز ہے،

مسلمانون کا یہ یقین ہے، کہ ان کا مذہب عیسائیت سے اس قدر افضل ہے، کہ یہ ناممکن ہے کہ عیسائی اسلام کی صحت کا قائل نہ ہو، یہان تک کہ ہم عیسائی جو مسلمانون سے بے تعصبانہ ملتے ہین تو مسلمان سمجھتے ہین، کہ یہ اسی خیال کا اثر ہے، مسلمان کو اس پر ناز ہے، کہ وہ خدا کی عبادت نہایت طریقہ سے کرتا ہے، اس کے مذہب کو ظاہری علامتین اور سروسامان درکار نہین، اسکو عیسائیون کے مذہبی جلسون مین بت پرستانہ عبادتین نظر آتی ہین، مسلمان عیسائیون کو اہل کتاب کہتے ہین، لیکن ان کو اپنا ہمسر نہین سمجھتے بلکہ اکثر تو عیسائیون کو بت پرستون سے بدتر سمجھتے ہین، کیونکہ وہ سمجھتے ہین کہ خدا نے جو مذہب ان پر اتارا تھا، اس کو عیسائیون نے جان بوجھ کر بدل دیا،

مذہب عیسوی کے متعلق مسلمانون کے یہ خیالات ہین، ظاہر ہے، کہ یہ خیالات عیسائیت کی ترقی کے کس قدر سدراہ ہین، پادریون کو مختلف قومون کے عیسائی بنانے مین ہر جگہ کامیابی ہوئی، وحشی قومون مین بھی اور شائستہ قومون مین بھی، لیکن مسلمانون مین وہ جہان گئے، انکو کامیابی کا دروازہ ہر طرف سے بند ملا، بت پرست تو مین جب مہذب ہوئین تو انھون نے اپنے وحشیانہ مذہب کو فوراً چھوڑ دیا، کیونکہ وہ ان کی عقل کے موافق نہ تھا، ان کی شائستگی نے ان کو آمادہ کر رکھا تھا، کہ وہ خالص عقلیات کو قبول کر لین، اس لئے جب پادریون نے منطقی دلائل سے اپنا مذہب ان کے سامنے پیش کیا، تو انھون نے فوراً قبول کر لیا، مقدس پولوس کو اکثر بت پرستون سے سابقہ پڑتا تھا، جو اپنے خدا کو اس لئے چھوڑ دیتے تھے، کہ ان کا جھوٹا ہونا ان پر ثابت ہو جاتا تھا، یونانی بھی اکثر دلیل اور برہان کی طرف مائل نظر آتے تھے، وحشی

بت پرستون کا عیسائی ہونا اس لئے آسان تھا کہ پادریون کو ان پر علمی تفوق حاصل تھا، لیکن یہ کس پادری کے امکان مین ہے، کہ کسی مسلمان کو اس کے مذہب کی طرف سے متزلزل کر دے، اور اس چیز کی اس سے عبادت کرالے جس کو وہ حقیر سمجھ رہا ہے، یا اصل مذہب کو اسکی نظر مین بے وقعت کر دے جس کو وہ منتہاے عزت خیال کرتا ہے،

مسلمانون کے دل مین عیسائیت کے خلاف جو خیال جم گیا ہے اور وہ ابدی ہے، پادری اس کو کیونکر اس کے دل سے دور کر سکتے ہین، درانحالیکہ مسلمان اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کرنا بھی پسند نہین کرتا، اور نہ کسی قسم کی بحث کی برداشت کر سکتا ہے،

یہان یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان، استدلال اور حجت سے عیسائیت کے قبول کرنے پر آمادہ نہین، تو یہ کیا ممکن نہین کہ زور شمشیر سے کام لیا جائے، اس کا جواب یہ ہے اگر فرنچ مین فتح کے وقت بھی مسلمانون کو عیسائی نہین بنا سکتے تھے، جیسا کہ شارلمین نے کیا تھا، اس لئے مجبوراً کلیسا کو سکوت سے کام لینا پڑا، جیسا کہ آج تمام قومون نے سالمت کا پہلو اختیار کر لیا ہے، لیکن کلیسا اس سالمت کو مذہب عیسوی کا کوئی مسئلہ مسلمہ نہین قرار دیتا، بلکہ اس سے صریح انکار کرتا ہے،

الجیریا مین جو معاہدہ ہوا، اس کی رو سے کسی پر مذہبی جبر کرنا بالکل ممنوع ہے، کیونکہ فرنچ گورنمنٹ نے جنرل بورمان کے توسط سے معاہدہ کیا تھا، کہ اہل عرب کے مذہب سے تعرض نہین کیا جائیگا، اور اس کی عزت کیجائے گی، اس معاہدہ کے خلاف لیطور استثنا کے ایک واقعہ پیش آنے کے قریب تھا، اسکی تفصیل یہ ہے، کہ ۱۸۶۸ء مین الجیریا کے بشپ کو مذہبی حمیت کا جوش پیدا ہوا، اور اس نے چاہا کہ بہت سے مسلمانون کو عیسائی بنالے، چنانچہ الجیریا کے عظیم الشان قحط کے بعد اس نے بہت سے یتیمون کو اس غرض سے جمع کیا، لیکن جنرل

ملکوہین نے جو الجیریا کا گورنر تھا بشپ کی مخالفت کی، اور اس کوشش کو اس بنا پر چلنے نہ دیا کہ یہ معاہدہ کے خلاف ہے،

ایک عجیب متناقض بات یہ ہے، کہ الجیریا مین آج ایسے لوگ بھی موجود ہین جنکو اس پر افسوس ہے، کہ یہ طریقہ کیون نہین اختیار کیا گیا، لیکن یہی لوگ، اگر پایۂ تخت (فرانس) مین ہوتے تو ان لوگون کی صف مین کھڑے ہوتے، جو بڑے زور سے اس بات کے حامی ہین، کہ تمام مذہبون کو آزاد رہنا چاہیے، گویا کہ وہ ایسی سلطنت کے آرزومند ہین، جو ایک طرف تو غیر مذاہب کو زر و مال کی دلفریبی سے منتشر کرنے کی کوشش کرے، اور دوسری طرف موحد مسلمانون سے جنگ کی تیاری کرے، اگر کوئی چالاک پادری ہمت کر کے ابتدائے زمانۂ فتح مین کھڑا ہوتا، اور اس کے اس مشن کا امرائے سلطنت مین سے کوئی ایسا پرجوش ممبر ہوتا جس کو خود بھی عیسائی مذہب کی اشاعت کی طرف توجہ ہوتی، یا دلفریب عورتون کے ذریعہ سے مذہبی اشاعت کی طرف اسے التفات دلایا جاتا، اور ان سے جاہ و منزلت کا بھی اقرار کیا جاتا تو بہت آسانی سے ہزارون عرب اپنے اپنے مذہب کو خیرباد کہہ کے فرانسیسی مذہب کے پیرو بنجاتے، مسلمانون کا کمیشن کے اشارہ سے عیسائی مذہب کی مخالفت اور کسی دباؤ سے ان کا متاثر نہ ہونا یہی دو سبب ہین جو عیسائیت کو اسلام مین قدم رکھنے کی اجازت نہین دیتے، گو کہ کیتھلک مشنری نے پہلے ہی یہ سمجھا دیا کہ اس وعظ و نصیحت سے مسلمانون کے قلوب عیسائیت کے طرف مائل نہین ہو سکتے، مگر باوجود ان دقتون کے انھون نے اپنے مقصد سے کنارہ کشی نہ کی، اور نہ انھون نے جد و جہد سے ہمت ہاری، اور نہ اسلام کے شکست دینے کی دشواریون کا خیال کر کے ان کی ہمتین پست ہوئین، جہان پہونچے اپنے مقاصد مین کامیاب ہونے کی تدبیرین کین، فقرا و مساکین کی مالی امداد کی، چھوٹے بچون مین تعلیم

پھیلائی، بیمارون کی خدمتین کین، مسٹر سرلیفاریا لکھتا ہے، کہ انھون نے باوجود ان تمام احسانات کے ان کے مذہب مین کبھی دست اندازی نہ کی، بلکہ انھون نے اپنا مقصد ان کو مذہبی خیالات سے علیحدہ رکھنا قرار دیا، کیونکہ ان کا اب یہ خیال تھا کہ اگر ہم انجیل کو عرب مین شایع نہ کر سکیں تو اس مین کچھ شک نہین، کہ سلطنت فرانس کے اقتدار کو ان لوگون مین اس بہانے سے عمدہ طریقہ سے پھیلا سکین گے، اور ان احسانات کے ذریعہ سے ان کے دلون مین سلطنت سے ہمدردی کا بیج بو سکین گے،

تعدد ازواج

قرون وسطیٰ مین عام خیال تھا کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کا سب سے بڑا کام تعدد ازواج ہے، کیونکہ انھون نے اس کے ذریعہ سے لوگون کو اسلام کی طرف مائل کیا، پیرون ستم ظریفی سے کہتا ہے کہ "اسلام نے عورتون کے لیے بھی متعدد شوہرون کا وعدہ کیا ہے" عیسائی واعظون نے انھین جھوٹی روایتون پر اعتماد کرکے اسلام کو یہ خطاب دیئے ہین "چارپایون، اونٹون اور جانورون کا مذہب" رینان نے ابن رشد کی جو سوانحعمری لکھی ہے، اسمین لکھتا ہے کہ "یہ مذہب .... کا یا ان لوگون کا ہے، جو غریق شہوت ہین"

تعدد ازواج ہم تہذیب یافتہ لوگون کے اخلاق اور بالخصوص ہماری مذہبی رسوم پر نشتر کا کام دیتا ہے، شریعت موسوی مین تعدد ازواج موجود تھا، اور گو حضرت موسیٰ کی شریعت بھی حضرت عیسیٰ کی شریعت کی طرح الہامی شریعت ہے، تاہم ہم اس مسئلہ کو نہین سمجھ سکتے، پادری بروغلی کہتا ہے کہ "یہ ایک ایسا حکم ہے جس کا مقصد سمجھنا مشکل ہے، خدا نے خاص حالتون مین اسکو جائز کر دیا تھا، جسکو ہم نہین سمجھ سکتے،" مین سمجھتا ہون کہ پادری موصوف

اور ان کے ہم خیالون کو یہ ڈر پیدا ہوتا ہوگا کہ مذہب عیسوی کو ایسے دو مذہبون کے ہمسایہ
مین رکھکر داغ نہ لگ جائے جو منزل من اللہ ہین، اور جن کے مسائل مذہب عیسوی کے
مخالف ہین لیکن ہم اگر یہ تسلیم کر لین کہ شریعت الٰہی بھی اُن مصلحتون کو ملحوظ رکھتی ہی جو شریعت
انسانی مین ہوتی ہین، تو کیا ہرج ہے، انسانی قانون احکام مین نہایت احتیاط سے کام
لیتا ہی، اور وقت اور موقع کی تمام ضرورتون کا لحاظ رکھتا ہی، تو پھر شریعت الٰہی مین اس قسم
کی احتیاط اور مراعات نہ ہونے کی کیا وجہ ہی، مانسیو دولسٹ جو ایک بڑا متکلم شخص ہی، اسکی
بھی یہی رائے ہی، کہ سب سے پہلے جو اخلاقی شریعت خدا نے نازل کی وہ لوگون کے حالات اخلاق
اور زمانہ کی ضرورتون کے موافق تھی بیشک قومون کے اخلاق مین ایک نقص پایا جاتا ہی، جو
انکی اصل فطرت مین موجود ہی، اور جسکی تلافی ابد تک نہین ہو سکتی یعنی کثرت شہوت بے شبہہ
ایک اخلاقی عیب ہی، لیکن بہر حال جسم کی قوت اور صحت کی دلیل ہی، مشرق کے مردون مین
مغرب کی بہ نسبت زیادہ قوت اور جوش پایا جاتا ہی، اس لئے بعض علما ے علم طبایع الامم
کی راے ہے، کہ چونکہ مشرقی لوگون مین غایت درجہ کی قوت پائی جاتی ہی، اسلئے تعدد ازدواج
ان قومون کے لئے ایک ضروری چیز ہی،

عجائبات قدرت جنکے خیال سے عقل حیرت زدہ ہو جاتی ہی، ان مین ایک یہ بھی
ہے کہ مغرب مین خدا متعدد ہین لیکن بیوی صرف ایک بخلاف اس کے مشرق مین خدا ایک
ہے اور بیویان متعدد، متعدد خدا اور جورو ایک اہل مغرب کے مناسب ہی، اور متعدد جورو اور
ایک خدا اہل مشرق کے لئے موزون ہی،

چونکہ اہل مغرب و اہل مشرق کے مذہب، تمدن اور نوعیت مین کلیۃً اختلاف ہی،
اسلئے ہم مغربی لوگ قرآن کے احکام کو جو تعدد ازواج کے متعلق ہین اچھی طرح سمجھ نہین سکتے"

ایک بڑا ضروری پہلو جسکو محققین نے ہمیشہ نظر انداز کر دیا، یہ ہی کہ تعدد ازدواج عرب کی قدیم عادت ہی، جو اسلام سے بہت پہلے بھی موجود تھی، عرب مین تعدد ازدواج مساجد کے وجود پر مقدم ہے، اس لئے پادری پروغلی کا یہ قول کلیۃً غلط ہی، کہ تعدد ازدواج اسلام کیساتھ پیدا ہوا، یہ امر قطعی ہے کہ قبائل عرب جو اسلام لائے وہ اسلام سے پہلے بھی اسی طریقہ پر تھے جیسا کہ آج حبشی قومون کا حال ہی، جو عموماً اسلام کی طرف مائل ہین، قرآن مجید مین جس حد تک تعدد ازدواج ہی، قبائل عرب اور سودان مین اس سے کہین زیادہ رواج تھا، قرآن مجید مین صرف چار بیویون کی اجازت ہی، اسی بنا پر اہل عرب اور سودان آنحضرت صلعم کی نسبت یہ اعتقاد رکھتے ہین کہ آپ سختی پسند پیغمبر تھے، اسمین بھی شبہہ نہین کہ ابتدا مین آنحضرت کا میلان ایک ہی زوجہ کی طرف تھا، جیسا کہ آپ کی ابتدائی زندگی شاہد ہی لیکن قریش کو اس کا پابند کرنا سخت مشکل تھا، ان مین ایسے لوگ تھے جو دس دس بیبیان رکھتے تھے (مثلاً حارث بن غیلان) انکو اگر یہ حکم دیا جاتا کہ صرف ایک بیوی پر اکتفا کرین تو ان کو سخت ناگوار ہوتا، اور وہ اس کے متحمل نہ ہو سکتے، ممکن تھا، کہ اسکا یہ اثر ہوتا کہ ان کے جدید عقائد متزلزل ہو جاتے، اس لئے آنحضرت صلعم نے انکو حکم دیا کہ دس بیویون مین سے صرف چار کو ترجیح کے اعتبار سے انتخاب کر لین، اور باقی کو طلاق دیدین،

ذیل کی آیت سے پایا جاتا ہی کہ اسلام ایک بیوی پر اکتفا کرنے کو ترجیح دیتا ہی،

وان خفتم الا تقسطوا فی الیتامی	اور اگر تم کو ڈر ہو کہ تم یتیمون مین انصاف نہ کرسکوگے
فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی	تو جو عورتین پسند آئین ان سے نکاح کر لو دو دو، تین تین،
وثلاث ورباع فان خفتم الا	چار چار لیکن اگر تم کو یہ خوف ہو کہ تم عدل نہ کرسکوگے تو صرف
تعدلوا فواحدۃ او ماملکت ایمانکم	ایک یا جو تمھاری مملوکہ ہون،

اس آیت کے دوسرے ٹکڑے کے معنی جیسا کہ علما سے مروی ہے، یہ ہین، کہ اگر آدمی کو خوف ہو کہ وہ اپنی بیویون مین عدل نہ کر سکے گا، اور کسی بیوی کو اورون پر ترجیح دیگا، اس کے ساتھ اس کی حالت اس کی مقتضی نہ ہو کہ دونون کے حقوق ادا کر سکے تو اس پر فرض ہوگا کہ ایک ہی بیوی پر اکتفا کرے،

بعض علما کی یہ بھی راے ہے کہ انسان تعدد ازدواج کی نسبت خود مختار نہین ہو بلکہ یہ قاضی کا کام ہے کہ ہر شخص کے حالات کے لحاظ سے مناسب حکم دے، اگر اس کے نزدیک اس سے عدل نہین ہو سکتا، تو وہ اس کو تعدد ازدواج کی اجازت نہ دیگا،

ان علمانے سند مین یہ روایت پیش کی ہے کہ خلیفہ منصور اپنی بیوی کو حد سے زیادہ چاہتا تھا، اور اس بنا پر اس نے دوسری شادی کا ارادہ نہین کیا، لیکن جب چند برس عیش و عشرت سے گذری تو اس کو جدت کی ہوس ہوئی اور دوسری شادی کرنی چاہی، منصور کی بیوی کو یہ حال سنکر سخت رنج ہوا، اور اس نے کہا کہ ایک سے زیادہ شادی ناجائز ہے منصور نے امام ابوحنیفہ کو بلا بھیجا اور پوچھا کہ مسلمان کے لئے کے بیویان جائز ہین؟ امام صاحب بول اٹھے کہ چار، منصور نے اپنی بیوی کی طرف (جو پردہ سے سن رہی تھی) دیکھا اور بہ آواز کہا کہ کیون امام صاحب کی راے سنی، امام صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ لیکن منصور کو ایک سے زیادہ شادی جائز نہین منصور نے پوچھا کیون؟ امام صاحب نے کہا تم نے اپنی بیوی کی طرف جس انداز سے دیکھا اور جس طرح گفتگو کی، اس سے مین قیاس کرتا ہون کہ تم اس کے ساتھ عدل نہین کرتے اس لئے مین حکم دیتا ہون کہ اسی پر قناعت کرو، مجھ کو معلوم نہین کہ منصور نے امام ابوحنیفہ کے اس حکم کی اطاعت بھی کی یا نہین،

جو لوگ تعدد ازدواج کی خواہش ظاہر کرتے ہین ان کی حالت منصور سے مشابہ ہے، کیونکہ

حقیقت یہ ہے، کہ ازواج میں عدل نہین ہوسکتا، اسی بناپر بہت کم ایسا اتفاق ہوتا ہے کہ قضاۃ کے سامنے اس قسم کے مقدمات پیش ہوتے ہون لیکن نان و نفقہ کے لحاظ سے یہ حالت نہین ہے،

تعدد ازواج کو تین چیزون نے روک رکھا ہے، ان مین ایک یہ بھی ہے، کہ متعدد بیویون کی کفالت نہین ہوسکتی، مشرق مین تعدد ازواج امارت پسندی مین داخل ہے، اسی بناپر اس سے صرف دولت مند لوگ متمتع ہوتے ہین، اور یہ امر گویا دولتمندی کا ایک لازمہ خیال کیا جاتا ہے جیسا کہ قدیم جرمن لوگون مین خیال تھا، اور چونکہ مسلمان اختلاف حالت کو نہایت رضامندی اور حسن اعتقاد کے ساتھ قبول کرتے ہین اس لئے فقرا کو امراکے تعدد ازواج پر رشک نہین پیدا ہوتا جس طرح وہ امراکی اور امتیازی باتون پر رشک نہین کرتے، وہ قرآن مجید کے تمام احکام کا جس طرح ادب کرتے ہین، اسی طرح اس حکم (یعنی جو عدل کی طاقت نہ رکھتا ہو وہ متعدد شادیون کا مجاز نہین) کی بھی اطاعت کرتے ہین اسکے علاوہ وہ اس سے ناواقف نہین کہ کئی بیویون والے کو کیا کیا مصائب اور رنج پیش آتے ہین، اور یہ کہ عیش کامل انھین کا حصہ ہے، جو ایک بیوی پر قانع ہین،

مانیو کا روز کا یہ خیال غلط ہے، کہ تعدد ازواج غربا کے لئے حرام ہے، اور امرا کے لئے قابل عفو گناہ ہے، تعدد ازواج کی نسبت مسلمانون کا وہی خیال ہے جو یونس مقدس اکثر کہا کرتا تھا کہ ہر مباح چیز لائق عمل نہین، شریعت اسلامی نے گو تعدد ازواج کو جائز کہا ہے، لیکن اکثر مسلمان اس اجازت سے فائدہ نہین اٹھاتے، وہ جانتے ہین کہ اس سے تنگی معاش اور فقدان صحت کا ڈر ہے، کثیر الازواج اشخاص کی بیویان اکثر شاکی رہتی ہین کہ ان کے ازواج ان سے قطع تعلق کرلیتے ہین، رات دن کے جھگڑون سے گھر مصیبت کدہ

بجا تا ہے عربی زبان مین اکثر ایسے جملے پائے جاتے ہین جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کثرتِ ازدواج
ان کو پسند نہین، مثلاً دو گھوڑون پر سوار ہونے والے شخص کو گرنے سے ڈرنا چاہیے،
محبت کے لئے دو بیویان بہت ہین اور اگر عافیت درکار ہے تو صرف ایک جو قانون
معاملاتِ ازدواج مین امیر و غریب کو یکسان حق نہین دیتا، ہمارے موجودہ خیالات اس کی
تائید نہین کر سکتے لیکن جو شخص مسلمانون کے حالات سے واقف ہے، وہ سمجھ سکتا ہے کہ مسلمانون
مین اس قسم کا قانون وہ نتائج نہین پیدا کرتا جو ہم خیال کرتے ہین،
مسلمان غربا اپنی حالت پر قانع اور رضامند ہین، خدا نے انکی قسمت مین جو کچھ لکھدیا ہے
وہ دل سے اس پر راضی ہین، گو مانسیو دوبرجلی اس امر کو تسلیم نہین کرتے،
قرآن مجید مفلس کے لئے حکم دیتا ہے کہ جب تک اس کو نکاح کا مقدور نہ ہو وہ انتظار
کرے، (دیکھو کتاب کا ضمیمہ ششم) باایں‌ہمہ مسلمانون مین ایسے بہت کم ہوتے ہین جو شادی سے
محروم ہون، عموماً لوگ ۲۰ برس کے سن مین شادی کرتے ہین، اہلِ مشرق عزوبت (شادی
نہ کرنا) سے بالکل ناواقف ہین، یہ مصیبت تمدنِ حال نے پیدا کی ہے، رسول اللہ صلعم صحابہ
سے جب باتین کرتے تھے تو یہ فقرہ اکثر فرماتے تھے کہ "اسلام مین رہبانیت نہین ہے، ایک دفعہ
آپ نے فرمایا کہ جورو والے کی ایک سانس، سائٹھ شادی نہ کرنے والون کی نماز سے بہتر ہے۔
(یہ حدیث خدا جانے کہان سے نقل کر دی ہے)
ناظرین کو تقریراتِ بالا سے معلوم ہوا ہوگا کہ جو لوگ تعددِ ازدواج کے نقصانات بیان
کرتے ہین، انھون نے اگر غلط بیانی نہین کی ہے، تو کم از کم مبالغہ ضرور کیا ہے، پادری برجلی
کا یہ بیان بالکل غلط ہے، کہ "مشرق مین جو شرمناک برائیان پھیلی ہین، تعددِ ازدواج کی بدولت
ہین" بلکہ سچ یہ ہے کہ اس رسم نے ان برائیون کو نرم کر دیا ہے، اس کے علاوہ یہ فیصلہ کرنا

یہی شکل ہے کہ مشرق مین یہ برائیان مغرب سے زیادہ ہین، حقیقت یہ ہے کہ اسلام پر یہ داغ ان یورپین سیاحون نے لگایا ہے، جنکی عادت ہے کہ بغیر تحقیق کے جزئی واقعہ سے کلیات بنا لیتے ہین، اگر یہ تعمیم نہ ہوتی تو ان کو اپنی تصنیفات کے لئے کچھ سرمایہ ہاتھ نہ آتا، شرمناک برائیان ہر قوم مین ہوتی ہین، پیرس، لندن، برلن مین یہ برائیان مشرق سے زیادہ ہین، جس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبرِ اسلام نے ان کو بڑی سختی سے حرام قرار دیا ہے، اور ان کو معمولی گناہ نہین قرار دیا ہے، جیسا کہ بعض لوگ اس آیت سے استنباط کرتے ہین،

واللذان یاتیانها منکم فاذوهما فان تابا واصلحا فاعرضوا عنهما ان الله کان توابا رحیما،

آیت مذکورہ سے یہ استنباط کرنا کہ شارعِ اسلام نے بدکاری کو ایک معمولی گناہ قرار دیا ہے، آیت کے معنی بدل دینا ہے، اس کے علاوہ اس مضمون کے متعلق قرآن مین صرف یہی ایک آیت نہین ہے، بلکہ اور بہت سی آیتین ہین، مثلاً سورۂ اعراف کی یہ آیت

ولوطا اذ قال لقومه اتاتون الفاحشة ما سبقکم بها من احد من العالمین،

اسلام کے احکام جو اس بدکاری کے متعلق ہین خواہ قرآن سے ماخوذ ہون یا حدیث سے تمام دنیا کی شریعتون کے مقابلہ مین نہایت سخت ہین، شریعتِ اسلام نے خلاف وضع فطری جرم کے لئے قتل کی سزا مقرر کی ہے، اگر مرتکبانِ جرم دونون بالغ ہون تو دونون قتل کر دیئے جائین گے، ایک ہو تو ایک، اور دونون نابالغ ہون تو انکو سو سو درے لگائے جائین گے، اور بدکاریان جو قریب البلوغ لوگون مین پائی جاتی ہین مشرق مین بجز استثنائی حالتون کے ان کا وجود نہین جس کی وجہ یہ ہے کہ شادی کرنے مین نہایت

آسانیاں ہین،یہ خیال سخت غلط ہے،کہ مسلمانون کے مذہب مین عقد نکاح ایک قسم کی خرید و فروخت کا معاملہ ہے،جس کے ذریعہ سے عورت بیچ ڈالی جاتی ہے،اور شوہر اس پر مالکانہ قابض ہوجاتا ہے،شریعت اسلام مین نکاح کے ذریعہ سے عورت کو بہت سے اخلاقی اور عملی حقوق حاصل ہوتے ہین،جو عورت کا درجہ سوسائٹی مین بلند کردیتے ہین،عورت کو اختیار ہے کہ وہ شوہر سے یہ شرطین کرالے کہ وہ کسی اور عورت سے شادی نہ کریگا،نہ لونڈی لائیگا،نہ بہت دنون تک گھر سے غائب رہیگا،نہ اس کو کسی طرح کی تکلیف دیگا،نہ اس کو گھر کے مشکل کامون مین پھنسائیگا،شوہر اگر شرائط کی پابندی نہ کریگا تو عورت کو اختیار ہوگا کہ وہ طلاق لیلے اگر وہ طلاق کو نہین پسند کرتی تو اس کو اختیار ہے،کہ قاضی سے درخواست کرے کہ شوہر اسکے سوکن کو طلاق دیدے،اور لونڈی کو آزاد کردے تاکہ وہ اس سے متمتع نہ ہونے پائے.....

قرآن نے صرف یہی نہین کیا کہ چار کی قید لگا کر تعداد ازواج کے دائرہ کو گھٹا دیا بلکہ اس نے اس طریقہ کو بھی مٹادیا،جو عرب مین عام طور سے مروج تھا یعنی چند روزہ نکاح (متعہ)

مانسیو ریفیل کہتے ہین کہ اگر ہم پیغمبر اسلام کے زمانہ کی طرف رجوع کرین تو معلوم ہوگا کہ عورتون کے لئے جو مفید احکام پیغمبر اسلام نے صادر کئے کسی نے نہین کئے،عورتون پر آپ کے بہت سے احسانات ہین،قرآن مین عورتون کے حقوق کے متعلق بہت سی مہتم بالشان آئتین ہین،بعض آیتون مین یہ بیان ہے کہ عورتون سے کس قسم کے تمتعات ناجائز ہین،بعض مین یہ تفصیل ہے کہ کس حشمت و وقار سے ان سے معاملہ کرنا چاہئے،

الیوم احل لکم الطیبات و طعام الذین	آج تمھارے لئے پاک چیزین حلال کردی گئین اور
اوتوا الکتاب حل لکم و طعامکم حل	اہل کتاب کا کھانا تمھارے لئے حلال ہے اور تمھارا
لھم والمحصنات من المومنات	کھانا ان کے لئے اور مسلمان عفیفہ عورتین

والمحصنات من الذين اوتوا الكتاب من	اور اس قوم کی عفیفہ عورتین جن پر تم سے پہلے کتاب
قبلكم اذا اتيتموهن اجورهن محصنين	نازل ہو چکی ہے، جبکہ تم ان کے مہر ادا کر دو، اور
غير مسافحين ولا متخذی اخدان،	عفت مقصود ہو، نہ عیاشی اور داشتہ بنانا،
قل للمؤمنين يغضوا من ابصارهم ويحفظوا	مسلمانون سے کہدو کہ اپنی نگاہین نیچی رکھین، اور
فروجهم ذلك ازكى لهم ان الله خبير	فحش سے بچے رہین، یہ ان کے لئے زیادہ پاکیزگی ہے،
بما يصنعون،	اور خدا ان کے کامون سے واقف ہے،
قد افلح المؤمنون الذين هم فی صلاتهم	وہ مسلمان کامیاب ہین جو نماز مین خشوع کرتے
خاشعون والذين هم عن اللغو معرضون	ہین اور بیہودہ باتون سے بچتے ہین، اور زکوٰۃ
والذين هم للزكوٰة فاعلون والذين هم	دیتے ہین، اور پاک دامن رہتے ہین،
لفروجهم حافظون	

رسول اللہ صلعم نے صحابہ کو بہت سے ایسے احکام تلقین کئے جنہین شہوت رانی سے روکا اور عفت وعصمت کی تاکید کی آپ نے حکم دیا کہ منگیتر کو بھی عورت کا صرف چہرہ اور ہاتھ دیکھنا جائز ہے، اور بیگانہ عورت کو نظر اٹھا کر دیکھنا بھی حرام ہے، انجیل مین ہے کہ جو شخص کسی عورت کو نظر شہوت سے دیکھتا ہے، وہ دل سے زنا کرتا ہے، مسلمانون کا مقولہ ہے کہ آنکھ کا زنا ظاہری زنا سے زیادہ برا ہے، ان احکام نے بدنظری کو زنا کے برابر قرار دیدیا اور اس کی پابندی صرف مسلمان کرسکتے ہین جنکی عورتین پردہ مین رہتی ہین،

آیات مذکورۂ قرآن سے معلوم ہوگا کہ پیغمبر کو ان خرابیون کے روکنے کا کس قدر خیال تھا جو عشق وہوس سے پیدا ہوتی ہین، یہ بندشین اس غرض سے تھین کہ اولاد وازدواج والے امن وراحت سے رہین، اغالبا انجیل مین اس سے زیادہ سخت احکام ہین، لیکن

ان پر صرف وہ لوگ عمل کرتے ہین جنکو خدا نے کلمات اخلاق مین ممتاز کیا ہے، اور وہ بہت کم ہین، باقی عام لوگ تو اخلاقی حیثیت سے ان کو دوسری قومون پر کچھ ترجیح نہین بخلاف اس کے قرآن کے احکام نرم ہین، عام مسلمان ان کا لحاظ رکھتے ہین، اور اس پر عمل کرتے ہین قرآن مین صفائی اور صحت کی تاکید ہے، مسلمان اس پر کاربند ہین اور اس وجہ سے ان کے اخلاق ممتاز ہین، ان باتون نے ان کی طبیعتون مین متانت اور وقار پیدا کردیا ہو، اگر اس قسم کے احکام نہ ہوتے تو ممکن تھا کہ مسلمان بھی شہوت پرست بنجاتے، جیسا کہ آج کل تہذیب یافتہ قومون کا حال ہے،

مسلمانون اور عیسائیون مین غیرت و حمیت کے لحاظ سے آسمان و زمین کا فرق ہو، مسلمان جب یورپ کے اشتہارات پڑھتا ہے، یورپ مین عورتون کو ننگے لباس مین ناچتے دیکھتا ہے، رقص کے جلسون مین عورتون کو بیحیائی کے ساتھ، بازو کھولے ہوئے دیکھتا ہو اور اس قسم کے ہمارے اور تفریحی جلسون مین شریک ہوتا ہو تو اسکی نظر پر زخم لگتا ہے، مین نے ایک دن وزیر مصطفیٰ کے گھر مین شیوخ عرب کو دیکھا، جن کے پاکیزہ اخلاق و عادات ان کے سر کے تاج اور تمغائے امتیاز تھے، وہ اس لیے بلائے گئے تھے کہ ان کی شرکت سے جلسہ کی شان بڑھے، ان کے سامنے عیسائی عورتین مردون کی بغل مین ہاتھ ڈالے سینے کھولے ہوئے ٹہلتی پھرتی تھین، یہ شیوخ ان کی طرف سخت حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، ان کو یہ نہین خیال ہوتا تھا، کہ وہ کسی تفریحی جلسہ مین شریک ہین، بلکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ ایک ایسا تماشا گاہ ہو جسمین شہوت پرستی کو بالکل آزادی دیدی گئی ہو، اور چہرون سے شرم کی نقاب اٹھا دگئی ہے، اس لئے ہر شخص جو چاہتا ہے کرتا ہے، جیسا کہ سال مین ایک دن حبشی اور بعض اور کمینہ قومون مین اس قسم کی بیہودگیون کا رواج ہے، لیکن جب وہ دیکھتے ہین کہ جلسہ مین وہ معزز

افسر شریک ہین جن کے وہ ماتحت ہین تو ان کو اپنے خیال سے باز آنا پڑا، اور سمجھے کہ ہم جو کچھ دیکھ رہے ہین یہ اصلی حالت ہے، اور اہل یورپ کا یہ عام معمول ہے، اس وقت ان کو اپنی شریعت محمدی کے احکام یاد آئے اور جب انھون نے اس شرمناک منظر کا ان احکام سے مقابلہ کیا تو دفعۃً قرآن کی عظمت ان کے دلون مین بڑھ گئی، جسمین یہ احکام ہین :-

قل للمؤمنات یغضضن من ابصارھن ویحفظن فروجھن ولا یبدین زینتھن الا ما ظھر منھا ولیضربن بخمرھن علی جیوبھن،

مسلمان عورتون سے کہدو کہ اپنی نگاہین نیچی رکھین اور اپنے ناموس کی حفاظت کرین اور اپنی آرائش نہ دکھلائین بجز اس حصہ کے جو خود دکھلا رہتاہے، اور اپنے دوپٹے اپنے گریبانون پر ڈال لین، الی آخرہ[1]

---

[1] یہ پوری آیت نقل کرنے کے بعد مصنف نے اس مضمون کی اور آیتین بھی نقل کی ہین،

مسلمانون کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہوکر کیونکر رہنا چاہئے

مسلمانون نے چار دانگ عالم مین بارہ تیرہ سو برس تک حکومت کی، حکومت کا آغاز عین بانیِ اسلام کے زمانہ مین ہوا، اور آج تک جابجا اسلامی حکومتین قائم ہین، سیکڑون غیر قومین اسکی محکوم ہوئین، ان اسباب سے یہ بدیہی ہے کہ اسلام نے غیر مذہب والون پر حکومت کرنیکے دستور، اور آئین مفصل منضبط کئے ہونگے،

لیکن اسلام کو محکوم ہوکر بہت کم رہنا پڑا، اس لئے بعض لوگون کا خیال ہو کہ اس حالت کے متعلق حدیث سے فقہ سے تاریخ سے ہم کو کوئی ہدایت نہین مل سکتی، اور فقہ کا یہ حصہ بالکل اچھوتا رہ گیا،

چونکہ یہ نہایت سخت خطرناک غلطی ہے، اس لئے ہم تفصیل سے بتانا چاہتے ہین کہ اسلام مین اس کے متعلق کافی قواعد اور احکام موجود ہین، اور حدیث، فقہ، تاریخ سب اس قسم کے مسائل اور واقعات سے لبریز ہین،

اس مسئلہ کے متعلق اصل مین سوال یہ پیدا ہوتا ہے، کہ جب کوئی غیر مذہب حکومت مسلمانون کے ملک اور زمین پر قابض ہو جائے تو،

(۱) یہ قبضہ حقیقی ہوتا ہے، یا غاصبانہ،

(۲) مسلمانون کو حکومت کی اطاعت فرض ہوتی ہو یا نہین،

فقہ مین اس کا ایک مستقل باب ہو جسکی سرخی یہ ہے، باب استیلاء الکفار اس کے

ذیل میں یہ حکم ہیں :-

وان غلبوا علی اموالنا واحرزوها بدارهم	اگر غیر مذہب والے ہمارے مال پر غالب آجائیں، اور
ملکوها،	اُن کو اپنے گھر میں جمع کریں تو وہ اُسکے مالک ہونگے،
ویجب علینا اتباعهم (در مختار)	اور ہم پر اُن کی اطاعت فرض ہوگی،

چونکہ اسلامی احکام کی اصلی بنیاد قرآن اور حدیث ہے، اس لئے فقہی روایتوں سے پہلے ہم قرآن و حدیث کی طرف متوجہ ہوتے ہیں،

قرآن مجید میں اُن صحابہ کو جو دولتمند تھے، اور اپنی دولت چھوڑکر ہجرت کرکے چلے آئے تھے اور اُن کے مال و دولت پر اہلِ مکہ نے قبضہ کر لیا تھا، خدا نے **فقیر** فرمایا ہے، للفقراء المہاجرین اس سے فقہا نے یہ استدلال کیا ہے کہ جب اہل مکہ نے ان کے مال و اسباب پر قبضہ کر لیا تو وہ اُس کے حقیقی مالک ہوگئے، اس بنا پر صحابہ کو خدا نے فقیر فرمایا، شاید کسی کو خیال ہو کہ چونکہ صحابہ کا قبضہ جاتا رہا تھا، اس لئے خدا نے ان کو مفلس کہا، لیکن ایسے شخص کے لئے جو گھر سے نکل آئے اور اس کے مال و اسباب پر اور لوگ قابض ہو جائیں اصطلاحِ شرع میں ایک دوسرا لفظ موجود ہے یعنی ابن السبیل،

شامی شرح در مختار میں جہاں یہ مسئلہ لکھا ہے کہ قبضہ کی حالت میں قابض لوگ حقیقی مالک ہو جاتے ہیں یہ استدلال کیا ہے،

لقوله تعالی للفقراء المهاجرین	کیونکہ خدا نے فرمایا ہے للفقراء المهاجرین اس آیت
سماهم فقراء فدل علی ان الکفار ملکوا	میں خدا نے مہاجرین کو فقیر کہا، اس سے معلوم ہوا کہ کفار
اموالهم اللتی هاجروا منها ومن	صحابہ کے مال کے حقیقی مالک ہوگئے تھے، کیونکہ جو شخص
لا یصل الی ماله لیس فقیرا بل	اپنے مال کا مالک ہوتا ہے، اور صرف اُس کا قبضہ اُٹھ

هو ابن السبیل، جاتا ہے تو اسکو فقیر نہین بلکہ ابن السبیل کہتے ہین،

فقہا کے نازک اور دقیق استدلال کی ہم داد دیتے ہین لیکن ہمارے نزدیک اس قدر موشگافی
اور دقیقہ سنجی کی ضرورت نہین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مین اس قسم کا واقعہ پیش
آچکا تھا، اور اس طرز عمل سے صاف معلوم ہوسکتا ہے کہ مسلمانون کو غیر مذہب کی حکومت مین کیونکر
رہنا چاہیئے، مکہ مین جب مخالفون نے مسلمانون کو حد سے زیادہ ستانا شروع کیا تو آنحضرت صلعم نے
حکم دیا کہ لوگ ہجرت کرکے حبش (ابی سینا) کو چلے جائین، چنانچہ بہت سے صحابہ جنمین حضرت عبدالرحمن
بن عوف بھی تھے حبش مین چلے گئے، حبش کا بادشاہ عیسائی تھا جس کو اہل عرب نجاشی کہتے
تھے، صحابہ جب حبش مین آئے تو اتفاق سے چند روز بعد کسی بادشاہ نے اس ملک پر چڑھائی
کی، اور نجاشی نے اس کے مقابلہ کے لئے فوجین بھیجین صحابہؓ نے خود بلا کسی کی تحریک کے اپنی
طرف سے ایک قاصد بھیجا کہ فوج کے ساتھ جائے اور دم دم کی خبرین بھیجتا رہے تا کہ اگر ضرورت
ہو تو خود ہم لوگ نجاشی کی مدد کو آئین، صحابہؓ نے اسی پر اکتفا نہین کیا بلکہ پنج وقتہ نمازون مین
نجاشی کی فتح کی دعائین مانگتے تھے، چنانچہ یہ واقعہ محدث طبری نے اپنی تاریخ مین پوری
تفصیل کے ساتھ لکھا ہے، کوئی رعایا حکومت کے ساتھ اس سے زیادہ اور کیا وفاداری، اور
اطاعت شعاری کر سکتی ہے، کیا آج گورنمنٹ کو اس سے زیادہ کچھ درکار ہے،

اسلام کی تاریخ مین اکثر غیر قومین اسلامی ملکون پر قابض ہوگئین، اس وقت ہزارون فقہا
اور علما موجود تھے، کیونکر ممکن تھا کہ وہ اس کے متعلق فقہی احکام نہ مرتب کرتے، تاتاریون نے
جب تمام ایران اور عراق پر قبضہ کرلیا تو اس وقت جس قدر فقہ کی کتابین تصنیف ہوئین سب
مین اس کے متعلق تفصیلی احکام موجود ہین اصل بحث یہ پیدا ہوئی کہ یہ ممالک دارالاسلام ہونگے
یا دارالحرب، تمام فقہا نے بہ اتفاق لکھا کہ جب تک اسلامی احکام یعنی نماز روزہ وغیرہ جاری

ہین اُس وقت تک دارالاسلام باقی رہیگا، اور مسلمانون کی وہی حالت ہو گی جو اسلامی ملک مین ہوتی ہے، فتاوی بزازیہ مین یہ ہے،

وأما البلاد التي عليها ولاة كفار فيجوز فيها أيضا إقامة الجمع والأعياد والقاضي قاضٍ بتراضي المسلمين، وقد تقرر أن بقاء شيء من العلة يبقي الحكم، وقد حكمنا بلا خلاف بأن هذه البلاد قبل استيلاء التتار كان من ديار الإسلام وبعد استيلائهم إعلان الأذان والجمع والجماعات والحكم بمقتضى الشرع والفتوى والتدريس شائع بلا نكير من ملوكهم فالحكم بأنها من دار الحرب لا جهة له

باقی وہ مقامات جن کے حاکم کافر ہین تو وہان بھی جمعہ اور عیدین کا ادا کرنا جائز ہوگا، اور قاضی مسلمانون کی رضامندی سے قاضی ہوگا، کیونکہ یہ طے ہوچکا ہے کہ جب تک علت باقی رہتی ہے حکم باقی رہتا ہے، اور یہ متفقاً ہم لوگ طے کر چکے کہ یہ مقامات تاتاریون کے آنے سے پہلے دارالاسلام تھے، اور ان کے قابض ہونے کے بعد اذان جمعہ اور جماعت بہ اعلان ہوتی ہے، اور فیصلے شریعت کے موافق کیے جاتے ہین، اور درس وتدریس بغیر روک ٹوک کے جاری ہے، تو ایسی حالت مین ان مقامات کو دارالحرب کہنے کی کوئی وجہ نہین ہے،

غور کرو فقہا نے تاتاریون کے زمانہ مین یہ فتویٰ دیا، جو بت پرست تھے اور جنکو مسلمانون کے ساتھ کسی قسم کی مناسبت نہ تھی، آج جب کہ عیسائی حکومت ہے، جو اہل کتاب ہین مسلمانون کے فرائض مذہبی مین کوئی تعرض نہین کیا جاتا، مسلمان خود عیسائی مذہب کا زور شور سے سر بازار رد کرتے ہین، تو ایسی حالت مین کیا شبہہ ہو سکتا ہے کہ حکومت کی وہی پوزیشن ہوگی جو اکبر وجہانگیر کے زمانہ مین تھی، اور فقہا کا یہ حکم واجب العمل ہوگا کہ،

ويجب علينا اتباعهم (درمختار)

اور ہم پر انکی اطاعت واجب ہوگی،

یہ نہ خیال کرنا چاہئے کہ یہ محض تصوری یعنی زبانی باتین ہین، کثرت سے تاریخی واقعات شہادت دے رہے ہین کہ مسلمانون کا ہمیشہ طرزِ عمل یہی رہا، وہ جو کچھ کہتے تھے کرتے بھی تھے، پانچوین صدی مین جزیرہ سسلی پر عیسائی حکومت قابض ہوگئی تھی، اور راجر تخت نشینِ حکومت تھا، اُس وقت تک وہان کثرت سے مسلمان موجود تھے، ان کا طرزِ عمل یہ تھا کہ بادشاہ کے نہایت مطیع اور وفادار تھے یہان تک کہ بادشاہ کو جس قدر اُن پر اعتماد تھا، خود اپنی عیسائی رعایا پر نہ تھا، **علامہ ابن جبیر** نے اسی زمانہ مین سسلی کا سفر کیا تھا، وہ ان واقعات کو لکھکر لکھتا ہے کہ یہان پر تمام بڑے بڑے عہدون پر مسلمان مامور ہین، یہان تک کہ شاہی باورچیخانہ کا اہتمام بھی مزید اعتماد کی وجہ سے مسلمانون ہی کے ہاتھ مین ہے،

تاتاری جس زمانہ مین ایران اور عراق پر قابض تھے، اکثر بڑے بڑے عہدون پر مسلمان ہی مامور تھے، **ہلاکو خان** کی سفاکی اور اسلام کی دشمنی مسلمۂ عام ہے، **بغداد** جو مسلمانون کے جاہ وجلال کا کعبہ تھا اسی کے ہاتھون برباد ہوا تھا تاہم اس کے حکومت کے دست وبازو خواجہ **رشید الدین** اور **علاء الدین جوینی** تھے خواجہ **رشید الدین** وزیر اعظم تھے اور درحقیقت کاروبارِ حکومت انھین کے ہاتھ سے انجام پاتے تھے،

ہلاکو خان کے بعد جب اس کا بیٹا اباقاآن خان بادشاہ ہوا تو اُس کے دور مین بھی ان دونون بھائیون کا وہی احترام رہا، علامہ شاکر کتبی نے **فوات الوفیات** مین جہان علاء الدین جوینی کا تذکرہ لکھا، لکھتے ہین :-

صاحب الدیوان الخراسانی اخو الصاحب الکبیر شمس الدین کان لهما الحل والعقد فی دولة ابغا ونالا

وزارتِ خراسان کے مالک اور وزیر اعظم شمس الدین کے بھائی تھے اور ابغا کی سلطنت مین یہی دونون بھائی سیاہ وسپید کے مالک تھے، اور اس قدر دولت

من الجاہ و الحشمۃ ما یجاوز الوصف — حشمت ان لوگون نے حاصل کی جو بیان سے باہر ہی،

روضۃ الصفا مین جہان خواجہ شمس الدین (وزیر ہلاکو خان) کا تذکرہ کیا ہے، لکھا ہی۔

"چون اباقا خان بر سریر سلطنت قرار گرفت خواجہ مشار الیہ (خواجہ شمس الدین) زیادہ

از معہود و منظور بعیون عاطفت یافت و شغل خطیر وزارت بر قرار سابق با و مفوض گشت

و خواجہ بعزمے صائب و رائے ثابت و اقبال مساعد در اتمام مہام مملکت و ترفیہ احوال

سپاہی و رعیت و اصلاح خلل و تدارک زلل بہ نوعی شروع نمود کہ مزیدے بر آن

متصور نبود و ملوک و سلاطین و اکابر خراسان و عراق و بغداد و شام و روم دار من

را ملجا و ماوی شد"

یہ اعتماد یہ رتبہ ان لوگون نے اسی وجہ سے حاصل کیا تھا کہ جس وفاداری، دیانت

اور لیاقت سے یہ لوگ بادشاہی خدمات بجا لاتے تھے، خود ہلاکو خان کے ہمقوم اور عزیز

بجا نہین لا سکتے تھے،

محقق طوسی، جنکی شہرت محتاج بیان نہین وہ بھی ہلاکو خان کے معتمد خاص تھے،

اور اوقاف اسلامی کل انھین کے زیر اہتمام تھے، فوات الوفیات مین لکھا ہی،

کان ذا حرمۃ وافرۃ و منزلۃ عالیۃ — ہلاکو کے دربار مین ان کی بڑی عزت اور نہایت

عند ھلاکو و کان یطیعہ فیما یشیر بہ — قدر تھی، ہلاکو ان کے مشورون پر عمل کرتا تھا، اور مال

علیہ و الاموال فی تصرفہ — اُن کے تصرف مین تھا،

گو ہم پسند نہین کرتے لیکن محقق طوسی نے ہلاکو خان کی وفاداری مین اسلام تک کو برباد

کر دیا یعنی بغداد کا حملہ اور اُس کی بربادی صرف محقق طوسی کے اشارہ سے تھی، ورنہ ہلاکو خان

اس پر آمادہ نہین ہوتا تھا چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین مین اس واقعہ

کو محقق طوسی کے مفاخر مین شمار کیا ہے،

واقعات مذکورۂ بالا سے تم کو معلوم ہوگا، کہ رسول اللہ صلعم کے عہد زرین سے لیکر آج تک مسلمانون کا ہمیشہ یہ شعار رہا کہ وہ جس حکومت کے زیر اثر رہتے اس کے وفادار اور اطاعت گذار رہتے یہ صرف ان کا طرز عمل نہ تھا، بلکہ ان کے مذہب کی تعلیم تھی، جو قرآن مجید، حدیث، فقہ سب مین کنایۃً اور صراحۃً مذکور ہے،

ما قصۂ سکندر و دارا نخواندہ ایم
از ما بجز حکایت مہر و وفا مپرس

غیر قومون کی مشابہت

ہماری قوم مین نئے علوم وفنون اور نئے تمدن اور شائستگی کے نہ پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ بہت سے مسلمانون کا اب تک خیال ہے، کہ ہم کو غیر قومون کا تشبہ شرعاً ناجائز ہے، یہی وجہ ہے کہ اب تک قوم کے مقدس حضرات، یورپین علوم وفنون، یورپین زبان، یورپین تمدن، یورپین طرز معاشرت سے جہان تک ہو سکتا ہی، اجتناب کرتے ہین، اور بضرورت کوئی بات اختیار کرنی پڑتی ہے تو ان کا دل انکو ملامت کرتا رہتا ہے،

ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی غلطیون کے پیدا ہونے کی بڑی وجہ یہ ہی کہ قدیم تعلیم مین تاریخ کا حصہ شامل نہ تھا، اور اس وجہ سے اکثر مسلمان آنحضرت صلعم اور خلفاے راشدینؓ اور صحابہؓ کے طرز معاشرت کے تفصیلی حالات سے بالکل آشنا نہین جس شخص نے سلف کی تاریخ سرسری نظر سے بھی پڑھی ہوگی، وہ اس بات سے کیونکر انکار کر سکتا ہے کہ آنحضرت صلعم اور خلفاے راشدین نے تمدن اور معاشرت کے متعلق غیر قومون کی بہت سی باتین پسند فرمائین، شاہ ولی اللہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ مین نہایت تفصیل کے ساتھ اصلاح رسومات پر ایک مضمون لکھا ہے، اس مین ایک موقع پر وہ تحریر فرماتے ہین کہ

”انبیاء اور پیغمبرون کا یہ طریقہ تھا، کہ کھانے، پینے، لباس، تعمیرات، آرایش، خرید وفروخت وغیرہ کے متعلق وہ اُن معمولات پر نظر ڈالتے تھے، جو ان کی قوم مین پہلے سے جاری تھے اگر وہ معقول ہوتے تھے، تو بحال خود رہنے دیتے تھے، اور جن باتون مین کسی قسم کی برائی

ہوتی تھی ان کی اصلاح کر دیتے تھے"

اس کے بعد شاہ صاحب نے، دیت، خمس، قسامت وغیرہ کی نسبت لکھا ہے کہ "یہ قاعدے زمانہ جاہلیت مین جاری تھے، اور آنحضرت صلعم نے اسی طرح رہنے دیئے" پھر فرماتے ہین،

"وکان قباد وابنہ نوشروان وضعا علیہم الخراج والعشر فجاء الشرع بنحو من ذلک"

یعنی قباد اور اس کے بیٹے نوشیروان نے لوگون پر خراج اور عشر مقرر کیا تھا، پس شریعت بھی قریب قریب اسی کے مطابق آئی شاہ صاحب نے توچونکہ شریعت کا نام لیا، اس لئے قریبا قریب کا لفظ لکھا، لیکن امام ابوجعفر طبری نے جو محدث اور مجتہد دونون تھے، جہان نوشیروان کے قانون خراج وجزیہ کا ذکر کیا ہے، صاف یہ الفاظ لکھے ہین :-

اقتدیٰ بہا عمر بن الخطاب، یعنی حضرت عمرؓ نے نوشیروان کے ان قاعدون کی اقتدا اور پیروی کی"

یہ مسلم ہے کہ نوشیروان مذہبا مجوسی اور قوم کے لحاظ سے ایرانی تھا، پھر جب حضرت عمرؓ کو تمدن اور امور ملکی کے متعلق ایک مجوسی اور ایرانی کی اقتدا سے عار نہ تھا، تو آج ہم لوگون کو یورپ کی عمدہ باتون کے اختیار کرنے مین کیا مضایقہ ہو سکتا ہو؟

یہ بحث کلی طور پر تھی، اب ہم اس آرٹکل مین اُن باتون کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ لکھنا چاہتے ہین، جو قرن اول مین دوسری قومون سے لی گیئن، لیکن قبل اس کے اُن حدیثون سے تعرض کرنا ضرور ہو، جن سے ثابت ہوتا ہو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، دوسری قومون کی مشابہت سے منع فرماتے تھے، حقیقت یہ ہے کہ جب کوئی پیغمبر یا بانی مذہب، کسی نئے مذہب کی بنیاد ڈالتا ہو، تو اُسکو خواہ مخواہ بعض ایسی مخصوص علامتین قایم کرنی پڑتی ہین، جو اس کے پیروؤن اور عام لوگون مین امتیاز اور شناخت کا ذریعہ ہون، اس قسم کی علامت کو شعار کہا جاتا ہو،

اور اردو مین اس کا ترجمہ دردی یا تمتہ کیا جا سکتا ہی بے شبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بعض چیزون مین اس قسم کا امتیاز قائم کیا تھا، اور ان کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ ان باتون مین غیر مذہب والون کی مشابہت نہ اختیار کرو لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ دوسری قومون اور دوسرے مذہب والون کی ہر بات سے اجتناب کیا جائے سخت غلطی ہی،

آنحضرت صلعم کے طریق عمل اور متعصب علماء کی نافہمی کی ایک عمدہ مثال یہ ہے کہ غزوۂ احزاب مین جب قریش نے بڑے سر و سامان سے مسلمانون پر چڑھائی کی، تو سلمان فارسیؓ نے آنحضرت صلعم کی خدمت مین عرض کیا کہ "ایران مین یہ دستور ہے کہ جب دشمن کی تعداد زیادہ ہوتی ہی تو خندق کھود کر پناہ لیتے ہین" آنحضرت صلعم نے ان کے مشورہ کے مطابق خندق تیار کرائی اور عربی زبان مین خندق کا لفظ اول اسی وقت استعمال ہوا "خندق" کا لفظ "کندہ" کا معرب ہی جس کے معنی کھودے گئے کے ہین، معرب کرنے کا عام قاعدہ ہی کہ اخیر کی ہائے ہوز کو ق سے بدل لیتے ہین، جس طرح پیادہ سے بیدق، خورنگہ سے خورنق، اسی طرح منجنیق اور دبابہ جو لڑائی کے آلات ہین، عرب مین مستعمل نہ تھے، لیکن فارس اور یونان مین اسکا عام رواج تھا، سب سے پہلے طائف کے محاصرہ مین جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رومی نژاد صحابی کے اشارہ سے اس کا استعمال کیا، ان واقعات کے مقابلہ مین "جان نثاری" فوج کا واقعہ خیال کرو،

سلطنت ترکی کی ایک مشہور فوج تھی جس نے یورپ اور ایشیا مین بے شمار فتوحات حاصل کی تھین، سلطان محمود کے زمانہ مین جب یورپ نے فنون جنگ اور فوجی قواعد مین نئے نئے قاعدے ایجاد کئے، تو سلطان موصوف نے اپنی فوج کو بھی انھین اصول کے موافق مرتب کرنا چاہا لیکن "جان نثاری" فوج نے اس بنا پر انکار کیا کہ ہم کافرون کی تقلید نہین

کرتے، یہ انکار در اصل فوج کی طرف سے نہ تھا، بلکہ درپردہ شیخ الاسلام کی سازش تھی، اور وہ پیشواے مذہب ہونے کے لحاظ سے اس تقلید کو ناجائز خیال کرتا تھا، سلطان محمود سمجھتا تھا، کہ نئے اصول کے اختیار کئے بغیر یورپ کی ہمسری نہیں ہوسکتی، شیخ الاسلام اور فوج کو اپنے تعصب پر اصرار تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ فوج نے بغاوت کی اور کل کی کل لڑکر تباہ ہوگئی، اسی قسم کی غلطی ہے، جو آج کل ہمارے علما اور متعصب مسلمان کررہے ہین، اور جس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ عہد نبوت اور خلافت کے حالات سے بہت کم واقف ہین، اور زیادہ سچ یہ ہے کہ بالکل واقف نہین،

اب ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بتاتے ہین، کہ معاشرت اور تمدن کے متعلق کیا کیا باتین غیر قومون کی اختیار کی گئین، اور کب اور کس وقت اختیار کی گئین، اس حیثیت سے یہ آرٹکل ایک تاریخی آرٹکل ہوگا، اور عام ناظرین کو اس سے زیادہ دلچسپی ہوگی،

لباس کے متعلق یہ تو ظاہر ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خاص لباس نہین اختیار کیا تھا، بلکہ جاہلیت مین جو لباس مستعمل تھا وہی اسلام مین بھی باقی رہا، لیکن زیادہ تفتیش سے ثابت ہوتا ہے، کہ مجوسیون اور عیسائیون کی بہت سی چیزین اختیار کرلی گئی تھین، عرب مین پاجامہ کا مطلق وجود نہ تھا، یہی وجہ ہے کہ عربی زبان مین اس کے لئے کوئی لفظ نہ تھا، عرب مین جب اس کا استعمال ہوا تو فارسی لفظ "شلوار" کو معرب کرکے "سروال" بنالیا اور وہی لفظ آج تک مستعمل ہے، حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت مین اگرچہ قومی خصوصیت قایم رکھنے کے لحاظ سے لوگون کو عرب کے قدیم لباس یعنی تہمد کا پابند رکھنا چاہا، چنانچہ عتبہ بن فرقد کو فرمان لکھا، اسمین صاف یہ الفاظ لکھے، کہ "پاجامہ پہننا چھوڑدو" لیکن قبول عام پر کس کا زور ہے؟ پاجامہ کا رواج ہوا، اور اس عمومیت کے ساتھ ہوا کہ تمام عرب مین

تہمد کا نام بھی نہین رہا عینی[1] شرح بخاری مین لکھا ہی کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

نے بھی پاجامہ پہنا تھا،

برنس ایک قسم کی لمبی ٹوپی تھی جس کو خاص عیسائی استعمال کرتے تھے صحابہ مین سے

اکثرون نے اس کا استعمال کیا اور خود حضرت عمر فاروقؓ اس کو استعمال کرتے تھے، رفتہ رفتہ

جب تعصب کی ابتدا ہوئی تو لوگون کو اس کے استعمال مین تامل ہوا لیکن بڑے بڑے ائمۂ

مذہب نے جواز کا فتوی دیا عینی شرح بخاری مین ہے کہ امام مالک سے لوگون نے پوچھا کہ کیا

برنس کا پہننا اس بنا پر مکروہ ہے کہ عیسائیون کے لباس کے مشابہ ہے" انھون نے جواب دیا

کہ نہین یہان (یعنی مدینہ مین) لوگ عمومًا اس کو استعمال کرتے تھے"

لباس کے سوا معاشرت کی اور بہت سی چیزون مین غیر قومون کی تقلید کی گئی، عرب

مین پہلے تابوت کا طریقہ نہین تھا حضرت زینبؓ کا جب انتقال ہوا، تو حضرت عمرؓ نے

لوگون سے کہا کہ "جنازہ کے اٹھانے مین کافی پردہ پوشی نہین ہوتی، کیا اس کی کوئی تدبیر

نہین ہوسکتی ؟" اسماء بنت عمیسؓ بھی اس موقع پر تشریف رکھتی تھین، انھون نے کہا کہ مین نے

حبش مین دیکھا ہے کہ مردون کے لئے تابوت بناتے ہین" چنانچہ انکی راے کے مطابق تابوت

تیار ہوا حضرت عمرؓ نے دیکھا تو بہت پسند فرمایا، اور اس وقت سے یہ طریقہ جاری ہوگیا،

معاشرت کے متعلق غیر قومون کی رسوم وعادات کے پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہ ہوا کہ مسلمانون

نے روم وفارس کی فتوحات کے ساتھ عیسائیون اور یہودیون کے یہان رشتے ناتے

شروع کردیئے، مدائن کی فتح کے بعد، سیکڑون صحابہ نے عیسائی عورتون کے ساتھ شادیان

کرلین، حضرت عمرؓ کو اطلاع ہوئی تو انھون نے سپہ سالار کو خط لکھا، اور اپنی ناراضی کا

اظہار کیا، انھون نے جواب مین لکھا کہ آپ کا یہ حکم آپ کی ذاتی راے ہے، یا منصب خلافت

[1] عینی جلد دہم صفحہ ۱۰۳ مطبوعہ قسطنطنیہ،

سے متعلق ہے؟ حضرت عمرؓ نے جواب لکھا کہ "اسکو منصب خلافت سے کچھ تعلق نہین، بلکہ میری ذاتی رائے ہے" اور اس بنا پر ہے کہ تم لوگ اپنی قوم کی عورتون کو چھوڑ کر غیر قومون کے نہ ہو رہو، چونکہ اس وقت تمام مسلمانون مین آزادی کا جوہر موجود تھا، لوگون نے حضرت عمرؓ کی ذاتی رائے کی کچھ پروا نہ کی، اور اپنے ارادون پر قایم رہے، رفتہ رفتہ ہزارون عیسائی اور یہودی عورتین مسلمانون کے نکاح مین آگئین، اور قدرت کے قاعدہ کے مطابق، ان کی معاشرت اور رہنے سہنے کے طریقے مسلمانون مین پھیل گئے، اگرچہ اس سے قومی خصوصیتون کو کچھ نقصان پہونچا، لیکن بڑا فائدہ یہ ہوا کہ رات دن کے ملنے جلنے سے اسلام کے عقیدے ان کے دلون مین جگہ پکڑتے گئے، اور ان مین سے سیکڑون مسلمان ہوگئین، بلکہ سچ پوچھیے تو غیر قومون مین اسلام کے پھیلنے کا ایک بڑا سبب یہ بھی تھا،

ملکی نظم و نسق اور طریقۂ جنگ تو گویا بالکل فارس اور یونان کے انداز پر قائم ہوا، حضرت عمرؓ نے خراج اور جزیہ کے متعلق جو قاعدے جاری کئے وہ بالکل نوشیروان کے مرتب کردہ تھے، چنانچہ امام طبری، اور ابن الاثیر وغیرہ نے صاف تصریح کی ہے، آنحضرت صلعم اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ تک خزانہ اور دفتر کا بالکل وجود نہ تھا، فتوحات مین جو روپیہ آتا تھا وہ اسی وقت تقسیم کر دیا جاتا تھا، حضرت عمرؓ کے زمانہ مین جب روپیہ کی افراط ہوئی، تو انھون نے صحابہؓ کو جمع کر کے رائے لی کہ یہ زر کثیر کیا کیا جائے، بعض صحابہؓ جو رومیون کے دفتر اور حساب کتاب کے طریقے دیکھ آئے تھے، انھون نے کہا کہ ہم نے شام مین رومیون کے یہان دیکھا ہے کہ خزانہ اور فوج کا دفتر مرتب رہتا ہے، آج کل کا زمانہ ہوتا تو ہمارے علما من تشبہ بقوم کا مسئلہ پیش کرتے، لیکن حضرت عمرؓ نے اسی وقت چند حساب دان اشخاص کو بلا کر دفتر کی تیاری کا حکم دیا،

اسی طرح عدالتون کا انتظام، پولیس کا محکمہ، صوبجات اور اضلاع کی تقسیم، پبلک ورک، ڈاک کا بندوبست، وغیرہ وغیرہ یہ تمام انتظامات خود خلفاے راشدین کے عہد مین قایم ہوئے اور ٹھیک عجم اور یونان کے نمونہ کے موافق قائم ہوئے، زمانہ مابعد مین جب فلسفہ وغیرہ کی کتابون کا ترجمہ ہوا، تو عربی زبان بالکل غیر قومون کے علوم و فنون سے بھر گئی، یہان تک کہ خود مذہبی علوم بھی ان کے اثر سے نہ بچ سکے،

یونانی علوم و فنون کی تقلید اور اتباع کا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہوگا، کہ آج یونانی طب کو ہم مسلمانی طب سمجھتے ہین، حدیث کی کتابون مین اکثر امراض کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علاج مذکور ہین، یہان تک کہ طب نبوی ایک مستقل مضمون بنگیا ہے، لیکن تمام اسلامی دنیا مین بیماریون کا جو علاج کیا جاتا ہے، وہ ارسطو اور بقراط کے قاعدہ کے مطابق کیا جاتا ہے، اور طب نبوی کا ذکر تک نہین آتا، ایک طرف تو یہ بے تعصبی اور آزاد خیالی، اور ایک طرف یہ تعصب اور ضد کہ یورپ کی کسی بات پر عمل نہ کیا جائے، ورنہ غیر مذہب والون کی مشابہت لازم آئیگی، اور من تشبہ بقوم کا مصداق بننا پڑیگا ع

بہ بین تفاوت رہ از کجاست تا بکجا

خلافت

منجملہ ان الفاظ کے جو مسلمانون مین مذہبی حیثیت سے مستعمل ہین، ایک یہ لفظ بھی ہے لیکن چونکہ یہ لفظ پالٹیکس سے بھی تعلق رکھتا تھا، اور پولٹیکل اغراض نے اکثر اس کے مفہوم اور حقیقت کو بدل کر تعبیر کرنا چاہا، اس لئے بعض اوقات عوام مین اس کے متعلق غلط فہمیان پھیل گئین، اور کم سے کم یہ کہ اس کے معنی مین ابہام اور اشتباہ آگیا، سال دو سال سے زیادہ نہین گذرے کہ اردو اخبارات مین یہ بحث ایک اتفاقی واقعہ کی وجہ سے چھڑ گئی تھی، اور اس نے کسی حد تک طول بھی پکڑ لیا تھا، لیکن پھر بعض اسباب سے رک گئی، اس زمانہ مین سر سید مرحوم نے ایک نہایت دلچسپ آرٹیکل لکھا تھا، جو علی گڈھ گزٹ مین شایع ہوا تھا، مین نے بھی ایک ضمنی موقع پر اپنے سفرنامہ مین اس بحث کی طرف اشارہ کیا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس بات کی ضرورت ہے کہ یہ مسئلہ نہایت تحقیق کے ساتھ بالکل صاف کر دیا جائے، اس مسئلہ پر دو حیثیتون سے بحث ہو سکتی ہے،

(۱) مذہب کے رو سے منصب خلافت کی کیا حقیقت ہے؟

(۲) شروع اسلام سے آج تک یہ لفظ کس معنی مین، اور کن لوگون کے لئے استعمال کیا گیا؟

خلافت یا امامت مرادف الفاظ ہین، اور یہ الفاظ احادیث اور عقائد کی کتابون مین ایک ہی معنی مین استعمال کئے جاتے ہین، خلافت یا امامت کی جو تعریف عقائد کی کتابون مین مذکور ہے، وہ یہ ہے ”مسلمانون پر ایک عام تصرف کا اختیار، جسکی اطاعت تمام مسلمانون

پر(حضرد دیکھو) شرح مواقف مین خلافت کی تعریف ان الفاظ سے کی گئی ہے "آنحضرت صلعم کی قایم مقامی دین کے قائم رکھنے، قوم کی حفاظت کرنے مین" شرح مقاصد مین یہ الفاظ ہین "دین اور دنیا کی افسری بحیثیت قائم مقامی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم"

اس منصب کے حاصل ہونے کے لیے اسلام کے تمام فرقون کے نزدیک جو شرطین ہین، ان مین سے ایک بڑی مقدم شرط یہ ہے کہ وہ شخص قریش کے خاندان سے ہو، اس شرط سے مسلمانون کے فقط ایک گروہ یعنی معتزلہ نے انکار کیا ہے، لیکن یہ گروہ کئی سو برس سے دنیا سے بالکل معدوم ہو گیا ہے، اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ آج تمام دنیا کے مسلمانون کے مذہبی اعتقاد کے مطابق صرف وہ شخص خلیفہ یا امام ہو سکتا ہے، جو قریش کے خاندان سے ہو، جس بنا پر خلافت کے لئے یہ شرط ضروری سمجھی گئی ہے، وہ وہ حدیثین ہین جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مختلف پیرایون مین نہایت کثرت سے منقول ہین، چنانچہ ان کو ہم اس موقع پر تفصیل کیساتھ نقل کرتے ہین:-

(۱) الائمۃ من قریش	امام قریش مین سے ہونگے، (مسند امام احمد بن حنبل)
(۲) الملک من قریش	حکومت قریش مین رہیگی، ترمذی (صحیح)
(۳) الخلافۃ فی قریش	خلافت قریش مین ہوگی، مسند امام احمد بن حنبل (اس کے تمام راوی ثقہ ہین)
(۴) یکون اثنا عشر امیرا کلھم من قریش	بارہ امیر ہونگے جو سب کے سب قریش سے ہونگے صحیح البخاری، (صحیح)
(۵) الخلافۃ بعدی ثلاثون سنۃ ثم یکون ملکا	خلافت تیس برس رہیگی پھر اس کے بعد سلطنت ہوجائیگی، ابو داؤد، نسائی، ابن ماجہ، ترمذی (ابن حبان نے بھی اسکو صحیح لکھا ہے)

لہ دیکھو عینی شرح بخاری جلد ۱۱ صفحہ ۱۴۴

(۴) لایزال امر الناس ماضیا ما ولا هم اثنا عشر رجلا کلهم من قریش۔	لوگوں کا کام اُس وقت تک ٹھیک رہیگا جب تک بارہ شخص حکمران رہیں گے جو سب کے سب قریش سے ہونگے صحیح مسلم (صحیح)

ان احادیث مین سے بعض کا توصریح مطلب یہ ہے کہ خلافت قریش کا حق ہے" اور بعض مین بظاہر پیشین گوئی کے طور پر یہ بیان کیا گیا ہے، کہ خلافت ہمیشہ قریش مین رہیگی لیکن چونکہ کئی سو برس ہو چکے کہ تمام دنیا مین کوئی حکمران قریش کے خاندان سے نہین ہے اس لئے ان احادیث کا یہ مطلب قرار دیا گیا ہے کہ خلافت کا حق درحقیقت صرف قریش کو ہے، اور اس خاندان کے لوگ جو حکمران ہین وہ بادشاہ ہین، مگر خلیفہ نہین ہین لیکن جس حدیث مین یہ مذکور ہے کہ خلافت صرف تیس برس رہیگی پھر سلطنت ہوجائیگی" اس سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ تیس برس کے بعد جو فرمانروا ہوئے، وہ باوجود قریش ہونے کے خلیفہ نہ تھے، بلکہ بادشاہ تھے،

بہرحال تمام روایات کا قدر مشترک یہ ہے کہ خلافت کے لئے قریش ہونا ضرور ہے، اور جو شخص قریش کے خاندان سے نہ ہو وہ کسی طرح تمام مسلمانون کے اعتقاد کے مطابق خلیفہ نہین ہوسکتا،

مسلمانون نے کبھی اور کسی زمانہ مین اُس شخص کو خلیفہ نہین مانا، جو قریش کے خاندان سے نہ ہو، سب سے اول جس موقعہ پر یہ مسئلہ زیر بحث آیا، وہ آنحضرت صلعم کی وفات کا دن تھا، عین آپ کی وفات کے دن انصار نے یعنی جو لوگ مدینہ کے رہنے والے تھے، یہ دعوی کیا کہ خلافت ہمارا حق ہے لیکن جب مہاجرین نے اُن کے مقابلہ مین یہ استدلال پیش کیا کہ خلافت صرف قریش کا حق ہے، تو اُنھون نے سر تسلیم خم کر دیا، اور اپنے دعوے سے دست بردار ہوگئے، چنانچہ یہ واقعہ نہایت تفصیل کے ساتھ تاریخ طبری، ابن اثیر، ابن خلدون مین مذکور ہے

عباسیون کی سلطنت مین جب ضعف آگیا تو ہر طرف دعویداران حکومت پیدا ہوگئے،
جنمین سے بعض بعض خاندانون نے وہ جبروت واقتدار حاصل کیا، اور اُن کے حدود سلطنت
اس قدر وسیع ہوگئے کہ خود دولت عباسیہ کے زمانہ مین کبھی نہین ہوئے تھے، تاہم ان مین
سے کبھی کسی نے خلافت کا دعویٰ نہین کیا، اور ہمیشہ عباسی خلیفہ کے آگے (باوجود اس کے
کہ وہ دلی کے بہادر شاہ سے زیادہ رتبہ نہین رکھتے تھے) سرجھکاتے رہے، اور اس کی
صرف یہ وجہ تھی کہ وہ خود قریش کے خاندان سے نہ تھے، اور اس لئے اگر وہ خلافت کا
دعویٰ کرتے تو مسلمانون مین سے ایک شخص بھی ان کے دعوی کو تسلیم نہ کرتا،

عضد الدولہ، محمود غزنوی، ملک شاہ سلجوقی، دنیا کے بہت بڑے عظیم الشان شاہنشاہ
گذرے ہین، لیکن یہ سب کے سب بغداد کے دربار سے لقب اور خطاب حاصل کرتے تھے،
اور اس پر فخر و ناز کرتے تھے، عضد الدولہ جسکو شاہنشاہ کا لقب حاصل تھا، اور جو بڑی
سطوت و اقتدار کا بادشاہ گذرا ہے، ۳۶۹ سنہ ہجری مین جب بغداد مین طائع اللہ خلیفہ عباسی
کے دربار مین لقب لینے کے لئے حاضر ہوا، تو سب سے پہلے اُس نے زمین چومی، پھر پیچھے ہٹ کر دوبارہ
زمین چومی، اس طرح سات دفعہ زمین بوسی کی، اور جب خلیفہ نے مہربانی سے اُس کو زیادہ
تقرب کی اجازت دی، تو اُس نے بڑھکر خلیفہ کے پاؤن چومے، اس وقت خلیفہ نے اُس کو
کرسی پر بیٹھنے کا حکم دیا، لیکن اُس نے بار بار معذرت کی، اور جب خلیفہ نے اُس کو مجبور کیا تو
الامر فوق الادب کے لحاظ سے کرسی کو بوسہ دیکر اُس پر بیٹھ گیا، اور کہا کہ "مین خدا سے دعا
مانگتا ہون کہ حضور کی اطاعت مجھ سے اچھی طرح بن آئے" ان تقریبات کے ادا کرنے کے
اثنا مین عضد الدولہ کا ایک افسر جو اس کے ساتھ تھا، اس بت پرستی سے گھبرا کر بول اٹھا
کہ "کیا یہ خدا ہے؟ جو آپ اس طرح تعظیم بجالاتے ہین" عضد الدولہ نے کہا کہ "ہان یہ حد ا

کا خلیفہ ہے"

مصر مین جب فاطمیہ خاندان نے ایک وسیع سلطنت قائم کر لی، اور خاندان عباس اُنکو دبا نہ سکا، تو عباسیون سے بجز اس کے اور کوئی تدبیر بن نہ آئی، کہ ایک محضر لکھوایا جس مین فاطمیہ کے نسب کا انکار تھا، اور اس پر تمام علماء سے دستخط کرائے، اور اس طرح لوگون کو ان کی طرف سے برگشتہ کیا، جس کا یہ اثر ہوا کہ ایک مدت مدید کے بعد فاطمیہ کے ایک افسر نے خلیفۂ فاطمی کو تخت سے اتار دیا، اور عباسیہ کی سلطنت قائم کر دی، یہ افسر صلاح الدین ایوبی تھا جو آج "فاتح بیت المقدس" کے نام سے تمام عالم مین مشہور ہے،

۶۵۵ھ مین بغداد کی سلطنت جب ہلاکو کے ہاتھ سے تباہ ہو گئی، اور خاندان بنی عباس برباد کر دیا گیا، تو اس خاندان مین ایک شخص جس کا نام احمد ابو القاسم تھا، اور جیلخانہ مین مقید تھا، بھاگ کر مصر پہونچا، یہان اس وقت ملک ظاہر بیبرس کی حکومت تھی، احمد کے پہونچنے کے ساتھ ظاہر نے ایک بہت بڑا دربار کیا، اور بڑے عجز و نیاز کے ساتھ احمد کے ہاتھ پر بیعت کی، احمد کی وفات کے بعد چونکہ اس کے کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے ایک اور عباسی شہزادہ جو بغداد کی تباہی مین بچ گیا تھا خلیفہ کیا گیا، اور ایک مدت تک اس کے خاندان مین یہ دبرائے نام) خلافت رہی، یہ خلفاء اگرچہ اس قدر بے اختیار اور بے حقیقت تھے، کہ انکو بجز مقررہ وظیفہ کے کسی قسم کی حکومت حاصل نہ تھی، تاہم مذہبی عظمت یہ تھی کہ بادشاہ وقت ہمیشہ ان کے آگے سر جھکاتا تھا، ہندوستان کے مشہور بادشاہ تغلق نے اسی خاندان کی سلطنت کا فرمان منگوایا تھا، اس پر اس قدر خوشی کا اظہار کیا تھا، کہ تمام شہر کی آئینہ بندی کرائی، اور شعرا نے مبارکبادی کے قصیدے لکھے، بدر چاچ کے ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے۔

جبرئیل از طاق گردون ابشرد اگویان رسید ... کز خلیفہ سوے سلطان خلعت وفرمان رسید

غرض تیرہ سو برس سے آج تک کسی ایسے خاندان نے کبھی خلافت کا دعویٰ نہین کیا
جو قریش کے خاندان سے نہ رہا ہو، ناظرین کو حیرت ہوگی کہ اگر ایسا ہو تو ٹرکی خاندان کو
کیون خلافت کا دعویٰ ہے اچا لانکہ یہ عموماً مسلم ہے کہ ترک قریش کے خاندان سے نہین ہین
یہ واقعہ درحقیقت تعجب انگیز ہے، اور واقعہ کا سبب اس سے زیادہ تعجب انگیز ہے ترکون
مین سلطان بایزید ثانی تک جو اس خاندان کا آٹھوان بادشاہ تھا کسی حکمران نے خلافت
کا لقب نہین اختیار کیا تھا چنانچہ آج بھی ترک مصنفین اس زمانہ تک کسی ترکی بادشاہ
کو خلیفہ کے لقب سے یاد نہین کرتے، سلطان سلیم اول نے جو ۹۱۸ھ مین تخت سلطنت
پر بیٹھا، جب مصر فتح کیا، تو اس وقت وہان عباسی خاندان کا ایک برائے نام خلیفہ موجود
تھا جس کا نام المتوکل تھا (یہ وہی خاندان تھا جس کا ابھی ہم ذکر کر چکے ہین) سلطان
سلیم اسکو بجبر قسطنطنیہ لایا، اور اس کو مجبور کیا کہ خلافت کے لقب سے دست بردار ہو جائے
اور یہ لقب سلیم کے نام منتقل کر دے المتوکل اگرچہ اس پر راضی نہ تھا لیکن مجبوراً اسکو قبول
کرنا پڑا، چنانچہ مسجد ایا صوفیہ مین جا کر اس نے اس بات کا اعلان کیا، اور یہ پہلا دن ہے
کہ ٹرکی خاندان کے ساتھ یہ فرضی لقب اضافہ کیا گیا، یہ واقعہ اگرچہ بظاہر مضحکہ آمیز ہے،
لیکن خود ترک مورخین اس کے معترف ہین، اور ترکی تاریخون مین جہان سلیم کا ذکر ہے
یہ واقعہ بھی ساتھ ہی مذکور ہے۔

حقوق الذمیین

یعنی

اسلام مین غیر مذہب والون کے حقوق

دنیا کے عجیب عجیب اتفاقات کی اگر ایک فہرست تیار کیجائے تو یہ واقعہ ضرور اسمین درج کرنے کے قابل ہوگا، کہ مسلمانون کے متعلق اگرچہ یورپ کی واقفیت کے ذریعے نہایت وسیع ہوگئے ہین، اور ہوتے جاتے ہین، اسلامی آبادیون کا بہت بڑا حصہ اُس کے قبضے مین آگیا ہی، سیکڑون عربی دان علما پیدا ہوگئے ہین، عربی تصنیفات کثرت سے یورپین زبانون مین ترجمہ ہوتی جاتی ہین، مسلمانون کے نہایت نایاب تاریخی ذخیرے اصلی زبان مین شائع ہوتے جاتے ہین، اورینٹیل کانفرنس نے مشرق اور مغرب کا ڈانڈا ملا دیا ہی، تاہم غلط معلومات کا بادل جو آج سے کئی سو برس پہلے یورپ کے افق پر چھایا تھا، اب تک نہین ہٹا، بہت سے بہت یہ ہوا ہے کہ وہ کسی قدر ہلکا ہوگیا ہے لیکن فضا مین اب بھی اس قدر تاریکی ہے کہ اذا اخرج یدہ لم یکد یرٰھا (ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہین دیتا) یہ غلط معلومات اوّل اوّل مذہبی راستے سے آئے تھے، اور چونکہ یورپ مین مذہب کا زور خود گھٹ گیا ہے، اس لئے مذہبی حیثیت کے لحاظ سے اب انکا اثر بھی چندان قوی نہین رہا، تاہم جب کبھی پولیٹکل ہوا چلتی ہے، تو یہ دبی چنگاریان اس قدر جلد بھڑک اٹھتی ہین، کہ تمام یورپ مین ایک

آگ سی لگ جاتی ہے،

آرمینیا کے جھگڑے مین ترکون پر جو شنیعہ الزامات لگائے گئے ابھی اس کی تحقیق بھی نہین شروع ہوئی تھی کہ یورپ کے اہل قلم نے دنیا مین غلغلہ ڈال دیا کہ خود مسلمانون کے مذہب مین عیسائی رعایا سے ایسا سلوک کرنا جائز بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہی، اور اس وجہ سے یہ یقین کرنا کہ ترکون نے وہ تمام ظالمانہ کارروائیان کی ہونگی گویا اس بات کا یقین کرنا ہی کہ ترک اپنے مذہب کے پابند ہین اور پورے پابند ہین،

اسی سلسلہ مین ٹائمس کے پرچہ مورخہ ۲۶ جنوری ۱۸۹۵ء مین پادری ملکم مکال نے بڑے دعوے کے ساتھ ایک آرٹیکل لکھا جسمین یہ ثابت کرنا چاہا کہ مذہب اسلام عیسائیون کے حق مین نہایت سخت ظالمانہ قانون ہے، اور اسلامی حکومتون مین ہمیشہ اس قانون پر عمل درآمد رہا ہے، دلی کے مشنریون نے اس آرٹیکل کا ترجمہ چھاپ کر شایع کیا، اور دیباچہ مین یہ تمہید لکھی کہ "یہ آرٹیکل اس قدر مدلل اور پرزور ہے کہ خود ٹائمس کا وہ مسلمان مضمون نگار جو مذہب اسلام کی حمایت مین مضامین کا سلسلہ لکھ رہا تھا، اس آرٹیکل کے بعد بالکل بند ہو گیا، اور کچھ جواب نہ دے سکا"،

آج کل کے مصنفین اسلام نے یورپ کی بہت سی غلط فہمیون کو دور کیا ہے لیکن افسوس ہے، کہ انھون نے اس عظیم الشان مسئلہ پر توجہ نہین کی، کتبخانہ اسکندریہ، عورتون کے حقوق، جزیہ، یہ سب جزئی مباحث ہین لیکن ذمیون کے حقوق کا مسئلہ ایسا مہتم بالشان اور وسیع ہے کہ اگر اس کا قطعی فیصلہ کر دیا جائے تو یورپ کی غلط فہمیون کا سارا طلسم ٹوٹ جائیگا، مین یہ مضمون اسی خیال سے لکھتا ہون، اور امید کرتا ہون کہ یہ بھی اسی طرح اپنے مقصد مین کامیاب ہوگا جس طرح اس سے پہلے کتبخانہ اسکندریہ و الجزیہ کو اپنے

"متعدد مین کامیابی ہوچکی ہے"

اس رسالہ کا موضوع جس پر بحث کا تمام سلسلہ قائم ہے یہ ہی کہ اسلام مین ذمیون کے کیا حقوق ہین؟ یہ جملہ تین لفظون پر مشتمل ہی، اسلام، ذمی، حقوق، اسلام سے ہماری مراد قرآن یا وہ احادیث نبوی ہین جن کی صحت اصول حدیث کی رو سے ثابت ہوچکی ہے،

ذمی اُن رعایا کو کہتے ہین جو اسلامی حکومت مین آباد ہون، اور جنکا مذہب اسلام نہ ہو، لفظ حقوق کی تفسیر کی ضرورت نہین، موضوع کے جو الفاظ ہین اگرچہ انکی تشریح یہی ہے، جو ہم نے کی لیکن ہمارا دعویٰ اُس سے زیادہ وسیع ہے جو موضوع سے مفہوم ہوتا ہے، یعنی جس طرح ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ مذہب اسلام نے ذمیون کے حقوق نہایت فیاضی سے قائم کئے اسی طرح ہمارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ یہ صرف تحریری قانون نہ تھا بلکہ تیرہ سو برس کی وسیع مدت مین من حیث الاغلب طریق عمل بھی اسی کے مطابق رہا،

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ اسلام کے ابتدائی زمانہ مین یعنی آغاز نبوتؐ سے فتح مکہ تک جو عشرہ مین واقع ہوئی، لڑائیون کا ایک ایسا متصل سلسلہ قائم رہا جسکی وجہ سے یہ موقع ہی نہین نصیب ہوا کہ اسلام کو حکومت اور سلطنت کی حیثیت حاصل ہوتی اور رعایا کے ساتھ سلطنت کو جو تعلقات ہونے چاہئین، اُس کے متعلق قانون اور قاعدے منضبط ہوتے، قرآن مجید اور احادیث نبویؐ سے اس باب مین جن احکام کا پتہ لگتا ہی، وہ خاص مسلمانون سے متعلق ہین یعنی غیر مذہب والون سے ان کو واسطہ نہین، اس وقت تک غیر مذہب والون سے جو تعلقات پیدا ہوئے تھے، وہ اسی قدر تھے کہ کسی قوم سے کچھ معاہدہ ہوگیا، کسی سے چند شرائط کے ساتھ صلح ہوگئی، مختصر یہ کہ اس وقت تک غیر مذہب والے اسلام کی رعایا نہین کہلاتے تھے، خیبر کی آبادی فتح ہوکر بھی صرف اسی قدر ہوا کہ یہودیون سے بٹائی پر معاملہ ہوگیا"

اور زمین اُن کے قبضہ میں چھوڑ دی گئی فتح مکہ کے بعد یمن، بحرین، عمان، عدن، وغیرہ فتح ہوئے ان اضلاع میں کثرت سے دوسری قومیں یعنی یہود، عیسائی، پارسی آباد تھے، چونکہ اس وقت امن وامان قائم ہوچکا تھا، اور اسلام کو پوری قوت حاصل ہوچکی تھی، اسلام نے صاف صاف اُن کو رعایا کے لقب سے پکارا اور خود اُن کو بھی اس لقب سے عار نہیں رہا لیکن ان کے متعلق کسی قسم کے مجموعۂ احکام نافذ ہونے کے بجائے اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا کہ ان پر جزیہ مقرر کیا گیا، اور اُس کے معاوضے میں اُنکو چند حقوق دیئے گئے، سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں تقریباً سنہ ۹ھ میں نجران کے عیسائیوں پر جزیہ مقرر ہوا ان کے بعد ایلہ، اذرح، اذرعات وغیرہ وغیرہ پر بھی جزیہ لگایا گیا، یہ ظاہر ہے کہ اس وقت تمدن سلطنت کا آغاز تھا، اور اس وجہ سے تاریخوں میں مسلمان یا ذمی رعایا کے حقوق کی تفصیل نہیں مل سکتی، تاہم اس معاملہ کے متعلق جس قدر سرمایہ مل سکے اُس کو نہایت تلاش سے مہیا کرنا چاہئے، کیونکہ گو وہ مختصر اور سادہ ہوں، لیکن اُن سے حقوق الذمیین کے قانون کے اصول معلوم ہوتے ہیں، اور اس کا فیصلہ ہوسکتا ہے کہ زمانۂ مابعد میں ذمیوں کے متعلق جو مفصل قانون بنا، اُس کا مایۂ خمیر کیا تھا؟

بانیٔ اسلام یعنی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن قوموں پر جزیہ لگایا اُن کو تحریر کے ذریعہ سے مفصلۂ ذیل حقوق دیئے،

(۱) کوئی دشمن اُن پر حملہ کریگا تو اُن کی طرف سے مدافعت کیجائے گی (رسول اللہ صلعم کے خاص الفاظ یہ ہیں، ینصروا[2]

(۲) اُن کو اُن کے مذہب سے برگشتہ نہیں کیا جائیگا، خاص الفاظ یہ ہیں لا یفتنوا

[1] فتوح البلدان صفحہ [2] ایضاً صفحہ ۵۹،

عن دينهم،

(٣) جزیہ جو اُن سے لیا جائیگا، اُس کے لئے محصّل کے پاس خود جانا نہین پڑیگا،

(۴) اُن کی جان محفوظ رہیگی،

(۵) اُن کا مال محفوظ رہیگا،

(۶) اُن کے قافلے اور کاروان (یعنی تجارت) محفوظ رہین گے،

(۷) اُنکی زمین محفوظ رہیگی،

(۸) تمام چیزین جو اُن کے قبضے مین تھین بحال رہینگی،

(۹) پادری رہبان، گرجون کے پجاری اپنے عہدون سے برطرف نہین کئے جائینگے،

(۱۰) صلیبون اور مورتون کو نقصان نہین پہونچایا جائیگا،

(۱۱) اُن سے عشر نہین لیا جائیگا،

(۱۲) اُن کے ملک مین فوج نہ بھیجی جائیگی،

(۱۳) پہلے سے ان کا جو کچھ مذہب اور عقیدہ تھا وہ بدلوایا نہین جائیگا،

(۱۴) اُن کا کوئی حق جو ان کو پہلے سے حاصل تھا زائل نہین ہوگا،

(۱۵) جو لوگ اس وقت حاضر نہین ہین یہ احکام اُن کو بھی شامل ہونگے،

پہلی اور دوسری دفعہ کے سوا باقی تمام حقوق جس معاہدے سے قائم ہوتے ہین وہ ذیل مین بعینہٖ منقول ہین،

ولنجران وحاشیتها جوار الله وذمة محمد النبی رسول الله علی انفسهم وملتهم وارضهم واموالهم وغائبهم وشاهدهم وعیرهم وبعثهم وامثلتهم لا یغیر ما

سلہ فتوح البلدان صفحہ ۶۴،

كانوا عليه ولا يغير حق من حقوقهم وامثلتهم لا يفتن اسقف من اسقفيته ولا راهب من رهبانيته ولا واقه من وقاهيته على ما تحت ايديهم من قليل او كثير وليس عليهم رهق ولا دم جاهلية ولا يحشرون ولا يعشرون ولا يطأ ارضهم جيش الخ[1]

ذمیون کے متعلق اسلام کا جو اصلی قانون ہے، وہ اس سے زیادہ نہین کیونکہ اسلام صرف اُن مسائل اور احکام کا نام ہے جو قرآن مجید یا احادیث صحیحہ سے ثابت ہون، اس کے سوا جو کچھ ہے، گو اس نے قوم مین اور ملک مین کوئی اعتبار حاصل کر لیا ہو، لیکن وہ اسلام کا اصلی قانون نہین ہے،

ذمیون کے حقوق کے متعلق اگرچہ یہ مختصر قواعد ہین اور اسلام کو ابتدائی زمانے مین غیر قومون کے ساتھ جسقدر کم تعلق پیدا ہوا تھا، اُس کے لحاظ سے اس سے زیادہ ضرورت بھی نہ تھی، تاہم انھین قواعد مین نہایت مہتم بالشان امور کا ماخذ موجود ہے، اور حقیقت یہ ہے کہ ذمیون کے حقوق کے متعلق گو کتنا ہی مفصل مجموعۂ قوانین بنایا جاوے، لیکن اُسکی جزئیات ان اصول سے باہر نہین جا سکتین،

اب ہم نہایت تفصیل کے ساتھ بتانا چاہتے ہین کہ زمانۂ مابعد مین جب کہ غیر قومون سے نہایت وسیع اور قوی تعلقات قائم ہو گئے ذمیون کے ساتھ اسلامی حکومتون کا طرز عمل کیا رہا، سب سے زیادہ جس زمانے کے واقعات اس بحث کے تصفیہ کے لئے کام آسکتے ہین، وہ **خلافت فاروقی** کے واقعات ہین، اُن کی خلافت کا زمانہ ایک ممتد زمانہ ہے، اول اول انھین کے وقت مین غیر قومون کے ساتھ سلطنت و رعیت کے تعلقات قائم ہوئے، ان کی نسبت مخالفون نے کہا ہے کہ وہ غیر مذہب والون کے ساتھ سختی سے

---

[1] فتوح البلدان صفحہ ۶۵، قاضی ابو یوسف نے بھی اس معاہدہ کو کتاب الخراج مین نقل کیا ہے،

برتاؤ کرتے تھے، اُن کے عہد مین رعایا کے جس قدر حقوق قائم ہو سکتے ہین، ہو چکے تھے، اور ہر ایک حق کی نسبت صاف صاف فیصلہ کر دیا گیا تھا، اور سب سے بڑھکر یہ کہ اُن کی حکومت اسلامی حکومت کی اصلی تصویر خیال کیجاتی ہی،

حقوق مین سب سے مقدم قصاص کا حق ہے، یعنی یہ کہ قتل و خون کے معاملے مین فاتح اور مفتوح کے حقوق برابر سمجھے جائین، آج جن ملکون مین تمدن اور تہذیب کی حکومت ہے، اُن کا یہ دعویٰ ہے کہ اُنھون نے اس مساوات کو قائم رکھا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ الفاظ کے ذریعہ سے یا عمل کے ذریعہ سے ؟ مین اس کا فیصلہ اُن لوگون پر چھوڑتا ہون جو رات دن اپنی آنکھون سے اس کی مثالین دیکھتے رہتے ہین، اس کے مقابلہ مین دیکھو اسلام نے کیا کیا،

قبیلۂ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو مار ڈالا تھا، حضرت عمرؓ کو اسکی اطلاع دی گئی، اُنھون نے لکھ بھیجا کہ، قاتل مقتول کے وارثون کو حوالہ کر دیا جائے، چنانچہ قاتل حنین نام ایک شخص کو جو مقتول کے وارثون مین تھا سپرد کر دیا گیا، اور اُس نے اُسکو قتل کر ڈالا[۱]، جہان تک ہمکو معلوم ہے حضرت عمرؓ کے اس طریق عمل سے کسی زمانہ مین اختلاف نہین کیا گیا، بلکہ حضرت علی علیہ السلام نے صاف صاف لفظون مین فرمایا کہ من کان له ذمتنا فدمه کدمنا ودیته کدیتنا یعنی "جو لوگ ذمی ہو چکے اُن کا خون ہمارا خون ہے، اور اُن کا خون بہا ہمارا خون بہا ہے"، حضرت علی علیہ السلام کو یہ موقع خود بھی پیش آیا، اور اُنھون نے صاف حکم دیدیا کہ قاتل جو مسلمان تھا قتل کر ڈالا جائے، اس سے بڑھ کر یہ کہ جب مقتول کے وارثون نے آکر عرض کیا کہ ہم نے خون معاف

[۱] زیلعی تخریج ہدایہ مطبوعہ دہلی صفحہ ۳۳۸ و ۳۳۹،

کر دیا، تو آپ نے فرمایا کہ تم پر کچھ دباؤ تو نہیں ڈالا گیا،

عمر بن عبد العزیز جنکو دوسرا عمرؓ کہا جاتا ہے، اُن کے عہد میں بھی اس قسم کا واقعہ پیش آیا، اور انھون نے بھی یہی حکم دیا کہ قاتل مقتول کے وارثون کے حوالہ کر دیا جائے، چنانچہ وارثون نے اُسکو بے تکلف قتل کر دیا،

حضرت عثمانؓ کے زمانہ مین ولید بن عقبہ جو صحابی تھے کوفہ کے گورنر تھے، ایک دفعہ ایک یہودی نے ان کے سامنے شعبدہ بازی کے تماشے دکھائے، اس وقت اور بہت سے تماشائی موجود تھے، ان مین جندب بن کعب ازدی بھی تھے، جو بڑے مشہور تابعی ہین اور صحیح ترمذی مین اُن کی روایتین منقول ہین، وہ ان شعبدون کو شیطان کا اثر سمجھے اور یہودی کو قتل کر دیا، ولید نے اُسی وقت اُنکو گرفتار کر لیا، اور یہودی کے قصاص مین قتل کر دینا چاہا، لیکن چونکہ وہ بڑے جتھے کے آدمی تھے، ان کے قبیلہ والے ان کی حمایت کو کھڑے ہو گئے، ولید نے اس وقت دفع الوقتی کے لئے ان کو قیدخانہ بھیجدیا اور ارادہ کیا کہ موقع پاکر قتل کر دین گے، داروغہ جیل کو ان پر رحم آیا اور کہا کہ تم چپکے سے بھاگ جاؤ، انھون نے کہا کیون؟ کیا درحقیقت مین قتل کر دیا جاؤن گا؟ داروغہ جیل نے کہا خدا کی خوشنودی کے لئے تمھارا قتل کر دینا کچھ بڑی بات نہین، غرض وہ بھاگ گئے، صبح کو ولید نے جندب کو قصاص کیلئے طلب کیا، داروغہ نے کہا کہ وہ تو چھپ کر بھاگ گیا، ولید نے اسکے بدلے داروغہ کی گردن ماردی، ہم کو اس امر سے بحث نہین کہ داروغہ جیل کا قتل کر دینا جائز تھا یا نہین، بلکہ یہ دکھانا منظور ہے کہ باوجودیکہ جندب بڑے رتبہ کے آدمی

لے زیلعی صفحہ ۲۰۵ کے ایضاً صفحہ مذکورہ بالا کے مسعودی ذکر خلافت عثمانؓ کتاب الاوائل مین اس واقعہ کو کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے،

تھے، اور یہودی ایک معمولی باز گیر تھا، تاہم ولید کو ایک حکم شرعی کی تعمیل کے لحاظ سے جندبؓ کے قتل کر دینے مین کچھ تامل نہ ہوا،

اسی سلسلہ مین حضرت عمر فاروقؓ کی شہادت کا واقعہ بھی سننے کے قابل ہے، حضرت عمرؓ کے قاتل کا نام **فیروز** تھا، جو مجوسی النسل تھا، اور عیسائی مذہب رکھتا تھا، حضرت عمرؓ کے بڑے بیٹے عبید اللہ سے لوگون نے بیان کیا کہ اور لوگ بھی اس سازش مین شریک تھے، چنانچہ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے عبد الرحمنؓ نے چشم دید واقعہ بیان کیا، عبید اللہ تلوار ہاتھ مین لیکر نکلے، اور فیروز کے بیٹے اور جفینہ و ہرمزان کو جن پر سازش کا شبہہ تھا قتل کر دیا، ان مین سے ہرمزان مسلمان ہو گیا تھا، باقی عیسائی تھے، عبید اللہ اسی وقت گرفتار کر لئے گئے، اور حضرت عثمانؓ جب مسند خلافت پر بیٹھے تو پہلا مسئلہ یہی پیش کیا گیا کہ عبید اللہ کی نسبت کیا کرنا چاہئے، حضرت **عثمانؓ** نے صحابہ کو بلا کر رائے طلب کی، تمام مہاجرین یعنی اُن بزرگون نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ وطن چھوڑ کر چلے آئے تھے، اور تمام صحابہ کی بہ نسبت افضل سمجھے جاتے تھے، یک زبان ہو کر کہا کہ عبید اللہ کو قتل کر دینا چاہئے، حضرت علی علیہ السلام بھی اس مجمع مین موجود تھے، اور انھون نے بھی یہی رائے دی، اگرچہ حضرت عثمانؓ بعض مصلحتون کی وجہ سے اس فیصلہ کی تعمیل نہ کر سکے اور (جیسا کہ مورخین نے لکھا ہے) حضرت عثمانؓ کی خلافت کی یہ پہلی کمزوری تھی، تاہم انھون نے تینون مقتولون کے بدلے بیت المال سے خون بہا دلایا، شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ لوگون نے عبید اللہ کا قتل کیا جانا جو تجویز کیا تھا، وہ ہرمزان کے قصاص مین تھا، اور ہرمزان مسلمان ہو چکا تھا، لیکن یہ قیاس صحیح نہین، اولاً تو روایتون مین اس قسم کی تخصیص کا

لے مسعودی ذکر خلافت عثمانؓ کتاب الاوائل مین بھی اس واقعہ کو کسی قدر اختلاف کے ساتھ نقل کیا ہے،

کوئی اشارہ نہین پایا جاتا، اس کے علاوہ حضرت عثمانؓ نے تینون کا جو خون بہا دلایا اسین کسی قسم کی تفریق نہین کی،

ہم کو جہانتک معلوم ہے اسلام کی تمام تاریخ مین اس کے خلاف کوئی مثال نہین ہے بعض مسلمان مورخون نے لکھا ہے، کہ ہارون الرشید کے زمانہ مین ایک مسلمان نے کسی ذمی کو مارڈالا، قصاص مین مسلمان ماخوذ ہوا لیکن کسی خاص وجہ سے ہارون الرشید کو اس کی رعایت منظور تھی، اور اس لئے اس نے چاہا کہ وہ قتل سے بچ جائے، چنانچہ قاضی ابو یوسفؒ صاحب کو بلاکر اس کی تدبیر پوچھی، قاضی صاحب نے فرمایا کہ "شہادت سے یہ ثابت نہین کہ وہ مارے جانے کے وقت بھی قانوناً ذمی تھا" اگرچہ ہمارے نزدیک یہ واقعہ ثابت نہین تاہم اگر اس کو مان لیا جائے تب بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ذمی کے قصاص مین مسلمان کو قتل سے بچانا ایک ایسا عظیم واقعہ تھا، جس کے حیلہ پیدا کرنے کے لئے قاضی ابو یوسفؒ جیسے شخص کی ضرورت پڑی، اور وہ بھی اس کے سوا کچھ حیلہ نہ بتا سکے کہ اسکا ذمی ہونا مشتبہ ٹھہرائین،

مال اور جائداد کے حقوق جنکو انگریزی مین "رائٹ آف پراپرٹی" اور "رائٹ آف لینڈ" سے تعبیر کیا جاتا ہے، ان مین بھی مسلمان اور ذمی برابر درجہ رکھتے تھے، ذمیون کے قبضہ مین جس قدر زمینین تھین اسلام کے بعد عموماً بحال رکھی گئین، یہانتک کہ اگر خلیفۂ وقت یا بادشاہ کو مسجد یا کسی اور عمارت کی غرض سے زمین لینے کی ضرورت ہوتی تھی تو معاوضہ دیکر لیجاتی تھی،

حضرت عمرؓ کے زمانہ مین ایک شخص نے دجلہ کے کنارے گھوڑون کے پالنے کے لئے ایک رمنہ بنانا چاہا، آپ نے ابو موسیٰ اشعریؓ کو جو بصرہ کے گورنر تھے

لکھ بھیجا کہ اگر وہ زمین ذمیون کی نہ ہو، اور اسمین ذمیون کی نہرون اور کنوون کا پانی نہ آتا ہو تو سائل کو زمین دیدیجائے[1]، خلیفہ منصور عباسی نے جب بغداد کو دار الخلافہ بنانا چاہا تو آس پاس کی قومین جو وہان کی زمیندار تھین اُن سے قیمت دیکر زمین مول لی[2] حیرہ مین قدیم زمانہ کے محل اور ایوان تھے جو اسلام کے زمانہ مین ویران ہوچکے تھے حضرت عمرؓ کے عہد مین کوفہ مین جو جامع مسجد بنی اسمین کچھ ملبہ وہان کے مکانات سے آیا تھا اگرچہ ان کا کوئی قانونی وارث نہ تھا تاہم چونکہ ذمیون کی زمین مین تھا، اس لئے ذمیون کو ان کی قیمت ان کے جزیہ مین مجرا دی گئی[3]، اس کے سوا سیکڑون واقعات ہین جن سے صاف ثابت ہوتا ہی کہ ذمیون کے مال اور جائداد سے کبھی تعرض نہین کیا گیا،

آغاز اسلام ہی مین یہ مسئلہ بڑے معرکہ کے ساتھ طے ہوگیا تھا، کہ غیر مذہب والے جو اسلام کی رعایا بنگئے ہین، اُنکی مقبوضہ زمینین اُن کے قبضہ سے نکالی نہین جاسکتین، حضرت عمرؓ کے عہد مین جب عراق فتح ہوا تو عبد الرحمٰن بن عوفؓ اور حضرت بلالؓ نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ جس قدر مفتوحہ زمین ہے اہل فوج کو تقسیم کردیجائے حضرت عمرؓ نے انکار کیا، اور دیر تک بحث رہی، آخر یہ ٹھہرا کہ تمام مہاجرین اور انصار سے مشورہ کیا جائے، چنانچہ ایک بڑا مجمع ہوا اور انصار مین سے دس شخص جو اپنے اپنے قبیلہ کے وکیل اور قائم مقام تھے مجمع مین حاضر ہوئے، تمام بڑے بڑے مہاجرین صحابہ یعنی حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، طلحہؓ، عبد اللہ بن عمرؓ وغیرہ بھی موجود تھے، حضرت عمرؓ نے کھڑے ہوکر نہایت توضیح سے اس مسئلہ کو بیان کیا، بلالؓ اور عبد الرحمٰن بن عوفؓ اب بھی مخالف رہے، لیکن عام رائے یہ ہوئی کہ ذمی اپنی زمینون سے بیدخل نہین کئے جاسکتے

[1] فتوح البلدان صفحہ ۱۵۳، [2] ایضاً صفحہ ۲۹۵، [3] ایضاً صفحہ ۲۸۶،

حضرت بلال رضؓ اس پر بھی قائل نہین ہوتے تھے لیکن حضرت عمر رضؓ نے جب قرآن مجید کی ایک آیت استدلال مین پیش کی تو اُن کو مجبور ہونا پڑا اور بلا اختلاف تمام صحابہؓ کے اتفاق سے یہ مسئلہ طے ہوگیا[1]،

اسی بنا پر فقہ کا یہ مسئلہ مسلمہ ہے کہ اگر بادشاہ یا امامِ وقت کسی زمانہ مین زمین کو ذمیون کے قبضہ سے نکالنا چاہے، تو نہین نکال سکتا، قاضی ابو یوسف کتاب الخراج مین لکھتے ہین،

وَلَیْسَ لَہٗ اَنْ یَّاْخُذَ مَا بَعْدَ ذَالِکَ مِنْھُمْ وَھِیَ مِلْکٌ لَّھُمْ یَتَوَارَثُوْنَھَا وَیَتَبَایَعُوْنَھَا

یعنی امام وقت کو یہ اختیار نہین کہ اس کے بعد ان سے زمین کو چھین لے، وہ زمین انکی ملک ہو، ان مین نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتی رہیگی، اور وہ اس کو خرید و فروخت کر سکتے ہین،

حضرت عمر رضؓ نے اپنے عہدِ خلافت مین جاگیرات کا ایک صیغہ قائم کیا تھا یعنی حقوقِ اسلامی کے لحاظ سے جسکو مناسب سمجھتے تھے اُس کو جاگیر عطا کرتے تھے، لیکن چونکہ آراضیات بالکل ذمیون کی مملوکہ تھین، اور حضرت عمرؓ کو ان مین کسی قسم کے تصرف کا اختیار نہ تھا، اس لئے اس غرض کے لئے خاص وہ زمینین مخصوص کی تھین جو کسی کی ملک نہ تھین، چنانچہ اس قسم کی زمینین حسب ذیل تھین، جاگیرات خالصہ جو نوشیروان نے خاندان شاہی کے لئے مخصوص کی تھین، لاوارث اشخاص کی زمین، دریا برآمد، ڈاک خانہ کے متعلق زمین،

اس کے ساتھ یہ اصول بھی قرار پایا کہ جو ملک بزور فتح کیا جائے، وہان کے باشندون کی جائداد فروخت کرنے پر بھی مسلمانون کے ہاتھ منتقل نہین ہو سکتی، یہ قاعدہ اگرچہ

---

[1] یہ پوری تفصیل کتاب الخراج صفحہ ۱۴، ۱۵ مین ہے،

اس لحاظ سے مقرر ہوا تھا کہ مسلمان کے قبضہ مین آجانے سے زمین دہ یکی ہو جاتی ہی، اور خراج کو نقصان پہونچتا ہے، تاہم اس قاعدے نے ذمیون کو بہت بڑا فائدہ یہ پہونچایا کہ زمین کسی حالت مین ان کے خاندان اور ان کی قوم کے قبضہ سے باہر نہین جا سکتی تھی، چنانچہ اس کے خلاف اگر کبھی عمل ہوا تو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا گیا، امام لیث بن سعد نے مصر مین تھوڑی سی زمین مول لی تھی، اس پر وہان کے بڑے بڑے علما، مثلاً ابن لہیعہ اور نافع بن یزید سخت معترض ہوئے[1] عقبہ بن عامر ایک بڑے بزرگ صحابی تھے، اور امیر معاویہ نے ان کو مصر کا گورنر مقرر کیا تھا، وہ مصر کے ایک گاؤن مین اپنی سکونت کے لئے مکان بنوانا چاہتے تھے، چنانچہ امیر معاویہؓ نے اس غرض سے انکو ایک ہزار جریب زمین عطا کی، اُنھون نے خراب اور افتادہ زمین جو کسی کے قبضہ مین نہ تھی انتخاب کی، اور جب ان کے نوکر نے کہا کہ کوئی عمدہ قطعہ لیجئے، تو انھون نے کہا یہ نہین ہو سکتا، کیونکہ معاہدہ مین جو شرطین ہین ان مین ایک یہ بھی ہے کہ ذمیون کی زمین ان کے قبضہ سے نکالی نہین جائیگی[2]، ان سب سے بڑھکر یہ کہ اکثر ممالک مین جو خراج ذمیون پر مقرر کیا گیا، اُس کے ساتھ یہ شرط بھی لکھدی گئی کہ آیندہ کبھی اس پر اضافہ نہ کیا جائے گا، خود مصر کے معاہدہ مین یہ شرط داخل تھی، چنانچہ امیر معاویہؓ نے جب مصر کے عامل وردان کو لکھا کہ خراج کی مقدار مین اضافہ کیا جائے تو اس نے صاف انکار کیا اور جواب مین لکھا کہ معاہدہ مین شرط ہو چکی ہو کہ خراج مقررہ پر اضافہ نہ ہوگا، اگرچہ اسمین شبہہ نہین ہو سکتا کہ زمانۂ مابعد مین خراج کی مقدار بدلتی رہی، لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہین کہ اصل جمع پر اضافہ ہوا، بہت سی زمینین نئی آباد ہو گئی تھین اور

---

[1] مقریزی صفحہ ۲۹۵، [2] ایضاً صفحہ ۳۰۰،

ان پر اضافہ ہونا خود مقتضائے انصاف تھا،

سب سے مقدم اور ضروری بحث مذہبی حقوق کی ہے، یورپ میں جس گروہ نے اسلام کو نکتہ چینیوں کا ہدف بنا رکھا ہی، اُن کی حوصلہ آزمائی کا بڑا جولانگاہ یہی ہے، اُن کا دعویٰ ہے کہ اسلام مین مذہبی آزادی بالکل نہین ہے، اور قدیم اسلامی حکومتون نے غیر قومون کے مذہبی حقوق بالکل پامال کر دیئے تھے، لیکن ہم دکھانا چاہتے ہین کہ اسلام نے تمام دنیا کی قومون کو جس حد تک مذہبی آزادی دی کبھی کسی قوم نے نہین دی، ہزاب دینے کا دعویٰ کر سکتی ہے، یورپ دو سو برس پہلے تو مذہبی آزادی کا نام بھی نہین لے سکتا تھا، آج بے شبہہ اُسکو یہ دعویٰ ہے، مگر کیونکر ہے؟ اس لئے کہ اُس کو خود مذہب کی پروا نہین رہی، بے شبہہ یورپ گرجا اور بتخانے کے جھگڑے مین انصاف کا پلہ برابر رکھتا ہی لیکن اگر ایک سڑک اور مسجد کا معاملہ پیش آجائے تو مسجد بے تکلف برباد کر دیجاتی ہی، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جس فیاضی پر نازہے، وہ مذہبی آزادی کا نہین بلکہ مذہبی بےپروائی کا اثر ہے،

مذہبی آزادی کے متعلق اسلام کا جو اصول ہے، اُن الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نجرانیون کے معاہدون مین تحریر فرمائے تھے، اور جس کو ہم اس مضمون کے پہلے حصہ مین نقل کر چکے ہین یعنی یہ کہ پادری وغیرہ اپنے منصب پر بحال رہین گے، اور مذہب سے کچھ تعرض نہ کیا جائیگا، یہ خاص رسول اللہ صلعم کے احکام ہین، اور اس لئے دوسرے لفظون مین کہا جا سکتا ہے کہ یہ خاص اسلام کے احکام ہین، اس سے یہ بھی قیاس ہو سکتا ہی کہ خلفائے راشدینؓ جو رسول اللہ صلعم کے افعال و اقوال کے یادگار تھے، اس باب مین اُن کا طرزِ عمل کیا رہا ہوگا؟ لیکن ہم صرف قیاس پر قناعت نہین کرتے، تاریخ کی مستند کتابون، مثلاً بلاذری، طبری، ازدی، وغیرہ مین کثرت سے

معاہدے اصلی الفاظ مین مذکور ہین، جنکا قدر مشترک یہ ہے کہ کسی کے مذہب سے تعرض نہ کیا جائیگا، چنانچہ مزید اطمینان کے لئے ہم بعض معاہدون کو اس مقام پر نقل کرتے ہین، خالد[1] نے حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ مین جب حیرہ پر فتح حاصل کی تو یہ معاہدہ لکھدیا،

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ ولا یمنعون من ضرب النواقیس ولا من اخراج الصلبان فی یوم عیدھم

یعنی انکے گرجے برباد نہ کئے جائین گے نہ انکو سنکھ بجانے سے منع کیا جائیگا، نہ عید کے دن صلیب کے نکالنے سے روکا جائیگا،

عانات پر جب خالدؓ کا گذر ہوا تو وہان کا پادری ان کے پاس حاضر ہوا، اور انھون نے ان شرائط پر اس سے صلح کر لی،

لا یھدم لھم بیعۃ ولا کنیسۃ وعلی ان یضربوا نواقیسھم فی ای ساعۃ شاؤا من لیل او نھار الا فی اوقات الصلوٰۃ وعلی ان یخرجوا الصلبان فی ایام عیدھم[2]،

یعنی اُن کے گرجے برباد نہ کئے جائین گے، وہ نماز کے وقتون کے سوا، رات دن مین جس وقت چاہین ناقوس بجائین، اور تمام تیوہارون مین صلیب نکالین،

قاضی ابویوسف صاحب نے کتاب الخراج مین ان احکام کو نقل کرکے لکھا ہے کہ "خالدؓ کے ان معاہدون پر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ کسی نے کبھی اعتراض نہیں کیا" اس لحاظ سے اگر فقہی اصطلاح کے موافق کہا جائے تو کہہ سکتے ہین کہ اس مسئلہ پر صحابہؓ کا اجماع ہو گیا تھا، اور یہی وجہ ہے کہ زمانۂ مابعد مین جب کبھی کسی متعصب فرمانروا نے اس کے خلاف کرنا چاہا، تو مذہبی پیشواؤن نے

[1] کتاب الخراج صفحہ ۸۴، [2] ایضاً صفحہ ۸۴،

فوراً مخالفت کی، اور اگر کسی مجبوری کی وجہ سے یہ جرأت نہ کرسکے تو اس کے مرنے کے بعد اسکی تلافی کردی گئی، ہارون الرشید، جب نائس فورس قیصر روم کی بار بار بغاوت سے نہایت برہم ہوا تو عیسائیون کی طرف سے اُس کے خیالات بہت کچھ بدل گئے تھے، غالباً اسی کا اثر تھا کہ اس نے قاضی ابو یوسف صاحب جو مذہبی صیغہ کے افسر کل تھے، پوچھا کہ عیسائیون کے گرجے اسلام مین کیون محفوظ رہے، اور آج ان کو کیون یہ اجازت حاصل ہے، کہ وہ علانیہ صلیب نکالتے ہین، ؟ اس کا جواب جو قاضی صاحب نے لکھا اس کے خاص الفاظ یہ ہین، :-

انما کان الصلح بین المسلمین واھل الذمة فی اداء الجزیة وفتحت المدن علی ان لا تھدم بیعھم ولا کنائسھم داخل المدینة ولا خارجھا وعلی ان یقاتلوا من ناواھم عن عدوھم وعلی ان یخرجوا الصلبان فی اعیادھم ففتحت الشام کلھا والحیرة الا اقلھا علی ھذا فلذلک ترکت البیع والکنائس ولم تھدم[1]،

یعنی مسلمانون اور ذمیون سے جزیہ کی بناپر جو صلح ہوئی تھی، اس شرط پر ہوئی تھی کہ ان کی خانقاہین، اور گرجے شہر کے اندر ہون یا باہر، برباد نہ کئے جائین گے اور یہ کہ انکا کوئی دشمن ان پر چڑھ آئے تو ان کی طرف سے مقابلہ کیا جائیگا، اور یہ کہ وہ تیوہارون مین صلیب نکالنے کے مجاز ہین، چنانچہ تمام شام اور حیرۃ (باستثنا بعض مواضع کے) انھین شرائط پر فتح ہوا، اور یہی وجہ ہے کہ خانقاہین اور گرجے اسی طرح چھوڑ دیے گئے، اور برباد نہین کیے گئے "

[1] کتاب الخراج صفحہ ۸۰۔

خلیفہ ہادی کے زمانہ مین ۱۶۹ھ مین جب علی بن سلیمان مصر کا گورنر مقرر ہوا، تو حضرت مریم کے گرجا اور چند گرجون کو منہدم کرا دیا، ہادی نے ایک سال کی خلافت کے بعد وفات پائی اور ہارون الرشید تخت نشین ہوا، اس نے علی کو معزول کرکے ۱۷۱ھ مین موسیٰ بن عیسیٰ کو مصر کا گورنر مقرر کیا، موسیٰ نے گرجون کے معاملہ مین علما سے استفسار کیا، اس وقت مصر کے تمام علما کے پیشوا الیث بن سعد تھے، جو بہت بڑے محدث اور نہایت مقدس اور بزرگ تھے، انھون نے علانیہ فتویٰ دیا کہ منہدم شدہ گرجے نئے سرے سے تعمیر کرا دیئے جائین، اور دلیل یہ پیش کی کہ مصر مین جس قدر گرجے ہین خود صحابہ اور تابعین کے زمانہ مین تعمیر ہوئے تھے، چنانچہ تمام گرجے سرکاری خزانہ سے تعمیر کرا دیئے گئے،[1] علامہ مقریزی نے تاریخ مصر مین اس واقعہ کو ان الفاظ مین لکھا ہی؛

فبنیت کلها بمشورة اللیث بن سعد وعبد الله بن لهیعة وقالا هو من عمارة البلاد واحتجا بان الکنائس التی بمصر لم تبن الا فی الاسلام فی زمن الصحابة والتابعین[2]،

اسی طرح دمشق کا ایک گرجا ایک رئیس کی بیجا فیاضی سے خاندان بنی نصر کے قبضہ مین آگیا تھا، حضرت عمر بن عبد العزیز نے اپنے عہد خلافت مین اسکو بنی نصر سے چھین کر عیسائیون کے حوالہ کر دیا، اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالین ملتی ہین لیکن اس موقع پر ہم ایک ایسا واقعہ نقل کرتے ہین، جو صرف ایک جزئی واقعہ کی حیثیت نہین رکھتا بلکہ اس سے جانشینان اسلام کے عام طرز عمل کا اندازہ ہو سکتا ہی،

دمشق کی جامع مسجد ایک گرجا کے متصل تھی، جس کا نام یوحنا کا گرجا تھا، امیر معاویہ

[1] النجوم الزاہرہ واقعات ۱۶۹ھ، [2] مقریزی جلد دوم صفحہ ۵۱۱،

نے اپنے عہد خلافت مین ضرورت کی وجہ سے چاہا کہ گرجا کو مسجد مین شامل کر لین لیکن عیسائیون نے انکار کیا، امیر معاویہؓ مجبور رہے، عبد الملک بن مروان نے اپنے زمانہ مین عیسائیون سے درخواست کی اور معاوضہ پیش کیا عیسائی پھر راضی نہ ہوئے اور عبد الملک کو باز رہنا پڑا، ولید نے اپنے زمانِ خلافت مین عیسائیون کے آگے ایک بہت بڑی رقم پیش کی، وہ اسی طرح انکار کرتے رہے، ولید نے غصہ مین آکر کہا، کہ تم خوشی سے نہین دیتے تو مین جبراً لے لونگا، عیسائیون نے کہا کہ جو شخص کسی گرجا کو نقصان پہونچاتا ہے، وہ پاگل یا کوڑھی ہوجاتا ہے، ولید کو اس پر زیادہ غصہ آیا خود اپنے ہاتھ مین کدال لیکر گرجا کی دیوار ڈھانی شروع کی، اور بالآخر گرجا مسجد مین شامل کر لیا گیا، حضرت عمر بن عبد العزیز کے زمانہ مین عیسائیون نے اس تعدی کی شکایت کی، حضرت عمر بن عبد العزیز نے دمشق کے عامل کو لکھ بھیجا کہ گرجا کا جو حصہ مسجد مین ملا لیا گیا ہے، وہ عیسائیون کو واپس کر دیا جائے، اس پر مسلمانون کو نہایت رنج ہوا، کہ ہم جس مسجد مین نماز پڑھ چکے اور اذانین دے چکے، اس کو کیونکر ڈھائین، آخر عیسائیون کے پاس جاکر خوشامد کی، اور کہا کہ آغاز فتح مین غوطۂ دمشق کے جس قدر گرجے مسلمانون کے قبضہ مین رہ گئے تھے، اور اب تک ہین، وہ سب واپس کر دیئے جائینگے، اگر تم اس مسجد کے ڈھانے سے باز آؤ" عیسائی اس پر راضی ہوئے، اور عمر بن عبد العزیز کو اسکی اطلاع دیگئی، انھون نے عیسائیون کی خواہش کے موافق مسجد کا منہدم کرنا روک دیا، اور ان کو غوطۂ دمشق کے تمام گرجے دلا دیئے،

اس واقعہ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ غیر مذہب والون کی کسی عبادتگاہ پر تصرف کرنا کس قدر پرخطر کام سمجھا جاتا تھا، اور مقدس خلفا، کہان تک گرجاؤن وغیرہ کا

[1] یہ پوری تفصیل فتوح البلدان صفحہ ۱۲۵ مین مذکور ہے،

لحاظ رکھتے تھے،

یورپین مصنفون کی طرف سے بڑا اعتراض یہ پیش کیا جاتا ہی کہ مسلمانون کے عہد مین نئے گرجاؤن یا تبخانون کے بننے کی اجازت نہ تھی، لیکن یہ انکی سرسری معلومات کا نتیجہ ہی یہ بحث خود صحابہؓ کے زمانہ مین پیش آچکی تھی، اور اس کا فیصلہ کر دیا گیا تھا، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تھا، تو انھون نے جواب دیا کہ جو شہر مسلمانون کے خاص آباد کردہ ہین، وہان غیر مذہب والون کو یہ حق حاصل نہین کہ گرجا اور تبخانہ بنائین، یا ناقوس بجائین، باقی جو قدیم شہر ہین وہان ذمیون سے جو معاہدہ ہے مسلمانون کو اسکا پورا کرنا ضرور ہوگا[1]، حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کا یہ فتویٰ بھی اس لحاظ سے تھا کہ اس وقت تک مسلمان، اور دوسری قومین اچھی طرح ملے جلے نہین تھے، لیکن جب یہ حالت نہین رہی تو وہ فیصلہ بھی نہین رہا، چنانچہ خاص اسلامی شہرون مین اس کثرت سے گرجا، تبخانے اور آتشکدے بنے کہ انکا شمار نہین ہوسکتا، بغداد خاص مسلمانون کا آباد کیا ہوا شہر ہی، وہان کے گرجون کے نام معجم البلدان مین کثرت سے ملتے ہین، قاہرہ مین جو گرجے بنے وہ مسلمانون ہی کے عہد مین بنے، یوٹیکیس نے جو ۳۲۸ھ مین اسکندریہ کا لارڈ بشپ تھا، اپنی کتاب مین جو عربی زبان مین ہے، اور جس کو پروفیسر پوکاک نے لاٹین ترجمہ کے ساتھ چھاپا ہی، اس قسم کے بہت سے گرجون کا نام اور ان کے حالات لکھے ہین،

خالد بن عبد اللہ قسری نے جو ہشام بن عبد الملک کے زمانے مین عراقین کا گورنر تھا، اور عرب کے نہایت نام آور لوگون مین شمار کیا جاتا ہی، اپنی مان کے لئے جو عیسائی مذہب رکھتی تھی، خود ایک گرجا تعمیر کرا دیا تھا، عضد الدولہ نے جو بہت بڑا نامور شہنشاہ

---

[1] کتاب الخراج صفحہ ۸۸،

گذرا ہے اور نہایت صاحب فضل وکمال تھا، اپنے وزیر نصر بن ہارون کو چرچ اور گرجاؤن کے بنانے کی عام اجازت دی تھی[1]، چنانچہ اس نے ۳۶۹ھ مین نہایت کثرت سے تمام ممالک اسلامیہ مین چرچ اور گرجے تعمیر کرائے،

مسلمانون نے صرف یہی نہین کیا کہ پرانے معبد قائم رکھے یا نئے معبدون کی تعمیر کی اجازت دی، بلکہ انھون نے نہایت انصاف سے معبدون کے متعلق تمام عہدے اور تمام وہ جائدادین بحال رہنے دین جو ان معبدون پر وقف تھین، یہان تک کہ پجاریون اور مجاورون کے جو روزینے پہلے سے مقرر تھے، وہ بھی اپنے خزانے سے جاری رکھے، عمرو بن العاص رضی نے حضرت عمر رضی کے عہد مین جب مصر فتح کیا تو جس قدر آراضیات گرجاؤن پر وقف تھین، اسی طرح بحال رہنے دین، چنانچہ اس قسم کی جو آراضیات ۳۰۰ھ تک موجود تھین انکی مقدار ۲۰ ہزار فدان تھی[2]، محمدؐ قاسم نے جب سندھ فتح کیا تو برہمنون کو بلاکر بتخانون کے متعلق انکو جو اختیار دیئے اسکو مورخ علی بن حامد نے اپنی تاریخ سندھ مین ان الفاظ مین لکھا ہے:-

"پس اکابر ومقدمان وبراہمہ را فرمود کہ معبود خود را عبادت کنند وفقرائے برہمنان را باحسان وتعہد تیمار دارند واعیاد ومراسم خود بہ شرائط آباواجداد قیام نمائیند وصدقاتے کہ پیش ازین در حق براہمہ مید ادند برقرار قدیم بدہند"

بنیامین جو مصر کا پیٹریارک تھا، اور ایرانیون کے تسلط کے زمانے مین مصر سے بھاگ گیا تھا، اسکو خود عمرو بن العاص رضی نے ۲۰ھ مین امان کی تحریر بھیجکر مصر مین بلوایا،[3] اور پیٹریارک کے عہدے پر مامور کیا، محمدؐ فاتح نے جب ۱۴۵۳ء مین قسطنطنیہ فتح کیا تو یونانی

---

[1] ابن الاثیر واقعات ۳۶۹ھ، [2] دیکھو مقریزی جلد دوم صفحہ ۴۹۹، [3] ایضاً صفحہ ۴۹۲،

کلیسا کا خود محافظ بنا، اور تمام پادریوں کو ہر قسم کے قانون کے احکام سے بری کر دیا،

اسلام میں غیر مذہب والوں کے مذہبی احکام کا جو لحاظ کیا جاتا تھا، اس کا ثبوت اس سے بڑھکر کیا ہوگا کہ یہ فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کوئی عیسائی ایک گرجا بنانے کی وصیت کر جائے، تو اسلامی عدالت اس وصیت کو جائز تسلیم کریگی اور مسجد بنانے کی وصیت کر جائیگا تو ناجائز، چنانچہ صاحب ہدایہ نے باب الوصیۃ میں امام ابوحنیفہؒ کا یہ مذہب نقل کر کے انکی طرف سے یہ دلیل پیش کی ہے، لانا امرنا بان نترکھم وما یدینون یعنی ہم کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم غیر مذہب والوں کو ان کے احکام مذہبی پر چھوڑ دیں، ایک دفعہ جب حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں ایک عورت نے مسلمانوں کی ہجو کے اشعار گائے، اور ایک افسر نے اس جرم پر اس کے ہاتھ کاٹ ڈالے، تو حضرت ابوبکرؓ نے اس افسر کو خط لکھا کہ اگر وہ عورت مسلمان تھی تو کوئی معمولی سزا دینی چاہئے تھی، اور اگر ذمی تھی تو جب ہم نے اس کے شرک اور کفر سے درگذر کی تو ہجو تو شرک سے بہرحال کم ہے[۱]

عیسائی نکتہ چینیوں کی نسبت ہم کو صرف یہی شکایت نہیں کہ وہ اسلامی تاریخ سے ناآشنا ہیں، بلکہ افسوس یہ ہے کہ وہ خود اپنے قدیم عیسائی بزرگوں کی روایتوں سے واقفیت نہیں رکھتے، حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مرو کا جو پیٹریارک تھا، اور جس کا نام (JESUJAH) تھا، اس نے ایران کے لارڈ بشپ (SIMEON) کو جو خط لکھا تھا، اسمیں یہ الفاظ ہیں

"عرب جن کو خدا نے اس وقت جہان کی بادشاہت دی ہے، عیسائی مذہب پر حملہ نہیں کرتے، بلکہ برخلاف اس کے وہ ہمارے مذہب کی امداد کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور خداوند یسوع کے مقدسوں کی عزت کرتے ہیں، اور گرجوں اور خانقاہوں کے لئے

---

۱ طبری واقعات سنہ ۱۲ھ،

عطیہ دیتے ہین"

مذہبی اور قانونی حقوق کے بعد جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے، یہ امر زیادہ قابل لحاظ ہو
کہ ذمیون کو رتبہ اور اعزاز کے لحاظ سے اسلامی گورنمنٹ اور اسلامی پبلک مین کیا درجہ
حاصل تھا، فاتح اور مفتوح کی تمیز ایک ایسا فطرتی اثر ہے، جو کسی طرح کسی کے مٹائے
نہین مٹ سکتا، پچھلی دنیا مین تو یہ امتیاز اس حد تک پہونچا تھا، کہ فاتح قومون نے
ہمیشہ مفتوحین کو جانورون سے کچھ ہی زیادہ سمجھا، ہندو آرین ہندوستان مین آئے تو یہان
کے اصلی باشندون کو اس طرح خاک مین ملا دیا، کہ اُن کو شودر کے لقب سے خود عار
نہین رہا، روم نے تمام مفتوحہ قومون کو گویا غلام بنا رکھا تھا، دنیا اسی حالت مین تھی
کہ اسلام کا قدم آیا، اُس کے گرد و پیش ہر طرف اسی قسم کی مثالین موجود تھین لیکن اس نے
کیا کیا؟ یہ کیا کہ دنیا کے اس رواج یافتہ قاعدے کو دفعۃً مٹا دیا، اور قول و فعل دونون سے
بتا دیا کہ حقوق عامہ مین جسقدر آدمی آسمان کے نیچے ہین، سب برابر ہین، اسلام ہی نے
یہ بات سکھلائی تھی کہ جب ایک یہودی نے حضرت علیؓ پر خود اُنکی خلافت کے زمانہ مین
ایک زرہ کا دعویٰ کیا، تو جناب ممدوح کو اسکی جوابدہی کیلئے عدالت مین حاضر ہونا پڑا
اور وہ بغیر کسی عذر کے معمولی فریق مقدمہ کی حیثیت سے عدالت مین حاضر ہوئے، یہ اسلام
ہی کی تعلیم تھی کہ جب ایک عیسائی نے ہشام بن عبد الملک پر جو بڑی عظمت اور
اقتدار کا خلیفہ گذرا ہے ایک جائداد کا دعویٰ کیا، اور حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے دربار
مین مقدمہ پیش ہوا تو حضرت عمرؓ نے ہشام کو عدالت مین طلب کیا، اور کہا کہ مدعی کے
برابر کھڑے ہو کر جواب دہی کرو، ہشام نے وکیل مقرر کرنا چاہا، حضرت عمرؓ نے کہا نہین
تم خود سامنے کھڑے ہو کر جواب دو، ہشام نے عیسائی کے ساتھ سخت کلامی شروع کی،

حضرت عمرؓ نے نہایت سختی سے ڈانٹا، اور کہا کہ دوبارہ یہ حرکت سرزد ہوئی تو بغیر سزا دیئے، نہ چھوڑون گا، چونکہ رودادسے عیسائی کا حق ثابت تھا، اسکو ڈگری دلائی اور حکم دیا کہ ہشام کی دستاویز جو اُس نے پیش کی تھی چاک کر دیجائے[1] تاریخ اسلام مین اس قسم کے اور بہت سے واقعات ہین لیکن ہم نے صرف اُن بزرگون کے نمونے پیش کئے ہین جو خود اسلام کے نمونے تھے،

اسلامی حکومتون مین مسلمان، اور ذمی عموماً برابری کی حیثیت سے رہتے تھے، سرکاری مناصب مین مجالس عامہ مین، عام معاشرت مین، فاتح مفتوح کی کچھ تمیز نہ تھی لیکن قبل اس کے کہ ہم اس دعویٰ کو تفصیلی طور سے ثابت کرین ہم کو اُن شبہات کا جواب دینا چاہئے جو اس موقع پر خواہ مخواہ پیدا ہونگے، عیسائی مصنفین نے ہمیشہ نہایت زور کے ساتھ اسلام پر یہ الزام لگایا ہی کہ اُس نے دوسری قومون کو نہایت ذلت کی نگاہ سے دیکھا اور ذلت کی محسوس علامتین قائم کین، اسلام نے یا اسلام کے جانشینون نے یہ قاعدے بنائے کہ ذمی ایک خاص قسم کا لباس اختیار کرین، جو اُن کی محکومی اور ذلت کی علامت ہو، گھوڑے پر نہ سوار ہون، راستے مین تادباً مسلمانون سے بچ کر نکلین، بڑے بڑے عہدے نہ پائین، اُن کے ساتھ مساویانہ برتاؤ نہ کیا جائے،

ہم بے شبہہ تسلیم کرتے ہین کہ فقہ کی پچھلی تصنیفات مین ذمیون کی نسبت یہ احکام موجود ہین، لیکن ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ یہ احکام خدا کے، رسول کے، صحابہ کے، ائمہ مجتہدین کے احکام نہین ہین، اسی کے ساتھ ہمارا یہ بھی دعویٰ ہی کہ یہ احکام کسی زمانے مین رواج

[1] عیون الحدائق صفحہ ۷۰،

نہین پائے، کسی کسی ظالم بادشاہ نے جوشِ تعصب مین اس قسم کی کارروائی کی تو وہ اسی عہد تک رہی، مورخین نے عام طور پر لکھا ہو کہ "سب سے پہلے جس نے ذمیون کا لباس بدلا وہ المتوکل باللہ عباسی تھا" اس سے یہ امر تو علانیہ ثابت ہے کہ متوکل باللہ سے پہلے یہ لباس نہ تھا، متوکل نے ذمیون پر اور بھی طرح طرح کی سختیان کین، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ وہی متوکل ہے، جس نے حضرت امام حسین علیہ السلام کے مزار مبارک کو کھدوا کر خاک کے برابر کر دیا، اور منادی کرا دی کہ کوئی شخص زیارت کو نہ آنے پائے، جس شخص نے خود جگر گوشۂ رسول ؐ کے ساتھ یہ برتاؤ کیا ہو، اُس کے کسی فعل پر کیا استدلال ہو سکتا ہے،

یہ سچ ہے کہ حضرت عمر فاروق ؓ نے بھی ذمیون کے لئے ایک خاص لباس کی تعیین کی تھی، لیکن یہ وہی لباس تھا جو مدت سے اونکا قومی لباس چلا آتا تھا، اور اس وجہ سے یہ خیال نہین ہو سکتا کہ اس سے تحقیر اور ذلت مقصود تھی، اس بحث کو ہم نے مختصراً سیرۃ النعمان مین لکھا ہے، اور انشاء اللہ الفاروق مین اس بحث کا قطعی فیصلہ کر دینگے، یہان صرف یہ دیکھنا ہے، کہ حضرت عمر ؓ کا یہ حکم آیا کوئی مذہبی اور انتظامی حیثیت رکھتا تھا یا صرف اُن کا مذاقِ طبیعت تھا جس کے معنی صرف یہ تھے، کہ تمام قومین اپنی قومی خصوصیتون پر قایم رہین،

اس امر کے فیصلہ کے لئے یہ دیکھنا چاہئے کہ لباس کے بارے مین حضرت عمر ؓ کے احکام کس حد تک عمل مین آسکے،

حضرت عمر ؓ نے جہان غیر قومون کو عرب کے لباس کے اختیار کرنے سے روکا تھا، اہلِ عرب کو بھی عجم کی وضع سے پرہیز کرنے کی تاکید کی تھی، چنانچہ عتبہ بن فرقد کو جو فرمان لکھا تھا اُسمین یہ الفاظ تھے، علیکم بلباس ابیکم اسمٰعیل وایاکم والتنعم وزی العجم و القوا الخفاف

وائتزروا والسو اودیل یعنی تکوا پنے باپ اسمٰعیل کا لباس پہننا چاہئے، خبر دار عیش طلبی اور اہل عجم کی وضع نہ اختیار کرنا، موزہ اور پاجامہ پہننا چھوڑ دو،

لیکن نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت عمرؓ بیت المقدس کے معاہدہ کے لئے شام تشریف لیگئے تو تمام افسران فوجی رومیون کے لباس مین تھے، اس پر ناراضی بھی ظاہر فرمائی، لیکن جب ان لوگون نے اس کا سبب بتایا تو چپ ہوگئے، اس سے بڑھکر یہ کہ جب مصر فتح ہوا تو اہل فوج کی خوراک ولباس کا انتظام اس طرح کیا گیا کہ عیسائی ہر سال غلہ اور کپڑون کی ایک تعداد مقررہ جزیہ کے ساتھ ادا کرتے رہین، ان کپڑون مین عمامہ اور جبہ کے ساتھ موزے اور پاجامے بھی شامل تھے، حالانکہ موزہ اور پاجامہ کے استعمال کو حضرت عمرؓ اپنے سابق فرمانون مین منع کر چکے تھے، حضرت عمرؓ کی ان دو مختلف کارروائیون کی تاویل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے، کہ اول اول انکی وہ رائے تھی لیکن جب انھون نے دیکھا کہ طبائع کے میلان عام کو وہ روک نہین سکتے، تو انھون نے اس خیال کو جانے دیا،

غیر قومون کو حضرت عمرؓ نے جو روک ٹوک کی تھی وہ بھی نہ چل سکی، عیسائیون اور یہودیون نے مسلمانون کی بہت سی خصوصیتین اختیار کرلین یہان تک کہ عمر بن عبد العزیز نے جو حضرت عمرؓ کے قدم بہ قدم چلنا چاہتے تھے اپنے ایک عامل کو لکھا کہ وقد ذکر لی ان کثیرا من قبلك من النصاری قد راجعوا لبس العمائم و ترکوا المناطق[۲] یعنی مجھکو معلوم ہوا ہے کہ اکثر عیسائی عمامہ باندھنے لگے ہین اور پیٹیان لگانی چھوڑ دی ہین "

ایک خاص قابل لحاظ یہ بات ہے کہ مسلمان جہان جہان گئے اور جہان جہان انکی حکومتین قایم ہوئین، انھون نے خود مفتوح قومون کا لباس اختیار کر لیا، اور یہ ظاہر

---

[۱] فتوح البلدان صفحہ ۲۱۵، [۲] کتاب الخراج صفحہ ۷۳،

ہے کہ اگر اُن کا لباس ذلت اور تحقیر کی علامت ہوتا تو مسلمان ذلت اور تحقیر کو کیون گوارا کرتے عباسیون کی سلطنت کا آغاز درحقیقت منصور کے عہد سے سمجھا جاتا ہی اُس نے دربار کے لئے جو ٹوپی اختیار کی وہ وہی مجوسیون کی ٹوپی تھی جو خاص اُنکی قومی علامت تھی، معتصم باللہ جس کے زمانے مین دولت عباسیہ پورے شباب پر پہونچ گئی تھی، اُس نے بالکل شاہان عجم کی وضع اختیار کر لی تھی، مورخ مسعودی نے لکھا ہی "وغلب علیہ التشبہ بملوک الاعاجم فی الآلۃ ولبس القلانس والشاشیات فلبسها الناس اقتداءً بفعلہ وسمیت المعتصمیات" یعنی وہ ٹوپی اوڑھنے پگڑی باندھنے اور ساز و سامان رکھنے مین رئیسان عجم کی تقلید کا بہت شایق تھا، چنانچہ اُسکو دیکھ کر سب نے یہ وضع اختیار کر لی اور اس وضع کا نام معتصمی پڑگیا،

سندھ وغیرہ مین جب عربون کی حکومت قایم ہوئی اور اُس کے مختلف حصون مین خاص عرب کی نسل کے سلاطین فرمان روا ہوئے، تو تمام مسلمانون نے ہندؤن کی وضع اختیار کر لی چنانچہ ابن حوقل بغدادی جس نے چوتھی صدی کے آغاز مین ان ممالک کا سفر کیا تھا، کھنبات کی نسبت اپنے جغرافیہ مین لکھتا ہے "وزی المسلمین والکفار بها واحد فی اللباس وارسال الشعر" یعنی یہان مسلمان اور کافرون کی ایک وضع ہے، دونون ایک سا لباس پہنتے ہین، اور بال بڑے بڑے رکھتے ہین"

وہی مورخ سندھ اور منصورہ کی نسبت لکھتا ہے "وزیهم زی اهل العراق الا ان زی ملوکهم یقارب زی ملوک الهند" یعنی یہان کے مسلمانون کا لباس عراق کا سا ہے لیکن یہان کے بادشاہون کی وضع ہندو راجاؤن کے قریب قریب ہے"

لہ مروج الذہب مسعودی ذکر خلافت قاہر باللہ،

مخالفون کی طرف سے بلکہ خود متعصب مسلمانون کی طرف سے بڑا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود یہ حکم دیا تھا کہ عیسائیون اور یہودیون کو سلام نہ کرو، چنانچہ عبداللہ بن عمرؓ نے ایک دفعہ نادانستگی سے ایک عیسائی کو سلام کیا تو پھر اُس سے جاکر کہہ آئے کہ تو میرا اسلام پھیر دے، یہ اور اس قسم کی روایتین بہت زیادہ شہرت پکڑ گئی ہین، اور ہمارا فرض ہے کہ ہم اس راز سے بالکل پردہ اٹھادین،

حقیقت یہ ہے کہ مدینہ منورہ اور اُس کے اطراف مین جو یہود رہتے تھے، اُن مین اس قدر تعصب تھا کہ بات بات مین اسکا اثر پایا جاتا تھا، وہ مسلمانون کو سلام کرتے تھے تو السلام علیکم کے بجائے السام علیکم کہتے تھے جس کے معنی یہ ہین کہ "تم کو موت آئے" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ جب یہود اس طرح سے سلام کرین تو تم صرف یہ کہدو کہ علیکم یعنی "تم پر" یہی روایت ہے جو مختلف پیرایون مین ادا کی گئی ہے،[1] اور جسکا حاصل صرف یہ ہے کہ جس طرح لوگ تم سے پیش آئین تم بھی اُن سے اسی طرح پیش آؤ، یہ شبہہ عبداللہ بن عمرؓ نے سلام کہکر واپس لیا تھا، لیکن اولاً تو اس بات کا کوئی ثبوت نہین کہ وہ عیسائی ذمی یعنی اسلام کی رعیت تھا، اور ہماری بحث یہان صرف ذمیون کے ساتھ مخصوص ہی، دوسرے اصلی بات یہ ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ کی یہ ذاتی رائے تھی، اور دوسرے صحابہ جو علم و فضل تحقیق و اجتہاد مین اُن سے بہت بڑھکر تھے، اُن کی رائے اس کے بالکل خلاف تھی، حضرت عبداللہ بن عباسؓ جنکو بحر العلم کا خطاب ملا تھا، وہ فرمایا کرتے تھے کہ کوئی شخص یہودی ہو یا عیسائی، یا آتش پرست، سبکے سلام کا جواب اسی طرح دینا چاہئے، جس طرح وہ تمکو سلام کرتا ہے، کیونکہ خدا نے خود فرمایا ہی کہ (فاحییتم بتحیۃ فحیوا باحسن

[1] ادب المفرد امام بخاری صفحہ ۱۵۹،

منها اور ردوها، یعنی جب تم کو کوئی شخص سلام کرے تو تم اُس سے زیادہ عمدہ طور پر
اُس کا جواب دو یا عمدہ طور سے نہیں تو برابر طور سے سہی، عبداللہ بن عباسؓ کا یہ قول
امام بخاری نے ادب المفرد مین نقل کیا ہی، ابو موسیٰ اشعریؓ جو بڑے رتبہ کے صحابی تھے
اُنھون نے ایک عیسائی راہب کو خط لکھا تو سرنامہ پر سلام لکھا، اس پر ایک شخص نے
اعتراض کیا اُنھون نے جواب دیا کہ اُس نے مجھکو خط مین سلام لکھا تھا تو مین نے بھی لکھا
امام بخاری نے ادب المفرد مین عبداللہ بن عباسؓ کا قول نقل کرکے لو قال لی فرعون بارک
اللہ فیک قلت وفیک یعنی اگر فرعون بھی مجھکو یہ الفاظ کہے کہ خدا تجھکو برکت دے تو مین
اُس کے جواب مین کہونگا کہ خدا تجھکو برکت دے"

حاصل یہ کہ اسلام کا یہ اصول تھا اور اسی پر ہمیشہ عمل درآمد رہا، کہ جو قوم جس طرح
اسلام کے ساتھ پیش آتی تھی، اسلام بھی اُس کے ساتھ اُسی طرح پیش آتا تھا جو عیسائی
یا یہودی وغیرہ دوستانہ اور مہذبانہ برتاؤ کرتے تھے، اُنکے ساتھ اُسی طریقے سے برتاؤ
کیا جاتا تھا، البتہ اسلام مین عیسائیون کی طرح یہ فیاضی نہین ہے کہ کوئی شخص کسی
کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو وہ دوسرا گال پھیر دے کہ لو یہ بھی حاضر ہے،

ذمیون کو معاشرت کے تمام امور مین جو مساویانہ درجہ حاصل تھا، اُس کا ثبوت
اس سے بڑھکر کیا ہوگا کہ اسلامی تذکرون مین جہان کسی صاحب علم عیسائی یا یہودی
کا ذکر آتا ہی تو اُس کا نام اُسی معززانہ اور مدح آمیز طریقہ سے لیا جاتا ہی جس طرح ایک مسلمان
اہل کمال کا لیا جاسکتا تھا، یہان تک کہ اگر مذہب کی تصریح نہو تو کسی طرح امتیاز نہین
ہوسکتا کہ یہ کسی مسلمان کا تذکرہ ہے، یا کسی غیر مذہب کے آدمی کا، بختیشوع جبرئیل
سلمویہ، حنین بن اسحاق، یوحنا بن ماسویہ، ابو اسحاق صابی کا تذکرہ اسلامی

تاریخون مین جس عظمت سے کیا گیا ہی، اُن کتابون کے پڑھنے سے اُس کا اندازہ ہوسکتا ہی
مین اس موقع پر نمونے کے لئے صرف ابن التلمیذ کی نسبت جو بغداد کا ایک معزز عیسائی
تھا مورخانِ اسلام کے چند فقرے نقل کرتا ہون، عماد کاتب جو سلطان صلاح الدین
کا میر منشی تھا، اس کو سلطان الحکما کے لقب سے مخاطب کرکے یہ الفاظ لکھے ہین، وہو ایتہا
وہو شیخ بہی المنظر حسن الرداء لطیف الروح بعید الھمۃ عالی الھمۃ مصیب الفکر
حاسن مر الرای دکنت اتعجب فی امرہ کیف حرم الاسلام مع کمال فہمہ وعترانہ
علمہ،،

کیا کوئی قوم کسی دوسری قوم کا ذکر اس سے زیادہ مدح اور تعریف کے ساتھ کرسکتی
ہے، آج کل کے مقدس علمار کے آگے اگر دنیاوی حیثیت مین بھی کسی انگریز کا ذکر مدح کیساتھ
کیاجائے تو وہ اُسکو اسلامی شان کے خلاف سمجھین گے، مگر اسکی صرف یہ وجہ ہی کہ انکو
تاریخ پر نظر نہین اور اُنکو معلوم نہین کہ وہ جن بزرگون کے نام لیوا ہین، اُن کا طریق عمل
کیا تھا،

خلفاے عباسیہ کے دربار مین غیر مذہب والون کو جو اعزاز اور رتبہ حاصل تھا اس سے
کون انکار کرسکتا ہے، عباسیون کے دربار کا یہ خاص آئین تھا کہ کسی شخص کا نام دربار
مین لقب یا کنیت کے ساتھ نہین لیا جاتا تھا، اس قاعدے سے کوئی ایسا ہی بڑی عزت
اور مرتبے کا آدمی مستثنیٰ ہوسکتا تھا، یہان تک کہ اکثر بڑے بڑے علمار کو یہ عزت نصیب نہین
ہوتی تھی، باوجود اس کے مامون الرشید، جبریل بن بختیشوع کا نام دربار مین کنیت کیساتھ
لیتا تھا، ہارون الرشید نے عام حکم دیدیا تھا کہ جس شخص کو مجھ سے کچھ کہنا ہو یا کوئی عرض
پیش کرنی ہو تو جبریل بن بختیشوع کے ذریعے سے کرے، چنانچہ بڑے بڑے افسران فوجی

ہارون رشید سے جو کچھ عرض معروض کرتے تھے جبریل کے ذریعہ سے کرتے تھے متوکل باللہ نے باوجود اس کے کہ ذمیون کی نسبت سخت احکام جاری کئے تھے، تاہم اُس کے دربار مین ذمی اہل کمال کو یہ عزت حاصل تھی کہ بختیشوع دربار مین خود متوکل کا سا لباس پہنکر آتا تھا، اور اکثر صحبتون مین متوکل کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھتا تھا، یہان تک کہ ایک دفعہ بختیشوع متوکل کی خدمت مین حاضر ہوا تو اتفاق سے وہ اس وقت دیوان خاص کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا تھا بختیشوع بھی وہین چوکھٹ پر اُس کے برابر بیٹھ گیا، سلمویہ بن بنان کو جو عیسائی مذہب رکھتا تھا معتصم باللہ کے دربار مین یہ عزت حاصل تھی کہ معتصم کے جس قدر فرمان صادر ہوتے تھے سلمویہ کے دستخط سے ہوتے تھے، علامہ ابن ابی اصیبعہ نے طبقات الاطبا مین سلمویہ کی نسبت معتصم کا یہ فقرہ نقل کیا ہے، اکبر عندی من قاضی القضاۃ یعنی سلمویہ میرے نزدیک قاضی القضاۃ سے بڑھکر ہے، سلمویہ جب بیمار ہوا تو معتصم خود عیادت کو گیا اور افسوس کے ساتھ رویا، سلمویہ نے جب وفات کی تو اس رنج مین تمام دن کھانا نہین کھایا، اور حکم دیا کہ اس کا جنازہ ایوان شاہی مین لا کر رکھا جائے، اور عیسائی مذہب کے موافق شمع اور بخور جلا کر اسکے جنازے کی نماز پڑھی جائے،

خلیفہ المعتضد باللہ کے دربار مین جہان تمام وزرا امرا دست بستہ کھڑے رہتے تھے، صرف وزیر اعظم اور ثابت بن قرۃ کو بیٹھنے کی اجازت تھی، حالانکہ ثابت بن قرۃ مذہبًا صابی تھا اور ذمی تھا، ایک دن معتضد ثابت بن قرۃ کے ہاتھ مین ہاتھ دیے کر ٹہل رہا تھا دفعۃً معتضد نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا، ثابت خوف سے کانپ اٹھا، معتضد نے کہا ڈرو نہین، میرا ہاتھ تمھارے ہاتھ کے اوپر تھا، لیکن چونکہ تم علم و فضل مین مجھسے بڑھکر ہو اس لئے تمھارا ہاتھ اوپر ہونا چاہیے"

سلطان صلاح الدین فاتحِ بیت المقدس، نہایت پابندِ شریعت اور متقی و پرہیزگار تھا، اُس کے دربار مین کثرت سے عیسائی تھے، اور وہ اُنکی نہایت عزت و توقیر کرتا تھا، انھین مین سے ابن المطران ایک عیسائی تھا، صلاح الدین کی عادت تھی کہ وہ لڑائی کے معرکون مین ایک سرخ خیمہ نصب کراتا تھا، اور جب لڑائی سے فارغ ہو کر بیٹھتا تھا تو اُسی خیمے مین بیٹھتا تھا، چونکہ یہ امتیاز کی علامت تھی اس لئے حکم تھا کہ اور کوئی شخص اس رنگ کا خیمہ نہ رکھے، ابن المطران چونکہ شان و شوکت اور تمام باتون مین خود سلطان صلاح الدین کی ہمسری کرنا چاہتا تھا، اس نے اپنا خیمہ بھی سرخ رنگ کا تیار کرایا، اور اسی مین بیٹھا کرتا تھا، صلاح الدین نے دیکھا تو کہا کہ مجھ کو اس سے کوئی اعزاز مقصود نہین تھا صرف ضرورت کی وجہ سے ایسا کیا گیا تاکہ لوگ میرے خیمہ کو بآسانی پہچان لین، یہ کہکر اس کا خیمہ اکھڑوا دیا، ابن المطران اس پر سخت برہم ہوا اور دو دن تک دربار مین نہ آیا، آخر صلاح الدین نے بڑی استمالت سے اُس کو راضی کیا، اس قسم کی سیکڑون مثالین ہین، کوئی کہان تک گنوائے،

یورپ والو! اگر اسلامی حکومتون مین ذمیون کی اسی طرح ذلت اور تحقیر کی جاتی تھی، تو کاش تم اپنی مفتوحہ قومون کے ساتھ اسی ذلت اور تحقیر کا برتاؤ کرتے،

اعزاز اور توقیر کی نسبت شاید کہا جائے کہ یہ پالیٹکس کی بنا پر تھا، اس لئے ہم یہ دکھانا چاہتے ہین کہ اسلام اور جانشینانِ اسلام ذمیون کی نسبت دلی ہمدردی، اور غمخواری کے کیا خیالات رکھتے تھے، ذمیون کی نسبت اگرچہ ہر قسم کے معاملات حضرت عمرؓ کے عہد مین منضبط ہوئے، اور زمانۂ مابعد مین بلحاظ اغلب انھین کا طرزِ عمل، سچے مسلمانون

کا طرز عمل رہا لیکن ابتدا خود جناب رسول اللہ کے زبانِ مبارک مین ہو چکی تھی، اور اس وجہ سے ہم کو اس باب مین خود شریعت کا طرز عمل معلوم ہو سکتا ہے، قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج مین یہ حدیث روایت کی ہو، کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبد اللہ بن ارقم کو جزیہ کے وصول کرنے پر مقرر کیا تو اُنکو بلا کر فرمایا، الا من ظلم معاھدا او کلفہ فوق طاقتہ او انتقصہ او اخذ منہ شیئا بغیر طیب نفسہ فانا حجیجہ یوم القیامۃ[1]، یعنی جان لو کہ جو شخص کسی معاہد (یعنی ذمی) پر ظلم کریگا، یا اُس سے اُسکی طاقت سے زیادہ کام لے گا یا اُس کو ذلیل کریگا یا اُس سے کوئی چیز اُسکی مرضی کے بغیر لے گا تو مین قیامت کے دن اُس کا دشمن ہونگا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی اس ہدایت کا یہ اثر تھا کہ صحابہ جہان کہین ذمیون پر کسی قسم کی سختی ہوتی دیکھتے تھے، فوراً مواخذہ کرتے تھے، سعید بن زید نے ایک دفعہ دیکھا کہ ذمیون کو مال گذاری وصول کرنے کے لئے دھوپ مین کھڑا کیا گیا ہے، اُسی وقت وہان کے حاکم سے جا کر کہا کہ مین نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جو شخص لوگون کو عذاب دیتا ہے، خدا اُسکو عذاب دیگا، ہشام بن حکیم کو بھی اسی قسم کا واقعہ پیش آیا، اور انھون نے اسی وقت حاکمِ وقت یعنی عیاض بن غنم کے پاس جا کر ملامت کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہی قول سند مین پیش کیا،

ایک دفعہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے شخص کو ایک دروازے پر بھیک مانگتے دیکھا، اس سے پوچھا کہ تیرا کیا مذہب ہے، اُس نے کہا یہودی، فرمایا بھیک کیون مانگتا ہے، بولا کہ تنگی اور مفلسی کی وجہ سے اور جزیہ کے ادا کرنے کے لئے حضرت عمرؓ اسکو اپنے ساتھ اپنے

[1] کتاب مذکور صفحہ ۷۱، ۲ صفحہ ۷۱،

مکان پر بلوالیا اور کچھ نقد اپنے پاس سے دیکر بیت المال کے افسر کے پاس کہلا بھیجا انظروا هذا وضرباءه والله ما انصفناه ان اکلنا شبیبته ثم نخذله عند الهرم انما الصدقات للفقراء والمساکین والفقراء هم المسلمون وهذا من المساکین من اهل الکتاب[1]

یعنی اس بوڑھے اور اس کے ساتھیوں پر خیال کرو، خدا کی قسم یہ انصاف کی بات نہین کہ اس کی جوانی کی کمائی ہم نے کھائی، اور اب یہ بوڑھا ہوگیا ہے، تو اسکو ہم نکال دین، صدقے کی نسبت جو خدا نے کہا ہے کہ فقیرون اور مسکینون کو دینا چاہئے تو فقیرون سے مسلمان اور مسکینون سے اہل کتاب مراد ہین،

حضرت عمرؓ کی اس ہمدردی اور رحم کا جو انکو ذمیون کے ساتھ تھا اس سے بڑھکر کیا ثبوت ہوگا، کہ باوجود اس کے کہ وہ ایک ذمی کے ہاتھ سے مارے گئے تھے، تاہم ذمیون کا اُن کو یہ خیال تھا کہ وفات کے وقت مین نہایت ضروری وصیتین جو کین اُن مین ایک یہ تھی کہ ذمیون کے ساتھ جو اقرار ہین وہ پورے کئے جائین، ان کی طاقت سے زیادہ کام ان سے نہ لیا جائے، اور ان کے دشمنون کے مقابلے مین ان کی طرف سے لڑائی کیجائے،

عراق مین حضرت عمرؓ نے جو خراج مقرر کیا تھا، اگرچہ نہایت خفیف تھا، تاہم ان کو ہمیشہ خیال رہا کہ تشخیص مالگذاری مین ذمیون پر سختی تو نہین کی گئی، چنانچہ جن لوگون نے زمین کی پیمایش کرکے جمع تشخیص کی تھی، اُن کو اکثر بلاکر اُس کی نسبت پوچھا کرتے تھے، خراج جب آتا تھا تو دس شخص بصرے سے اور دس کوفے سے طلب کئے جاتے تھے، حضرت عمرؓ ان کے اظہار لیتے تھے، اور جب وہ چار دفعہ شرعی قسم

[1] حضرت عمرؓ کے اس قول کو امام بخاری نے اپنی کتاب مین نقل کیا ہے،

کہا کرتے تھے کہ مالگزاری کے وصول کرنے میں ذمیوں پر سختی نہیں کی گئی ہی تب انکو تسلی ہوئی تھی، مسلمانوں کو ذمیوں کے ساتھ جو ہمدردی تھی، اس کے لئے اس قسم کی سیکڑوں جزوی مثالیں ملتی ہیں، لیکن ان سب کا استقصا نہیں کیا جا سکتا، اس لئے ہم ایک ایسے واقعہ پر اکتفا کرتے ہیں جس سے جماعت اسلامی کی عام رائے کا اندازہ ہو سکتا ہے،

جزیرۂ سائپرس جب سنہ ۲۸ھ میں فتح ہوا تو شرط یہ ٹھہری کہ وہاں کے لوگ مسلمانوں اور رومیوں کے باہمی معرکوں میں کسی کا ساتھ نہ دیں گے، لیکن سنہ ۳۳ھ میں انھوں نے مسلمانوں کے برخلاف رومیوں کو مدد دی، امیر معاویہؓ نے ان پر چڑھائی کی، اور شہر کو فتح کر کے پہلی شرط پر پھر صلح کر لی، لیکن وہ اپنی شرارت سے پھر باز نہ آئے، اس پر ولید بن یزید نے ایک گروہ کو جلاوطنی کی سزا دی، اگرچہ وہ اس سزا کے فی الحقیقت مستحق تھے لیکن انکی سازش کا ثبوت قطعی نہ تھا، تمام مسلمان اور علما اور فقہا ولید کی اس حرکت پر سخت برہم ہوئے، کہ ذمیوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا جائز نہیں، چنانچہ ولید کے بعد جب اس کا بیٹا تخت خلافت پر بیٹھا تو اس نے ان سب کو واپس بلا لیا اور تمام مسلمانوں نے ولید کی اس کارروائی کی تحسین کی، دولت عباسیہ کے زمانے میں وہاں کی رعایا نے پھر بغاوت کا ارادہ کیا، اس وقت عبد الملک بن صالح گورنر تھا، اور بڑے بڑے نامور ائمہ اور فقہا مثلاً لیث بن سعد، امام مالک، سفیان بن عیینہ، موسیٰ بن اعین، اسمٰعیل بن عیاش، یحییٰ بن حمزہ، ابو اسحٰق فزاری، مخلد بن حسین وغیرہ موجود تھے عبد الملک نے ان سب کے پاس استفتا بھیجا اور پوچھا کہ قاعدۂ شریعت کی رو سے انسے کیا سلوک کرنا چاہیے، علامہ بلاذری نے فتوح البلدان میں ان ائمہ کے فتوے

الگ الگ اُن کے الفاظ مین نقل کئے ہین، اکثرون نے تو یہی رائے دی کہ ان سے درگذر کرنا چاہئے، کیونکہ فقط ارادۂ بغاوت سے وہ ذمیت کے حقوق سے محروم نہین ہوگئے، لیکن جن بعض بزرگون نے سختی کی اُنھون نے بھی صرف یہ اجازت دی کہ اُن کو سال بھر کی مہلت دیجائے، اگر اس مدت مین وہ پورے مطیع ہوجائین تو بہتر ورنہ ان کو کہدیا جائے کہ رومیون کے ملک مین چلے جائین، یحیٰی بن حمزہ اور ابواسحاق فزاری و مخلد بن حسین نے یہ فتویٰ دیا کہ ان لوگون کے پاس جس قدر مال واسباب اور زمین وغیرہ ہے ایک ایک چیز کی دوگنی قیمت بیت المال سے اداکیجائے اوران کو کہدیا جائے کہ وہ اور کہین جاکر آباد ہوجائین، اسمٰعیل بن عیاش نے لکھا کہ "وہ بیچارے رومیون کے مظلوم ہین، اس لئے ہم کو ان کی مدد کرنی چاہئے" ان بزرگون کے فتوون اور رایون سے بہ آسانی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ ذمیون کے ساتھ اسلام کا کیا برتاؤ تھا،

سب سے اخیر بحث ملکی حقوق کی ہے، یعنی یہ کہ ذمیون کو انتظام سلطنت مین کہان تک دخل تھا، لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ شروع سے اس بحث مین ہمارے مخاطب عیسائی ہین جنکا یہ دعویٰ ہے کہ اسلام غیر مذہب والون کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کا حکم دیتا ہے، اس لئے ہم ملکی حقوق کی بحث مین یورپ کے نظام سلطنت سے موازنہ کرین گے، کیونکہ عیسائیون کے نزدیک عدل وانصاف تہذیب وشائستگی کا معیار یورپ اور یورپ کا اصول حکومت ہے،

سب سے مقدم امر یہ ہے کہ ملکی حقوق کی نسبت یورپ کی مہذب سے مہذب حکومتون نے فاتح ومفتوح مین جو حد فاصل قائم کی ہے، وہ اسلامی حکومتون نے کبھی نہین کی اسلام نے یا اسلامی حکومتون نے کبھی یہ قاعدہ نہین بنایا، کہ جو شخص ولایت زادہ ہو اسکو

فلان قسم کے حقوق نہین مل سکتے، یا فلان فلان عہدے فاتح قوم کے افراد کے ساتھ مخصوص ہین،

اسلام کے آغاز مین ملکی اور فوجی عہدے مختلف نہ تھے، جو شخص صوبہ کا گورنر ہوتا تھا، وہی سپہ سالار بھی ہوتا تھا، یہان تک کہ جو لوگ منصب قضا پر مامور ہوتے تھے، وہی ضرورت کے وقت فوج کے جنرل مقرر ہو کر بھیج دیئے جاتے تھے، تہذیب اور شایستگی کے تاریخ دان اس بات کو بخوبی جانتے ہین کہ سلطنت جب اول اول قایم ہوتی ہو تو اسکے مختلف صیغے مدت تک باہم مختلط رہتے ہین، جس قدر تمدن زیادہ ترقی کرتا جاتا ہو اسی قدر تقسیم عمل کا اصول زیادہ عمل مین آتا جاتا ہو، اور ہر ہر صیغہ جدا جدا صورت پکڑتا جاتا ہو، اسی کلیہ کے موافق اسلام کے ابتدائی زمانے مین بھی اس قسم کا اختلاط والتباس رہا، اور اس کا یہ لازمی نتیجہ تھا کہ مفتوح قومین ملکی انتظامات مین کم شامل ہوسکین، کیونکہ اسوقت تک جس قدر ملکی عہدے تھے اُن مین فوجی مہمات بھی شامل تھین، اور اس وجہ سے غیر قومین خود اُن پر خطر خدمات کو گوارا نہین کرتی تھین،

اس موقع پر یہ امر قابلِ استفسار ہے، کہ اگر غیر قومون نے خود فوجی خدمتون کو قبول کرنا چاہا تو اسلام نے ان کی خواہش کا کہان تک لحاظ رکھا، اور جواب یہ ہے کہ اسلام نے بےتکلف انکی درخواست منظور کی، حضرت عمرؓ کے وقت مین جا بجا یہ موقعے پیش آئے کہ عیسائیون اور آتش پرستون نے باوجود اپنے مذہب پر قایم رہنے کے فوجی خدمتون مین شامل ہونے کی درخواست کی، اور حضرت عمرؓ نے نہایت خوشی سے ان کی درخواست کو منظور کر کے انکو وہ تمام حقوق دیدیئے جو مسلمانون کو حاصل تھے، لیکن ناظرین کو یہ توقع نہین رکھنی چاہیئے کہ ہم اس موقع پر اُن واقعات کی تفصیل بھی بیان کرینگے، ورنہ الفاروق کیلئے کیا رہجائیگا،

بہرحال اسلام کے ابتدائی زمانے مین وہ خدمتین اور عہدے جنہین فوجی حیثیت بھی شامل تھی ذمیون کو کم ملے لیکن جس صیغے مین اس حیثیت کا لگاؤ نہ تھا وہ ذمیون کے لئے کھلا رہا بلکہ حق یہ ہے کہ خاص انھین کے قبضۂ اختیار مین رہا، خراج اور مال گذاری کے محکمون اور دفتر عموماً عیسائی اور آتش پرست قابض تھے، یہان تک کہ اس دفتر کی زبان بھی لاطینی اور فارسی و قبطی رہی، شام مین ۸۱ھ تک دفتر خراج لاطینی زبان مین تھا اور اس وقت اثنناس نام ایک عیسائی اس محکمہ کا افسر تھا، عراق کا دفتر حجاج بن یوسف کے زمانے مین، فارسی سے عربی زبان مین منتقل ہوا، وہ بھی اسوجہ سے کہ دفتر خراج کے میر منشی نے جو آتش پرست تھا اور جسکا نام فرخ زاد تھا مغرورانہ یہ دعویٰ کیا تھا کہ عربی زبان اس قابل نہین کہ حساب کے تمام جزئیات کو ادا کر سکے،

رفتہ رفتہ جب مسلمانون نے زیادہ ترقی کی اور ملکی اور فوجی صیغے مین فی الجملہ امتیاز ہوا تو ذمیون کو ملکی صیغے مین بار ہونے لگا، سب سے پہلے اس کی ابتدا امیر معاویہؓ کے عہد مین ہوئی یعنی ابن آثال ایک عیسائی حمص کا فنانشل کمشنر اور وہان کا حاکم مقرر ہوا[1] رفتہ رفتہ کوئی بڑے سے بڑا منصب اور عہدہ ایسا نہین رہا جو غیر مذہب والون کے دسترس سے باہر رہا ہو، مذہبی صیغہ کو چھوڑ کر دربار مین سب سے بڑے عہدے دو تھے، وزارت اور کتابت کتابت آج کل کی اصطلاح مین چیف سکریٹری کے عہدے کے برابر تھی یعنی ہر قسم کے فرامین سلطنت، اور سلطنت غیر سے مراسلت کا کام اسی سے متعلق ہوتا تھا، اور اسی وجہ سے وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، چنانچہ ابن خلدون نے مقدمہ تاریخ مین جہان اس عہدے کا ذکر کیا لکھا ہو کہ ان صاحب ھذہ الخطۃ

---

[1] تاریخ یعقوبی ذکر حکومت معاویہؓ

لابد ان یتخیر من اسمع طبقات الناس،

غرض یہ دونون منصب جو اعلیٰ ترین مناصب تھے ذمیون کو عطا کئے گئے، عبد الملک بن مروان جو سلطنت بنو اُمیہ کا دوسرا تاجدار تھا، اس کا کاتب ابن سرجون ایک عیسائی تھا دولت عباسیہ کے عہد مین ابو اسحاق صابی جو اس منصب پر ممتاز تھا بڑے رتبے کا شخص گذرا ہے اور ابن خلکان وغیرہ نے اس کے فضل و کمال کی بڑی تعریف کی ہے سلطنت دیلم کا سرتاج عضد الدولہ جو شہنشاہ کے لقب سے پکارا جاتا تھا اس کا وزیر اعظم ایک عیسائی تھا جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام خلفا و سلاطین دنیاوی جاہ و جلال کے ساتھ مذہبی شان بھی رکھتے تھے، یورپ کو اس قسم کی بے تعصبی اور فیاضی تک پہونچنے کے لئے ابھی کئی سو برس درکار ہین،

ایک امر البتہ قابل لحاظ ہی کہ اسلامی حکومتون مین سول اور ملٹیری ڈپارٹمنٹ کسی زمانے مین صاف صاف الگ نہین ہوئے، اس واسطے جس حد تک ملکی صیغہ مین فوجی حیثیت کا لگاؤ رہتا تھا، ذمی اُس سے کم متمتع ہو سکتے تھے لیکن اس کے سوا اور ہر قسم کے مناصب اور عہدے تمام ذمیون کے لئے کھلے تھے، اور ہر زمانے مین سیکڑون اور ہزارون عیسائی یہودی ہندو، آتش پرست، سرکاری خدمتون پر مامور رہے، ہندوستان مین ایک خاص تغیر ہوا یعنی یہ کہ ہندؤون نے کثرت سے فوجی خدمتین قبول کین، اور فوج مین بہت بڑا حصہ انکا تھا، اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہندؤن نے ہر قسم کے بڑے بڑے ملکی عہدے حاصل کئے، ناواقف ہندو خیال کرتے ہین کہ یہ فیاضی صرف اکبر کے ساتھ مخصوص تھی اور یہ اسکی مادری حیثیت کا اثر تھا، لیکن یہ انکی تاریخی جہالت کا نتیجہ ہے، جہانگیر، شاہجہان، یہان تک کہ عالمگیر جس کو نہایت متعصب خیال کیا جاتا ہے، سب نے ہندوؤن

کو بڑے بڑے عہدے دیئے، شاہجہان کے دربار مین سب سے بڑا منصب نہ ہزاری تھا یعنی وہ ارکان سلطنت جنکو نو ہزار سوارون کے رکھنے کی اجازت تھی، اس سے اتر کر ہفت ہزاری اور اس عہدے پر مہابتخان خانخانان ممتاز تھا، اس کے نیچے پنجہزاری و چارہزاری وغیرہ تھے، چنانچہ اس درجہ کے مناصب پر مسلمانون اور ہندوؤن کی تعداد قریب برابر تھی، ہم نہایت اختصار کے ساتھ یہان اس قسم کے ہندو عہدہ دارون کی فہرست لکھتے ہین جس کو ہم نے شاہجہان کی سرکاری تاریخ شاہجہان نامہ سے انتخاب کیا ہے؛

رانا جگت سنگھ	پنجہزاری	راجہ بیٹھل داس	چارہزاری
گج سنگھ	"	بھارت بندیلہ	"
جے سنگھ	"	راؤ سور	"
راؤ رتن ہاڑ	"	جگدیو رائے	"
جھجار سنگھ	"	ہیمر رائے	"
مالوجی دکنی	"		
اوداجی رام	"		
بہادرجی	"		

ان کے علاوہ گیارہ ہندو افسر دوہزاری، بارہ ڈیڑھ ہزاری، سولہ ایکہزاری، آٹھ نہ صدی، گیارہ ہشت صدی، آٹھ ہفت صدی تھے، اور ان سے نیچے کے عہدہ دار تو بیشمار تھے،

ان تمام واقعات کے ثابت ہونیکے بعد دنیا خود اس کا فیصلہ کر سکتی ہے کہ اسلام اور مسلمانون نے غیر قومون کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا؟

الجزیہ

غیر مذہب والون نے ہمیشہ اس لفظ کو نہایت ناگواری سے سنا ہے، اُن کا خیال
ہے کہ اسلام اس لفظ کا موجد ہے، اسلام ہی نے یہ اصول پیدا کیا جس سے اُس کا مقصد
مسلمانون اور غیر مذہب والون مین نہایت متعصبانہ اور نامناسب تفرقہ قایم کرنا تھا، اُن کا
خیال ہے کہ جزیہ ایک ایسا جبر تھا جس سے بچنے کے لیے اسلام کا قبول کر لینا بھی گوارا
کیا جاتا تھا، اور اس وجہ سے وہ جبراً مسلمان کرنے کا ایک قوی ذریعہ تھا، لیکن یہ تمام
غلط خیالات انھین غلط فہمیون سے پیدا ہوئے ہین، جو غیر قومون کو اسلام کی نسبت
ہین، ہم اس موقع پر تین حیثیتون سے جزیہ پر بحث کرنی چاہتے ہین، جزیہ اصل مین کس
زبان کا لفظ ہے اور کن معنون مین مستعمل ہوتا ہے، ایران اور عرب مین جزیہ کی بنیاد کب
سے قایم ہوئی، اسلام نے اسکو کس مقصد سے اختیار کیا،

پہلی بحث

جزیہ گو اب مصطلح معنی مین خاص ہو گیا ہو، لیکن لغت کی رو سے وہ خراج اور جزیہ
کے لیے یکسان موضوع ہے، قاموس مین ہے، الجزیۃ خراج الارض وما یوخذ
من الذمی، جوہری وصاحب قاموس نے اس لفظ کے اصل و اشتقاق سے کچھ بحث نہین
کی، صاحب کشاف نے اسکو جزی سے مشتق خیال کیا ہے، اصل یہ ہے کہ غیر زبانون کے

جو الفاظ عربی میں مستعمل ہو گئے ہیں، ان کی نسبت ہمارے مصنفین اکثر غلطی کرتے ہیں، تعجب یہ ہے کہ خاص اس قسم کے الفاظ نہایت استیعاب سے جمع کئے گئے ہیں، اور یہ فن لغت کی ایک شاخ بن گئی ہے، تاہم جو کتابیں اس موضوع پر لکھی گئی ہیں، مثلاً شفاء العلیل وغیرہ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے مصنفین غیر زبانوں سے ماہر نہ تھے تخنیق اور صوفی صاف یونانی الفاظ ہیں جنکی اصل تکانک اور سوفت ہے، لیکن ہمارے علمائے لغت تخنیق کی اصل "من چہ نیک" بتاتے ہیں، اور صوفی کو صوف سے ماخوذ سمجھتے ہیں، جو ایک قسم کا کپڑا ہوتا ہے، اس قسم کے اور سیکڑوں الفاظ ہیں،

غیر زبانوں کے الفاظ اور مصطلحات کے متعلق نہایت صحیح اور مستند کتاب جو عربی زبان میں لکھی گئی وہ **مفاتیح العلوم** ہے، یہ کتاب صاحب کشف الظنون کا ماخذ ہے، اور علامہ مقریزی نے اس کی نسبت لکھا ہے کہ، کتاب جلیل القدر[1] اس میں جزیہ کی نسبت لکھا ہے، الجزیۃ اعنی رؤس اهل الذمۃ جمع جزیۃ وهو معرب گزیت وهو الخراج بالفارسیۃ

یعنی ذمیوں سے جو جزیہ لیا جاتا ہے، یہ معرب لفظ ہے، جسکی اصل گزیت ہے اور اس کے معنی فارسی میں خراج کے ہیں،

فارسی لغت نویسوں نے گزیت کی لغت میں تصریح کی ہے، کہ جزیہ اسی کا معرب ہے برہان قاطع میں ہے گزیت بفتح اول وکسر ثانی زرے باشد کہ حکام ہر سالہ از رعایا گیرند وآنرا اخراج ہم گویند وزرے را نیز گویند کہ از کفار ذمی ستانند، نظامی گوید،

گہش خاقان خراج چین فرستد — گہش قیصر گزیت دین فرستد

وآنچہ شہرت دارد بہ کسر اول وفتح ثالث است ومعرب آن جزیہ باشد، فرہنگ جہانگیری

---

[1] دیکھو کتاب مذکور مطبوعہ یورپ صفحہ ۵۹،

کے مصنف نے دوسرے معنی کے سند مین حکیم سوزنی کا یہ شعر سنداً نقل کیا ہو؛

کتاب خویش بخواہم در دعمل بکنم　　　　که تا گزیت بساند تا نخوراہل کتاب

اور یہ بھی لکھا ہو کہ جزیہ اس کا معرب ہے،

ہم کو اسمین ذرا بھی شبہہ نہین کہ جزیہ اصل مین فارسی کا لفظ ہے، تصریحات لغت کے علاوہ تاریخی قرینہ نہایت قوی موجود ہے، یہ مسلم ہے کہ اسلام سے پہلے عرب مین جزیہ کا لفظ مستعمل ہوچکا تھا، یہ بھی مسلم کہ فارسی مین گزیت کا لفظ اس معنی مین قدیم سے شایع ہے، تاریخی شہادتون سے جیساکہ ہم آیندہ بیان کرین گے، ثابت ہے کہ نوشیروان نے جزیہ کے قواعد مقرر کئے تھے، اور اس زمانہ مین نوشیروان کے عمال یمن اور مضافات یمن پر مقصوب تھے، اس طرح گزیت کا لفظ قانونی طور پر عرب مین پھیلا اور معرب ہو کر جزیہ ہو گیا، یہ عام قاعدہ ہے کہ محکوم ملک مین جب فرمان روا زبان کے الفاظ دخل پانے لگتے ہین، تو سب سے پہلے وہ الفاظ آتے ہین جو سلطنت کے قانونی الفاظ ہوتے ہین، زبان عرب مین جس قدر فارسی الفاظ معرب ہو کر شایع ہو گئے ہین کسی اور زبان کے نہین ہوئے، اُس پر طرہ یہ کہ جزیہ کا لفظ معرب ہونے کے لئے گویا پہلے ہی آمادہ تھا، صرف ایک حرف کی تبدیل اور دو ایک تغیر سے وہ عربی قالب مین پورا اتر گیا،

دوسری بحث

جہان تک ہم کو معلوم ہے ایران و عرب مین خراج و جزیہ کے وہ قواعد جو بادنی تغیر اسلام مین رائج ہین، نوشیروان کے عہد مین مرتب ہوئے، امام ابو جعفر طبری جو بہت بڑے محدث اور مورخ تھے، نوشیروان کے انتظامات ملکی کے بیان مین لکھتے ہین

والزم الناس الجزیۃ ماخلا اھل البیوتات والعظماء والمقاتلۃ والھرابذۃ والکتاب ومن کان فی خدمۃ الملک وصیرو ھا علی طبقات، اثنی عشر درھما وثمانیۃ وستۃ واربعۃ، ولم یلزموا الجزیۃ من کان اتی لہ من السن دون العشرین او فوق الخمسین[1]۔

یعنی لوگون پر جزیہ مقرر کیا گیا جسکی شرح ۱۲ درہم اور ۸ و ۶ و ۴ تھی لیکن خاندانی شرفا اور امرا و اہل فوج اور پیشوایانِ مذہب اور اہل قلم اور عہدہ دارانِ دربار جزیہ سے مستثنیٰ تھے، اور وہ لوگ بھی جنکی عمر ۵۰ سے زیادہ یا ۲۰ سے کم ہوتی تھی،

امام موصوف اس واقعہ کے بیان کرنے کے بعد لکھتے ہین، وھی الوضایع التی اقتدی بھا عمر بن الخطاب حین افتتح بلاد الفرس، یعنی حضرت عمرؓ نے جب فارس کو فتح کیا تو انھین قاعدون کی تقلید کی" علامہ ابو حنیفہ دینوری نے بھی کتاب الاخبار الطوال مین بعینہ اس تفصیل کو نقل کیا ہے[2]۔

جس غرض سے نوشیروان نے جزیہ کا قاعدہ جاری کیا، اُس کی وجہ علامہ طبری نے نوشیروان کے اقوال سے یہ نقل کی ہے، کہ "اہلِ فوج ملک کے محافظ ہین، اور ملک کیلئے اپنی جانین خطرے مین ڈالتے ہین، اس لئے لوگون کی آمدنی سے اُن کے لئے ایک رقم خاص مقرر کی گئی، کہ اُن کی محنتون کا معاوضہ ہو"

خراج و جزیہ کے متعلق جو کچھ ان مورخون نے لکھا اُس کی تائید فردوسی کے اشعار سے بھی ہوتی ہے، اگرچہ بعض امور مین دونون کا بیان مختلف ہے، ہم اُن اشعار کو اس موقع پر نقل کرتے ہین ؎

[1] تاریخ کبیر طبری صفحہ ۹۶۲، [2] دیکھو کتاب مذکور صفحہ ۷۰۔

ہمہ پادشاہان شدند انجمن	زمین را بسنجید و بر زد رسن
گزیتے نہادند بر یک درم	گرایدون کہ دہقان نبودے دژم
گزیت رز بارور شش درم	بخرماستان بر ہمین زد رقم
کسے کش درم بود و دہقان نبود	نبودے غم در رنج کشت و درود
گذارندہ از دہ درم تا چہار	بہ سالے از دلبستدے کاردار
دبیر و پرستندۂ شہریار	نبودے بہ دیوان کسے را شمار

دونون روایتون کے فرق کو ناظرین خود سمجھ سکتے ہین،

تیسری بحث

اسلام نے جو انتظام قایم کیا، اُسکی روسے ہر مسلمان فوجی خدمت کے لئے مجبور کیا جا سکتا تھا، یہ قاعدہ کچھ آسان قاعدہ نہ تھا اور لوگ اگر ذرا بھی اُس سے بچنے کا حیلہ پاجاتے تھے، تو اُس سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، چنانچہ ایک بار جب جزیرۂ سلی[1] مین مکتب کے معلم اس جبر سے بری کر دیئے گئے، تو سیکڑون آدمیون نے اور کام چھوڑ کر یہی پیشہ اختیار کر لیا،

اس لحاظ سے کل مسلمان فوجی خدمت رکھتے تھے، اور ضرور تھا کہ وہ جزیہ سے اسی طرح بری رہین جسطرح نوشیروان عادل نے عموماً اہلِ فوج کو اس (جزیہ) سے بری رکھا تھا، لیکن غیر مذہب والے جو اسلامی حکومت کے ماتحت تھے اور جنکی حفاظت مسلمانون کو کرنی پڑتی تھی، اُن کو فوجی خدمت پر مجبور کرنے کا اسلام

[1] دیکھو معجم البلدان یاقوت حموی، ذکر صقلیہ،

کو کوئی حق نہ تھا نہ وہ لوگ ایسی پرخطر خدمات کے لیے راضی ہو سکتے تھے، اس لئے ضرور تھا کہ وہ اپنی محافظت کے لیے کوئی معاوضہ دیں، اسی معاوضہ کا نام جزیہ تھا جو فارسی لغت سے معرّب کیا گیا تھا، لیکن اگر کسی موقع پر غیر قوموں نے فوج میں شریک ہونا یا شرکت کے لیے آمادہ ہونا گوارا کیا تو وہ جزیہ سے بری کردیے گئے، جیسا کہ ہم آیندہ تاریخی شہادت سے ثابت کریں گے،

جزیہ کا معاوضہ حفاظت ہونا علمی و عملی طور سے ہمیشہ مسلّم رہا اور سچ یہ ہے کہ اسی خیال نے اکثر اہل لغت کو اس طرف متوجہ نہ ہونے دیا کہ جزیہ فارسی زبان کا لفظ ہے وہ سمجھے کہ یہ لفظ جزاء سے نکلا ہے جس کے معنی بدلے کے ہیں، اور چونکہ یہ بھی ایک معاوضہ اور بدلہ ہے لہذا اس مناسبت سے اسکا نام جزیہ رکھا گیا،

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وخلفاے راشدین کے جو معاہدے تاریخوں میں منقول ہیں اُن سے صاف پایا جاتا ہے کہ جزیہ ان لوگوں کی محافظت کا معاوضہ تھا، خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے والی ایلہ کو جو فرمان جزیہ کا تحریر فرمایا اسمیں یہ الفاظ مندرج فرمائے، یحفظوا ویمنعوا یعنی ان لوگوں کی حفاظت کیجائے اور دشمنوں سے بچائے جائیں[1] حضرت عمرؓ نے وفات کے قریب جو نہایت ضروری وصیتیں کیں انمیں ایک یہ بھی تھی کہ غیر مذہب والے جو ہماری رعایا ہیں وہ خدا اور رسول کی ذمہ داری میں ہیں، اور مسلمانوں کو انکی طرف سے ان کے دشمنوں سے مقابلہ کرنا چاہئے، اس موقع پر ہم بعض معاہدات اصلی الفاظ میں نقل کرتے ہیں، جن سے نہایت صاف اور مصرح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ جزیہ صرف حفاظت کا معاوضہ تھا، اور غیر مذہب والے جو مسلمانو

[1] دیکھو فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۵۹،

کی رعایا تھے، یہی سمجھ کر یہ معاوضہ ادا کرتے تھے،

هذا الكتاب من خالد بن الوليد لصلوبا ابن نسطونا وقومه اني عاهدتكم على الجزية والمنعة فلك الذمة والمنعة ما منعناكم فلنا الجزية والا فلا، كتب سنة اثنتي عشرة في صفر[1]،

یہ خالد بن الولید کی تحریر ہے، صلوبا ابن نسطونا اور اس کی قوم کے لئے مین نے تم سے معاہدہ کیا جزیہ اور محافظت پر، پس تمھاری ذمہ داری اور محافظت ہم پر ہے، جب تک ہم تمھاری محافظت کرین ہم کو جزیہ کا حق ہے، ورنہ نہین، ۱۲ھ صفر مین لکھا گیا،

۲۔ اہلِ اسلام نے عراق عرب کے اضلاع مین وہان کے باشندون کو جو عہد نامے لکھے اور جن پر بہت سے صحابہ کے دستخط تھے، اُن کے ملتقط الفاظ یہ ہین،

براءة لمن كان من كذا وكذا من الجزية التي صالحهم عليها الامير خالد بن الوليد وقد قبضت الذي صالحهم عليه خالد والمسلمون لكم يد على من بدل صلح خالد ما اقررتم بالجزية وكنتم امانكم امان وصلحكم صلح ونحن لكم على الوفاء[2]،

اُن لوگون کے لئے جنھون نے اس اس تعداد کا جزیہ دینا قبول کیا ہے، اور جن پر خالد بن ولید نے ان سے مصالحت کی جزیہ برات نامہ ہے، خالد اور مسلمانون نے جس تعداد پر صلح کی وہ ہم کو وصول ہوئی جو شخص خالد کی صلح کو بدلنا چاہے اسکو تم لوگ مجبور کرسکتے ہو بشرطیکہ جزیہ ادا کرتے ہو تمھاری امان امان ہو، اور تمھاری صلح صلح (یعنی جس سے تم صلح کرو ہم بھی صلح کرین گے، اور جس کو تم امان دوگے ہم بھی امان دین گے)

[1] تاریخ کبیر ابو جعفر جریر طبری مطبوعہ یورپ جز خامس صفحہ ۲۰۴۸ [2] تاریخ طبری صفحہ ۲۰۵۰،

اس کے مقابلے مین عراق کی رعایا نے یہ تحریر لکھی،

اناقد ادینا الجزیۃ التی عاھدنا علیھا	ہم نے وہ جزیہ ادا کر دیا جس پر خالدؓ سے معاہدہ
خالد علی ان یمنعونا و امیرھم البغی	کیا تھا، اس شرط پر کہ مسلمان اور نیز اور تمام قومین اگر
من المسلمین و غیرھم، (طبری صفحہ مذکور)	ہم کو گزند پہونچانا چاہین، تو جماعت اسلام اور ان کے
	افسر ہماری حفاظت کے ذمہ دار ہون،

ان تحریری معاہدون کے علاوہ جہان جہان صحابہؓ نے دعوت اسلام کی جزیہ کی نسبت یہی خیال ظاہر کیا، مثلاً ۱۴؁ھ مین یزدگرد کے پاس جب صحابہؓ گئے، تو نعمان بن مقرن نے جو سفارت کے سردار تھے گفتگو کے خاتمہ پر کہا ان اتقیتمونا بالجزاء قبلنا و منعنا کم یعنی اگر جزیہ ادا کرنے کے ذریعہ سے جان بچاؤ گے تو ہم قبول کرین گے، اور تم کو تمھارے دشمنون سے بچائین گے، یا جب سپہ سالار فارس سے گفتگو ہوئی تو حذیفہ بن محصن نے کہا ادا الجزاء و نمنعکم ان احتجتم الی ذلک یعنی یا جزیہ دو اور اس صورت مین جب تم کو ضرورت ہوگی تو ہم تمھاری حفاظت کرین گے" یہ معاہدے اور تقریرین صرف زبانی باتین نہ تھین بلکہ ہمیشہ اس پر عمل کیا گیا،

ابو عبیدہؓ جراح نے شام مین جب متواتر فتوحات حاصل کین تو ہرقل نے ایک عظیم الشان فوج مسلمانون پر حملہ کرنے کے لئے طیار کی، مسلمانون کو اس کے مقابلے مین بڑی مستعدی سے بڑھنا پڑا، اور اُن کی تمام قوت و توجہ فوجون کی ترتیب مین مصروف ہوئی، اُس وقت حضرت ابو عبیدہؓ امین افسر فوج نے اپنے تمام عاملون کو جو شام کے مفتوحہ شہرون پر مامور تھے، لکھ بھیجا، کہ "جس قدر جزیہ و خراج جہان جہان وصول کیا گیا ہے، سب اُن لوگون کو واپس دے دو جن سے وصول ہوا تھا اور اُن سے کہہ دو

کہ ہم نے تم سے جو کچھ لیا تھا، اس شرط پر لیا تھا کہ تمھارے دشمنون سے تمھاری حفاظت کرسکین، لیکن اب اس واقعہ کے پیش آجانے کی وجہ سے ہم تمھاری حفاظت کا ذمہ نہین اٹھا سکتے"، ابو عبیدہ کے خاص الفاظ جنہین عیسائیون سے خطاب ہی، یہ ہین،

انما رددنا علیکم اموالکم لانہ قد بلغنا ما جمع لنا من الجموع وانکم قد اشترطتم علینا ان نمنعکم وانا لا نقدر علی ذلک وقد رددنا علیکم ما اخذنا منکم

عیسائیون نے مسلمانون کو دل سے دعا دی اور کہا کہ خدا پھر تم کو ہمارے شہرون کی حکومت دے، رومی ہوتے تو اس موقع پر واپس دینا تو درکنار جو کچھ ہمارے پاس تھا وہ بھی لے لیتے، چنانچہ سب سے پہلے اس حکم کی تعمیل حمص مین ہوئی جہان حضرت ابو عبیدہ خود مقیم تھے، انھون نے حبیب بن مسلمہ کو بلا کر کہا کہ جو کچھ ذمیون سے وصول ہوا ہے، سب اُن کو واپس کردو، اس کے بعد ابو عبیدہ دمشق مین آئے، اور سوید بن کلثوم کو اس کام پر مقرر کیا کہ ذمیون سے جس قدر رقم وصول ہوئی ہے، سب اُن کو واپس کردیجائے،

ان سب باتون سے زیادہ یہ امر اس دعوی کے لئے دلیل مبین ہی، کہ اگر کسی غیر قوم نے فوجی خدمت پر رضامندی ظاہر کی تو اُسی طرح جزیہ سے بری رہے جس طرح خود مسلمان،

حضرت عثمانؓ کے زمانے مین جب حبیب بن مسلمہ نے قوم جراجمہ[۲] پر فتح پائی تو اُن

---

[۱] دیکھو کتاب الخراج قاضی ابو یوسف صفحہ ۸۱، و فتوح البلدان صفحہ ۱۳۷ و فتوح الشام ازدی صفحہ ۱۳۷

[۲] ایک عیسائی قوم تھی اور شہر جراجمہ اور اس کے مضافات مین آباد تھی، معجم البلدان مین اس مقام کا ذکر تفصیلاً لکھا ہی،

لوگون نے فوجی خدمتون مین بوقت ضرورت شریک ہونا خود پسند کیا، اور اس وجہ سے وہ تمام قوم جزیہ سے بری رہی، نہ صرف جراجمہ بلکہ بہت سے نبطیون اور اُن کے متصل کی آبادیون نے یہ امر اختیار کیا اور جزیہ سے بری رہین، خلیفہ واثق باللہ عباسی کے زمانے مین وہان کے عامل نے غلطی سے اُن لوگون پر جزیہ لگایا، تو انھون نے خلیفہ کو اطلاع دی اور دربار خلافت سے اُنکی برات کا حکم صادر ہوا، جزیہ کا معاوضہ حفاظت ہونا اس قدر صاف صاف ظاہر کر دیا گیا تھا کہ معاہدون مین یہان تک تصریح کر دیجاتی تھی کہ ذمی اگر صرف ایک سال فوجی خدمت مین شریک ہون گے، تو اُس سال کا جزیہ چھوڑ دیا جائیگا۔
چنانچہ خود حضرت عمرؓ کے زمانے مین کثرت سے یہ معاملہ پیش آیا، عتبہ بن فرقد نے جب آذربائجان فتح کیا تو معاہدے مین یہ الفاظ لکھے علی ان یودوا الجزیۃ علی قدر طاقتھم ومن حشر منھم فی سنۃ وضع عنہ جزاء تلک السنۃ۔ یعنی صلح اس شرط پر ہوئی کہ جزیہ ادا کرین، اور جو شخص کسی سال لڑائی مین بلایا جائیگا تو اس سال کا جزیہ معاف کر دیا جائیگا۔
اسی طرح حضرت عمرؓ کے زمانے مین جب آرمینیہ کے بعض حصے فتح ہوئے، تو سپہ سالار نے معاہدے مین یہ الفاظ لکھے، ان ینفروا لکل غارۃ وینفذوا لکل امر ناب اولم ینبہ الا الوالی صلاحا علی ان توضع الجزاء عمن اجاب الی ذلک ومن استغنی عنہ منھم وقعد فعلیہ مثل ما علی اہل اذربائجان من الجزاء (۱)
یعنی صلح اس شرط پر ہوئی کہ یہ لوگ جب لڑائی پیش آئے یا کوئی ضرورت پیش ہو تو مسلمانون کے ساتھ شریک ہون، اس صورت مین ان پر جزیہ نہین لگایا جائیگا لیکن جس شخص کی ضرورت ہو اور وہ بیٹھ رہے تو اس کو آذربائجان والون کی طرح

---

(۱) فتوح البلدان بلاذری صفحہ ۱۵۹ و ۱۶۱ و ۱۹۱

جزیہ ادا کرنا ہوگا، اسی معاہدے مین یہ لفظ بھی ہے، اور وہ صاف صاف ہمارے دعویٰ کی توضیح ہے، "دالحشی عوض من جزا الیھو" یعنی لڑائی مین ذمیون کا شریک ہونا جزیہ کا قایم مقام ہی، خود حضرت عمرؓ نے متعدد دفعہ یہ احکام بھیجے تھے، کہ اگر کسی ذمی سے اتفاقیہ کسی موقع پر مدد لو تو اُس سال کا جزیہ چھوڑ دو، حضرت عمرؓ کے زمانے مین جرجان وغیرہ ممالک مین جو معاہدہ ہوا، اسمین یہ الفاظ تھے، "ومن استعنا بہ منکم فلہ جزاءہ فی معونتہ عوضا من جزائہ" یعنی ہم اگر کسی ذمی سے اعانت لینگے تو اُس اعانت کے بدلے مین جزیہ چھوڑ دیا جائیگا،

معاہدات مین یہ تصریح کہ جزیہ کے عوض مین ہم تمھاری اندرونی و بیرونی حفاظت کے ذمہ دار ہین، جب حفاظت پر قدرت نہ ہو تو جزیہ کا واپس کر دینا، جو قومین فوجی مدد پر آمادہ ہون اُن کو جزیہ سے بری رکھنا کیا ان واقعات کے ثابت ہونے کے بعد بھی شبہہ رہ سکتا ہی کہ جزیہ کا مقصد وہی تھا جو ہم نے تیسری بحث کے آغاز مین بتایا ہی،

جزیہ کے مصارف یہ تھے، لشکر کی آراستگی، سرحد کی حفاظت قلعون کی تعمیر، ان کے بچاؤ، سڑکون اور پلون کی تیاری، سررشتۂ تعلیم، بے شبہہ اس طرح اس خاص رقم سے مسلمانون کو بھی فائدہ پہونچتا تھا، اور پہونچنا چاہئے تھا، مسلمان لڑائیون مین شریک ہوتے، جانین لڑاتے، ملک کو تمام خطرون سے بچاتے تھے، پس جس طرح اُن کے جسم و جان سے ذمی رعایا مستفید ہوتی تھی، اگر ذمیون کے مال سے مسلمانون کو بھی فائدہ پہونچتا تھا تو کیا بے جا تھا، اس کے علاوہ صدقہ کی رقم جو خاص مسلمانون سے وصول کیجاتی تھی اُس مین ذمی رعایا برابر کی شریک تھی، حضرت عمر فاروقؓ نے بیت المال

---

[1] تاریخ کبیر طبری،

کے داروغہ کو کہلا بھیجا تھا کہ خدا کے اس قول مین انما الصدقات للفقرا ءو المساکین (صدقات فقیرون اور مسکینون کے لئے ہین) مسکینون سے عیسائی اور یہودی مراد ہین[1]،

جزیہ کی تعداد زیادہ سے زیادہ بیس روپئے سالانہ تھی، کسی کے پاس لاکھون روپیہ ہون تو اس سے زیادہ دینا نہین پڑتا تھا، عام شرح چھ روپئے اور تین روپیہ سالانہ تھی، بیس برس سے کم اور پچاس برس سے زیادہ عمر والے اور عورتین، مفلوج، معطل العضو، نابینا، مجنون، مفلس یعنی جس کے پاس دو سو درہم سے کم ہو، یہ لوگ عموماً جزیہ سے معاف تھے، اب ہم پوچھتے ہین کہ ایسا ہلکا ٹیکس جسکی تعداد اسقدر قلیل تھی جسکے ادا کرنے سے فوجی پرخطر خدمت سے نجات مل جاتی تھی، جسکی بنیاد نوشیروانِ عادل نے ڈالی تھی، کیا ایسی ناگوار چیز ہو سکتی ہی جیسی کہ اہلِ یورپ نے خیال کی ہی کیا دنیا مین ایک شخص نے بھی اس سے بچنے کے لئے اپنا مذہب چھوڑا ہوگا؟ کیا کسی نے اپنے مذہب کو ایسے ہلکے ٹکس سے بھی کم قیمت سمجھا ہوگا، اگر کسی نے ایسا سمجھا تو ہم کو اس کے مذہب کے ضایع ہونے کا رنج بھی نہ کرنا چاہیے، جو لوگ جزیہ ادا کرتے تھے، اُن کو اسلام نے جسقدر حقوق دیئے کون حکومت اس سے زیادہ دیسکتی ہی، لیکن چونکہ ہمارے مضمون کے عنوان سے یہ بحث کسی قدر دور پڑجاتی ہی اس لئے اس موقع پر ہم یہ بحث چھیڑنی نہین چاہتے،

---

[1] کتاب الخراج امام ابو یوسفؒ

اختلاف

اور

مسامحت

آج کل قوم کے تنزل اور ادبار کے مسئلہ پر جب بحث کیجاتی ہے، تو تنزل کا سب سے بڑا سبب جو قرار دیا جاتا ہے وہ آپس کا اختلاف ہے، ہر شخص کو نظر آتا ہے کہ مسلمانون مین اس سرے سے اُس سرے تک یہ عام مرض پھیلا ہوا ہے، شیعہ، سنی مقلد، غیر مقلد، وہابی، بدعتی معتزلۂ حال (نیچری) بیسیون فرقے ہین، پھر ان مین الگ الگ جتھے جنمین سے ہر ایک دوسرے کو گمراہ اور بد دین کہتا ہے، ارباب بریلی، دیوبند، ندوہ، سب حنفی ہین، لیکن بریلی والون کے نزدیک دیوبند اور ندوہ دونون کافر، اس تفرق، اس اختلاف، اس بوقلمونی کے ساتھ کوئی قوم کیونکر زندہ رہ سکتی ہے؟ یہ حالت پیش آئے تو ایک کوہ گران کی بھی دھجیان اڑجائین، چونکہ اس خیال کا اثر ایک بہت بڑے قومی اور تاریخی مسئلہ پر پڑتا ہے اس لئے ہم اس پر تفصیل کے ساتھ بحث کرنا چاہتے ہین،

اس مسئلہ کے طے کرنے کے لئے امور ذیل کا فیصلہ کرنا چاہیے،

(۱) کیا زمانۂ سلف مین اختلاف نہ تھا؟

(۲) اختلاف کے ساتھ اتحاد ممکن ہے؟ یا نہین؟

پہلے امر کے لئے ہم کو اُس زمانہ پر نظر ڈالنی چاہیے، جب آفتاب اسلام کی دوپہر تھی،

جب ایک طرف تیغ وسنان نے اسپین اور سندھ کے ڈانڈے ملا دیئے تھے، اور دوسری طرف صریر قلم نے مصر و یونان کے خفتہ علوم و فنون کو جگا دیا تھا، اس وقت قدری، جبری، معتزلی، جہمی وغیرہ وغیرہ اس قدر بے شمار فرقے تھے کہ بمشکل ان کو ۷۳ کے عدد میں محصور کیا گیا، ان فرقوں میں جو اختلاف تھا، اس کی یہ کیفیت ہے کہ ایک دوسرے کو کافر ملکہ کافر سے بدتر کہتا تھا، اور گمراہ و مرتد و زندیق کہنا تو معمولی بات تھی،

معتزلہ قرآن مجید کو مخلوق اور حادث کہتے تھے، اس مسئلہ کی نسبت محدثین اہل سنت کے یہ اقوال ہیں جو امام بیہقی نے کتاب الاسماء والصفات[1] میں نقل کئے ہیں،

وکیع بن الجراح،

من زعم ان القرآن محدث فقد کفر	جس کا یہ خیال ہو کہ قرآن مخلوق ہو وہ کافر ہو،

یزید بن ہارون،

من زعم ان کلام اللہ مخلوق فهو والذی لا الٰہ الا ہو زندیق،	جو یہ سمجھتا ہو کہ کلام الٰہی مخلوق ہو، خدائے یکتا کی قسم وہ زندیق ہو،

امام بخاری،

نظرت فی کلام الیهود والنصاریٰ والمجوس فما رأیت قوما اضل فی کفرهم من الجهمیة	میں نے یہودیوں، عیسائیوں، مجوسیوں سب کا کلام دیکھا ہو، کوئی کفر میں اس قدر گمراہ نہیں جس قدر جہمیہ،

اشعری، ماتریدی، حنبلی، محدثین، سب اہل سنت وجماعت ہیں، اور سب ایک دوسرے کو برسرِ حق سمجھتے ہیں، تاہم جب ان میں سے ایک اپنے عقائد کا ذکر، دوسرے کے مقابلہ میں کرتا ہے، تو اسکا نام اس طریقہ سے لیتا ہو، تمہید[2] ابوشکور سالمی حنفیوں کی علم عقائد کی مشہور

---

[1] کتاب مذکور مطبوعہ الہ آباد ص ۹۰، تا ۹۱، [2] کتاب حنفیوں کی علم کلام کی مشہور و مسلم کتاب ہو،

و مستند کتاب ہی، اس مین لکھا ہی:۔

قال بعضهم انا نعرف الله تعالی بالرسول	بعض کہتے ہین کہ ہم خدا کو رسول کے ذریعہ سے جانتے
وهو قول الاشعری وقال اهل السنة	ہین اور یہی اشعری کا قول ہی اور اہل سنت
والجماعة انا نعرف الرسول بالله تعالی	والجماعہ کا یہ قول ہی کہ ہم رسول کو خدا کے ذریعہ
(تمہید مطبوعہ دہلی صفحہ ۔)	سے جانتے ہین،

امام بزدوی، نے علم کلام مین جو کتاب لکھی ہی اور جسکا قلمی نسخہ ہماری پیش نظر ہی اس مین بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہی،

علامہ ذہبی مشہور محدث ہین اور فن حدیث مین ان کے بعد کوئی ان کا ہمسر نہین پیدا ہوا انکی نسبت علامہ ابن السبکی طبقات مین لکھتے ہین ۱؎۔

ان شیخنا الذهبی له علم و دیانة وعنده	یہ ہمارے استاد ذہبی عالم ہین متدین ہین باانہمہ
علی اهل السنة تحمل مفرط فلا یجوز ان	اہل سنت سے نہایت تعصب برتتے ہین اس لئے
یعتمد علیه وهو شیخنا ومعلمنا غیر ان	ان پر اعتماد نہین ہوسکتا، اور وہ ہمارے شیخ اور
الحق احق بالاتباع	معلم ہین لیکن حق بات پیروی کئے جانے کی زیادہ مستحق

علامہ ابن عبدالبر جو مشہور محدث گذرے ہین اور جنکی شرح موطاے امام مالک یہ شروح موطا مین سب سے بہتر ہے انھون نے اپنی کتاب جامع بیان العلم مین جو ۱۳۲۰ھ مین قاہرہ مین چھاپی گئی ہے، ایک خاص باب باندھا ہی، اسکا اقتباس ہم اس موقع پر نقل کرتے ہین:۔

فعن مغیرة عن حماد انه ذکر اهل الجنة	مغیرہ سے مروی ہی اور مغیرہ حماد سے روایت کرتے

۱؎ الرفع والتکمیل مصنفہ مولانا عبدالحی لکھنوی صفحہ ۲۰۔

فقال ما لهم فلم يكن عندهم شئ والله
لصبيانكم اعلم منهم بل صبيان صبيانكم

وعن الزهري قال ما رأيت قوما انقض
لعرى الاسلام من اهل مكة + + + +
وهذا ابن الشهاب (اى الزهري) قد
اطلق على اهل مكة فى زمانه انهم نقضو
عرى الاسلام ما استثنى منهم احدا
فيهم من اجلة العلماء من لا خفاء
بجلالته فى الدين هاظن ذلك والله
اعلم لما روى عنهم فى الصرف ومتعة
النساء وروى على بن مسهر عن هشام
بن عروة عن ابيه قال قالت عائشة ما
علم انس بن مالك وابوسعيد الخدري
بحديث رسول الله صلى الله عليه وسلم
وانما كانا غلامين صغيرين + + ومن
ابن وهب قال مالك وذكر عنده اهل
العراق فقال انزلوهم منزلة اهل الكتاب

ہیں کہ انھوں نے اہل حجاز کا تذکرہ کیا تو کہا کہ
میں نے ان لوگوں سے سوالات کئے تو ان کے پاس
کچھ نہ تھا خدا کی قسم تمھارے بچے ان سے زیادہ علم
رکھتے ہیں، بلکہ تمھارے بچوں کے بچے بھی،

زہری سے مروی ہے کہ میں نے کسی قوم کو اہل مکہ
سے زیادہ شیرازۂ اسلام کو منتشر کرنے والا نہیں دیکھا
+ + + + ابن شہاب زہری نے اپنے زمانہ کے عام
اہل مکہ کے متعلق کہا کہ وہ اسلام کے شیرازہ کو منتشر
کرتے ہیں، زہری نے ان میں کسی کو مستثنیٰ نہ کیا،
حالانکہ ان میں بڑے بڑے علماء موجود تھے جن کی
مذہبی عظمت وجلالت مخفی نہیں، میں گمان کرتا
ہوں کہ زہری نے یہ اس لئے کہا کہ اہل مکہ سے
مسئلہ صرف اور متعہ مروی ہے، علی بن مسہر نے
ہشام بن عروہ سے روایت کی اور ہشام اپنے باپ
سے راوی ہیں کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ انس
بن مالک اور ابوسعید خدری نے حدیث نبوی
صلی اللہ علیہ وسلم کو کچھ نہیں جانا، وہ دونوں چھوٹے
بچے تھے اور ابن وہب سے مروی ہے کہ امام مالک
کے سامنے اہل عراق کا تذکرہ ہوا تو انھوں نے فرمایا کہ

لا تصدقوهم ولا تکذبوهم، | کہ اہل عراق کو اہل کتاب کی طرح سمجھو نہ انکی تصدیق کرو نہ تکذیب،

اختلاف کے ساتھ اتحاد، اوپر کی روایتون سے تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ عین ترقی اسلام کے زمانہ مین اختلاف عقائد کی کیا حالت تھی، لیکن اس وقت لوگ اس نکتہ کو سمجھ سکتے تھے اور سمجھے تھے، کہ اختلاف کے ساتھ بھی مشترکہ اغراض مین اتحاد ممکن ہی،

اس نکتہ کی تلقین خود قرآن مجید نے کی تھی،

وان جاھداک علی ان تشرک بی ما لیس لک بہ علم فلا تطعھما وصاحبھما فی الدنیا معروفا،	اگر وہ دونون (مان باپ) یہ کوشش کرین کہ تو ہمارا شریک اس چیز کو بنائے، جس کا تجھکو علم نہین تو تو ان کا کہا نہ مان لیکن دنیا مین ان سے اچھی طرح پیش آ،

اس آیت کا یہ مفہوم ہے کہ مثلاً ایک شخص مسلمان ہے، اور اس کے مان باپ مشرک اور کافر ہین، وہ چاہتے ہین کہ اپنے بیٹے کو بھی مشرک اور کافر بنا لین، اس حالت مین خدا حکم دیتا ہے، کہ کفر اور شرک مین انکا کہنا نہین تسلیم کرنا چاہئے، لیکن اس سے انکے حقوق پدری زائل نہین ہوجاتے، اس لئے دنیاوی معاملات مین ان کا ادب لحاظ اسی طرح ملحوظ رکھنا چاہئے جو عموماً والدین کا حق ہی،

اس آیت نے بتا دیا کہ اختلاف اور اتفاق کے حدود الگ الگ ہین، یہ ممکن ہی کہ مذہب کے معاملہ مین اختلاف ہو اور دوسرے معاملات مین اتحادی اصول پر عمل کیا جائے،

قرون اولی مین اس اصول پر عمل رہا، مثالین ہم ذیل مین لکھتے ہین جن سے یہ مسئلہ اچھی طرح ذہن نشین ہو سکے گا،

(۱) اوپر گذر چکا کہ محدثین، قدریہ، جبریہ، معتزلہ، شیعہ وغیرہ کو اہل بدعت اور اہل اہوا کہتے تھے، ان کو گمراہ اور . . . . . سمجھتے تھے، باانیہمہ دین کا نہایت اہم کام یعنی حدیث کا روایت کرنا، اُن سے جائز سمجھتے تھے، فن حدیث کا یہ ایک مسئلہ ہو کہ فرقہاے باطلہ سے حدیث روایت کرنا جائز ہو یا نہین یعنی مثلاً اگر ایک حدیث آنحضرت صلعم سے منقول ہو جس کے سلسلۂ روایت مین معتزلی، یا شیعہ وغیرہ ہون تو یہ حدیث معتبر ہوگی یا نہین اس مسئلہ کے متعلق اکثر ائمۂ حدیث کا یہی فتوی ہے کہ ان مین سے خطابیہ کے سوا جنکے مذہب مین جھوٹ بولنا جائز ہو، باقی اور فرقون سے روایت کرنا جائز ہے فتح المغیث شرح الفیۃ الحدیث مین ابن حبان کا قول نقل کیا ہو،

لیس بین اھل الحدیث من ائمتنا خلاف فی ان الصدوق المتقن اذا کانت فیہ بدعۃ ولم یکن یدعوا الیھا ان الاحتجاج باخبارہ جائز[1]

ہمارے ائمہ مین سے محدثین کے نزدیک اس امر مین کوئی اختلاف نہین ہو کہ اگر راست گو حافظ بدعتی ہو لیکن اپنی بدعت کی طرف لوگون کو بلاتا نہین تو اسکی روایات سے دلیل لانا جائز ہو،

اسی کتاب مین حاکم نیشاپوری کی تاریخ نیشاپور سے نقل کیا ہو،

ان کتاب مسلم ملآن من الشیعۃ[2]

امام مسلم کی کتاب شیعی رواۃ سے بھری ہوئی ہو،

علامہ ابن الصلاح کا قول ہو:-

فان کتبھم طافحۃ بالروایۃ عن المبتدعۃ غیر الدعاۃ[3]

محدثین کی تصنیفات غیر داعی بدعتیون کی روایت سے پر ہین،

ابراہیم بن یحیٰی امام شافعی کے استاد تھے، ان کا مذہب قدری تھا، اس لئے جب

---

[1] کتاب مذکور طبع لکھنؤ صفحہ ۱۴۱ [2] کتاب مذکور صفحہ ۱۴۲، [3] ،،

امام شافعی اُن سے روایت کرتے تھے تو کہتے تھے کہ یہ حدیث مجھ سے ایسے شخص نے روایت کی جس کا دین مشکوک ہے لیکن روایت صحیح کرتا ہی، خطیب بغدادی اسی قول کو نقل کرکے لکھتے ہین :-

ان هذا مذهب ابن ابی لیلی و سفیان الثوری	یہ ابن ابی لیلی اور سفیان ثوری کا مذہب ہے
و نحوه عن ابی حنیفة بل حكاه الحاكم	اور اسی کے مثل ابو حنیفہ سے مروی ہے بلکہ یہی مذہب
فی المدخل عن اكثر ائمة الحديث	حاکم نے مدخل مین اکثر ائمہ حدیث کا نقل کیا ہی

امام شافعی کتاب الام مین لکھتے ہین :-

فلم نعلم من سلف الائمة من يقتدى	ہم نہ گذشتہ ائمہ مین سے جنکی اقتدا کیجاتی ہے
به ولا من بعدهم من التابعين رد	اور نہ ان کے بعد کے علماے تابعین مین سے کسی
شهادة احد بتاويل وان خطاءه	کو جانتے ہین جس نے کسی تاویل سے کسی کی شہادت
وضلله ورأه استحل ما حرم الله عليه	رد کردی ہو گو وہ اسکو گنہگار یا گمراہ کیون نہ قرار دیتا
(فتح المغیث صفحہ ۱۴۲)	ہو یا اُس کے متعلق یہ کیون نہ سمجھتا ہو کہ اس نے خدا
	کی حرام کی ہوئی چیز حلال کر لی،

علامہ ذہبی میزان الاعتدال ابان بن تغلب کے ذکر مین لکھتے ہین :-

ان البدعة على ضربين فبدعة صغرى	بدعت کی دو قسمین ہین، بدعت صغرہ جیسے شیعیت
كغلو التشيع اوكا لتشيع بلا غلو ولا تحرف	مین شدید ہونا یا شیعیت بغیر شدت ...... یہ شیعیت
فهذا اكثر فى التابعين وتابعيهم مع الدين	تابعین و تبع تابعین مین بہت ہی، باوجود اسکے
والورع والصدق فلو رد حديث	ان مین مذہب، تقوی اور صدق ہی، اگر ان لوگون

لہ الفیة الحدیث صفحہ ۱۴۱،

ھولاء لذھب جلۃ آثار النبویۃ وھذہ مفسدۃ بینۃ ... فالشیعی الغالی فی زمان السلف وعرفھم ھو من تکلم فی عثمان والزبیر وطلحۃ ومعاویۃ و طائفۃ ممن حارب علیا رضی اللہ عنہم وتعرض بسبھم والغالی فی زماننا وعرفنا ھو الذی یکفر ھولاء ویتبرأ من الشیخین ایضاً فھذا ضال معتر	کی حدیثین رد کر دیجائین، تو آثار نبوی کا ایک حصہ جاتا رہیگا اور یہ خرابی ظاہر ہی ... شدید شیعی سلف کے زمانہ میں اور اصطلاح مین وہ شخص ہی جسکو حضرت عثمان، زبیر، طلحہ، معاویہ مین اور اس گروہ مین جنکو حضرت علی سے جنگ کی کلام ہوا اور ان کو برا کہتا ہو، اور ہمارے زمانہ مین اور ہماری اصطلاح مین شدید شیعی وہ ہی جو ان لوگون کی تکفیر کرتا ہی، اور نیز شیخین سے بیزاری ظاہر کرتا ہو، یہ شخص گمراہ اور فریب خوردہ ہے،

اس قسم کے سیکڑون اقوال ہین جنکا شمار نہین ہوسکتا، یہ مسئلہ اس اصول کی بنا پر ہی کہ مذہبی اعتقاد اور راست گوئی الگ الگ باتین ہین ممکن ہی کہ ایک شخص کے عقائد اچھے ہون لیکن کاذب الروایت ہو، اسی طرح یہ ممکن ہی کہ ایک شخص کے عقائد خراب ہون لیکن دروغ گو نہ ہو، محدثین کی یہ انتہا کی نکتہ سنجی، حقیقت شناسی، اور بے تعصبی ہی کہ وہ عقیدہ کے لحاظ سے ایک شخص کو بدعقیدہ، بدعتی، گمراہ سمجھتے ہین، لیکن اگر ان کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہی کہ وہ شخص جھوٹ نہین بولتا، تو اس سے بے تکلف حدیث سیکھتے ہین، روایت کرتے ہین، اس کی شاگردی کا اعتراف کرتے ہین،

قتادہ ایک مشہور محدث گذرے ہین، ان کی نسبت علامہ ذہبی نے میزان الاعتدال مین لکھا ہی:-

ما کان قتادۃ یرضی حتی یصیح بہ صیاحاً	قتادہ کو قدر کو زور شور کے ساتھ چلا کے کہے بغیر

یعنی القدر۔ قال ابن عدی وبہ دال دستوائی — چین نہین آتا تھا ابن ابی عروبہ اور دستوائی کہتے ہین

قال قتادۃ کل شیٔ بقدر الا المعاصی، قلت مع — کہ قتادہ کا قول تھا ہر چیز کی تقدیر ہو چکی ہے لیکن گناہ

ھذا الاعتقاد الردی ما تأخر احد عن الاحتجاج بہ — مین کہتا ہون کہ اس اعتقاد فاسد کے باوجود کوئی

بحدیثہ اللہ یسامحہ (تذکرۃ الحفاظ مطبوعہ حیدرآباد) — انکی حدیث کیساتھ حجت لانے سے باز نہ رہا خدا انکو بخشے

(۲) اسی اصول کا یہ نتیجہ تھا کہ نصاب تعلیم مین، مخالف فرقہ کے لوگون کی مذہبی کتابین بھی داخل تھین، ہر شخص جانتا ہے کہ زمخشری معتزلی تھا، اور اس نے قرآن شریف کی جو تفسیر کشاف کے نام سے لکھی، اس مین اپنے عقائد کہین صریحاً اور کہین اشارۃً داخل کئے تاہم یہ کتاب ابتدا سے آج تک ہمارے علما کے درس اور مطالعہ مین رہی، علما کو یقین تھا کہ ادب عربیت، معانی و بلاغت کے لحاظ سے یہ کتاب لاجواب ہے، اس لئے اسکی عام خوبی سے انکار نہین کر سکتے تھے، البتہ جہان جہان زمخشری نے اپنے عقائد کا اظہار کیا ہے، وہان تنبیہ کر دیتے تھے کہ یہ معتزلہ کے عقائد ہین،

(۳) عقلی اور ادبی علوم مین، اختلاف عقائد کا مطلق اثر نہ تھا، علوم عقلیہ مین جو لوگ امام فن مانے جاتے ہین قریباً کل، آجکل کے نقطۂ نظر سے خارج المذہب اور کم از کم فاسد العقیدہ تھے، فارابی اور بوعلی سینا افلاک کو قدیم مانتے تھے، محقق طوسی غالی شیعہ تھے، چنانچہ تجرید مین خلفاے راشدینؓ کے مطاعن نہایت تفصیل سے لکھے ہین، فن بلاغت کے تمام ارکان یعنی جاحظ، عبد القادر جرجانی، سکاکی، معتزلی تھے، نحو کا سب اعلیٰ درجہ کا مصنف رضی شیعہ ہے، فنون ریاضیہ یعنی اقلیدس اور حساب کا تمام تر مدار محقق طوسی کی تصنیفات پر ہے، با این ہمہ تمام علماے اہل سنت وجماعت انھین کتابون کو پڑھتے پڑھاتے اور انھین کو اپنا ماخذ اور مرجع قرار دیتے آئے، اور ان کے مصنفون کے نام کے بجاے، ان کو

یشخ، محقق، معلم ثانی، امام کے لقب سے یاد کرتے ہین، نا تہ عامل کا مشہور شعر ہے،

عامل اندر نحو صد باشد چنین فرمودہ اند ... یشخ عبد القاہر جرجانی پیر ہدی

(۲) سب سے بڑھکر یہ کہ اہل سنت وجماعت مخالفین مذہب کے پیچھے نماز پڑھنا جائز سمجھتے تھے اور پڑھتے تھے گو بعض لوگون نے اس کی مخالفت بھی کی لیکن عام فتوی یہی ہا کہ سب کے پیچھے نماز جائز ہے،

امام نووی جو مشہور محدث تھے، انھون نے لکھا ہے :-

ولم یزل السلف والخلف علی الصلوٰة خلف المعتزلة وغیرھم	اور سلف وخلف کا اس پر برابر اتفاق رہا کہ معتزلہ وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے،

عبد العلی بحر العلوم ارکان اربعہ مین لکھتے ہین :-

واما انہ لا یجوز الصلوٰة خلف منکر الشفاعة لاھل الکبائر ومنکر الرویة وعذاب القبر ومنکر الکرام الکاتبین لانہ کافر لتوارث ھذہ الامور من الشارع ولا یصلی خلف منکر المسح علی الخفین والمشبھة وامثالھا من تشویشات المتاخرین مخالفة لما علیہ القدماء من الائمة المجتھدین فلا یلتفت الیھا فضلا عن ان یفتی بھا (کتاب مذکور مطبوعہ مطبع سیدی کلکتہ ۱۹۵ و ۱۶۱)	باقی یہ امر کہ جو شخص شفاعت کبائر اور رؤیت اور عذاب قبر اور کراماً کاتبین کا منکر ہو، اس کے پیچھے سرے سے نماز ناجائز ہے کہ یہ امور شارع سے تواتر ثابت ہین، اس لئے اس کا منکر کافر ہے، اور یہ امر کہ مسح خفین کا جو منکر ہو اس کے پیچھے اور مشبہ کے پیچھے نماز ناجائز ہو یہ اور اس قسم کی باتین، متاخرین کی تشویشات مین ہین اور ائمہ مجتہدین کے خلاف ہین، انکی طرف التفات بھی نہین کیا جا سکتا چہ جائیکہ ان پر فتوی دیا جائے،

لہ فتح المغیث صفحہ ۴۳۴،
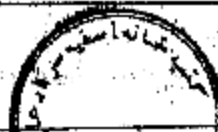
الفاروق

یعنی حضرت فاروق اعظم کی لائف اور طرز حکومت، صحابہؓ کے فتوحات، طریقۂ حکومت، عراق وشام، مصر اور ایران کے فتح کے واقعات، حضرت عمرؓ کی سیاست، اخلاق، زہد وعدل اور اسلام کی عملی تعلیم کا شاندار منظر، مولانا شبلیؒ کی یہ بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے، اگرچہ مسخ شدہ صورت میں معمولی کاغذ پر اس گران پایہ کتاب کے بیسوں اڈیشن فروخت ہو رہے ہیں، مگر اہل نظر کو ہمیشہ اس کے اعلیٰ اڈیشن کی تلاش تھی، مطبع معارف نے نہایت اہتمام اور سعی بلیغ سے اس کا نیا اڈیشن تیار کرایا ہے، جو حرف بحرف نامی پریس کانپور کی نقل ہے، نہایت عمدہ کتابت، اعلیٰ چھپائی، عمدہ کاغذ، دنیائے اسلام کا رنگین نفیس نقشہ، مطلا ٹائٹل، ضخامت ۴۱۲ صفحے، قیمت: للعہ ر

الجہاد فی الاسلام

اس کتاب میں اسلامی جہاد کی حقیقت بتائی گئی ہے، اسلام کے قوانین صلح وجنگ کی تفصیل کرکے دوسرے مذاہب کے قوانین جنگ سے ان کا مقابلہ کیا گیا ہے، اور موجودہ یورپین قوانین جنگ پر تبصرہ کرکے ان پر اسلامی قانون کا تفوق ثابت کیا گیا ہے، اور مخالفین کے تمام شکوک وشبہات زائل کئے گئے ہیں، ضخامت ۴۹۲ صفحے، لکھائی چھپائی کاغذ عمدہ، قیمت: للعہ ر

منیجر دار المصنفین اعظم گڈھ

صحفا مطہرۃ فیہا کتب قیمۃ
سلسلۂ دار المصنفین
(۳۹)
مقالات شبلی
جلد دوم
مولانا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ
کے
تمام ادبی مضامین کا مجموعہ جن کو مختلف رسالوں سے یکجا کیا گیا ہے،
باہتمام مسعود علی ندوی
در مطبع معارف اعظم گڑھ طبع شد

فہرست مقالاتِ شبلیؒ جلد دوم

دیباچہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"مقالاتِ شبلی" کی دوسری جلد جسمین مولٰسنا مرحوم کے دس ادبی مضامین شامل ہین پیش ہے، اس مین سے صرف دو مضمون "سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر" اور "املا اور صحتِ الفاظ" علی گڈھ کالج منتھلی میگزین بابت ۱۸۹۵ء سے لئے گئے ہین، اور "اردو ہندی" معارف مین چھپا تھا، بقیہ کل مضامین الندوہ سے لیے گئے ہین، فن بلاغت والے مضمون کا کچھ حصہ موازنہ انیس و دبیر مین داخل ہے، مگر کسی قدر تغیر کے بعد،

"شعر العرب" پر مولانا پوری کتاب لکھنا چاہتے تھے، مگر دو نمبرون سے زیادہ نہ لکھ سکے،

دوسری جلدین بھی بتدریج شائع ہونگی،

سید سلیمان ندوی

۱۳ اگست ۱۹۳۱ء

عربی زبان

دنیا میں یون تو سیکڑون ہزارون زبانین مروّج اور مستعمل ہین، لیکن سب کی اصل الاصول صرف تین زبانین ہین، ایک سامی جو سام بن نوح کی طرف منسوب ہے، اس زبان سے جو زبانین پیدا ہوئین وہ عربی، عبرانی، سریانی، کلدانی، نبطی وغیرہ ہین، ان زبانون مین بعض اوصاف ایسے پائے جاتے ہین جو انھین کے ساتھ مخصوص ہین ان مین سے ایک یہ ہے کہ ان مین بعض حرف ایسے ہین جنکا تلفظ اور کوئی قوم نہین کر سکتی، مثلاً ح، ع، ق، ص، ض، ط، ظ، دوسرے یہ کہ ان زبانون مین مذکر اور موئنث کے لئے ضمیرین اور افعال جدا جدا ہین، تیسرے یہ کہ ان زبانون مین اسم، فعل، حرف، ہر ایک کے ساتھ ضمیر لاحق ہو سکتی ہے، اس امر مین اختلاف ہے کہ ان سامی زبانون مین نسبتہً قدیم کون زبان ہی، قدما کا عام خیال یہ تھا کہ عبرانی سب سے زیادہ قدیم ہے، یورپ کے اکثر متاخرین، سریانی کو قدیم تر بتاتے ہین، لیکن حق یہ ہے کہ یہ شرف عربی زبان کو حاصل ہے، اس کے دلائل حسب ذیل ہین،

عربی، سریانی اور عبرانی مین سب سے قدیم کون زبان ہے

۱- عبرانی اور سریانی زبان مین جس قدر الفاظ کے مادے ہین، عربی مین سب موجود ہین، بخلاف اس کے عربی زبان مین بہت سے مادے ہین جو عبرانی اور سریانی زبانون مین نہین، اس سے ثابت ہوتا ہی کہ عربی زبان اصل تھی، اس لئے تمام مادے اس مین موجود تھے، عبرانی اور سریانی زبانین چونکہ زمانۂ مابعد کی

زبانین تھین اس لئے بہت سے مادے متروک ہوگئے،

۲- عربی مین جس قدر افعال ہین سب قیاس کے موافق ہین، بہت کم الفاظ ہین جنمین خلاف قاعدگی اور شذوذ پایا جاتا ہی، بخلاف اس کے سریانی اور عبرانی مین جس قدر الفاظ قیاس کے موافق ہین، اس سے زیادہ اسی کے مخالف ہین، اور یہ ظاہر ہی کہ جو زبانین جسقدر زیادہ قدیم ہوتی ہین، اسی قدر ان مین اصول اور قاعدہ کی پابندی پائی جاتی ہی،

۳- عبرانی اور سریانی زبانون مین بہت سے ایسے الفاظ ہین، جنکی اصل معلوم نہین اور یہ پتہ نہین لگتا کہ یہ کن الفاظ سے مشتق ہین، لیکن عربی زبان مین ان الفاظ کی اصلین اور مشتق منہ موجود ہین،

۴- عبرانی اور سریانی مین اکثر الفاظ کے اجزا اصلیہ جاتے رہے ہین، لیکن عربی زبان مین موجود ہین، مثلاً انت اور انتم کا نون، الف لام تعریف کا لام، جمع متکلم مضارع کا نون،

۵- عربی مین جن الفاظ مین ضاد کا حرف تھا، عبرانی اور سریانی مین ص اور ع سے بدل دیا ہی مثلاً، ارض، ضان، قبض کو عبرانی مین ارص، صان، قبص کہتے ہین، اور سریانی مین انھین الفاظ کو ارع، عان، قبع کہتے ہین،

یہ الفاظ اگر اصل مین عبرانی ہوتے، تو عربی مین ضاد اور سریانی مین ع سے بدلنے کی کچھ ضرورت نہ تھی، کیونکہ ان دونون زبانون مین خود ص کا حرف موجود ہی اسی طرح اگر یہ الفاظ اصل مین سریانی ہوتے تو عربی مین ض اور عبرانی مین ص سے بدلنے کی کوئی ضرورت نہ تھی، کیونکہ عین کا حرف دونون زبانون مین پہلے سے موجود ہے،

اس سے ثابت ہوا کہ یہ الفاظ در اصل عربی ہین، اور چونکہ ض عربی کے سوا اور کسی زبان مین موجود نہین، اس لئے عبرانی نے اس کو ص سے بدل دیا اور سریانی نے ع سے بدلا

جن عربی الفاظ مین ذ ہے، وہ عبرانی مین ز سے اور سریانی مین د سے بدل دیئے گئے، مثلاً
ذکر، عذر، ذراع کو عبرانی مین زکر، عزر، زروع کہتے ہین اور سریانی مین دکر، عدر، دراع
اسی طرح جن الفاظ عربی مین ث ہے، وہ عبرانی مین ش سے اور سریانی مین ت سے
بدل جاتے ہین، مثلاً ثلج، ثعلب، ثقل، ثور، میراث، وثب، اثنان، ثلاثہ، کہ یہ سب الفاظ عبری
مین ش سے اور سریانی مین د سے لکھے جاتے ہین،

دلائل مذکورۂ بالا کے سوا ایک بڑی دلیل عربی زبان کے قدیم ہونے کی یہ ہو کہ عبری
زبان کی سب سے قدیم تصنیف سفر ایوب تسلیم کیجاتی ہو، اس کتاب مین نہایت کثرت سے
عربی الفاظ بھرے ہوئے ہین، اس سے ثابت ہوتا ہو کہ عربی زبان عبرانی سے پہلے موجود تھی،
یہان ایک شبہہ پیدا ہوتا ہو، وہ یہ کہ عبری اور سریانی زبان مین نہایت قدیم زمانہ
سے تصنیفات پائی جاتی ہین، بخلاف اس کے عربی زبان کی قدیم سے قدیم تصنیف کا اسلام
کے زمانہ سے کچھ ہی پہلے پتہ چلتا ہو،

لیکن اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہو، کہ تصنیفات کی حیثیت سے عربی زبان عبری
اور سریانی سے متاخر ہو، اور یہ سچ ہے کیونکہ عرب مین علوم و فنون کا رواج بہت پیچھے ہوا،
لیکن اس سے یہ نہین ثابت ہوتا کہ عربی زبان سرے سے موجود ہی نہ تھی، کسی زبان کا
وجود اور اس زبان مین تصنیفات کا وجود، دو مختلف امر ہین، اور دونون مین کوئی لزوم
نہین،

فنّ بلاغت

مسلمانون نے جو علوم و فنون خود ایجاد کئے اور جنمین وہ کسی کے مرہونِ منت نہین ان مین ایک یہ فن بھی ہے، عام خیال یہ ہے، اور خود ہمکو بھی ایک مدت تک یہ گمان تھا کہ یہ فن بھی مسلمانون نے یونانیون سے لیا، ابن اثیر نے مثل السائر مین ایک جگہ لکھا ہے کہ "یونانیون نے فن بلاغت پر جو کچھ لکھا ہے، اگرچہ اس کا ترجمہ عربی مین ہو چکا ہے لیکن مین اس سے واقف نہین، اور اس لئے اس فن مین مین نے جو نکتے اضافہ کئے ہین ان مین سے کسی کا مین مقلد نہین بلکہ خود مجتہد ہون"

ابن اثیر نے گو اپنے آپکو یونان کی خوشہ چینی کے الزام سے بچایا ہے لیکن نحواً عبارت سے اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ اصل فن یونان ہی سے آیا تھا لیکن اب اس خیال کی غلطی علانیہ ثابت ہو گئی، اصل یہ ہے کہ ارسطو نے ایک کتاب ریطوریقا کے نام سے لکھی تھی، جس کو اس نے منطق کا ایک حصہ قرار دیا تھا، ریطوریقا وہی لفظ ہے جس کو انگریزی مین رٹارک کہتے ہین، اردو مین اس لفظ کا ترجمہ خطابت یا فن تقریر ہو سکتا ہے، یہی کتاب ہے جسکی نسبت لوگون کو دھوکا ہوا کہ مسلمانون کا فن بلاغت اسی سے ماخوذ ہے، اس کتاب کو شیخ بوعلی سینا نے اپنی کتاب منطقیات شفا مین پورا پورا لے لیا ہے، یعنی اس کے مطالب اپنے الفاظ مین ادا کر دیئے ہین، ابن رشد نے اس کتاب کے اصل ترجمہ کی جو اصلاح کی تھی اس کا بڑا حصہ بیروت مین چھپ گیا ہے، یہ ذخیرے ہمارے سامنے

ہین، اور ان سے ثابت ہوتا ہی کہ مسلمانون کا فن بلاغت ارسطو کی کتاب سے چھو بھی نہین گیا ہی؛

ارسطو کی کتاب کا موضوع یہ ہی کہ جب کوئی تقریر کسی موقع پر کیجائے تو امور ذیل قابل لحاظ ہون گے،

(۱) مضمون تقریر کیا ہی،

(۲) تقریر کے مخاطب کون لوگ ہین،

(۳) تقریر کرنے والا کون ہی،

ان مختلف حثیتون کے لحاظ سے تقریر کے مقدمات کس قسم کے ہونے چاہئین، چنانچہ ارسطو نے اس کتاب مین بتایا ہی کہ واعظ، وکیل، حکیم، فریق مقدمہ وغیرہ وغیرہ کی تقریر کے اصول کیا ہین؟ اور ہر ایک کے طریقۂ استدلال کو کس طرح ایک دوسرے سے مختلف ہونا چاہیے، اگرچہ اس مین شبہہ نہین کہ ارسطو کی یہ کتاب نہایت دقیق اور لطیف مباحث پر مشتمل ہی، اور اگرچہ اسکا بھی سخت افسوس ہی کہ مسلمانون نے اس کتاب سے کچھ فائدہ نہین اٹھایا، لیکن بہرحال مسلمانون کا فن بلاغت ایک جداگانہ چیز ہے اور اس کے وہ خود موجد ہین۔

فن بلاغت پر جہان تک ہمکو معلوم ہی سب سے پہلی جو کتاب لکھی گئی ہے، وہ دلائل الاعجاز عبدالقاہر جرجانی ہے، اس سے پہلے کی تصنیفین بھی ہم نے دیکھی ہین لیکن درحقیقت انکو اس فن کی تصنیف نہین کہہ سکتے، دلائل الاعجاز کے بعد اور بہت سی کتابین لکھی گئین یہان تک کہ مطول اور مختصر معانی پر گویا خاتمہ ہوا،

آجکل یہ فن جس طریقہ سے پڑھا اور پڑھایا جا رہا ہی، اس سے زیادہ کسی فن کی

سمجھ نہیں ہوئی، طلبا اور علما ان لفظوں اور عبارتوں کو جو مختصر معانی وغیرہ میں مذکور ہیں بار بار دہراتے ہیں، لیکن خود نہیں جانتے کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، یہ ایک عام قاعدہ ہے کہ جب انسان کسی فن کے مسائل کو سمجھ لیتا ہے، اور اس پر حاوی ہو جاتا ہے، تو جہاں کہیں ان مسائل کا موقع آتا ہے، انسان ان کو استعمال کر سکتا ہے اور کرتا ہے، مثلاً اگر تم نے عربی فن نحو میں مہارت حاصل کر لی ہے، تو جب کوئی عربی عبارت تمھارے سامنے آجائیگی، تم اس کو بے تکلف پڑھتے چلے جاؤ گے لیکن فن بلاغت کی درس و تدریس کی یہ حالت ہے کہ مختصر معانی اور مطول سو سو بار دہرا چکے ہیں، لیکن اگر قرآن مجید کی کوئی عبارت یا عربی کا کوئی شعر دیدیا جائے تو ہرگز نہ بتا سکیں گے، کہ اس میں کیا کیا بلاغت کے اصول پائے جاتے ہیں،

اس کی وجہ یہ ہے کہ ان درسی کتابوں میں مسائل بلاغت کو اس طرح صاف اور سلجھا کر نہیں لکھا ہے کہ طالب علم کے ذہن میں اصل مسئلہ کی تصویر اتر جائے، مسئلہ ابھی پورا بیان بھی نہیں ہوا ہے، کہ اس کے ساتھ لفظی جھگڑے شروع ہو جاتے ہیں، اور طالب علم کا ذہن ان بیہودہ بحثوں میں پریشان ہو جاتا ہے،

ایک بہت بڑی وجہ یہ ہے کہ مسائل کے لئے کثرت سے مثالیں نہیں پیش کیجاتیں عبدالقاہر جرجانی نے جو مثالیں لکھدی تھیں، وہی آج تک چلی آتی ہیں بلکہ انمیں سے بھی بہت سی چھوٹ گئیں،

مسائل بلاغت کے ذہن نشین کرنے کا سب سے بہتر طریقہ یہ ہے کہ اپنی زبان میں اس کی مثالیں سمجھائی جائیں، لیکن ہمارے علمار عربی مثالوں میں اس قدر محدود ہیں، کہ کسی اور زبان سے ان مسائل کی مثالیں پیش ہی نہیں کر سکتے،

ان وجوہ کی بنا پر ہم نے ارادہ کیا ہے، کہ وقتاً فوقتاً فن بلاغت کے مہمات مسائل

اس رسالہ مین اس طرح ادا کئے جائین کہ مسلہ کی تصویر دل مین اتر جائے اور اس غرض کیلئے
تمام مثالین اردو کے کلام سے دیجائین چنانچہ اس پرچہ مین ہم **فصاحت** کے مسلہ پر بحث کرتے
ہین، جو بلاغت کا پہلا زینہ ہی،

فصاحت کی تعریف علمائے ادب نے یہ کی ہی کہ لفظ متنافر الحروف نہ ہو، نامانوس نہ ہو،
قواعد صرفی کے خلاف نہ ہو، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ لفظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے
اور چونکہ آوازین بعض شیرین، دلآویز، اور لطیف ہوتی ہین، مثلاً طوطی و بلبل کی آواز، اور بعض
مکروہ و ناگوار مثلاً کوے اور گدھے کی آواز، اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہین، بعض شستہ بیک
شیرین اور بعض ثقیل بھدے ناگوار، پہلی قسم کے الفاظ کو **فصیح** کہتے ہین، اور دوسرے کو غیر فصیح،
بعض الفاظ ایسے ہوتے ہین کہ فی نفسہ ثقیل اور مکروہ نہین ہوتے لیکن تحریر و تقریر مین ان کا
استعمال نہین ہوا ہی، یا بہت کم ہوا ہے، اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کئے جاتے
ہین، تو کانون کو ناگوار معلوم ہوتے ہین، ان کو فن بلاغت کی اصطلاح مین **غریب** کہتے
ہین، اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت مین مخل انداز خیال کئے جاتے ہین، لیکن یہ نکتہ یہان
لحاظ کے قابل ہی کہ بعض موقعون پر غریب لفظ کی غرابت اس وجہ سے کم ہو جاتی ہی کہ
اس کے ساتھ کے الفاظ بھی اسی قسم کے ہوتے ہین، مثلاً ایک شاعر کہتا ہی :- ع

ذریت رسول کی خاطر جلائی نار

نار کا لفظ اس موقع پر نہایت نامانوس اور بیگانہ ہے، لیکن یہی لفظ جب فارسی ترکیبون
کے ساتھ اردو مین مستعمل ہوتا ہی مثلاً نار دوزخ، نار جہنم، تو وہ غرابت نہین رہتی،

فصاحت کے مدارج مین اختلاف ہی یعنی بعض الفاظ فصیح ہین بعض فصیح تر بعض
اس سے بھی بڑھکر فصیح، مثال کے طور پر ہم دو چار مثالین نقل کرتے ہین، جن سے فصاحت

اور فصاحت کے اختلافِ مراتب کا اندازہ ہوسکے گا، (ان مثالون مین ایک ہی مضمون مختلف الفاظ مین ادا کیا گیا ہی)

ع کس نے نہ دی انگوٹھی رکوع و سجود مین ع سائل کو کس نے دی ہی انگوٹھی نماز مین

ع آنکھون مین پھرے اور نہ مردم کو خبر ہو ع آنکھون مین یون پھیرے کہ مژہ کو خبر نہ ہو

ع رویا ہین بھی حسین کو ردیا ہی کہتے ہین ع حسرت ہی کہ خواب مین بھی رو دیا کیجئے

ع جیسے مکان سے زلزلہ مین چیا مکان ع جیسے کوئی بھونچال مین گھر چھوڑ کے بھاگے

معانی و الفاظ کی مناسبت حسن کلام کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائین، الفاظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام مین جیسے پر رعب، سخت، نرم، شیرین، لطیف، اسی طرح الفاظ بھی صورت اور وزن کے لحاظ سے مختلف طرح کے ہوتے ہین بعض نرم، شیرین اور لطیف ہوتے ہین بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہی، بعض سے درد اور غمگینی، ظاہر ہوتی ہی، اسی بنا پر غزل مین سادہ، شیرین سہل اور لطیف الفاظ استعمال کیے جاتے ہین، قصیدے مین پر زور شاندار الفاظ کا استعمال پسندیدہ سمجھا جاتا ہی، اسیطرح رزم و بزم، مدح و ذم، فخر و ادعا، وعظ و پند ہر ایک کے لئے جدا جدا الفاظ ہین، شعرا مین سے جو اس نکتہ سے آشنا ہین وہ ان مراتب کا لحاظ رکھتے ہین، اور یہ ان کے کلام کی تاثیر کا بڑا راز ہی لیکن جو اس فرق مراتب سے واقف نہین یا ہین، لیکن ایک خاص رنگ ان پر اس قدر چڑھ گیا ہی کہ ہر قسم کے مضامین مین ایک ہی قسم کے لفظ ان کی زبان سے ادا ہوتے ہین، انکا کلام بجز ایک خاص رنگ کے بالکل ا‍ثر ہوتا ہی، یہی نکتہ ہے کہ سعدی سے رزم اور فردوسی سے بزم نہین نبھ سکتی، فردوسی نے جہان حضرت یوسف کی نالہ وزاری کو اپنی کتاب یوسف زلیخا مین لکھا ہی، لکھتا ہے،

ع بعزیز یوسف دگر بارہ زار،

رزم، بزم، فخر، حسرت، شوق، ہر ایک مضمون کے لئے خاص خاص قسم کے الفاظ موزون ہین، اور ان مضامین کے لیے انھین الفاظ کو استعمال کرنا چاہیے، مثلاً ایک شاعر نے جلال اور غیظ کو ان الفاظ مین ادا کیا ہے:

تم تھا نہ ہمہمہ اسد کردگار سے — نکلا ڈکارتا ہوا ضیغم کچھار سے

کیا جانے کس نے ٹوک دیا ہے دلیر کو — سب وحشت کو نچا ہے یہ غصہ ہی شیر کو

تھا یہ بپھرا ہوا عباس مرا شیر جوان — سینہ حربہ پہ رکھے دیتا تھا نیزہ کی سنان

لرزہ تھا رعب حق سے ہر اک نابکار کو — روکے تھا ایک شیر جری دھزار کو،

ان اشعار مین جو الفاظ آئے ہین، جس طرح ان کے معنی غیظ و غضب کے ہین اسیطرح ان الفاظ کی آواز اور لہجہ سے بھی ہیبت اور غیظ و غضب کا اظہار ہوتا ہے،

کلام کی فصاحت، یہ بحث مفرد الفاظ سے متعلق تھی لیکن کلام کی فصاحت مین صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہین، بلکہ یہ بھی ضرور ہے، کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب مین آئے انکی ساخت ہیئت نشست اسکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو، ورنہ فصاحت قائم نہ رہیگی، قرآن مجید مین ہے ما کذب الفؤاد ما رای، فواد اور قلب ہم معنی الفاظ ہین، اور دونون فصیح ہین، لیکن اگر اس آیت مین فواد کے بجاے قلب کا لفظ آئے تو خود یہی لفظ غیر فصیح ہو جائیگا، جس کی وجہ یہ ہے کہ گو قلب کا لفظ بجاے خود فصیح ہے لیکن ماقبل اور مابعد کے جو الفاظ ہین، ان کی آواز کا تناسب، قلب کے لفظ کے ساتھ نہین ہے،

میر انیس کا مصرع ہے ع فرمایا آدمی ہے کہ صحرا کا جانور، صحرا اور جنگل ہم معنی ہین اور دونون فصیح ہین، انیس نے مختلف موقعون پر ان دونون لفظون کا استعمال کیا ہے، اور ہم معنی

ہونے کی حیثیت سے کیا ہی، لیکن اگر اس مصرع مین صحرا کے بجاے جنگل کا لفظ آجائے تو یہی لفظ غیر فصیح ہوجائیگا ذیل کے شعر مین

طائر ہوا مین مست ہرن سبزہ زار مین　　جنگل کے شیر گونج رہے تھے کچھار مین

اگر جنگل کے بجاے صحرا لاؤ تو مصرع کا مصرع پھس پھسا ہوجاتا ہی،

شبنم اور اوس ہم معنی ہین اور برابر درجہ کے فصیح ہین لیکن اس شعر مین

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا　　تھا موتیون سے دامن صحرا بھرا ہوا

اگر اوس کے بجائے شبنم کا لفظ لایا جائے تو فصاحت خاک مین ملجائیگی، یہی اوس کا لفظ جو اس موقع پر اس قدر فصیح ہی، اس مصرع مین ع شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے شبنم کے بجائے لایا جائے، تو فصاحت بالکل ہوا ہوجائیگی،

اس مین نکتہ یہ ہے کہ ہر لفظ چونکہ ایک قسم کا سُر ہے، اس لئے یہ ضرور ہی کہ جن الفاظ کے سلسلہ مین وہ ترکیب دیا جائے ان آوازون سے اس کو خاص تناسب بھی ہو ورنہ گویا دو مختلف سرون کو ترکیب دینا ہوگا، نغمہ اور راگ مفرد آوازون یا سرون کا نام ہی، ہر سر بجاے خود دلکش اور دلآویز ہے، لیکن اگر دو مخالف سرون کو باہم ترکیب دیدیا جائے، تو دونون مکروہ ہوجائین گے، راگ کے دلکش اور موثر ہونے کا یہی گر ہے، کہ جن سرون سے اس کی ترکیب ہو ان مین نہایت تناسب اور توازن ہو،

الفاظ بھی چونکہ ایک قسم کی صوت اور سر ہین، اس لئے ان کی لطافت، شیرینی اور روانی، اسی وقت تک قایم رہتی ہی، جب گرد و پیش کے الفاظ بھی ایسے ہین ان کے مناسب ہون، دبیر کا مشہور مصرع ہے، ع "زیر قدم والدہ فردوس برین ہے" اس مین جتنے الفاظ ہین، یعنی، زیر، قدم، والدہ، فردوس، برین، سب بجاے خود فصیح ہین، لیکن ان کے باہم ترکیب

دینے سے جو مصرع پیدا ہوا ہی، وہ اس قدر بھدا اور گران ہی کہ زبان اس کا تحمل نہین کرسکتی، شاید تم کو خیال ہو کہ مصرعہ کی ترکیب چونکہ فارسی ہوگئی ہی، اس لئے ثقل پیدا ہوگیا ہی، لیکن یہ صحیح نہین، سیکڑون شعرون مین اس قسم کی فارسی ترکیبین ہین، لیکن یہ ثقل نہین پایا جاتا، مثلاً میرانیس کہتے ہین ؎

مین ہون سزاِ شباب چمن خلد برین — مین ہون خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکین

پہلے مصرع مین فارسی ترکیب کے علاوہ توالیِ اضافات بھی موجود ہے، لیکن یہ بھدا پن اور ثقل نہین ہے،

جب کسی مصرعہ یا شعر کے تمام الفاظ مین ایک خاص قسم کا تناسب، توازن، اور توافق پایا جاتا ہی، اور اس کے ساتھ وہ تمام الفاظ بجائے خود بھی فصیح ہوتے ہین، تو وہ پورا مصرعہ یا شعر فصیح کہا جاتا ہے، یہی چیز ہے جس کو بندش کی صفائی، نشست کی خوبی، ترکیب کی دلآویزی، برجستگی، سلاست، اور روانی سے تعبیر کرتے ہین، یہی چیز ہے، جس کی نسبت خواجہ حافظ فرماتے ہین؎

آن را کہ خوانی استاد اگر بنگری بتحقیق — صنعت گرست اما شعرِ روان ندارد

الفاظ کے توازن و تناسب سے کلام مین جو فرق پیدا ہوجاتا ہے، وہ ایک خاص مثال مین آسانی سے سمجھ مین آسکتا ہی، میرانیس، حضرت علی اکبرؑ کی اذان دینے کی تعریف ایک موقع پر اس طرح کرتے ہین، ع "تھا بلبلِ حق گو کہ چہکتا تھا چمن مین"

اسی مضمون کو دوسرے موقع پر اس طرح ادا کرتے ہین، ع

بلبل چہک رہا ہی ریاضِ رسول مین

وہی مضمون ہے، وہی الفاظ ہین، لیکن ترکیب کی ساخت نے دونون مصرعون مین کسقدر فرق پیدا کر دیا ہی،

(ایتلاف الوزن مع المعنی) ترکیب الفاظ کے لحاظ سے شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ کلام کے اجزا کی جو اصلی ترتیب ہے وہ بحال خود قائم رہے، مثلاً فاعل، مفعول، مبتدا، خبر، متعلقات فعل جس ترتیب کے ساتھ ہر وقت بول چال مین آتے ہین، یہی ترتیب شعر مین باقی رہے، اگرچہ اسمین شبہہ نہین کہ اس ترتیب کا بعینہٖ قائم رہنا قریب قریب ناممکن ہے، صرف ایک آدھ شعر یا بہت سے بہت شعر دو شعر مین اتفاقیہ یہ بات پیدا ہو جاتی ہے، مثلاً سعدیؒ کے یہ اشعار ؎

بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری — کہ از بوے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم — ولیکن مدتے با گُل نشستم
جمالِ ہمنشین در من اثر کرد — وگرنہ من ہمان خاکم کہ ہستم

لیکن چونکہ نظم کا درحقیقت، سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ اگر اس کو نثر کرنا چاہین تو نہ ہو سکے اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے، جب شعر مین الفاظ کی وہی ترتیب باقی رہے جو نثر مین معمولاً ہوا کرتی ہے، اس بنا پر شاعر کو کوشش کرنی چاہئے کہ اگر اصلی ترتیب پوری پوری قائم نہین رہ سکتی، تو بہرحال اس کے قریب پہونچ جائے، جس قدر اس کا لحاظ رکھا جائیگا، اسی قدر شعر زیادہ صاف، برجستہ، روان، اور ڈھلا ہوا ہوگا، مثلاً یہ اشعار

کچھ تو ہوتے بھی ہین وحشت مین جنون کے آثار — اور کچھ لوگ بھی دیوانہ بنا دیتے ہین
دل نہین مانتا جہان جاؤن — ہاے مین کیا کرون کہان جاؤن

(الندوہ ج ۱۰ ن ۵، رمضان ۱۳۳۲ھ)

نظم القرآن و جمہرۃ البلاغۃ

"عام قیاس یہ ہے کہ صاحب کمال، کسی حالت میں گمنام نہیں رہ سکتا، تجربہ اور تاریخ بھی اسی کی شہادت دیتے آئے ہیں، لیکن کوئی کلیہ مستثنیٰ سے خالی نہیں، مولوی حمید الدین جنکی ایک عجیب و غریب تصنیف کا اس وقت ہم ذکر کرنا چاہتے ہیں، اس استثنا کی ایک عمدہ مثال ہیں، مولوی صاحب موصوف نے پہلے قدیم طریقہ کے موافق تعلیم پائی یعنی درس نظامیہ کے مطابق فارغ التحصیل ہوئے، پھر مولانا فیض الحسن صاحب شارح حماسہ سے، جو میرے بھی استاد ہیں، ادب کی تکمیل کی، اس کے بعد انگریزی شروع کی اور مدرستہ العلوم میں رہکر، بی اے، کی سند حاصل کی، زمان طالب العلمی ہی میں سر سید مرحوم کے حکم سے انھوں نے سیرت نبوی کے متعلق دو کتابیں عربی سے فارسی میں ترجمہ کیں جو مدرستہ العلوم کے نصاب دینیات میں شامل ہیں، اور چھپکر شائع ہو چکی ہیں، مدرسہ سے نکل کر، کراچی کے مدرستہ الاسلام میں عربی کے پروفیسر مقرر ہوئے اور اب تک اسی عہدہ پر ہیں، ان کا فارسی دیوان چھپکر شایع ہو چکا ہے، لارڈ کرزن، جب سواحل عرب کی مہم پر گئے تھے، تو یہ بھی ساتھ تھے، اور سرداران عرب کے سامنے عربی زبان میں لارڈ کرزن کی طرف سے جو تقریر پڑھی گئی، وہ انھیں کی لکھی ہوئی تھی، اس قسم کے واقعات میں سے ایک واقعہ بھی انسان کی شہرت کے لئے کافی ہو سکتا ہے، لیکن

مولوی صاحب اب بھی گمنام ہین، ان کی یہی خواہش ہو، اور اگر وہ اس خواہش

مین ہمیشہ کامیاب رہین تو ہمارا کوئی ہرج نہین،

لیکن اُن کی جس تصنیف پر ہم ریویو کرنا چاہتے ہین، اس کے متعلق ہم ان کی خواہش

کی پیروی نہین کرسکتے، یہ تصنیف (خصوصًا اس زمانہ مین) اسلامی جماعت کے لئے اسقدر

مفید اور ضروری ہو جس قدر ایک تشنہ لب اور سوختہ جان کے لئے آب زلال، اس لئے

ہم اس کتاب پر مفصل ریویو لکھنا چاہتے ہین، افسوس ہو کہ مصنف نے یہ کتاب عربی زبان

مین لکھی ہو، اور اس لئے عام لوگ اس سے متمتع نہین ہوسکتے، ہم نے اُن سے بارہا

کہا کہ اس زمانہ مین جو کچھ لکھنا چاہئے، ملکی زبان مین لکھنا چاہئے، لیکن انکی قدامت پرستی

اردو کی طرف ان کو مائل نہین ہونے دیتی، (اور سچ یہ ہو کہ وہ اردو لکھ بھی نہین سکتے)

عربی ہونے کی وجہ سے ہم ان کی عبارت کے اصلی اقتباسات نہین دے سکتے بلکہ اُسکے

مطالب پر اکتفا کرین گے"

نظم قرآن یہ امر صاف نظر آتا ہو کہ قرآن مجید کی اکثر آیات مین کوئی خاص ترتیب

نہین ہو، ایک آیت مین کسی فقہی حکم کا بیان ہو، اس کے بعد ہی کوئی اخلاقی بات شروع ہوجاتی

ہے، پھر کوئی قصہ چھڑ جاتا ہو، ساتھ ہی کافرون سے خطاب شروع ہوجاتا ہو، پھر کوئی اور بات

نکل آتی ہو، غرض یہ کہ عام تصنیفات کا جو طرز ہے، کہ ایک قسم کے مطالب یکجا بیان

کئے جائین، قرآن پاک کا یہ طرز نہین،

اس کے متعلق قدما کی مختلف رائین ہین، شاہ ولی اللہ صاحب نے لکھا ہو کہ چونکہ

قرآن مجید مین عرب کے خطبات کا انداز ملحوظ ہو، اور اُن کے خطبے، اسی طرح کے ہوتے

تھے، یعنی مختلف مضامین بلا ترتیب بیان کرتے تھے، اس لئے قرآن پاک مین بھی یہی

طرز ملحوظ رکھا ہی، اکثر علما کی یہ رائے ہے، کہ قرآن مجید کی آیتین، مختلف وقتون مین مختلف ضرورتون کے پیش آنے پر نازل ہوتی رہین، اس لئے اُن مین کوئی ترتیب کیونکر قایم ہوسکتی ہی، مثلاً کسی شخص کی مختلف تقریرون کو جو اس نے مختلف وقتون مین کین اگر یکجا قلمبند کردیا جائے، تو ان مین ترتیب کیونکر پیدا ہوسکتی ہے؟ یہ رائے بظاہر بالکل صحیح معلوم ہوتی ہے، کیونکہ یہ مسلم ہے کہ قرآن مجید نجاً نجاً یعنی جستہ جستہ نازل ہوا ہی اور ہر سورۃ اور ہر ٹکڑے کا شانِ نزول مختلف ہی، اس لیئے ان مین ترتیب کیونکر قایم رہ سکتی ہی؟ بعض علما نے یہ دعویٰ کیا ہی، کہ قرآن مجید کی تمام آیتون مین ابتدا سے لیکر انتہا تک، ترتیب اور تناسب ہی، بقاعی نے اس کے ثبوت مین مستقل تفسیر لکھی ہی، جسکا نام نظم الدرر فی تناسب الآیات والسور رکھا ہی، لیکن اس کے مطالب جو تفسیرون مین نقل کئے ہین، ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہی کہ زبردستی تناسب پیدا کیا ہے، اور اس قسم کا تناسب دنیا کی نہایت مختلف بلکہ متناقض چیزون مین بھی پیدا ہوسکتا ہی،

مولوی حمید الدین صاحب نے اسی مسئلہ پر یہ کتاب لکھی ہی، وہ اسی اخیر رائے کے مدعی ہین، یعنی یہ کہ ایک سورہ مین جسقدر آیتین ہین، ان مین ضرور کوئی قدر مشترک ہے، اور اس لحاظ سے وہ سب آیتین باہم متناسب ہین،

ان کا دعویٰ ہی کہ جس طرح ہر کتاب کا کوئی خاص موضوع (سبجکٹ) ہوتا ہی، اسیطرح ہر سورۃ کا ایک خاص موضوع ہی، اور تمام آیتین بالذات یا بواسطہ اسی موضوع سے متعلق ہوتی ہین، ان کا عام استدلال یہ ہے کہ اگر ایک سورۃ کی آیتون مین باہم اس قسم کا تناسب نہین ہے، تو اس کی کیا وجہ ہی کہ جب کوئی سورہ نازل ہونی شروع ہوتی تھی، اور مختلف وقتون مین مختلف آیتین نازل ہوتی تھین، تو آنحضرت صلعم حکم دیتے تھے کہ ان آیتون کو اس سورۃ

مین داخل کرتے جاؤ، پھر ایک حد تک پہونچ کر آپ فرماتے تھے کہ اب یہ سورہ ختم ہو گئی، اور اسکے
بعد دوسری آیت شروع ہوتی تھی، اگر یہ آیتین اس سورہ سے کوئی خاص مناسبت نہین رکھتی
تھین، تو ان آیتون کو انھین سورتون مین داخل کرنے کی کیا ضرورت تھی، بلکہ سورتون
کی تحدید اور تخصیص بھی بے کار تھی، اس سے بڑھکر یہ کہ روایات سے یہ ثابت ہو کہ بار ہا ایسا
ہوتا تھا کہ دو سورتین ساتھ ساتھ نازل ہو رہی ہین، اور جب کوئی آیت نازل ہوتی تھی
تو آپ فرماتے تھے کہ اس آیت کو فلان سورۃ مین داخل کرو، پھر دوسری آیت نازل
ہوتی تھی، تو فرماتے تھے کہ اس کو دوسری سورت مین شامل کرو، اگر اس آیت کو اُس
سورہ کے ساتھ کوئی خصوصیت نہین تھی تو جس آیت کو جس سورہ کے ساتھ چاہتے شامل کر دیتے
اس بنا پر مصنف نے تمام سورتون مین تناسب کا دعویٰ کیا ہو، اور نہایت دقتِ نظر سے
ہر جگہ اُسکو ثابت کیا ہو،

کتاب کا اصلی موضوع اسی قدر تھا، لیکن اس بحث کے ضمن مین، قرآن مجید کی فصاحت
و بلاغت کی بحث بھی آگئی، مصنف ان کتابون سے واقف تھا، جو قرآن مجید کی فصاحت
و بلاغت پر لکھی گئی ہین لیکن اس کو نظر آیا کہ یہ تمام کتابین ناتمام ہین، اور اس کی وجہ یہ ہے
کہ فصاحت و بلاغت کا جو فن مرتب کیا گیا تھا، وہ خود ناتمام تھا، اور تمام لوگون نے اسی
فن کے موافق قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت ثابت کی تھی،

اس بنا پر مصنف نے اصل فن پر توجہ کی، اور اسکو ایک نہایت وسیع پیمانہ پر نئے سرے
ترتیب دیا، اور فصاحت و بلاغت کے بہت سے جدید اصول قائم کئے، اس طرح ایک اور
مستقل کتاب تیار ہو گئی جسکا نام انھون نے جمہرۃ البلاغۃ رکھا، اس کتاب کی تمہید مصنف
نے اس طرح شروع کی ہے:۔

فنِّ بلاغت

علماے اسلام نے جب یہ ثابت کرنا چاہا کہ قرآن مجید بلاغت کے لحاظ سے معجز ہے، تو اس بات کی ضرورت پیش آئی کہ پہلے بلاغت کے اصول اور قواعد مرتب کر دیئے جائین، اس کا اصلی طریقہ یہ تھا کہ خود کلام عرب کا تتبع کیا جاتا، اور بلاغت کی جزئیات کا استقصا کر کے اسکے اصول اور ضوابط منضبط کئے جاتے لیکن جس زمانہ مین یہ کوشش کی گئی، اس وقت عجم کے علوم و فنون کا اثر مسلمانون پر غالب آگیا تھا، اس لئے مسلمانون نے جس طرح اور علوم و فنون یونان اور فارس سے اخذ کئے، اس فن کے مسائل بھی انھین کی تحقیقات کے موافق مرتب کئے عجم کے نزدیک بلاغت کے اصلی ارکان تشبیہ اور بدیع ہین، اس لئے علماے اسلام نے بھی انھین چیزون کو مہتم بالشان قرار دیا حالانکہ اہلِ عرب کے نزدیک بدیع ایک لغو چیز ہے اور تشبیہ چندان قابلِ اعتنا نہین،

علماے اسلام نے فنِ شعر اور بلاغت کی بنیاد ارسطو کی کتاب پر قائم کی، ارسطو اگر عرب مین پیدا ہوا ہوتا، اور کلام عرب کے تتبع اور استقرار کی بنا پر اس فن کی بنیاد قائم کرتا تو یقیناً اس مقصد مین کامیاب ہوتا لیکن وہ یونان مین پیدا ہوا اور پرورش پائی یونانیون ہی کا کلام اس کے پیشِ نظر رہا، اس لئے شاعری اور فنِ بلاغت کے جو اصول اس نے قائم کئے، یونانی شعراء کے کلام سے مستنبط کر کے قائم کئے، یونان مین شعر کا جو بہتر سے بہتر نمونہ سمجھا جاتا تھا وہ ہومر اور سوفکلیس کی شاعری تھی، ان دونون نے شاعری کی بنیاد مصنوعی قصون اور حکایتون پر رکھی تھی،

فنونِ لطیفہ کی تدوین کا عام قاعدہ یہ ہے کہ جس چیز کا حسن عام طور پر مسلم الثبوت

ہوتا ہے، اس پر نظر ڈالتے ہیں، اور اس کے اجزا کی تحلیل کرتے ہیں یعنی یہ کہ اسمیں کیا کیا باتیں پائی جاتی ہیں پھر انھیں چیزوں کو محاسن قرار دیکر کلیات قائم کر لیتے ہیں،

یونان میں ہومر اور سوفکلیس کا کلام، فصاحت و بلاغت میں بے نظیر تسلیم کیا جاتا تھا، ارسطو نے تحلیل کر کے دیکھا تو اُن کا کلام تمامتر حکایتیں اور افسانے تھے، اس نے یہ بھی دیکھا کہ یہ حکایتیں واقعی نہیں ہیں، بلکہ اکثر مصنوعی اور فرضی واقعات ہیں، اس سے اسکو خیال پیدا ہوا کہ کلام کی اصلی خوبی صرف یہ ہے، کہ کسی واقعہ کی تصویر کھینچی جائے، واقعہ فی نفسہ صحیح ہو یا نہ ہو، اس سے غرض نہیں، ارسطو نے یہ بھی دیکھا کہ دو چیزیں فی نفسہ بدصورت اور کریہ المنظر ہیں، انکی بھی اگر بعینہ تصویر کھینچ دی جائے تو طبیعت کو مزہ آتا ہے، اس سے اس نے یہ فیصلہ کیا کہ واقعہ صحیح ہو یا غلط، لیکن اگر اس طرح ادا کر دیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے، تو حسن کلام حاصل ہو جائے گا، اس خیال کی امور ذیل سے اور بھی تائید ہوتی ہے،

انسان میں محاکات کا مادہ تمام اور حیوانات سے زیادہ پایا جاتا ہے، بچہ وہی کام کرتا ہے جو اوروں کو کرتے دیکھتا ہے، اس بنا پر کسی واقعہ کی تصویر کھینچنا انسان کی اصلی فطرت کا اقتضا ہے،

علم فی نفسہ ایک مرغوب چیز ہے، اور کسی واقعہ کا بیان کرنا بھی ایک طرح کا علم ہے اس بنا پر واقعہ نگاری مرغوب عام ہے،

ان وجوہ کی بنا پر ارسطو نے محاسن کلام کی تمامتر بنیاد انھیں دو اصولوں پر رکھی اور ان کے خلاف جو باتیں نظر آئیں، انکو رد کر دیا، سوفاکلیس پر لوگوں نے اعتراض کیا تھا کہ تم نے لوگوں کے اخلاق و عادات کی جو تصویر کھینچی، وہ اصل کے مطابق نہیں

سوفاکلیس نے کہا کہ :-

"مین نے انکا ویسا حلیہ بیان کیا، جیسا ہونا چاہیے، نہ کہ جیسا انکا واقعی حلیہ ہی"

سوفاکلیس کا یہ جواب، اگرچہ غلط ہی لیکن ارسطو سکو اپنے اصول کے موافق پسند کرتا ہے

یونان مین شاعری سے جو کام لیا جاتا تھا وہ صرف مذاقیہ جلسون کا گرم کرنا ہوتا تھا، شعرا عمومًا مذاقیہ مصنوعی قصے نظم کرتے تھے یہان تک کہ شاعر سخن ساز اور دروغ باف کے لقب سے پکارا جاتا تھا، اس بنا پر ارسطو نے یہ اصول قائم کیا کہ شاعری کا اصلی مقصد لطف انگیزی ہی، اور اسی بنا پر اس کی رائے ہے کہ اگر راست گوئی سے یہ مقصد حاصل نہو تو شاعر کو، واقعہ کا گھٹانا بڑھا دینا جائز ہی،

علماے اسلام نے چونکہ بنیاد فن، ارسطو کے اصول پر قائم کی، اس لئے تمام مسائل مین وہی ارسطو کے خیالات کا اثر پایا جاتا ہی، ارسطو نے جھوٹے طلسم باندھنے کو کمال شاعری قرار دیا تھا، علماے اسلام نے بھی یہ اصول قرار دیا کہ احسن الشعر اکذبہ یعنی اچھا شعر وہ ہے، جس مین زیادہ جھوٹ ہو، ارسطو کے نزدیک بلاغت مصوری کا نام ہے، اس لئے علمائے اسلام کے نزدیک بھی بلاغت کی اصلی روح وروان، تشبیہ وتمثیل ہی کیونکہ تشبیہ بھی درحقیقت ایک قسم کی مصوری ہی چنانچہ عبدالقاہر جرجانی نے اسرار البلاغۃ مین لکھا ہی کہ بلاغت کے مہمات مسائل، تشبیہ ہی سے متفرع ہین،

ایک اور امر نے علماے اسلام کو خیال دلایا کہ بلاغت اور شاعری مین جھوٹ کو سچ پر ترجیح ہی، انھون نے دیکھا کہ استعارہ تشبیہ سے زیادہ لذیذ اور لطیف ہوتا ہی، مثلاً ان دونون فقرون مین "زید، شیر کے مشابہ ہی" "زید شیر ہے"

پہلا، تشبیہ اور دوسرا استعارہ ہے، اور یہی دوسرا فقرہ زیادہ پر زور اور بلیغ ہے،

اب ان دونون فقرون کو دیکھا تو نظر آیا کہ پہلا فقرہ، واقعیت کا پہلو رکھتا ہے، کیونکہ ایک شجاع شخص، دلیری اور بہادری مین شیر کا مشابہ کہا جاسکتا ہے، لیکن دوسرا فقرہ تمامتر مبالغہ اور جھوٹ ہے، اس بنا پر یہ رائے قائم ہوئی کہ بلاغت اور شاعری مین جو زور یا لطف پیدا ہوتا ہے، وہ مبالغہ اور جھوٹ سے پیدا ہوتا ہے، ان خیالات نے تمام لٹریچر کو مبالغہ اور کذب سے بھر دیا،

ارسطو کے دونون مذکورۂ بالا اصول غلط ہین، ارسطو کا یہ خیال کہ انسان مین محاکاتؔ[1] کا مادہ تمام جانورون سے زیادہ ہے، محض غلط ہے، اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ جانور اور انسان دونون مین محاکات کا مادہ ہے، تاہم یہ فرق ہوگا کہ انسان صرف انسانون کی محاکات کرتا ہے بخلاف اس کے بندر، تمام حیوانات اور انسانون کی محاکات کرتا ہے، آدمی کا بچہ جانورون کو بھی بولتے دیکھتا ہے، لیکن انکی بولی کی مطلق نقل نہین کرتا، بخلاف اس کے ہزار داستان یا مینا، ہر جانور کی بولی بولنے لگتی ہے، آدمی کا بچہ، جو اپنے مان باپ، بھائی کے اقوال و افعال کی نقل کرتا ہے، وہ اس بنا پر نہین کہ اس کی فطرت مین محاکات کی قوت ہے بلکہ اسکی وجہ یہ ہے کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے، تو اسمین تمام خصائل انسانی بالقوہ موجود ہوتے ہین، یہ خصائل نمونہ اور مثال کے دیکھنے سے ابھرتے اور ظہور کرتے ہین، بچہ پیدا ہوتے کے ساتھ دودھ پینا شروع کرتا ہے، اس نے پہلے کسی کو دودھ پیتے نہین دیکھا تھا، لیکن چونکہ خدا نے اسکی فطرت مین یہ قوت ودیعت رکھی ہے، اس لئے وقت معین پر خود بخود اسکا ظہور ہوتا ہے، اسی طرح انسان کو جو قوتین عطا ہوئی ہین، وقتاً فوقتاً خود انکا ظہور ہوتا ہے،

[1] محاکات کا لفظ ارسطو کی تحریر مین بار بار آیا ہے، اسلئے اس کے معنی اچھی طرح ذہن نشین کر لینے چاہئین محاکات کے معنی کسی چیز کی نقل اتارنا یا صورت کھینچنا ہے،

نمونہ اور مثال سے اس قوت کو صرف تحریک ہوتی ہو، نہ یہ کہ یہ افعال محاکات کی فطرت کی وجہ سے وجود مین آتے ہین،

ارسطو کا یہ خیال بھی غلط ہو کہ بلاغت کا مدار کذب سخن سازی، اور مبالغہ پر ہے، چنانچہ اس کی حقیقت آگے چل کر واضح ہوگی،

ارسطو کے خیالات کے رد کرنے کے بعد مصنف نے خود اس مسئلہ پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہو، کہ نطق اور بلاغت کس چیز کا نام ہے؟ اور اس کے کیا اصول و شرائط ہین، انکی تقریر کا خلاصہ حسب ذیل ہے،

انسان فطرۃً ناطق پیدا کیا گیا ہو، انسان اور دیگر تمام جانورون مین، جو چیز اصلی مایہ الامتیاز ہے، اور جس کو منطق کی اصطلاح مین فصل کہتے ہین، یہی نطق ہو، لیکن نطق سے آواز یا لہجہ یا راگ مقصود نہین، یہ چیزین بلبل اور طوطی مین بھی پائی جاتی ہین، اور انسان سے بڑھکر پائی جاتی ہین، بلکہ نطق سے یہ مراد ہے کہ دل مین جو خیالات آئین ان کا اظہار کر سکے،

عقل کا کام، سوچنا اور غور و فکر کرنا ہے، غور و فکر سے جو خیال پیدا ہوتا ہے، عقل جب اس کو ظاہر کرنا چاہتی ہے تو نطق ہی کے ذریعہ سے کر سکتی ہے، اسی لئے نطق عقل کا آلہ ہے،

ارسطو کی پہلی غلطی یہ ہے کہ وہ انسان کی اصلی فضیلت اور اس کا اصلی خاصہ محاکات قرار دیتا ہو، حالانکہ یہ خاصہ محاکات نہین، بلکہ نطق ہو، محاکات بھی نطق ہی کا ایک نتیجہ ہو، انسان مین قوتِ نطق نہ ہوتی تو محاکات بھی نہ ہوتی،

نطق کا کمال دو چیزون پر منحصر ہے، خیالات اور مطالب صحت اور خوبی سے ادا کئے جائین، جو مطالب ادا کئے جائین، خود بھی عمدہ اور صحیح ہون،

ارسطو اور پیروانِ ارسطو کے نزدیک یہ دوسری شرط ضروری نہین، ان کے نزدیک نطق کا کام صرف یہ ہے کہ وہ مضمون کو بعینہٖ ادا کرے، مضمون فی نفسہٖ برا ہو یا بھلا اس سے غرض نہین، ابو جعفر قدامہ نقد الشعر مین لکھتا ہو کہ

"اگر کسی شعر مین کوئی بیہودہ اور لغو مطلب ادا کیا گیا ہو، تو اس سے شعر کی خوبی پر کوئی اثر نہین پڑتا"

شعر کی خوبی کے لئے اسی قدر کافی ہو کہ جو مضمون ادا کیا گیا، کس خوبی اور لطافت سے ادا کیا گیا،

لیکن یہ خیال تمامتر غلط ہو، اور چونکہ یہ ایک اہم بحث ہو، اس لئے اس کو ہم کسی قدر تفصیل سے بیان کرتے ہین، یہ مسلّم ہے کہ نطق صرف آواز اور صوت کا نام نہین ہے بلکہ دو چیزون کے مجموعہ کا نام ہے، آواز اور معنی اور جب تک ان دونون مین حسن نہ پایا جائے، نطق کا کمال نہین ہو سکتا، خوش چشم آدمی اگر ایک آنکھ کا کانڑا ہو تو حسین نہین کہا جا سکتا،

حسنِ کلام کی بھی یہی حالت ہو، اکثر ایسا ہوتا ہو کہ ایک عمدہ اور پر اثر مضمون نحو وصرف کی معمولی پابندیون مین مقید رہکر ادا نہین ہو سکتا، اس حالت مین الفاظ مضمون کا حجاب بنجاتے ہین، اور اس وجہ سے مضمون، اس حجاب کو چاک کر کے دل مین اتر جاتا ہو، اسکی یہ مثال ہو کہ کوئی بادشاہ ضرورت کے وقت آدابِ سلطنت چھوڑ کر خود سفیر بنکر جائے اور اپنا پیغام خود پہونچا آئے، اس بیان سے ثابت ہوا کہ حسنِ کلام، الفاظ کا پابند نہین اور یہ کہ بلیغ دراصل مضمون ہوتا ہو، نہ الفاظ، لغت مین بلیغ کے معنی "پہونچنے والے" کے ہین اور جو چیز دل مین پہونچتی ہو، وہ دراصل معانی ہین نہ الفاظ،

اس تمہید کے بعد، اس بات پر لحاظ کرو کہ جب کوئی مضمون فی نفسہ بیہودہ اور لغو ہوتا ہی تو گو کیسے ہی فصیح اور شستہ الفاظ مین ادا کیا جائے، دل مین جگہ نہین کرتا، بلکہ اچٹ جاتا ہی، ممکن ہو کہ اس قسم کے مضمون سے کسی احمق اور بدمذاق کو مزا آئے، لیکن کلام کی حسن و خوبی کا فیصلہ احمقون کے مذاق کے رو سے نہین ہو سکتا، غرض ان اسباب سے کلام مین جب تک مضمون اور معنی کی خوبی نہ ہو، دل مین نہین اتر سکتا، اور اس بنا پر اسکو بلیغ بھی نہین کہہ سکتے، یہی وجہ ہے کہ شعرائے عرب، کلام کی تعریف حسن مضمون کے لحاظ سے کرتے ہین،

زہیر بن ابی سلمی کہتا ہی

وذی نعمۃ تممتہا و شکرتہا	وخصیم یکاد الحق یغلب باطلہ
دفعت بمعروف من القول صائب	اذا ما اضل الناطقین مفاصلہ
وذی خطل فی القول یحسب انہ	مصیب فما یلمم بہ فہو قائلہ
عبأت لہ حلماً و اکرمت غیرہ	واعرضت عنہ وہو باد مقاتلہ

قرآن مجید مین جہان بلیغ کا لفظ آیا ہی، اسی معنی مین آیا ہی، مثلاً قل لہم فی انفسہم قولاً بلیغا، یعنی اے محمدؐ! ان لوگون سے ایسی بات کہہ جو بلیغ ہو، یعنی ان کے دل مین اتر جائے، اسی طرح اس آیت مین بھی وللہ الحجۃ البالغۃ یہی معنی مراد ہین، حاصل یہ کہ جو مضمون جس قدر زیادہ دلنشین اور دلپذیر ہوگا اسی قدر زیادہ بلیغ ہوگا،

ایک اور واضح مثال سے یہ نکتہ ذہن نشین ہو سکتا ہی، فرض کرو ایک شخص کسی آدمی کو گالیان دے رہا ہے، اور گالیون مین ہر قسم کی سخن آرائی، لفاظی، جدت پسندی، استعارہ بندی صرف کرتا ہی، الفاظ بھی نہایت شستہ با محاورہ اور فصیح ہین، تو کیا تم

اس شخص کو فصیح و بلیغ کہو گے!!

اس تمام تقریر سے امورِ ذیل ثابت ہوئے، کلام کی خوبی، صرف محاکات کا نام نہیں، کلام کی غرض و غایت صرف، سامعین کو محظوظ کرنا نہیں بلکہ عقل کی سفارت اور پیغام بری ہے، کلام سے جو لذت حاصل ہوتی ہے، وہ اس لئے نہیں کہ کلام ایک قسم کی محاکات ہے' اور محاکات، انسان کی فطرت میں داخل ہے، بلکہ اس وجہ سے ہے، کہ نطق ایک قوت ہے اور ہر قوت کے استعمال میں انسان کو خواہ مخواہ مزہ آتا ہے، انسان کا اصلی خاصہ محاکات نہیں بلکہ نطق ہے، کلام کی خوبی سچائی پر موقوف ہے،

ان مقدمات سے معلوم ہوگا کہ بلاغت جس چیز کا نام ہے، وہ عقل کی دست و بازو انسانیت کا عنصر راستی کی مترجم اور فخر کا تاج ہے، وہ اس رتبہ کی چیز ہے، کہ ایک پیغمبر اولوالعزم کا معجزہ قرار پائے، اسی کا اثر تھا، کہ قرآن مجید کے اعجاز نے اعجازِ موسوی کو بے حقیقت کر دیا، عصائے موسوی کا معجزہ، یہودیوں یا قبطیوں کو غلامی کی حد سے آگے نہ بڑھا سکا، لیکن اعجازِ قرآنی نے لوگوں کو حضیضِ خاک سے اٹھا کر آسمان تک پہونچا دیا،

لیکن اگر بلاغت کی وہ حقیقت ہو جو ارسطو نے بیان کی، تو نعوذ باللہ، وہ کسی پیغمبر کا معجزہ کیا قرار پاسکتی ہے!!

بلاغت کی ماہیت اور حقیقت بیان کرنے کے بعد، اب ہم اس کے اصول اور آئین مرتب کرنا چاہتے ہیں، لیکن چونکہ بلاغت کا بہت بڑا مظہر، شاعری اور خطیبہ پردازی ہے، اس لئے پہلے ہم ان دونوں کی حقیقت سے بحث کرتے ہیں،

شاعری اور خطابت اگرچہ بلاغت کی حیثیت سے برابر کے شریک ہیں، تاہم ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے، شاعری کی حقیقت خود شاعری کے لفظ سے اچھی طرح سمجھ

ہین ہوسکتی ہی، اہل عرب چونکہ شاعری کی حقیقت کو خوب سمجھتے تھے، اس لئے انھون نے اسکا نام
بھی ایسا رکھا جو خود شعر کی حقیقت پر دلالت کرتا ہی، شاعر کے لفظی معنی، صاحب شعور کے
ہین، شعور، احساس (فیلنگ) کو کہتے ہین، یعنی شاعر وہ شخص ہی جسکا احساس قوی ہو، انسان
پر خاص خاص حالتین طاری ہوتی ہین، مثلاً، رونا، ہنسنا، انگڑائی لینا، یہ حالتین، جب انسان
پر غالب ہوتی ہین تو اس سے خاص خاص حرکات صادر ہوتے ہین، مثلاً رونے کی حالت
مین آنسو جاری ہوتے ہین، ہنسنے کے وقت ایک خاص آواز پیدا ہوتی ہی، انگڑائی کی
حالت مین، اعضا تن جاتے ہین، اسی طرح شعر بھی ایک خاص احساس کا نام ہی، شاعر کی
طبیعت پر رنج یا خوشی یا غصہ یا استعجاب کے طاری ہوتے ہی ایک خاص اثر پڑتا ہی، یہ اثر
الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہی، اسی کا نام شاعری ہی، شاعر کا احساس اورون کے
احساس سے قوی ہوتا ہی، لیکن اس کے یہ معنی نہین کہ اسکو اورون کی بہ نسبت، زیادہ رنج
یا زیادہ خوشی ہوتی ہی، بلکہ اس کے یہ معنی ہین کہ احساس کے وقت اس کی تمام قوتین جوش
مین آجاتی ہین، احساس اس کی قوت متخیلہ کو، نطق کو، آواز کو، لہجہ کو، سب کو یکبارگی مشتعل
کر دیتا ہی، شاعر گویا نو دمیدہ سبزہ ہی، کہ جب اسپر پانی پڑتا ہی تو رگ رگ مین سرایت کر جاتا ہی
اور وہ لہلہانے لگتا ہی،

خطیب (لکچرار) کا احساس بھی شاعر کے احساس سے کم نہین ہوتا لیکن خطیب اس
احساس سے مغلوب نہین ہوتا، اس کی غرض، دوسرون پر اثر ڈالنا ہوتا ہی، وہ اپنے احساس
کو قابو مین رکھ سکتا ہی، اور اس سے اسی حد تک اور اسی ترتیب اور مناسبت سے کام لیتا ہی
جہان تک اورون کے متاثر کرنے مین کام آئے، شاعر کو صرف موجودہ حالت سے کام ہوتا ہی
لیکن خطیب یہ بھی دیکھتا ہی کہ آیندہ کیا ہوگا، اس بنا پر خطیب، شاعر کی بہ نسبت، زیادہ عاقل،

زیادہ ذکی الحس، زیادہ عالی منزلت ہوتا ہی، اور اسی بنا پر اہل عرب، شعر کو جادوگری، اور خطبہ کو حکمت کہتے ہین،

عام لوگون کا خیال ہی، کہ شاعری کا اصلی عنصر تشبیہات اور استعارات ہین چنانچہ وہ حضرت عیسیٰ کے مواعظ کو اس بنا پر ایک قسم کی شاعری سمجھتے ہین، کہ وہ تشبیہات سے مملو ہین لیکن یہ خیال بالکل غلط ہی، شاعر کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت سریع الانفعال اور موسیقی الطبع ہوتا ہی، جب اس پر کوئی خاص اثر طاری ہوتا ہی، تو نغمہ، وزن، رقص کی قوتین جو اسمین فطری ہوتی ہین، دفعۃً تحریک مین آجاتی ہین،

حضرت داؤد پر جب خدا کے احسانات کا اثر غالب آتا تھا تو بے ساختہ وہ وجد مین آکر رقص کرنے لگتے تھے، انکا کلام جس قدر ہی، سرتاپا شعر ہے، جو انکے پرجوش دل سے بے ساختہ نکلتا تھا، اسی بنا پر اُن کے اشعار کو مزامیر کہتے ہین، بخلاف ان کے حضرت عیسیٰ پر شاعرانہ احساس غالب نہ تھا، اس لئے ان کے کلام مین شاعری کے بجائے حکمت اور فلسفہ ہوتا تھا۔

ارسطو نے اس بحث مین بھی سخت غلطی کی ہی، وہ کہتا ہی کہ شاعری کے جذبہ کے وقت انسان جو گانے یا ناچنے لگتا ہی، اس کی وجہ یہ ہے کہ نغمہ اور رقص، ایک قسم کی محاکات ہی یعنی انسان کے دل مین جو جذبات پیدا ہوتے ہین، آواز اور حرکات کے ذریعہ سے وہ انکی تصویر کھینچتا ہے چنانچہ رقّاص جو کچھ گاتے ہین، حرکاتِ رقص کے ذریعہ سے اسکو بتاتے بھی جاتے ہین،

لیکن یہ خیال غلط ہی، اصل حقیقت یہ ہے کہ جذباتِ انسانی مثلاً رنج، خوشی، خوف، تعجب، شوق، نفرت، یہ چیزین، انسان کے دل مین ایک نہایت پرزور حرکت پیدا کردیتی ہین، یہی حرکت آواز یا راگ یا رقص، یا تڑپ بنجاتی ہی، مثلاً انسان کو جب ہنسی آتی ہے تو دل مین ایک قسم کی حرکت پیدا ہوتی ہی، یہی حرکت ہنسی بنجاتی ہے، اور چونکہ یہ مادّات

حرکاتِ نفسانی کے مشابہ ہوتے ہین، اس لئے وہ حرکاتِ نفسانی پر اسی طرح دلالت کرتے ہین، جس طرح، الفاظ معانی پر دلالت کرتے ہین،

غرض جس طرح نطق، ایک فطری چیز ہی، اسی طرح یہ اشارات و حرکات بھی فطری ہین، جو بے اختیار سرزد ہوتے ہین، وہ محاکات کی غرض سے نہین کئے جاتے گو یہ ممکن ہی کہ محاکات کا مقصد، اس سے حاصل ہو جائے،

اس موقع پر پہونچکر ایک اور عام غلطی کا رفع کر دینا بھی ضرور ہی، اکثر لوگ، شعر اور نثر بلیغ کو ایک سمجھتے ہین، چنانچہ قدما مین ارسطو، اور متاخرین مین جان مل کا یہی مذہب ہی، ارسطو کا خیال ہے، کہ محاکات کے مختلف طریقے ہین، اور خود کلام، جو محاکات کا ایک خاص طریقہ ہی، اس مین محاکات کے تین ذریعہ پائے جاتے ہین، وزن، الفاظ، نغمہ یہ چیزین تنہا اور کبھی مل کر، واردات قلبی کی تصویر کھینچتی ہین، یہی محاکات شعر ہے، یہ محاکات کبھی صرف الفاظ کے ذریعہ سے ہوتی ہے، جس طرح سقراط کا مکالمہ، اور کبھی الفاظ اور نظم دونون کے ذریعہ سے، وزن شعر کے لئے کوئی ضروری چیز نہین، لیکن عام لوگون نے اس کو شاعری کا ضروری جز قرار دیدیا ہے،

ارسطو کا خیال اس حد تک صحیح ہے کہ وزن پر شعر کا مدار نہین، لیکن اس کے یہ معنی نہین کہ وزن شعر کے اجزا مین داخل نہین، وزن شعر کا جزء ہے لیکن چونکہ کل کے لئے محض ایک جز کافی نہین ہوتا، اس لئے تنہا وزن سے شعر نہین بن سکتا لیکن ارسطو کی یہ غلطی ہے کہ وہ سقراط کے مکالمہ اور ہومر کے کلام، دونون کو شعر قرار دیتا ہی،

جان مل کی رائے اس حد تک صحیح ہے کہ شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہے، اور یہ کہ شاعر دوسرون کو نہین بلکہ صرف اپنے آپ کو مخاطب کرتا ہی، اس تشریح سے جان مل

نے شاعر کو خطیب سے الگ کر دیا، اور اس بنا پر وہ سقراط کے مکالمہ کو شاعری نہین کہتا، لیکن جان مل نے بھی یہ غلطی کی کہ وہ وزن کو شعر کا کوئی ضروری جز نہین قرار دیتا،

اب دوبارہ غور کرو کہ شعر کس چیز کا نام ہے، انسان پر جب کوئی جذبہ طاری ہوتا ہے تو کسی نہ کسی ذریعہ سے ظاہر ہونا چاہتا ہے، اور چونکہ انسان کی تمام قوتون مین سے نطق سب سے زیادہ قوی اور اسی کی مخصوص قوت ہے، اس لئے یہ جذبہ نطق ہی کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے، جس طرح کہ حیوانات کے جذبات مختلف قسم کی آوازون سے ظاہر ہوتے ہین، مثلاً شیر کا ہمہمہ، طاؤس کی جھنکار، کویل کی کوک وغیرہ وغیرہ بعض وقت یہ جذبہ موزون حرکات کی صورت مین ظاہر ہوتا ہے، مثلاً طاؤس اور کبوتر کا رقص، یا راگ سننے کے وقت سانپ کا لہرانا، قدرت نے جن اشخاص کو نطق اور نطق کے ساتھ نغمہ کی بھی قوت دی ہے اس سے جذبات کی حالت مین شعر ادا ہوتے ہین، اور ساتھ ہی وہ گنگنانے بھی لگتا ہے، اور جب جذبہ زیادہ قوی ہوتا ہے، تو رقص کے حرکات بھی سرزد ہونے لگتے ہین، اس بنا پر شعر وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعہ کا نام ہے، لیکن چونکہ یہ چیزین جذبات کے کمال شدت کے وقت پیدا ہوتی ہین، اس لئے ہر شعر مین ان چیزون کا پایا جانا ضروری نہین، تاہم کوئی شعر نغمہ اور راگ سے بالکل خالی نہین ہو سکتا، خود وزن جو شعر کا ایک ضروری جز ہے، راگ کی ایک قسم ہے، اور یہی وجہ ہے کہ اہل عرب ہمیشہ شعر کو گا کر پڑھتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ شعر پڑھنے کو اہل عرب انشاد کہتے ہین جسکے معنی گانے کے ہین، اب تم نے سمجھا ہوگا کہ شعر کو وزن سے، نغمہ سے، رقص سے کیا تعلق ہے، درحقیقت یہ سب ایک ہی مخرج سے نکلے ہین، البتہ وزن کو شعر سے بہ نسبت نغمہ اور رقص کے زیادہ قوی تعلق ہے، اور اسی وجہ سے ہمیشہ لوگ وزن اور شعر کو ایک چیز سمجھتے آئے ہین،

اس بحث کے بعد مصنف نے بلاغت کے اصول اور قواعد اور جزئیات بیان کئے ہین، اسکو ہم آیندہ پرچہ کیلئے اٹھا رکھتے ہین،

شعر العرب

رجحان طبع کی اور بات ہی، ورنہ یہ ظاہر ہے کہ اقتضاے حالات کے لحاظ سے مجھکو شعر العجم سے پہلے شعر العرب لکھنا چاہئے تھا، بلکہ سچ یہ ہی کہ قومی ضروریات کی فہرست مین شعر العجم کا نام سیکڑون نمبرون کے بعد آنے کی چیز ہے لیکن کیا کیا جائے؟ شعر العرب لکھتا تو سمجھنے والے کہان سے آتے؟ مدرسون مین فن ادب کا مذاق نہین، اور کالج والے عربی خود نہین پڑھتے بلکہ یہ لقمہ زبردستی ان کے منہ مین ڈالا جاتا ہی، جس کو امتحان کے بعد وہ اگل دیتے ہین،

یہ سب کچھ سہی لیکن یہ کانٹا مرتے دم تک دل سے نہین نکل سکتا، کہ عربی شاعری اس قدر وسیع پراثر اور قومی جذبات سے لبریز اور اس کے متعلق ہماری زبان مین ایک حرف بھی نہین زیادہ افسوس یہ کہ شعر العرب کے لئے کچھ بہت زیادہ کد و کاوش کی ضرورت نہین کسی قدیم تصنیف کو سامنے رکھ لیا جائے اور انھین عنوانون کو کچھ پھیلا کر، کچھ نئے مذاق کا رنگ چڑھا کر لکھ دیا جائے، تو اچھی خاصی تالیف ہو جائیگی اس قسم کی قدیم تصنیفون مین سب سے بہتر اور سب سے جامع ابن رشیق قیروانی کی کتاب العمدہ ہی، اسکا نسخہ ہندوستان مین موجود نہ تھا، مدت ہوئی مین نے یہ صرف کثیر مصر کے کتبخانہ سے لکھوا کر منگوایا تھا، لیکن وہ ایک دوست کی نذر ہوا، اور شاید ایشیا سے یورپ مین پہونچ گیا، اتفاق سے اب کی ڈاک مین جو مصری کتابین آئین ان مین کتاب العمدہ کا بھی ایک نسخہ تھا، یار گم گشتہ کے ملنے سے جو خوشی ہوئی، اس کا بیان نہین ہو سکتا، شعر العرب

کی یاد پھر تازہ ہو گئی، کتاب تو جب لکھی جائیگی، لکھی جائیگی، لیکن سردست اس کتاب کا ریویو لکھتا ہون جس سے شعر العرب کی داغ بیل پڑ جائیگی، اسی پر کبھی عمارت بھی بنجائیگی اور مین اس کام کو نہ کر سکون گا تو کوئی اور خدا کا بندہ پیدا ہو جائے گا ع

مردے از غیب برون آید و کارے بکند

ابن رشیق افریقیہ کا رہنے والا تھا، اس کا باپ ایک رومی غلام تھا، اور زرگری کا پیشہ کرتا تھا، باپ نے ابتدا مین خاندانی پیشہ سکھلایا، لیکن اس نے اسی کے ساتھ علوم ادبیہ کی بھی تحصیل کی، اور یہ مذاق غالب آیا کہ ۴۰۶ھ مین قیروان گیا جو افریقیہ کا دار العلم تھا، یہان اس نے ان علوم کی تکمیل کی، لیکن جب وحشی عربون نے اس شہر کو برباد کر دیا تو وہ سسلی چلا آیا اور مازر مین قیام کیا، ۴۶۳ھ مین وفات پائی،

ادب مین اس کی بہت سی تصنیفات ہین، لیکن سب کی سرتاج کتاب العمدہ ہے جو ہمارے مضمون کا عنوان ہی، علامہ ابن خلدون نے اس کتاب کی نسبت لکھا ہی کہ اس فن مین کوئی کتاب اس درجہ کی نہین لکھی گئی، اس کتاب کا موضوع اگرچہ عرب کی شاعری اور اس کے اصول اور آئین ہین لیکن چونکہ اس وقت تک زبان یا شاعری کی تاریخ اور اصول و آئین کا منضبط کرنا کوئی فن نہین قرار پایا تھا، اس لئے مصنف نے شاعری کے اصول پر کم اور صنائع و بدائع پر زیادہ لکھا ہی، تاہم جو کچھ لکھا ہی کسی قدر ترتیب بدل دینے سے مذاقِ حال کے سانچہ مین ڈھل سکتا ہی، اور ہم اس وقت ریویو مین یہی مقصد پیشِ نظر رکھتے ہین،

شاعری کی ابتدا عرب کا ملک ہزارون برس سے موجود ہی اس کا تمدن بھی کچھ نو عمر نہین تاہم تعجب ہی کہ شاعری کا پتہ اسلام سے سو ڈیڑھ سو برس آگے نہین چلتا، سبب

پہلا شاعر جس سے قصیدہ کی ابتدا ہوئی مہلہل بن ربیعہ ہے جو امرء القیس کا ماموں تھا، فرزدق کہتا ہے، ع دمہلہل الشعراء ذاک الاول،

امرء القیس آنحضرت صلعم سے تقریباً ۴۰ برس پہلے تھا، اس لئے مہلہل کا زمانہ بھی اس کے قریب قریب سمجھ لینا چاہئے، یہ بات عرب کی تاریخ کا طغرائے زرین ہے کہ وہاں شاعری کی ابتدا شریفانہ اور مردانہ جذبات سے ہوئی، ایران کی طرح مداحی اور خوشامدگوئی مین اس کی زبان نہین کھلی، عرب ہمیشہ سے جنگجو، بہادر، مہمان نواز، سیر چشم، غیور، اور بلند ہمت تھے، انھین باتون کو نظم مین ادا کرتے تھے، اور یہی ان کی شاعری تھی، کوئی قبیلہ کسی شاعر کی خانہ جنگیون مین کسی قسم کی مدد کرتا تھا تو شکریہ کے ساتھ اس کا ذکر کرتے تھے مثلاً امرء القیس نے بنو تیم کی مدح مین کہا،

اقرحشا امرء القیس بن حجر بنو تیم مصابیح الظلام

سب سے پہلا شخص جس نے بادشاہ کی مدح لکھی وہ زہیر بن ابی سلمیٰ تھا جس نے ہرم بن سنان کی مداحی کی تاہم اس نے یہ آن قایم رکھی کہ ہرم نے جب یہ حکم دیا کہ زہیر جس وقت دربار مین آئے، اور مجھ کو سلام کرے تو اس کو انعام دیا جائے، اس حکم کے بعد زہیر جب کبھی دربار مین جاتا تھا تو کہہ دیتا تھا کہ بادشاہ کے سوا اور سب کو سلام کرتا ہون،

زہیر کے بعد نابغہ ذبیانی نے سلاطین کی مداحی کی، اور اس وجہ سے تمام عرب اس کو ذلیل سمجھنے لگا اور اس کی قدر و منزلت جاتی رہی کتاب العمدہ مین ہے،

فسقطت منزلتہ وتکسب مالا جسیماً تو اس کی عزت جاتی رہی، اور اس نے مداحی سے بڑی دولت پیدا کی،

اہل عرب مداحی کو جس قدر ذلیل سمجھتے تھے اسکا اندازہ واقعات ذیل سے ہوگا،

لبید بن ربیعہ مشہور شاعر تھے جنکا ایک قصیدہ سبعہ معلقہ مین داخل ہے انکا معمول تھا کہ جب پورب کی ہوا چلتی تھی تو عام مہمانی کرتے تھے جسمین سیکڑون اونٹ ذبح کرتے تھے، بڑھاپے مین جب دولت کی طرف سے تنگی ہوئی تو یہ معمول قضا ہونے لگا، ولید بن عقبہ کو خبر ہوئی تو اس نے سو اونٹ بھیجدیئے کہ معمول مین فرق نہ آنے دیجئے، لبید نے اپنی لڑکی کو بلاکر کہا کہ بیٹا! اس شخص نے میرے ساتھ احسان کیا ہے لیکن اب مجھ سے شعر نہین کہے جاتے میری طرف سے تو شکریہ کے اشعار کہدے، اس نے یہ قطعہ لکھا:-

اذا هبّت رياح ابي عقيل	دعونا عند هبّتها الوليدا
اغر الوجه ابيض عبشميّا	اعان على مروّته لبيدا
ابا وهب جزاك الله خيرا	نحرناها واطعمنا الثريدا

اخیر شعر یہ تھا:-

فعد ان الكريم له معاد	وظني بابن اروى ان يعودا

دوبارہ بھی ایسی ہی فیاضی کر کیونکہ شریف بار بار فیاضی کرتے ہین، اور میرا گمان ہے کہ تو ایسا ہی کرے گا۔

چونکہ اس شعر مین اظہار حاجت تھا، لبید نے بیٹی سے کہا کہ اور شعر بہت اچھے ہین، لیکن اخیر شعر غیرت کے خلاف ہے،

عمر بن ابی ربیعہ قریش کا مشہور شاعر تھا، عبد الملک نے اس سے مدح کی فرمائش کی اس نے کہا کہ مین صرف عورتون کی مدح کیا کرتا ہون، (یعنی غزل لکھتا ہون)

ابن میّادہ نے خلیفہ منصور کی مدح مین قصیدہ لکھا اور قصد کیا کہ بغداد جا کر دربار مین سنائے، سوار ہو رہا تھا کہ اس کا نوکر حسب معمول اونٹنی کا دودھ لیکر آیا، ابن میادہ نے لیکر پیٹ پر ہاتھ پھیرا اور کہا کہ استغفر اللہ اس کے ہوتے مین امیر المومنین کی مدح لکھتا

ہوں اور بغداد جاتا ہوں۔

یزید ثقفی، حجاج کا ہموطن شاعر تھا حجاج نے اس کو فارس کا گورنر مقرر کیا جب وہ رخصت ہونے کے لیے آیا تو حجاج نے کہا کچھ شعر سناتے جاؤ، حجاج سمجھا تھا کہ اس کی مدح پڑھیگا، یزید نے برجستہ کہا:۔

وابی الذی سلب ابن کسریٰ رایۃ   بیضاء تخفق کالعقاب الطائر

میرا باپ وہ ہے جس نے نوشیروان کے بیٹے سے علم چھین لیا تھا جو عقاب کی طرح لہراتا جاتا تھا،

حجاج نے غضبناکی سے کہا کہ جب یزید باہر نکلے تو سند حکومت چھین لینا اور کہنا کہ تیرے باپ نے یہ چیز تجھکو وراثت میں دی تھی،

یزید نے کہا حجاج سے کہدینا کہ:۔

وورثت جدی مجدہ وفعالہ   وورثت جدک اعنزا بالطائف

میں نے اپنے باپ کا شرف اور کارنامے وراثت میں پائے، اور تیرے باپ نے وراثت میں بکریاں چھوڑیں۔

فرزدق بنی امیہ کے دربار کا شاعر تھا تاہم جب سلیمان بن عبدالملک نے اس سے شعر پڑھنے کی فرمایش کی تو بجاے اس کے کہ وہ سلیمان کی مدح میں کچھ پڑھتا اپنے خاندان کی مدح میں فخریہ اشعار پڑھے، سلیمان سخت برہم ہوا، اتفاق سے دربار کا ایک اور شاعر جسکا نام نصیب تھا موجود تھا اس نے برجستہ یہ اشعار پڑھے:۔

اقول لرکب قافلین لقیتھم   قفا ذات اوشال ومولاک قارب

قفوا اخبرونی عن سلیمان اننی   لمعروفہ من اھل ودان طالب

فعاجوا فاثنوا بالذی انت اھلہ   ولو سکتوا اثنت علیک الحقائب

سلیمان نے نصیب کو پانسو اشرفیاں دلوائیں اور کہا کہ فرزدق سے کہ دے کہ

کہ اپنے باپ کی آگ کے پاس جائے، فرزدق غصہ مین آکر یہ شعر پڑھتا ہوا دربار سے اٹھا،

وخیر الشعر اکرمہ رجالا   وشر الشعر ما قال العبید

اچھے شعر شرفا کہتے ہین،   اور سب سے برا شعر وہ ہے جو غلام موزون کرین،

غیر قومون کے میل جول اور شخصی حکومت کی بدا ثری سے عرب مین مداحی کا رواج ہوا، تاہم شروع شروع مین اتنی آن قائم رہی کہ خلفا، اور سلاطین اور امرا کے سوا اور کسی کی مدح نہین کرتے تھے اور نہ صلہ لیتے تھے، مروان ابن ابی حفصہ کہتا ہے:-

ولقد حبیت بالف الف لم تکن   الا لکف خلیفۃ و وزیر

مین نے لاکھون روپیے حاصل کئے   لیکن صرف خلیفہ یا وزیر سے،

ما زلت آنف ان اؤلف مدحۃ   الا لصاحب منبر او سریر

مین ہمیشہ اس بات کو عار سمجھتا رہا   کہ بجز صاحب تخت ومنبر کے اور کسی کی مدح کرون،

ذوق سخن مین یہ بحث زیادہ پھیل گئی اصل مضمون یہ تھا کہ عرب مین شاعری کی ابتدا کیونکر ہوئی اور کب ہوئی،

ابن رشیق نے شاعری کی ابتدا اور رفتہ رفتہ مختلف قبیلون مین پھیلنے کا ایک سلسلہ بیان کیا ہے جو مختصرا حسب ذیل ہے:-

قبیلہ ربیعہ،   اس قبیلہ کے مشہور شعرا یہ ہین مہلہل بن ربیعہ، مرقش اصغر و اکبر، طرفہ بن عبد، حارث بن حلزہ، متلمس، اعشی ان مین سے دو شاعر سبعہ معلقہ والے ہین،

بنو قیس،   اس قبیلہ مین نابغہ ذبیانی، نابغہ جعدی، زہیر بن ابی سلمیٰ کعب بن زہیر، لبید بن ربیعہ، حطیئہ، شماخ، مشہور شعرا

گذرے ہین ان مین بھی دو سبعہ معلقہ والے ہین،

تمیم

اس قبیلہ مین مدت تک شاعری قایم رہی اوس بن حجر اسی قبیلہ کا شاعر تھا،

ابتدا مین صرف قصیدے کہتے تھے رجز دو تین شعر سے زیادہ نہین ہوتے تھے جو معرکۂ جنگ یا مفاخرت وغیرہ کے موقع پر بے اختیار شاعر کی زبان سے نکل جاتے تھے، سب سے پہلے عجاج نے رجز کو وسعت دی، اور تمام وہ خیالات ادا کیے جو قصائد مین ادا کیے جاتے تھے، روبہ بن عجاج نے اسکو اور بھی ترقی دی یہ دونون بنی امیہ کے زمانے مین تھے، افسوس یہ کہ رجز انھین دونون پر ختم ہو گیا ورنہ اگر اس صنف کو ترقی ہوتی تو عرب مین بھی مثنوی کا رواج ہو جاتا جو شاعری کی سب سے بڑی شاخ ہے اور جس کی بدولت عجم نے اس میدان مین عرب سے علانیہ بازی جیتی، تاہم یہ صنف بالکل معدوم نہین ہوئی، ابن المعتز وغیرہ نے چھوٹی چھوٹی مثنویان لکھین، اور الفیہ ابن مالک وغیرہ بھی گویا اسی کے پرتوے ہین، گو وہ شعر نہین بلکہ نظم ہین،

زمانے کے اعتبار سے شعرائے عرب کے چار دور ہین،

جاہلی، یعنی اسلام سے قبل کے شعراء،

مخضرمی، یعنی جنھون نے دونون زمانے پائے، مثلاً لبید، حسان، نابغہ،

اسلامی، یعنی آنحضرت صلعم کے زمانے سے لیکر بنو امیہ تک،

محدث، یعنی دولت عباسیہ کے شعرا، اور ان کے مابعد،

ایران مین شاعر کے لئے مختلف علوم و فنون مین کامل ہونا ضرور تھا، چنانچہ تمام مشاہیر شعرا، نامور علما اور فضلا تھے، لیکن عرب مین اس کے برخلاف وہی شعرا فن شعر

کے امام اور پیشوا خیال کئے جاتے ہین جو جاہل مطلق تھے اور ایک حرف لکھ پڑھ نہین سکتے تھے، یہان تک کہ کسی اسلامی شاعر کی بے انتہا تعریف کرنا چاہتے ہین، تو کہتے ہین کہ اگر اس نے زمانۂ جاہلیت کا ایک دن بھی پایا ہوتا، تو سب سے بڑا شاعر ہوتا، اس کی وجہ یہی ہو کہ شاعری در اصل خالص فطری جذبات کے اظہار کا نام ہے، اور تمدن کے زمانے مین کوئی فطری حالت باقی نہین رہتی، بلکہ تصنع اور آورد کا اثر آجاتا ہو، اس کے علاوہ تمدن کے زمانے مین جذبات کا جوش و خروش نہین رہتا جو شاعری کی جان ہو، غور کرو ایک بہت بڑا متمدن شاعر فخریہ مین کہتا ہو اور یہ فخریہ شاعری کا بہترین نمونہ خیال کیا جاتا ہو،

اذا مضر الحمراء کانت ارومتی ۔۔۔ وقام بمجدی حازم وابن حازم

جب کہ قبیلہ مضر میرا مورث اعلیٰ ہو ۔۔۔ اور میری شرافت کے بانی حازم اور ابن حازم ہین،

عطست بانفی شامخا وتناولت ۔۔۔ یدای الثریا قاعدا غیر قائم

تو غرور سے ناک چڑھاتا ہون اور ۔۔۔ میرے ہاتھ بیٹھے بیٹھے ثریا کو چھو لیتے ہین،

لیکن ایک جاہلی شاعر یون فخر کرتا ہو:-

الا لا یجہلن احد علینا ۔۔۔ فنجہل فوق جہل الجاہلینا

ہان دیکھو! کوئی ہم سے جہالت نہ کرے ۔۔۔ ورنہ ہم جاہلون سے بڑھکر جاہل ہین،

اذا بلغ الفطام لنا صبی ۔۔۔ تخر لہ الجبابر ساجدینا

جب ہمارا کوئی بچہ دودھ چھوڑتا ہے ۔۔۔ تو بڑے بڑے جبار اسکے سامنے سجدہ مین گر پڑتے ہین

شاعری کا رتبہ اور شاعری کا اثر ایران بلکہ تمام ایشیا مین شاعری تفریح طبع کی چیز تھی، اس لئے انوری نے ایک قطعہ مین ثابت کیا ہو کہ انسانی جماعت مین شاعر کی اتنی بھی ضرورت نہین، جس قدر بھنگی اور خاکروب کی ہو، لیکن عرب مین شاعر ایک جنرل،

ایک فاتح، ایک سردار اعظم کا رتبہ رکھتا تھا، ایک شاعر صرف اپنے کلام کے اثر سے قبیلہ کے قبیلہ کو برباد اور گمنام کر دیتا تھا، عرب مین ایک نہایت معزز قبیلہ بنو نمیر تھا کسی مجمع مین اس قبیلہ کا کوئی آدمی بیٹھا ہوتا تھا اور کوئی اسکا نام و نسب پوچھتا تھا تو نمیر کا نام لیتے وقت اس کی آواز مین غرور کا لہجہ پیدا ہو جاتا تھا، جریر اس قبیلہ سے ناراض ہوا، رات کو ان کی ہجو لکھنے بیٹھا تو اپنے بیٹے سے کہا کہ ذرا چراغ مین تیل زیادہ ڈالدینا، آج دیر تک جاگونگا، یہ کہکر ہجو لکھنی شروع کی جب یہ شعر کہا:-

فغض الطرف انك من نمير   فلا كعبا بلغت ولا كلابا

تو زور سے اچھلا اور پکار اٹھا واللہ اخزیتہ لا یفلح ابداً (یعنی خدا کی قسم مین نے اس قبیلہ کو برباد کر دیا، اب یہ قیامت تک ابھر نہین سکتے، اسی وقت یہ شعر تمام عرب مین پھیل گیا اور یہ حالت ہوگئی کہ اس قبیلہ کا کوئی آدمی کہین جا نکلتا تھا، اور کوئی اسکا نام و نشان پوچھتا تھا تو قبیلہ کا نام بدل کر بتاتا تھا، یہان تک کہ رفتہ رفتہ اس قبیلہ کا نام ہی مٹ گیا،

اسی طرح وہ قبیلے جنکو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا، صرف ایک شاعر کی بدولت نامور ہو گئے، اور بڑے معزز قدیم قبیلون نے ان کو اپنا ہمسر مان لیا، یہی وجہ ہے کہ جب کسی گھرانے مین کوئی شاعر پیدا ہوتا تھا، تو تمام قبیلون کی طرف سے مبارکباد کے پیام آتے تھے، دعوتین ہوتی تھین، عورتین جمع ہوکر مبارکباد کے گیت گاتی تھین، قربانیان کیجاتی تھین، بخلاف اس کے ایران مین کوئی شخص شاعری مین در آتا تھا تو قوم سمجھتی تھی کہ گداگرون کی فہرست مین ایک نام کا اور اضافہ ہوا،

ایشیا مین شاعری نے کبھی کوئی ملکی یا قومی انقلاب نہین پیدا کیا، بلکہ یہ کہنا چاہئے

کہ شخصی حالتوں پر بھی اس کا کوئی نمایاں اثر نہیں ہوا، تم کہوگے کہ خواجہ حافظ کی شاعری نے تمام ایران کو رند بنا دیا، لیکن یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ خواجہ حافظ پر موجودہ سوسائٹی کا اثر تھا، یا خواجہ صاحب نے سوسائٹی کو متاثر کیا، یعنی خواجہ صاحب نے اس وقت کی موجود معاشرت کی تصویر کھینچی، یا انھوں نے وہ حالت اپنے کلام سے پیدا کر دی،

لیکن عرب میں شاعری ایک قوت تھی اور شاعر کا ایک شعر بھی کسی نمایاں نتیجہ سے خالی نہیں جا سکتا تھا، عمرو بن کلثوم کے ایک قصیدہ نے قبیلہ تغلب کو دو سو برس تک غیرت اور شجاعت کے نشہ میں چور رکھا، اس قبیلہ کے ایک ایک بچہ کو پورا قصیدہ یاد ہوتا تھا اور وہ مجامع عام میں پڑھتا تھا، امیر معاویہ لیلۃ الہریر کے دن حضرت علیؓ کے مقابلہ میں بھاگ نکلنے کے لئے بالکل تیار ہو چکے تھے، محض ان اشعار نے ان کو روک دیا :۔

وقولی کلما جشأت وجاشت　　مکانك تحمدی او تستریحی

لادفع عن مآثر صالحات　　واحمی بعد عن عرض صحیح

رسول اللہ صلعم کے مقابلہ کے لئے کفار جو بار بار مدینہ پر چڑھائیاں کرتے تھے ان میں متعدد لڑائیاں شعرا ہی نے برپا کرائی تھیں،

اسی بنا پر شعرا سلاطین اور روٴسا تک سے نہیں دبتے تھے، عرب کے مشہور بادشاہ عمرو بن ہند نے جب سلطنت کے نشہ میں آکر کہا کہ اب بھی کوئی عرب میں رہ گیا ہے جس کو میرے سامنے گردن جھکانے سے انکار ہو، تو درباریوں نے کہا کہ ہاں عمرو بن کلثوم شاعر، بادشاہ نے اس کو اور اس کی ماں کو بلا بھیجا، ماں شاہی محل میں گئی، تو بادشاہ کی ماں نے اس سے کسی چیز کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ ذرا اٹھا دینا، اس نے کہا اپنا کام خود کرنا چاہیئے، بادشاہ کی ماں نے دوبارہ کہا، اس پر غصہ میں آکر اس نے نعرہ مارا کہ

وإذلالہ یعنی ہاے ذلت، عمرو کلثوم نے باہر سے سنا، سمجھا کہ میری ماں کی توہین کی گئی،
اسی وقت تلوار میان سے کھینچ کر جھپٹا اور بادشاہ کا سر اڑا دیا، پھر بہت سخت رن پڑا،
دونوں طرف کے ہزاروں آدمی کٹ گئے، عمرو کلثوم نے یہ تمام واقعہ قصیدہ میں لکھا اور
سالانہ دنگل کے موقع پر عکاظ میں پڑھا،

الا لا یجھلن احد علینا	فنجھل فوق جھل الجاھلینا
ہان! ہم سے کوئی جہالت نہ کرے	ورنہ ہم جاہلوں سے بڑھکر جاہل ہیں
فانا نورد الرایات بیضا	ونصدرھن حمرا قد روینا
ہم اپنی برچھیاں میدان جنگ میں	سفید لیجاتے ہیں اور سرخ واپس لاتے ہیں

(۲)

مدح | مدح اگرچہ عرب کی اصلی شاعری میں داخل نہیں لیکن اسلام کے بعد تمدن کی وسعت
اور شخصی حکومتوں کے قایم ہونے کی وجہ سے شاعری کے چار ارکان میں سے مدح بھی
ایک رکن قرار پا گئی، اب چار ارکان یہ ہیں، مدح، ذم، عشقیہ، فخریہ، اس بنا پر اہل ادب نے
مدحیہ شاعری کے اصول اور ضابطے مقرر کئے جنکو ابن رشیق نے نہایت تفصیل اور توضیح
سے کتاب العمدہ میں لکھا ہے،

ایران میں مدحیہ بلکہ ہر قسم کی انواع سخن کے لئے مبالغہ اور غلو سب سے مقدم شرط تھی،
ممدوح کے وصف میں جسقدر زیادہ ناممکن باتیں جمع کیجائیں، اسی قدر شاعری کا کمال
خیال کیا جائیگا، مثلاً،

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پاے	تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

لیکن عرب نے اس کے لئے جو اصول قرار دیے حسب ذیل ہیں:-

(۱) الفاظ گزیدہ اور شستہ ہوں، سوقیانہ الفاظ اور محاورے نہ آنے پائیں،

(۲) زیادہ اشعار نہ ہوں چنانچہ بحتری سلاطین کی جب مدح لکھتا تھا تو بہت کم شعر لکھتا تھا، جریر مشہور شاعر کہا کرتا تھا، اذا مدحتم فلا تطیلوا،

ایک دفعہ فرزدق عبدالرحمٰن بن ام الحکیم کے پاس گیا، اور اسکی مدح پڑھنی چاہی، عبدالرحمٰن نے کہا مجھکو ایسی مدح سے معاف رکھو کہ اخیر اشعار تک پہونچتے پہونچتے پہلے مضامین بھول جائیں، صرف دو شعر پر اکتفا کرو تو میں تمکو اس قدر انعام دونگا کہ کسی نے تم کو نہ دیا ہوگا، فرزدق نے صرف دو شعر میں مدح ادا کی اور عبدالرحمٰن نے دس ہزار درہم عطا کئے،

(۳) مدح میں تفاوت مراتب کا لحاظ رکھا جائے یعنی بادشاہ وزیر دبیر افسر فوج حاکم عدالت ہر ایک کی مدح میں اس کے خاص اوصاف کا خیال رکھا جائے، مثلاً دبیر کی مدح میں اگر دلیری اور شجاعت کا وصف بیان کیا جائے، یا قاضی کو صاحب ہیبت و جلال کہا جائے تو ناموزون ہوگا،

لیکن ایرانی شاعری میں ایک قلی کی مدح میں بھی تمام شاہانہ اوصاف ثابت کر دیئے جاتے ہیں، علامہ ابن رشیق نے اس بحث میں لکھا ہو کہ جب ممدوح بادشاہ ہو تو شاعر کو خیال رکھنا چاہئے کہ ایسے اوصاف نہ بیان کرے جو عام رئیسوں میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً اخطل کے اس شعر

وقد جعل اللہ الخلافۃ منھم ۔۔۔ لا بیض لا عاری الخوان ولا جدب

یعنی خلافت خدا نے ایسے شخص کو دی ۔۔۔ جس کا دسترخوان تنگ نہیں،

پر لوگوں نے اعتراض کیا ہو کہ یہ وصف تو بادشاہ کے ایک ادنی نوکر میں بھی پایا جا سکتا

ہے، اسی طرح احوص کے اس شعر پر

وإذا تصل بالقول وبعضهم مذاق الحديث يقول ما لا يفعل

آپ جو کہتے ہیں کرتے ہیں اور اور لوگ صرف باتیں بناتے ہیں کچھ کرتے نہیں،

لوگوں نے یہ نکتہ چینی کی کہ یہ ایک معمولی بات ہے، بادشاہوں کی تعریف میں اغراق اور مبالغہ ہونا چاہئے، یعنی وہ اوصاف لکھنے چاہئیں جو عام انسانوں کے رتبہ سے بالاتر ہوں،

علامہ ابن رشیق پانچویں صدی ہجری میں تھے، جب کہ عرب کا مذاق عجم کے اختلاط سے بالکل بدل گیا تھا، ورنہ وہ جانتے کہ عرب کی شاعری کی یہی خوبی تھی کہ کسی موقع پر اصلیت اور واقعہ سے تجاوز نہیں ہو سکتا تھا، شعرائے عرب سلاطین کی مدح میں بھی وہی باتیں لکھتے تھے، جو واقعی ہوتی تھیں، یاد ہوگا کہ جب عرب کے ایک بادشاہ نے ایک شاعر سے کہا کہ میری مدح کرو تو اس نے کہا پہلے تم کچھ کرکے دکھاؤ تو میں کہوں،

(۴) ممدوح جب بادشاہ ہو تو اس کے اوصاف ذیل کا ذکر کرنا چاہئے، یعنی عقل عفت، عدل، شجاعت، چنانچہ شعرائے متقدمین انھیں اوصاف کا بیان کرتے تھے، لیکن متاخرین نے وسعت دیکر ان اوصاف کی شاخوں اور شاخ در شاخ اوصاف کو لیا اور اس میں وسعت پیدا کی، مثلاً وہ ممدوح کی نکتہ رسی، شرم و لحاظ، قوت تقریر، سیاست حلم وغیرہ کا بھی بیان کرتے ہیں، اور ان سب اوصاف کو عقل کے نتائج قرار دیتے ہیں،

(۵) زیادہ تر اصلی اور ذاتی اوصاف بیان کرنے چاہئیں، جو اوصاف عارضی ہیں، مثلاً حسن و دولتمندی جاہ و مال وغیرہ ان چیزوں کے ذکر کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ سب چیزیں چلتی چھاؤں ہیں، آج ہیں کل نہیں، بخلاف ذاتی اوصاف کے جو مرتے دم تک انسان کے ساتھ ہیں،

یہ قدامہ کی رائے ہے لیکن علامہ ابن رشیق کا خیال ہے کہ عارضی اوصاف کو سرے سے ترک نہیں کرنا چاہیے، البتہ ذاتی اوصاف کو مقدم رکھنا چاہیے،

اہل ادب میں یہ مسئلہ بحث طلب ہے کہ مدح میں سب سے بڑھکر کونسا شعر ہے، ہم اس موقع پر علامہ ابن رشیق کی کتاب سے مختلف اقوال نقل کرتے ہیں، جس سے عرب کے مذاق کا اندازہ ہوگا،

ایک دفعہ خلیفہ معتصم باللہ کے دربار میں شعرا کا مجمع ہوا معتصم باللہ نے کہا کہ تم میں کوئی شخص ایسے شعر کہہ سکتا ہے یہ کہکر منصور نمیری کے یہ اشعار پڑھے جو اس نے ہارون الرشید کی مدح میں لکھے تھے،

ان المکارم والمعروف اودیۃ   احلک اللہ منها حیث تجتمع

شریفانہ خصائل نہریں ہیں،   اور یہ نہریں جہاں جاکر ملگئی ہیں وہ تیری جگہ ہے

اذا رفعت امرأ فاللہ رافعه   ومن وضعت من الاقوام متضع

توجس شخص کو اونچا کرے خدا بھی اسکو اونچا کر دیتا ہے   اور تو جس کو گرادے وہ گرجاتا ہے،

ان اخلف الغیث لم تخلف انامله   او ضاق امر ذکرناه فیتسع

بادل رک جائیں تو اسکا دست کرم نہیں رکتا   جب کوئی مشکل آپڑتی ہے تو ہم حضور کا نام لیتے ہیں اور وہ حل ہو جاتی

محمد بن وہیب نے بڑھ کر کہا کہ ہم اس سے بڑھکر کہہ سکتے ہیں، پھر یہ شعر پڑھے:-

ثلاثۃ تشرق الدنیا ببهجتهم   شمس الضحی و ابو اسحق والقمر

تین چیزیں ہیں جنھوں نے دنیا کو روشن کر رکھا ہے   آفتاب، چاند اور معتصم باللہ

تحکی افاعیله فی کل نائبة   الغیث واللیث والصمصامۃ الذکر

بادل، شیر، اور تلوار   اسکے کارناموں کی نقل اتارتے ہیں

حطیہ ایک مشہور شاعر تھا، جب مرنے لگا تو کہا کہ انصار کو یہ پیغام پہونچا دینا کہ تمہارا بھائی سب سے بڑا مدح گو ہی جسکا یہ شعر ہی،

یغشون حتی ما تھر کلابھم　　لا یسألون عن السواد المقبل

عرب مین عموماً لوگ کتے پالتے تھے، یہ کتے اجنبی آدمی کو دیکھکر بھونکتے تھے، شاعر کہتا ہے کہ ممدوح کے پاس اس کثرت سے مہمان اور آیند و روند آتے جاتے رہتے ہین کہ اس کے کتے کسی کو دیکھکر بھونکتے نہین، کیونکہ تمام لوگون سے مانوس ہوگئے ہین، یہ ایک سچی مدح تھی لیکن ثعلب نے جب یہ حطیہ کا یہ قول سنا تو کہا کہ یہ غلط ہی سب سے عمدہ شعر مدح کا یہ ہی:-

فتی لو یباری الشمس القت قناعها　　او القمر الساری لالقی المقالدا

وہ اگر آفتاب و ماہتاب کا مقابلہ کرے تو آفتاب اپنے　　او پر نقاب ڈال لے اور چاند سپر ڈال دے

ثعلب اس زمانہ کا آدمی ہی جب عرب کا صحیح مذاق خراب ہوچکا تھا، اس لئے اس نے تکلف اور مبالغہ کو واقعیت پر ترجیح دی،

عرب مین مدحیہ شاعری کے جو عمدہ نمونے خیال کئے جاتے ہین، ان مین سے بعض ہم نقل کرتے ہین، ان سے اندازہ ہوگا کہ عرب کی شاعری کس قدر صحیح اور سچے خیالات کا آئینہ ہی،

اخی ثقة لا تھلک الخمر مالہ　　ولکنہ قد تھلک المال نائلہ

قابل اعتماد ہی شراب اسکی دولت کو ضایع نہین کرسکتی　　البتہ فیاضی اس کی دولت کو برباد کردیتی ہی

تراہ اذا ما جئتہ متھللاً　　کانک تعطیہ الذی انت سائلہ

اس کے پاس کچھ مانگنے جاؤ تو اسکا چہرہ　　ایسا شگفتہ ہوجائیگا کہ گویا تم ہی اسکو دیتے ہو

فمن مثل حصن في الحروب ومثله — لإنكار ضيم أو لخصم يجادله

لڑائی کے وقت یا دشمن کے مقابلہ میں یا عزت — کی پاسداری میں حصن کا ہمسر کہاں مل سکتا ہو

وفيهم مقامات حسان وجوهها — وأندية ينتابها القول والفعل

ان لوگوں کے کارنامے روشن ہیں — ان کی مجلسوں میں قول اور فعل ساتھ آتے ہیں

وإن جئتهم ألفيت حول بيوتهم — مجالس قد يشفى بأحلامها الجهل

ان سے ملنے جاؤ تو وہاں — ایسے لوگ نظر آئینگے جنکی دانشمندی جہالت کی دوا ہی

على مكثريهم حق من يعتريهم — وعند المقلين السماحة والبذل

انمیں جو دولتمند ہیں وہ مفلسوں کی حاجت روا کر دیتے ہیں — اور جو نادار ہیں وہ سائلوں سے خندہ پیشانی سے پیش آتے ہیں

سعى بعدهم قوم لكي يدركوهم — فلم يفعلوا ولم يلاموا ولم يألوا

اور دوسرے بھی چاہا کہ انکا رتبہ حاصل کریں — لیکن نہ کر سکے اور اس پر انکو الزام نہیں دیا جا سکتا

فما كان من خير أتوه فإنما — توارثه آباء آبائهم قبل

یہ جو کچھ کرتے ہیں ان کے باپ دادا — ان کو ورثے میں پہونچا ہے،

یہ اشعار زہیر کے ہیں جو اسلام سے پہلے زمانے کا شاعر ہی اور جو بالکل لکھا پڑھا نہ تھا، اس لئے اس کے خیالات نہایت سادہ اور بے تکلف ہیں لیکن جب اسلام کے بعد آورد اور تکلف آگیا، اسوقت بھی اصلیت اور واقعیت کا عنصر موجود تھا، متنبی، ابو تمام، بحتری نے اکثر جگہ بالکل عجمیوں کی طرح مبالغہ غلو اور دور از کار خیالات سے کام لیا ہی لیکن ان کے کلام کا بھی بہترین حصہ وہی خیال کیا جاتا ہی جسمیں واقعیت کی جھلک موجود ہوتی ہی، متنبی جب شام مصر اور بغداد ہر جگہ پھر کر عضد الدولہ کے دربار میں گیا ہی تو اسکو مخاطب کر کے کہتا ہی:-

وقد رأیت الملوک قاطبۃ　　　وسرت حتی رأیت مولاھا

میں نے سب بادشاہوں کو دیکھا　　　اور اب آکر بادشاہوں کے آقا کو دیکھا

ابا شجاع بفارس عضد الدولۃ　　　فنا خسرو شہنشاھا

جس کا نام ابو شجاع عضد الدولہ　　　فنا خسرو شہنشاہ ہے،

اسامیا لم تزدہ معرفۃ　　　وانما لذۃ ذکرناھا

یہ سب نام اور لقب میں نے اسلیے نہیں گنائے کہ لوگ یک لخت نہ پہچانیں تو دوسرے سے پہچان لیں، بلکہ اسلیے کہ بار بار اسکے لینے میں مجھکو مزہ آتا ہے،

برخلاف اس کے ایران کی شاعری میں ایک شعر بھی بجنسہ ایسا نہیں مل سکتا جو بعینہ خیال کیا جاتا ہو، اور اسکو واقعیت سے کچھ بھی علاقہ ہو،

فخریہ، عرب کی شاعری کا ایک رکن اعظم فخریہ شاعری ہے ایرانی شعرا نے بھی فخریہ شعر لکھے ہیں، لیکن وہ صرف شاعری یا علم و فضل کا فخر ہوتا ہے، یعنی میری شاعری اس درجہ کی ہے یا علم و فضل میں میرا کوئی ہمسر نہیں مثلاً منوچہری کہتا ہے،

امروز نہ شاعرم حکیم　　　دانندۂ حادث و قدیم

آنم کہ بہ سحر کالبے زرف　　　از شعلہ تراشں کردہ ام حرف

بانگ قلم درین شب تار　　　بس مست خفتہ کرد بیدار

اسرافِ معانیم نظر کن　　　زین گنج بہ مفلسان خبر کن

آنان کہ بمن نظر فگندند　　　در معرکہ ام سپر فگندند

گر عشق چنین بسوزدم پاک　　　مہتاب برون بریزم از خاک

بگداختہ آبگینۂ دل　　　آئینہ دہم بدست محمل

عرفی نے یہ جدت پیدا کی کہ علم وفضل کے ساتھ اپنے حسن وجمال کی بھی تعریف کرتا ہے، اور چونکہ وہ واقعی خوبصورت بھی تھا، اس لئے یہ نازیبا نہ تھا، لیکن فخر کا پہلو نہایت برا اختیار کیا ہے، چنانچہ کہتا ہے:۔

سر بر زدہ ام با مہ کنعان ز یکی جیب   معشوق تماشا طلب و آئینہ گیرم
میگویم و اندیشہ ندارم ز ظریفان   من زہرۂ رامشگر و من بدر منیرم

مہ کنعان کے مقابلہ اور معشوقیت کا مضائقہ نہیں، لیکن زہرہ رقاص بننا کون سی آدمیت ہے،

لیکن عرب کی فخریہ شاعری بالکل مختلف حیثیت رکھتی ہے، عرب میں سیکڑوں مختلف قبیلے تھے، ان میں جنگ وجدل رہتی تھی، اور ہر ایک کو اپنی مدد کے لئے اور قبیلوں سے کام لینا پڑتا تھا، اس غرض کے لئے شاعری سب سے بڑا کارگر آلہ تھا، اشعار میں وہ اپنے رتبہ اور شان کو اس حیثیت سے دکھاتے تھے کہ دوسروں پر اثر ہوتا تھا اور لوگ خواہ مخواہ ان کے حلقہ بگوش یا یار وفادار بنجاتے تھے، اسطرح فخریہ شاعری کی بنیاد پڑی، رفتہ رفتہ اسکو وسعت ہوتی گئی، اور فخریہ شاعری کے بہت سے موقع نکل آئے، جنکی تفصیل یہ ہے،

(۱) قبایل کے مقابلہ میں فخر کا اظہار،

(۲) معرکۂ جنگ میں فخر کا اظہار،

(۳) شعرا میں باہم مفاخرت، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ان میں کہیں شاعری کا فخر نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک شاعر، شاعر کے مقابلہ میں بھی جب فخر اور ترجیح کا دعوی کرتا تھا، تو علو نسب، جود و کرم رزم آرائی کے معرکوں کی بنا پر کرتا تھا،

جاہلیت اور ابتدائے اسلام کے فخریہ مین نسب کا فخر سب سے ضروری عنصر تھا لیکن متاخرین مین یہ عنصر کم ہوتا گیا متنبی کہتا ہے:-

مابقومی شرفت بل شرفوا بی   وبنفسی فخرت لا بجدودی

میرا شرف خاندان کی وجہ سے نہین ہے بلکہ خاندان کو مجھ سے شرف ہے، مجھکو اپنے باپ دادا پر ناز نہین بلکہ اپنے آپ پر ناز ہے

یہ وہی خیال ہے جسکو مرزا غالب نے ثبوت کے ساتھ ادا کیا ہے،

گوہر نہ بہ کان کان بہ گوہر وی شناست   بر فرخی ذات ولیسلم اب وعم را

متنبی نے اگرچہ فخر کا صحیح مفہوم سمجھا، لیکن طرز ادا سے شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ نسب کا ہیٹا ہوگا، اس لئے دوسرے شعرا نے اس پہلو کا بھی لحاظ رکھا، عامر بن طفیل کہتا ہے:-

فانی وان کنت ابن سید عامر   وفارسہا المشہور فی کل موکب

مین اگرچہ قبیلۂ عامر کے سردار کا بیٹا ہون   جو ہر معرکہ مین نامور رہا تھا،

فما سودتنی عامر عن وراثۃ   ابی اللہ ان اسمو بام ولا اب

تاہم مجھکو عامر کی وراثت نے سردار نہین بنایا   خدا یہ نہین چاہتا کہ میری عزت ماں باپ کی ممنون ہو

اب ہم فخریہ شاعری کے چند عمدہ نمونے نقل کرتے ہین جو حقیقی جوش کی تصویرین ہین:

ما ینکر الناس طرا حین نملکہم   کانوا عبیدا وکنا نحن اربابا

لوگون کو اس سے انکار نہین   کہ وہ غلام اور ہم آقا ہین،

ترى الناس ان سرنا یسیرون خلفنا   وان نحن اومانا الى الناس وقفوا

لوگ ہمارے پیچھے پیچھے چلتے ہین، اور جب ہم رکنے کا اشارہ کردیتے ہین تو سب ٹھہر جاتے ہین،

اذا ما غضبنا غضبۃ مضریۃ   ہتکنا حجاب الشمس او امطرت دما

جب ہمکو مضری[1] غصہ آتا ہے تو ہم آفتاب کو چاک کردیتے ہین، کہ اس سے خون ٹپکنے لگتا ہے،

[1] یعنی اس قوم کا غصہ جو قبیلہ مضر کا خاصہ ہے

اذا ما عز ناسید امن قبیلۃ ذری منبر صلی علینا و سلما

جب کسی قبیلہ کا سردار منبر پر چڑھتا ہو تو ہم پر درود اور سلام پڑھتا ہے،

و من یفتقر منا یعش بحسامہ و من یفتقر من سائر الناس سائل

ہمارے خاندان کا آدمی مفلس ہو جاتا ہو تو تلوار سے معاش پیدا کرتا ہو اور دوسرے خاندان کے آدمی بھیک مانگتے ہیں

و انا لنلھو بالحروب کما لھت فتاۃ بعقد او سخاب قرنفل

ہم لڑائیوں کو اس طرح کھیل سمجھتے ہیں جس طرح لونڈی ہار سے کھیلتی ہے

(از الندوہ جلد ۶ نمبر ۱۱ ماہ دسمبر ۱۹۰۹ء)
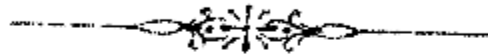
عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ

اوپر کے بیانات سے اس قدر تم کو معلوم ہوا ہوگا کہ فارسی شاعری عرب کی دستِ نگر ہے، لیکن یہ سوال پیدا ہوگا کہ استاد و شاگرد مین کیا فرق ہی، شاگرد نے استاد پر کیا اضافہ کیا، اور کن باتون مین اب بھی وہ استاد کا ہمسر نہین ہوسکتا؟

حقیقت یہ ہے کہ فارس کی شاعری اگرچہ بالکل عرب کا سایہ ہی لیکن دونون ملکون کے تمدن، معاشرت اور مقامی حالات مین اس قدر اختلاف ہی کہ ہر طرح کے تعلقات کے ساتھ بھی، دونون شاعریون مین زمین آسمان کا فرق پیدا ہوگیا ہی، عرب کا تمدن یہ تھا کہ بڑے بڑے جتھے پہاڑون اور میدانون مین رہتے تھے، کسی بادشاہ یا فرمان روا کے محکوم نہین تھے، آزادی اور خودسری کے خیالات ساتھ لیکر پیدا ہوتے تھے اور ساتھ لیکر جاتے تھے طبیعت جنگجو اور شوریدہ سر تھی، اس لئے آپس مین لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور ذرا ذرا سی بات پر قبیلے کے قبیلے لڑ کر فنا ہوجاتے تھے، فصاحت و بلاغت کا ملکہ فطرتی تھا، اس لئے جو حالت پیش آتی اور جو خیالات پیدا ہوتے ان کو اسی اصلیت اور جوش و خروش کے ساتھ ادا کر دیتے تھے،

رزمیہ شاعری، ان باتون کا اثر یہ تھا کہ ان کے اشعار مین شجاعت، جانبازی، مخاطرۂ نفس

لہ عربی شاعری سے مراد اسلام کے ماقبل کی شاعری ہی یا زیادہ سے زیادہ بنوامیہ کے عہد تک، اسکے بعد کی شاعری عربی نہین بلکہ عجمی ہی، صرف زبان کا فرق ہی جسطرح حکومت کہنے کو برائے نام عباسیہ کی تھی اصلی حکمران فارس اور ترک تھے،

زندہا دھندہ دلیری کے جو خیالات پائے جاتے ہین، فارس بلکہ دنیا کی کسی قوم کو نصیب نہین ہو سکتی، اس قسم کے اشعار کو حماسیات کہتے ہین، ان حماسیات کو پڑھو تو یہ عالم نظر آتا ہے کہ جنگل مین شیر گونج رہا ہے، فردوسی نے بھی شاہنامہ مین بڑے بڑے زور کے معرکے لکھے ہین، لیکن وہ اورون کے افسانے ہین، فردوسی داستان گو بنکر ان کو بیان کرتا ہے، لیکن عرب کا شاعر جو کہتا ہے اپنی سرگذشت کہتا ہے، اور اس لئے اسکا جو اثر ہوتا ہے، شاہنامہ کا نہین ہو سکتا، عرب مین جو مشہور شاعر گذرے ہین، وہی مشہور بہادر اور جنگ آور تھے مثلاً امرالقیس، عمرو بن کلثوم، عمرو معدیکرب، اس لئے وہ زبان سے وہی کہتے تھے جو ہاتھ سے کرتے تھے،

اس کے مقابلہ مین عجم کے شعرا کی یہ حالت تھی کہ انوری ایک دفعہ ڈاکوؤن مین گھر گیا، ایک حکیم صاحب اور ایک درزی بھی ساتھ تھا، سب جان بچا کر بھاگ نکلے انوری بطور علوم متعارفہ کے کہتا ہے، ع

حکیم و شاعر و درزی چگونہ جنگ کنند

آزادانہ خیالات، اسباب مذکورۂ بالا نے عرب کی شاعری کو آزادانہ خیالات سے لبریز کر دیا تھا، فارسی شاعری ہمکو یہ سکھاتی ہے،

اگر شہ روز را گوید شب ست این   بباید گفت اینک ماہ و پروین

بخلاف اس کے عرب کا شاعر اتفاق سے فلاکت مین پڑ جاتا ہے، ایک فرمان روا رئیس جو نسب مین اس سے کم رتبہ ہے، اس کو حاجتمند دیکھکر چاہتا ہے کہ اس سے قرابت پیدا کرے، شاعر کو خبر ہوتی ہے، وہ یہ اشعار جواب مین بھیجتا ہے،

بنی دابن کوزہ السفاھۃ کاسمھا   لیستادمنا ان شتونا لیا لیا

ابن کوز رئیس کا نام ہے، اُسکا نام بھی ویسا ہی کمینہ ہے جیسا وہ خود کمینہ ہے یہ خواہش ظاہر

کی کہ ہمارے ہاں قرابت کرکے شریف بنجائے اور یہ اس بنا پر کہ ہم نے چند روز فاقہ سے گذارے،

وانا علی عض الزمان الذی تری | نعالج من کرہ المخازی الدواہیا
ہاں زمانہ نے ہم کو ستایا تاہم ہم | ذلت کے مقابلہ میں مصائب کو برداشت کرتے ہیں
فلا تطلبنہا یا ابن کوز فانہ | غذ الناس مذ قام النبی الجواریا

ابن کوز اس خیال سے درگذر، جب سے رسول اللہ پیدا ہوئے لڑکیاں ہی لڑکیاں ہیں (اور کہیں شادی کرلو)

متنبی کے زمانے میں عرب کی تمام خصوصیات مٹ چکی تھیں، تاہم جب سیف الدولہ نے متنبی کی ناز برداریوں میں کمی کی اور شعرا کو اسکا ہم رتبہ قرار دیا، تو اس نے ایک قصیدہ لکھکر دربار میں پڑھا جسکا ایک شعر یہ ہے،

وما انتفاع اخی الدنیا بناظرہ | اذا استوت عندہ الانوار والظلم

یعنی جب انسان کو روشنی اور تاریکی یکساں معلوم ہو تو آنکھ سے کیا حاصل،

تمام قصیدہ میں اسی قسم کے آزادانہ خیالات ظاہر کئے اور بگڑ کر دربار سے چلا آیا،

مفاخرت، اسی بنا پر عرب کی شاعری کا ایک بڑا میدان مفاخرت ہے، جسمیں شاعر اپنے کارناموں کو بڑے جوش و خروش سے فخریہ بیان کرتا ہے، اور وہ اسکو زیب دیتا ہے، عرب کا ایک مشہور بادشاہ عمرو بن ہند گزرا ہے، اس کا اثر و اقتدار جب زیادہ بڑھا تو اس نے ایک دن درباریوں سے کہا کہ کیا اب عرب میں کوئی ایسا شخص بھی ہے جسکی ماں کو میری ماں کے سامنے گردن جھکانے سے عار ہو، انھوں نے کہا، ہاں عمرو بن کلثوم (قبیلۂ تغلب کا مشہور شاعر تھا) بادشاہ نے اسکو دعوت دیکر بلایا اور لکھا کہ مستورات

بھی ساتھ آئین، عمرو بن کلثوم دربار مین آیا، اور عورتین شاہی حرم مین گئین، ادھر اُدھر کی باتین ہو رہی تھین کہ بادشاہ کی والدہ نے عمرو بن کلثوم کی ماں سے کسی چیز کی طرف اشارہ کرکے کہا کہ بی بی ذرا اس کو اٹھا دینا، اس نے کہا آدمی کو اپنا کام آپ کرنا چاہیے، بادشاہ کی ماں نے دوبارہ کہا، وہ چیخ کر پکاری وا ذلاہ یا لتغلب یعنی ہاے تغلب کی ذلت، عمرو بن کلثوم نے باہر سے آواز سنی اور سمجھا کہ ماں کے ساتھ کوئی نامناسب برتاؤ ہوا، اسی وقت تلوار سے بادشاہ کا سر اڑا دیا اور خود بچ کر نکل آیا، پھر دونون قبیلون مین بڑے زور کا رن پڑا اور ہزارون سر کٹ گئے، عمرو بن کلثوم نے اس پر ایک قصیدہ لکھا اور جب عکاظ کا مشہور میلا قائم ہوا تو مجمع عام مین جوش و خروش کے ساتھ پڑھا، ایک مدت تک یہ حالت رہی کہ قبیلہ تغلب کا بچہ بچہ اس قصیدہ کو زبانی یاد رکھتا تھا، بالآخر یہ قصیدہ آب زر سے لکھکر در کعبہ پر آویزان کیا گیا، اسی بنا پر اسکو معلقہ کہتے ہین اور آج وہ سبعہ معلقہ مین داخل ہی، اس قصیدہ کا ایک ایک شعر، جوش و غیرت، حمیت و آزادی، دلیری و فخر کے صاعقہ کی گرج ہی، بادشاہ کو مخاطب کرکے کہتا ہی،

ابا هند فلا تعجل علینا   وانظرنا نخبرك الیقینا

اے ابوہند! جلدی نہ کر   ہم تجھکو سچے واقعات بتاتے ہین

بانا نورد الرایات بیضا   ونصدرهن حمرا قد روینا

ہم معرکۂ جنگ مین سفید جھنڈے لیکر جاتے ہین   لیکن انکو سرخ کرکے لاتے ہین،

الا لا یجهلن احد علینا   فنجهل فوق جهل الجاهلینا

ہان ہم سے کوئی جہالت نہ کرے   ورنہ ہم جاہلون سے بڑھکر جاہل ہین

تهددنا وتوعدنا رویدا   متی کنا لامك مقتوینا

تو ہمکو دھمکاتا اور ڈراتا ہے ، لیکن ہم کیا تیرے ماں کے غلام ہیں

فان قناتنا یا عمرو اعیت علی الاعداء قبلک ان تلینا

اے عمر! تجھ سے پہلے بھی ، ہمارے نیزوں کو لوگوں نے لچانا چاہا لیکن تھک کر رہ گئے

و انا المانعون لما اردنا و انا النازلون بحیث شینا

ہم جسکو چاہتے ہیں روک دیتے ہیں اور خود جہاں چاہیں پڑاو ڈال دیتے ہیں

اذا بلغ الفطام لنا صبی تخر لہ الجبابر ساجدینا

ہماری قوم کا بچہ جب دودھ چھوڑتا ہے ، تو بڑے بڑے جبار اسکے آگے سجدہ میں گر پڑتے ہیں

غور کرو، شعرائے فارس اس کے مقابلہ میں کس چیز پر فخر کر سکتے ہیں ، نظامی اور عرفی نے بڑے زور کے فخریہ لکھے ہیں ، لیکن فخر کی ساری کائنات یہ ہے کہ ہم اقلیم سخن کے بادشاہ ہیں ، الفاظ اور حروف ہمارے باجگذار ہیں ، مضامین ہمارے سامنے دست بستہ کھڑے رہتے ہیں ، اس سے آگے بڑھے تو یہ کہ ہم پری پیکر ہیں ، چنانچہ عرفی فرماتے ہیں ،

سر بر زدہ ام با مہ کنعان زیکے جیب معشوق تماشا طلب و آئینہ گیرم

یکگویم و اندیشہ ندارم ز ظریفان من زہرہ را مشکرو من بدمنیرم

مناظر قدرت | مناظر قدرت مثلاً پہاڑ، صحرا، جنگل ، سبزہ زار ، آب رواں ، ان چیزوں کی تصویر بھی جس طرح عرب کا شاعر کھینچ سکتا ہے ، ایران کے شاعر سے نہیں کھینچ سکتی ، اول تو اس قسم کی شاعری ایران میں کم ہے ، اور ہے تو وہ اصلیت اور مرقع نگاری نہیں جو عرب کا خاصہ ہے ، البتہ باغ و بہار کے مضامین نہایت بہتات کے ساتھ ہیں ، اور عرب اس باب میں ایران کا مقابلہ نہیں کر سکتا ، اور یہ بھی عرب کی واقعیت پسندی کی دلیل ہے ، وہ جو کچھ دیکھتا ہے ، وہی کہتا ہے ، اور یہ ظاہر ہے کہ عرب کو باغ و بہار کہاں نصیب تھے ، یہ بہارے

ہندوستان کا جوہر ہے کہ نرگس، یاسمن، سنبل، بنفشہ کبھی خواب مین بھی نہین دیکھا، لیکن
بہاریہ قصائد ایران مین بیٹھکر لکھتے ہین، یہان کی کوئی چیز گویا دیکھی ہی نہین،

جذبات انسانی یہ شاعری بھی عرب کے ساتھ مخصوص ہے، جذبات انسانی مین سب سے
بڑھکر رنج وغم کا جذبہ ہے جو مرثیہ کی بنیاد ہے لیکن ایران کے مرثیے بھی دراصل قصائد ہین؛
فرق یہ ہے کہ قصائد مین زندہ ممدوح کی مدح ہوتی ہے اور مرثیون مین مردہ کے اوصاف
بیان ہوتے ہین، بخلاف اس کے عرب بیٹی، اولاد، عزیز، دوست، احباب بلکہ اونٹ اور
گھوڑے کا مرثیہ لکھتا ہے، اور اس جوش وخروش کے ساتھ لکھتا ہے کہ دل پانی ہو جاتے ہین؛
مرثیہ پر ختم نہین ایران کے تمام جذبات کا یہی حال ہے، فارسی مین چار شعر ایسے نہین
ملتے جنمین کسی شاعر نے خاص اپنے غیظ وغضب کے جذبہ کا اظہار کیا ہو، بخلاف اس کے
چونکہ عرب کے تمام جذبات نہایت سخت اور مشتعل ہوتے ہین، اس لئے اسکو غصہ آتا ہے تو
منہ سے شرر جھڑنے لگتے ہین، ایران مین غزل کو بہت ترقی ہوئی جو ایک خاص جذبۂ عشق
کا اثر ہے، لیکن یہان بھی جسقدر آورد ہے آمد نہین،

تمدن و معاشرت کی خصوصیات، عرب کی شاعری اس بات مین بھی ایران سے ممتاز ہے کہ عرب کا
شاعر معاشرت اور خانگی زندگی کی خصوصیات اسقدر بیان کرتا ہے
کہ اس سے اس زمانہ کی رفتار، گفتار، نشست وبرخاست، وضع قطع، رہنے سہنے کے طریقے
زندگی کی ضرورتین، اسباب خانہ داری، ایک ایک چیز کا حال معلوم ہو سکتا ہے، بخلاف اسکے
فارسی شاعری مین یہ بھی نہین معلوم ہو سکتا کہ لوگ زمین پر رہتے تھے یا آسمان پر بسر کرتے تھے

معشوق، عرب کا معشوق بھی ایران سے جدا ہے یعنی ایران مین بجائے عورت کے مرد کو معشوق قرار
دیتے ہین، اور اس نے ایرانی شاعری پر سخت برا اثر ڈالا ہے تفصیل اسکی آگے آئیگی،

فارسی شاعری کی ترجیحی خصوصیات

ع عیب ہے جملہ بگفتی ہنرش نیز بگو، بے شبہہ عرب کی شاعری مین ایسی بہت سی باتین پائی جاتی ہین، جو ایران کو نصیب نہین، لیکن فارسی شاعری کو بھی بہت سی خصوصیتین حاصل ہین، جنمین وہ عرب سے علانیہ ممتاز ہے،

مثنوی۔ فارسی شاعری کی ایک بڑی صنف مثنوی ہے، جسمین سیکڑون واقعات اور ہزارون خیالات مسلسل بیان کئے جا سکتے ہین، عربی اس سے محروم ہے،

فلسفہ۔ عربی شاعری مین فلسفہ بہت کم ہے، بخلاف اس کے فارسی مین ناصر خسرو، عمر خیام، سنائی، نجفی، مولانا روم، عرفی وغیرہ نے ہر قسم کے فلسفہ کے مسائل اور خیالات ادا کر دیئے ہین،

اخلاق۔ اخلاقی شاعری عرب مین تھی، لیکن فارسی کی طرح مستقل حیثیت نہین رکھتی تھی، قصائد مین اخلاقی خیالات ادا کر دیتے تھے، بخلاف اس کے فارسی مین سیکڑون مثنویان، اخلاق مین لکھی گئین جنمین مسائل اخلاق مثلاً عفت، شجاعت، ہمت، توکل، استغنا کے عنوان قایم کیے گئے اور ہر عنوان کو نہایت تفصیل کے ساتھ لکھا،

تصوف۔ تصوف مین بھی عربی کم مایہ ہے، لے دیکر ابن فارض اور محی الدین عربی کا دیوان ہے، لیکن فارسی نے تصوف کے دریا بہا دیئے،

غزل۔ غزل کو بھی ایران نے بے انتہا ترقی دی چنانچہ، ان تمام خصوصیتون کی تفصیل الگ الگ مستقل عنوانون کے ذیل مین آئیگی،

تنوع خیالات۔ فارسی شاعری عمر مین عرب کی شاعری سے بہت زیادہ ہے، اس کے ساتھ اسکی حدود حکومت بہت وسیع ہین، جسکے مقابلہ مین عرب کی وسعت نقطہ سے بھی کم ہے،

اس بناپر گوناگون اور رنگ برنگ کے خیالات جو فارسی مین پائے جاتے ہین، عرب مین نہین مل سکتے،

جدتِ تشبیہات، ایران آب و ہوا، اور زمین کی شادابی کی وجہ سے بہشت کا چمن زار ہے اسلئے ایرانی شاعری کیلئے تشبیہات کا جو سرمایہ ہاتھ آسکتا تھا عرب کو نصیب نہین ہوسکتا تھا، مثلاً عرب کا شاعر دہن کی تعریف مین بڑی قوتِ تخیل صرف کرتا ہے تو انگوٹھی کے حلقہ سے تشبیہ دیکر رہجاتا ہے لیکن ایران کا خیال بند درج گوہر، چشمۂ نوش، پستہ، غنچہ، ذرہ، جوہر فرد سب کچھ دیجاتا ہے، اور پھر اس کی تشبیہ کا خزانہ خالی نہین ہوتا،

امرء القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر معشوق کی انگلی کو مسواک اور اسروع سے تشبیہ دیتا ہے جو جنگل کا ایک کیڑا ہوتا ہے لیکن فارسی کا شاعر اسکو دم قاقم سے تشبیہ دیتا ہے،

آن دلآویز دارد از نرمی ، سر انگشت چون دمِ قاقم

غرض تشبیہات کی لطافت اور استعارات کی نزاکت جو فارس مین پائی جاتی ہے عرب مین اسکا پتہ نہین لگ سکتا، بے شبہہ متاخرین عرب کے کلام مین بھی ہر قسم کے لطیف استعارات و تشبیہات پائے جاتے ہین، لیکن یہ شعرا یا تو خود عجمی ہین یا عجم مین نشو و نما پایا ہے اس لئے انکی شاعری درحقیقت فارسی شاعری ہے، صرف زبان کا فرق ہے،

(الندوہ، ج ۵ نمبر ۳، اپریل ۱۹۰۸ء)

سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر
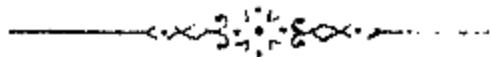
سرسید کے جسقدر کارنامے ہین اگرچہ رفارمیشن اور اصلاح کی حیثیت ہر جگہ نظر آتی ہے، لیکن جو چیزین خصوصیت کے ساتھ ان کی اصلاح کی بدولت ذرہ سے آفتاب بنگئین ان مین ایک اردو لٹریچر بھی ہی، سرسید ہی کی بدولت اردو اس قابل ہوئی کہ عشق و عاشقی کے دائرہ سے نکل کر ملکی، سیاسی، اخلاقی، تاریخی ہر قسم کے مضامین اس زور اور اثر، وسعت وجامعیت، سادگی اور صفائی سے ادا کر سکتی ہی کہ خود اس کے استاد یعنی فارسی زبان کو آج تک یہ بات نصیب نہین، ملک مین آج بڑے بڑے انشاپرداز موجود ہین، جو اپنے مخصوص دائرہ مضمون کے حکمران ہین، لیکن ان مین سے ایک شخص بھی نہین جو سرسید کے بار احسان سے گردن اٹھا سکتا ہو، بعض بالکل انکے دامن تربیت مین پلے ہین بعضون نے دور سے فیض اٹھایا ہی بعض نے مدعیانہ اپنا الگ سنہ نکالا، تاہم سرسید کی فیض پذیری سے بالکل آزاد کیونکر رہ سکتے تھے،

سرسید کی جس زمانہ مین نشوونما ہوئی دلّی مین اہل کمال کا مجمع تھا اور امرا و رؤسا سے لیکر ادنیٰ طبقہ تک مین علمی مذاق پھیلا ہوا تھا، سرسید جس سوسائٹی کے ممبر تھے اس کے بڑے ارکان مفتی صدرالدین خان آزردہ، مرزا غالب اور مولانا صہبائی تھے ان مین سے ہر شخص تصنیف وتالیف کا مالک تھا اور انھین بزرگون کی صحبت کا اثر تھا کہ سرسید نے ابتدا ہی مین جو شغلہ علمی اختیار کیا وہ تصنیف وتالیف کا شغلہ تھا

اول وہ رواج عام کے اقتضاء سے شاعری کے میدان مین آئے آہی تخلص اختیار کیا اور اردو مین ایک چھوٹی سی مثنوی لکھی جسکا ایک مصرعہ انھین کی زبانی سنا ہوا مجھے یاد ہے، ع نام میرا تھا کام انکا تھا،

لیکن حقیقت یہ ہو کہ انکو شاعری سے مناسبت نہ تھی اس لیے وہ بہت جلد اس کوچہ سے نکل گئے، اور نثر کی طرف توجہ کی، چونکہ حقایق اور واقعات کی طرف ابتدا سے میلان تھا اس لیے دلی کی عمارتون اور یادگارون کی تحقیقات شروع کی اور نہایت محنت و کوشش سے اس کام کو انجام دیکر ۱۸۴۷ء مین ایک مبسوط کتاب لکھی جو آثار الصنادید کے نام سے مشہور ہے،

اس وقت اگرچہ سرسید کے سامنے اردو نثر کے بعض بعض عمدہ نمونے موجود تھے، خصوصاً میر امن صاحب کی چہار درویش جو ۱۸۰۲ء مین تالیف ہوئی تھی، اور جس کی سادگی، صفائی اور واقعہ طرازی آج بھی موجودہ تصنیفات کی ہمسری کا دعوی کر سکتی ہے، اس کے ساتھ مضمون جو اختیار کیا گیا تھا یعنی عمارات اور ابنیہ کی تاریخ وہ تکلف اور آورد سے ابا کرتا تھا تاہم آثار الصنادید مین اکثر جگہ بیدل اور ظہوری کا رنگ نظر آتا ہے،

اس کی وجہ یہ تھی کہ سرسید کی رات دن کی صحبت مولانا امام بخش صہبائی سے رہتی تھی اور مولانائے موصوف بیدل کے ایسے دلدادہ تھے کہ انکا کلمہ پڑھتے تھے، اور جو کچھ لکھتے تھے اسی طرز مین لکھتے تھے،

سرسید نے مجھ سے خود بیان کیا کہ آثار الصنادید کے بعض بعض مقامات بالکل مولانا امام بخش صہبائی کے لکھے ہوئے ہین جو انھون نے میری طرف سے اور میرے نام

سے لکھدیئے تھے،

بہرحال اس کتاب مین جہان جہان انشاپردازی کا زور دکھایا ہے، اسکا نمونہ یہ ہے

"ان حضرت کی طبع رسا مشکل رابع سے پہلے اس سے نتیجہ حاصل کرتی ہے کہ بیچ الافتتاح سے ارباب فہم و ذکا، اور ناخن فکر عقدۂ لاینحل کو پہلے اس سے وا کرتا ہے کہ گرہ حباب کو انگشت موج دریا معنی فہمی اس درجہ کہ راست و درست سمجھ لیا کہ زبان سوسن نے کیا کہا اور رمز شناسی اس مرتبہ کہ واقعی معلوم ہوگیا کہ نگاہ نرگس نے کیا اشارہ کیا، اگر ان کی رائے روشن معجز نما ہو تو نقطۂ موہوم کو انگشت سے تقسیم کرے اور جز لایتجزی کو دو نیم"

اگرچہ اس سے بہت پہلے یعنی ۱۸۳۶ء مین مولوی محمد حسین آزاد کے والد بزرگوار مولوی محمد باقر نے اردو اخبار کے نام سے اردو کا ایک پرچہ نکالا تھا، اور خود سرسید نے ایک پرچہ جاری کیا تھا جس کا نام سید الاخبار تھا، اور دونون پرچون کی زبان ضرورت کے تقاضے سے سادہ اور صاف ہوتی تھی تاہم اس وقت تک یہ زبان علمی زبان نہین سمجھی جاتی تھی، اس لئے جب کوئی شخص علمی حیثیت سے کچھ لکھتا تھا تو اسی فارسی نما طرز مین لکھتا تھا، سرسید نے بھی اسی وجہ سے آثارالصنادید مین جہان انشاپردازی سے کام لیا اسی طرز کو برتا،

آثارالصنادید جس زمانہ مین نکلی اس کے تھوڑے ہی دنون کے بعد تقریباً ۱۸۵۰ء مین دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی، یعنی مکاتبات بجائے فارسی کے اردو مین لکھنے شروع کئے اور چونکہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے، اپنا کوچہ الگ نکال کر چلتے تھے، اس لئے انھون نے تمام ہمعصرون کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا، مکاتبات

ہین وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے، جیسے دو آدمی آمنے سامنے بیٹھے باتین کر رہے ہین، اس کے ساتھ بہت سے خطوط مین انسانی جذبات، مثلاً رنج وغم، مسرت و خوشی، حسرت وبیکسی، کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہو، اکثر جگہ واقعات کو اس بیساختگی سے ظاہر کیا ہو کہ واقعہ کی تصویر آنکھون کے سامنے پھر جاتی ہو، اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہین کہ اردو انشاپردازی کا آج جو انداز ہو، اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے اس کا سنگ بنیاد در اصل مرزا غالب نے رکھا تھا،

سرسید کو مرزا سے جو تعلق تھا وہ ظاہر ہے، اس لئے کچھ شبہہ نہین ہو سکتا کہ سرسید ضرور مرزا کی طرز سے مستفید ہوئے،

اسی زمانہ مین ہندوستان کے ہر حصہ مین کثرت سے اردو اخبارات جاری ہوگئے اور اردو انشاپردازی کو روز بروز ترقی ہوتی گئی، اخبارات کو ہر قسم کے اخلاقی تمدنی، ملکی، مذہبی، تاریخی مسائل سے کام پڑتا تھا، اس لئے ہر قسم کے مضامین لکھے گئے تاہم انشاپردازی کا کوئی خاص اسٹائل متعین نہین ہوا تھا، اس کے علاوہ جو کچھ تھا ابتدائی حالت مین تھا

سنہ ۱۸۷۰ء مین جسکو آج کم و بیش ۲۷ برس ہوئے، سرسید نے قوم کی حالت کی اصلاح کے لئے تہذیب الاخلاق کا پرچہ نکالا اور اردو انشاپردازی کو اس تبہ پر پہونچا دیا جس کے آگے، اب ایک قدم بڑھنا بھی ممکن نہین، سرسید نے اردو مین جو باتین پیدا کین اسکو وہ مختصراً تہذیب الاخلاق مین خود ایک مقام پر لکھتے ہین، ان کی خاص عبارت یہ ہے:-

" جہان تک ہم سے ہو سکا ہم نے اردو زبان کی علم ادب کی ترقی مین اپنے ان ناچیز پرچون کے ذریعہ سے کوشش کی، مضمون کے ادا کا ایک سیدھا اور صاف

طریقہ اختیار کیا، رنگین عبارت سے جو تشبیہات اور استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے، اور جس کی شوکت صرف لفظوں ہی لفظوں میں رہتی ہے، اور دل پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا، پرہیز کیا، اُس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو مضمون کے ادا میں ہو، جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تاکہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے"

اس آرٹیکل میں سرسید نے انشاپردازی کے اور بہت سے اصول بتائے ہیں جنکو اس موقع پر ہم اختصار کی وجہ سے قلم انداز کرتے ہیں،

سرسید کی انشاپردازی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ ہر قسم کے مختلف مضامین پر کچھ نہ کچھ بلکہ بہت کچھ لکھا ہے اور جس مضمون کو لکھا ہے اسدرجہ پر پہونچا دیا ہے کہ اس سے بڑھکر نا ممکن ہے، فارسی اور اردو میں بڑے بڑے شعرا اور نثار گذرے ہیں، لیکن انمیں ایک بھی ایسا نہ تھا جو تمام قسم کے مضامین کا حق ادا کر سکتا،

فردوسی بزم میں رہجاتا ہے، سعدی رزم کے مرد میدان نہیں، نظامی رزم و بزم دونوں کے استاد ہیں، لیکن اخلاق کے کوچہ سے آشنا نہیں، ظہوری صرف مدحیہ نثر لکھ سکتا ہے، برخلاف اس کے سرسید نے اخلاق، معاشرت، پالیٹکس، مناظر قدرت وغیرہ وغیرہ سب پر لکھا ہے، اور جو کچھ لکھا ہے لاجواب لکھا ہے، مثال کے طور پر بعض بعض مضامین کے جستہ جستہ فقرے نقل کرتے ہیں، امید کی خوشی پر ایک مضمون لکھا ہے جسمیں امید کو مخاطب کیا ہے، اس کے چند فقرے یہ ہیں:-

"دیکھ نادان بے بس بچہ گہوارہ میں سوتا ہے، اسکی مصیبت زدہ ماں اپنے دھندے میں لگی ہوئی ہے، اور اس گہوارہ کی ڈوری بھی ہلاتی جاتی ہے، بات کام

مین اور دل بچہ مین ہے اور زبان سے اسکو یون لوری دیتی ہے، سورہ میرے بچے سورہ،
اے اپنے باپ کی صورت اور میرے دل کی ٹھنڈک سورہ، اے میرے دل کی کونپل
سورہ، بڑھ اور پھل پھول، تجھ پر کبھی خزان نہ آئے، تیری ٹہنی مین کبھی کوئی خار
نہ چھوٹے، کوئی کٹھن گھڑی تجھکو نہ آئے، سورہ میرے بچے سورہ، میری آنکھون
کے نور اور میرے دل کے سرور میرے بچے سورہ، تیرا مکھڑا چاندسے بھی زیادہ
روشن ہوگا، تیری خصلت تیرے باپ سے بھی اچھی ہوگی، تیری شہرت تیری لیاقت
تیری محبت جو تو ہم سے کریگا ہمارے دل کو تسلی دیگی، سورہ میرے بچے سورہ
سورہ میرے بالے سورہ"

" یہ امید کی خوشیان ماں کو اس وقت تھین جبکہ بچہ غون غان بھی نہین کرسکتا
تھا، مگر جب وہ ذرا اور بڑا ہوا اور معصوم ہنسی سے ماں کے دل کو شاد کرنے لگا
اور اماں اماں کہنا سیکھا، اسکی پیاری آواز ادھورے لفظون مین اسکی ماں کے
کان مین پہونچنے لگی، آنسوؤن سے اپنی ماں کی آتش محبت کے بھڑکانے کے قابل
ہوا، پھر مکتب سے اسکو سروکار پڑا، رات کو ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق
غرض وہ دل سے سنانے لگا، اور جبکہ وہ تارون کی چھاؤن مین اٹھکر منھ ہاتھ دھوکر
اپنے ماں باپ کے ساتھ صبح کی نماز مین کھڑا ہونے لگا اور اپنے بے گناہ دل بے گناہ
زبان سے، بے ریا خیال سے خدا کا نام پکارنے لگا، تو امید کی خوشیان اور کس قدر
زیادہ ہوگئین، اور ہماری پیاری امید! تو ہی ہے جو مہد سے لحد تک ہمارے
ساتھ ہے"

" وہ دلاور سپاہی لڑائی کے میدان مین کھڑا ہے، کوچ پر کوچ کرتے تھک گیا

ہے، لڑائی کے میدان مین جبکہ بہادرون کی صفین چپ چاپ کھڑی ہوتی ہین اور لڑائی کا میدان ایک سن سان کا عالم ہوتا ہی، دلون مین عجیب قسم کی خوشی ملی ہوئی جرات ہوتی ہی، اور جبکہ لڑائی کا وقت آتا ہی، اور وہ آنکھ اٹھا کر نہایت بہادری سے بالکل بے خوف ہو کر لڑائی کے میدان کو دیکھتا ہی، اور جبکہ بجلی سی چمکنے والی تلوارین اور سنگینین اسکی نظر کے سامنے ہوتی ہین، اور بادل کی سی کڑکنے والی اور آتشین پہاڑ کی سی آگ برسانے والی توپون کی آواز سنتا ہی، اور جبکہ اپنے ساتھی کو خون مین لتھڑا ہوا زمین پر پڑا ہوا دیکھتا ہی، تو اے بہادرون کی قوت بازو! اور اے بہادرون کی جان تیرے ہی سبب سے فتحمندی کا خیال اسکے دل کو تقویت دیتا ہی، اسکا کان نقارہ مین سے تیرے ہی نغمہ کی آواز سنتا ہی"

تم دیکھ سکتے ہو کہ ان چند سطرون مین کس طرح نیچر کی تصویر کھینچی ہی، اور اسمین کس قدر درد اور اثر پیدا کیا ہی،

پالٹکس کا راستہ اس سے بالکل الگ ہی،

پنجاب مین جب یونیورسٹی قایم ہو رہی تھی، جسمین اورنٹیل تعلیم پر بہت زور دیا گیا تھا، سر سید کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اس سے پالٹکس کی بنا پر ہم کو اعلی تعلیم سے روکنا مقصود ہی، اس وقت سر سید نے پے درپے تین آرٹکل لکھے، ان آرٹکلون نے یونیورسٹی کے بانیون کو اس قدر گھبرا دیا کہ خاص ان آرٹکلون کے جواب مین سیکڑون مضامین لکھے گئے، اور انکا مجموعہ یکجا کر کے ایک مستقل کتاب طیار کی، افسوس ہے کہ اختصار کی وجہ سے ہم ان آرٹکلون کا کوئی حصہ نقل نہین کر سکتے،

سر سید نے انشا پردازی کی ترقی کے جو طریقے ایجاد کئے، ان مین ایک یہ تھا کہ بہت سے

اعلیٰ درجہ کے انگریزی مضامین کو اردو زبان کا قالب پہنایا، لیکن ترجمہ کے ذریعہ سے نہین، کیونکہ یہ طریقہ اب تک بے سود ثابت ہوا ہی، بلکہ اس طرح کہ انگریزی کے خیالات اردو مین اردو کی خصوصیات کیساتھ ادا کئے، امید کی خوشی کا مضمون جس کے ہم نے بعض فقرات اوپر نقل کئے در اصل ایک انگریزی مضمون سے ماخوذ ہے، انگریزی مین اڈیسن اور اسٹیل بڑے مضمون نگار گذرے ہین، سرسید نے ان کے متعدد مضامین کو اپنی زبان مین ادا کیا،

سرسید کی انشا پردازی کا بڑا کمال اس موقع پر معلوم ہوتا ہی جب وہ کسی علمی مسئلہ پر بحث کرتے ہین، اردو زبان چونکہ کبھی علمی زبان کی حیثیت سے کام مین نہین لائی گئی اسمین علمی اصطلاحات، علمی الفاظ اور علمی تلمیحات بہت کم ہین، اس لئے اگر کسی علمی مسئلہ کو اردو مین لکھنا چاہو تو الفاظ مساعدت نہین کرتے، لیکن سرسید نے مشکل سے مشکل مسائل کو اس وضاحت صفائی اور دلآویزی سے ادا کیا ہی کہ پڑھنے والا جانتا ہی کہ وہ کوئی دلچسپ قصہ پڑھ رہا ہی،

پروفیسر رینان نے جو فرانس کا ایک بڑا مشہور مصنف گذرا ہی، اپنے ایک مضمون مین لکھا ہی کہ عربی زبان مین یہ صلاحیت نہین کہ وہ فلسفی مسائل کو ادا کر سکے" رینان جن مسائل کے ادا کرنے کے لئے عربی زبان کو نا قابل سمجھتا ہی (گو یہ اسکا خیال محض غلط ہی) سرسید نے اردو جیسی کم مایہ زبان مین وہ مسائل ادا کر دئیے ہین، سرسید نے فلسفۂ الٰہیات پر جو کچھ اپنی مختلف تحریرون مین لکھا ہی، وہ فلسفہ کے اعلیٰ درجہ کے مسائل ہین،

زمانہ جانتا ہی کہ مجھکو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا، اور مین ان کے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا، تاہم اس سے مجھکو کبھی انکار نہ ہو سکا کہ ان مسائل کو سرسید نے جس طرح اردو زبان مین ادا کیا ہی، کوئی اور شخص کبھی ادا نہین کر سکتا،

سرسید کی تحریروں میں جا بجا ظرافت اور شوخی بھی ہوتی ہے لیکن نہایت تہذیب اور لطافت کے ساتھ مولوی علی بخش خان صاحب مرحوم جو سرسید کے رد میں رسالے لکھا کرتے تھے، حرمین شریفین گئے اور وہاں سے سرسید کی تکفیر کا فتویٰ لائے۔ اس پر سرسید ایک موقع پر تہذیب الاخلاق میں لکھتے ہیں :-

" جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظمہ تشریف لے گئے تھے اور ہماری کفر کی بدولت ان کو حج اکبر نصیب ہوا، اُن کے لائے ہوئے فتوؤں کے دیکھنے کے ہم بھی مشتاق ہیں،

بہ بین کرامت بت خانہ مرا اے شیخ   کہ چوں خراب شود خانۂ خدا گردد

سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی اور کسی کو ہاجی اور کسی کو کافر اور کسی کو مسلمان بناتا ہے،

یاران کہ بلطافت طبعش خلاف نیست   در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس "

تہذیب الاخلاق جب بند ہوا ہے، تو سرسید نے خاتمہ پر جو مضمون لکھا ہے اس کے ابتدائی فقرے یہ ہیں :-

" سوتوں کو جھنجوڑتے ہیں کہ جاگ اٹھیں، اگر اٹھ کھڑے ہوئے تو مطلب پورا ہوگیا، اور اگر نیند میں اٹھانے سے کچھ بڑبڑائے، کچھ جھنجھلائے، ادھر ہات جھٹک دیا، اُدھر سر جھٹک دیا، اور اینڈے پڑے سوتے رہے تو بھی توقع ہوئی کہ تھوڑی دیر بعد جاگ اٹھیں گے، شاید ہمارے بھائیوں کی اس اخیر درجہ تک نوبت آگئی ہے اگر یہ خیال ٹھیک ہو تو ہمکو بھی زیادہ نہ چھیڑنا چاہیے، بچے اٹھاتے وقت کہا کرتے ہیں کہ ہم کو اٹھائے جاؤ گے، تو ہم اور پڑے رہیں گے، تم ٹھہر جاؤ ہم آپ ہی اٹھ کھڑے ہونگے۔

بچہ کڑوی دوا پیتے وقت بسور بسور کر ماں سے کہتا ہو کہ بی ! یہ مت کہے جاؤ کہ شاباش بیٹا
پی لے، پی لے، تم چپ رہو میں آپ ہی پی لونگا، لو بھائیو! اب ہم بھی نہیں کہتے
کہ "اٹھو اٹھو پی لو پی لو"

حقیقت یہ ہے کہ سر سید نے اردو انشا پردازی پر جو اثر ڈالا ہو اس کی تفصیل کیلئے دو چار صفحے کافی نہیں ہو سکتے، یہ کام درحقیقت مولانا حالی کا ہے، وہ لکھیں گے، اور خوب لکھیں گے، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ لکھ چکے ہیں، اور خوب لکھا ہوگا، میں کالج کی طرف سے مجبور کیا گیا تھا کہ اس وقت جبکہ تمام ملک میں سر سید کا آوازۂ ماتم گونج رہا ہو، اور ہر شخص انکے کارناموں کے سننے کا شائق ہو، کچھ نہ کچھ مختصر طور پر فوراً لکھنا چاہئے، میں نے اسی کی تعمیل کی، ورنہ میں مولانا حالی کی مقبوضہ سرزمین میں مداخلت کا کوئی حق نہیں رکھتا، اور اس شعر کا مصداق بننا نہیں چاہتا،

بھلا تردد بیجا سے ان میں کیا حاصل　　　اٹھا چکے ہیں زمیندار جن زمینوں کو

(محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڈھ مئی ۱۸۹۰ء)

املا و صحت الفاظ

ایک معزز اور محترم بزرگ نے جو ہندوستان کے مشہور صاحبِ قلم اور معاملات ملکی مین بڑے اہل الرائے ہین، ہم کو ایک نہایت طولانی خط لکھا ہی جسمین سخت افسوس کے ساتھ اس بات کی شکایت کی ہی کہ نا اہلون کی وجہ سے اردو زبان روز بروز بگڑتی جاتی ہی، اور اگر اس کا تدارک نہین کیا جاتا تو ہماری قومی زبان برباد ہوئی جاتی ہی، ان کے خاص الفاظ یہ ہین:-

"آج کل مین دیکھتا ہون کہ اردو کے اخبار اور رسالے جو انگریزی پڑھے ہوئے مضامین نگار لوگ نکال رہے ہین یا اخبارون وغیرہ مین مضامین لکھتے ہین، ان غریبون کے ہاتھ سے بیچاری اردو کی ایسی مٹی خراب ہونی شروع ہوئی ہی کہ توبہ،

مضامین کا بیہودہ ہونا دوسری بات ہی، مگر زبان یعنی الفاظ اور املا کی غلطیان ایسی ہوتی ہین کہ میرا تو اکثر ان کے پڑھنے تک سے دل نفرت کرتا ہی یہ حالت خود انھین کے لئے قابلِ افسوس نہین ہے، بلکہ ایسی غلط عبارتون اور لفظون کے شیوع سے آیندہ بہت ہی برے نتائج پیدا ہون گے، لاہور کے ایک غیر انگریزی دان پرانے اخبار نویس نے جو بیچارہ سوائے عربی کے صرف معمولی سی فارسی پڑھا ہوا تھا، لفظ جناب کا مونث جنابہ بنایا، اب مین دیکھتا ہون کہ انکی بدولت یہ جنابہ

ایسی بری طرح پھیلتی جاتی ہو کہ توبہ،

لفظ نذر اور نظر مین فرق نہین کیا جاتا بجاے اتفیہ کے شفقی میرے خیال

مین غلط ہے، اسکا استعمال برابر ہو رہا ہو، موافقت کے مقابلہ مین لفظ نفاق

لکھا جارہا ہو اور جو کوئی کسی امر مین رائے مخالف رکھتا ہو اس کو اس طرح پر

خواہ مخواہ منافق کہا جاتا ہو، آپ فلان امر کے لئے مجاز نہین ہین اسکی جگہ لکھتے ہین

کہ آپ کو اس بات کا کیا مجاز ہو، محاذی کی جگہ محاذ اور ایک بڑی ضخیم کتاب کے نویسندہ

صاحب نے بجاے لفظ منادی یعنی واعظ کے منّاد بر وزن قناد و شداد اختراع کیا ہو،

وغیرہ وغیرہ، آپ کی خدمت مین یہ شکایت اس لئے لکھتا ہون کہ آپ کے اہتمام

سے (جو شاید برائے نام ہو) رسالہ کالج میگزین شایع ہوتا ہو، اسمین ایسی ایسی

فاش غلطیان ہوتی ہین کہ جنکو دیکھکر بہت رنج ہوتا ہو، اور غضب یہ ہو کہ جبکہ اسپر

لکھا جاتا ہو کہ مولانا محمد شبلی صاحب کے اہتمام سے شایع ہوا تو غور فرمایئے کہ بیچارے

انگریزی خوان اردو نویسون کے لئے تو گمراہ ہوجانے کے لئے ایک بڑی دلیل ہوجائیگی،

جب کوئی انکو سمجھانا چاہے گا، تو وہ یہی جواب دین گے، کہ فلان مقام پر ہم نے

ایسا ہی لکھا دیکھا ہو، اور چونکہ وہ رسالہ جناب مولانا جیسے مستند شخص کے اہتمام سے

شایع ہوتا ہو، تو یہ لفظ یا املا وغیرہ وغیرہ غلط کس طرح ہو سکتا ہو، اسی طرح ہمارے

ایک عالی کرم فرما مصنف و مضمون نگار نے کہین ہمارے عرفی کا یہ شعر پڑھ لیا ہوگا ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　آثار پدید است صنادید عجم را

یا جناب سید صاحب کی کتاب کا نام آثار الصنادید سن لیا ہوگا، اب بے تکلف

آثار قدیمہ کی نسبت لفظ صنادید لکھنا شروع کر دیا، اوران کی دیکھا دیکھی اور

لوگ بھی غلطی مین پڑتے جاتے ہین، ایک رسالہ آج کل سہارت سے بنام اصلاح جاری
ہوا ہے، اسکے ٹائٹل پیج پر جو ایک عربی کا حصہ ہے وہ قابل ملاحظہ ہے،
اگر آپ اخبار علیگڈھ کا ایک حصہ واسطے اصلاح اسمئے اغلاط کے مخصوص
فرمائکر الفاظ و املا ہاے غلط و محاورات غیر صحیح کی تصحیح فرمایا کرین تو دنیا پر خصوصاً
ہماری زبان اردو پر بڑا احسان ہو، ورنہ چند ہی سال مین ایک ایسی "گڈمڈی"
اردو پیدا ہوگی کہ باید و شاید، فانفطنوا الیٰ آخر بل کیفیت خلقت ایہ ضرور نہین
کہ کاتب مضمون کا نام لیکر اخبار مین نکتہ چینی کیجائے، بلکہ صرف اشارہ کے طور
پر لکھا جا سکتا ہی، اور جبکہ ایک آدھ کالم اسی کام کے لئے وقف کیا جائیگا تو لوگ
خواہ مخواہ ناراض بھی نہ ہون گے، کیونکہ اس عام طریق سے کسی کی تضحیک اور
توہین مقصود نہ ہوگی، بلکہ محض اصلاح زبان، زیادہ کہان تک سامعہ خراشی کرون،
سب سے پہلے مین اپنے محترم بزرگ کی خدمت مین یہ گذارش کرتا ہون کہ مین سال
بھر سے کالج میگزین کا اڈیٹر نہین ہون، اس لئے اس کی غلطیون کا (اگر واقع مین ہین)
مین ذمہ دار نہین،

اصل بحث کی نسبت اس امر سے انکار نہین ہو سکتا کہ اردو زبان مین بہت سے ایسے
الفاظ داخل ہو گئے اور ہوتے جاتے ہین، جو لغت اور ترکیب کے لحاظ سے غلط ہین لیکن سوال
یہ ہے کہ آیا یہ عام قاعدہ قرار پا سکتا ہی یا نہین، کہ جو لفظ، اصل لغت کے لحاظ سے غلط ہو، اسکا
استعمال بھی عموماً غلط ہی، فارسی زبان مین جب عربی کا اختلاط ہوا تو عربی کے سیکڑون
الفاظ اور جملے شامل ہو گئے، فارسی کے شعرا اور نثار عموماً علوم عربیہ مین نہایت مہارت
رکھتے تھے لیکن عربی الفاظ جو انھون نے برتے اس قدر غلط برتے کہ آج کم مایہ اردو دان اس سے زیادہ

غلطی نہین کر سکتے، تاہم وہی فارسی آجتک مستند و فصیح اور شیرین سمجھی جاتی ہے
چند مثالین مین اس موقع پر نقل کرتا ہون،

ع به تخنهاے دروغ تو تسلی شده رفت۔ نیلی
" بنشست و قرآن خواند و بجنبانید ہمی سر قاآنی
" جام شریعت شده مزیب واله
" شاخ بنفشه چون بروز لفین دوست گشت منوچہری
" قوم اشرب الصبوح یا ایہا النائمین
" در و لبیسِ بہندیش کاین خجسته نہاد عرفی
" سرو من طرح نو انداخته یعنی چه حزین

اصل حقیقت یہ ہے کہ زبان کی ابتدا عوام سے ہوتی ہے، اور یہ گروہ صحتِ الفاظ سے بالکل بیخبر ہوتا ہے، خواص اسی زبان کو لیکر کاٹ چھانٹ کر اصلاح کرتے ہین، اصلاح مین وہ بہت سے الفاظ کو اسی طرح چھوڑ دیتے ہین جسکی وجہ کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ وہ غلط الفاظ اس قدر عام استعمال مین رواج پا چکے ہوتے ہین کہ صحت کے ساتھ بولے جائین تو عام لوگون کی سمجھ مین نہ آئین، اور کبھی یہ کہ یہ امر زبان کی عزت اور خود مختاری کی دلیل سمجھی جاتی ہے کہ دوسری زبان کے الفاظ اسمین آئین تو اسی کے قالب مین ڈھلکر آئین،

فارسی اور اردو پر موقوف نہین، ہر زبان مین دوسری زبان کے الفاظ اکثر اصلی حالت پر نہین رہتے، البتہ چونکہ اردو کوئی مستقل زبان نہین، بلکہ عربی، فارسی، ہندی کا مجموعہ ہے، اسلئے اسکو عربی فارسی وغیرہ الفاظ پر تصرف کا بہت کم حق حاصل ہے، اس لئے جہان تک ہو سکے اسبات کا التزام زیادہ موزون ہے کہ غیر زبانون کے الفاظ صحیح تلفظ اور ترکیب کے ساتھ قائم رکھے جائین

لیکن اس سے بھی انکار نہین ہو سکتا کہ اساتذۂ قدیم و جدید نے عربی فارسی کے بہت سے الفاظ کو اردو زبان مین غلط طور سے برتا اور آج وہی غلط استعمالات فصیح اور با محاورہ خیال کیے جاتے ہین،

بہرحال اس قسم کے الفاظ کے استعمال و عدم استعمال کیلیے جو قاعدہ کلیہ قرار پا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ جو الفاظ فصحا اور مسلّم الثبوت اہلِ زبان کے عام استعمال مین آجائین وہ صحیح الاستعمال ہین اور جنکو اہلِ زبان نے عمومًا نہ قبول کر لیا ہوا نکا استعمال صحیح نہین، اسی بنا پر جب مشہور اساتذہ مثلاً امین قتیل میر آتش وغیرہ نے غلط الفاظ استعمال کئے تو لوگون نے اسیوقت اعتراض کیا، کیونکہ وہ الفاظ فصحا کے نزدیک استعمالِ عام کی سند نہین پا چکے تھے، اسلئے صرف ایک دو بزرگون کا استعمال گو وہ کیسے ہی مسلّم الثبوت استاد ہون صحت کی دلیل نہین قرار پا سکتا تھا،

ھمارے محترم بزرگ نے جن الفاظ کا ذکر کیا ہے وہ یقینًا فصحاے اہلِ زبان کے ہان مستعمل نہین ہین اسلئے انکے غلط ہونے مین کچھ کلام نہین ہو سکتا، بے شبہہ ایسے الفاظ کو بہت سختی سے روکنا چاہیے ورنہ زبان پر بہت برا اثر پڑیگا کیونکہ اگر اس قسم کے الفاظ تحریر و تقریر مین کثرت سے پھیل گئے تو ہر شخص کہان تک یہ تحقیق کرتا پھریگا کہ ان مین سے کون سے فصحا کے نزدیک مقبول ہو چکے ہین اور کون غیر مقبول،

(محمڈن اینگلو اورنٹیل کالج میگزین علی گڈھ) مارچ ۱۸۹۵ء
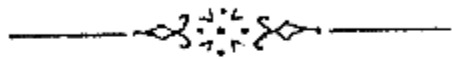
اُردو ہندی

"سنہ ۱۸۱۲ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ورنیکولر اسکیم کمیٹی قائم کی تھی جسکا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس دیسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اردو و ہندی دونوں زبانوں میں ایک ہی عبارت و الفاظ کے ساتھ پڑھا جائے۔ نیز اردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے،

مسٹر برن چیف سکریٹری نے اس کے متعلق ایک اسکیم مرتب کی مولانا مرحوم اس کمیٹی کے ممبر تھے، اس اسکیم کے متعلق انھوں نے جو خیالات ظاہر کئے تھے، وہ حسب ذیل تحریر ہیں،

یہ تحریر اس درجہ موثر رہی کہ مسئلہ کا فیصلہ خود ہندو ممبروں کی تائید سے مولانا ہی کی رائے پر ہوا، اور اس طرح اردو ہندی بنجانے سے بال بال بچ گئی،

مسٹر برن نے اپنی یادداشت میں جو تجویزیں پیش کی ہیں، ان میں اصلی اور مہتم بالشان مسائل دفعہ ۳ و ۴ میں، ان دفعات کا ورنیکولر پر نہایت وسیع اور دیرپا اثر پڑ سکتا ہے اس لئے ہمکو نہایت غور اور توجہ سے ان پر نظر ڈالنی چاہیے،

دفعات ۳ و ۴ کا ماحصل یہ ہے:۔

"اردو زبان اور ہندی زبان، در اصل ایک ہی زبانیں ہیں، کیونکہ انکی گرامر متحد ہے اور جن دو زبانوں کی گرامر متحد ہوتی ہے، وہ زبانیں در اصل ایک ہی ہوتی ہیں، اس بنا پر

ورنیکولر کورسس ایسی مشترک زبان مین بننا چاہئے کہ صرف رسم خط (کیرکٹر) کے فرق سے وہ اردو اور ہندی دونون بنجائے،

لیکن ہندی زبان کی ایک یہ خصوصیت ہو کہ اس کی نظم و نثر کی گرامر مختلف ہو اس لئے ہندی نظم کی گرامر کی واقفیت اور مہارت کے لئے، راماین تلسی داس، کورس مین داخل ہونی چاہئے، ہندوؤن کے لئے وہ لازمی کردیجائے، اور مسلمانون کے لئے بھی اس کا پڑھنا مناسب ہوگا،

اس تجویز پر بحث کرنے کے لئے ہم کو پہلے یہ فیصلہ کرلینا چاہئے کہ ہندی کے لفظ سے مسٹر برن کی کیا مراد ہو؟ ہندی دو قسم کی ہو، ایک جو دیہات مین بولی جاتی ہو، اور گنوار بولتے ہین، دوسری جو شہر مین تعلیم یافتہ ہندو روزمرہ استعمال کرتے ہین،

پہلی قسم کی ہندی تو کسی طرح کورس کی صلاحیت نہین رکھتی، جس کے دلائل حسب ذیل ہین :-

(۱) یہ ہندی ہر ضلع کی الگ ہو، اور ان مین باہم اس قدر اختلاف ہو کہ ایک ضلع کا آدمی دوسرے ضلع کی ہندی کو مشکل سے سمجھ سکتا ہو، اس لئے یہ فیصلہ کرنا ناممکن ہوگا کہ کس ضلع کے دیہات کی زبان کورس مین داخل کیجائے،

(۲) دیہات اور گنوارون کی زبان کسی ملک مین داخل نصاب نہین کیجاتی، اور نہ وہ کبھی علمی زبان قرار پاتی ہو، انگلستان مین دیہات کی انگریزی، کسی نصاب تعلیم مین داخل نہین ہے، ایران اور عرب وغیرہ کا بھی یہی حال ہو،

(۳) یہ زبان معمولی روزمرہ کے مطالب کے ادا کرنے کے لئے کافی ہوسکتی ہو، لیکن وہ کوئی علمی زبان نہین بن سکتی، حالانکہ ورنیکولر کو اس حد تک ترقی دینا مقصود ہو کہ کالج

کلاسون مین اخیر تک اس کا سلسلہ قائم ہے،

اب جو کچھ بحث ہوسکتی ہے، وہ دوسری قسم کی ہندی کے متعلق ہوسکتی ہے،

اس مین شبہہ نہین کہ شہرون مین عموماً ہندو جو زبان بولتے ہین، وہ اور اردو زبان، ایک ہی زبانین ہین، یعنی ان کے افعال اور اکثر مفرد الفاظ اور گرامر ایک ہی ہین، فرق یہ ہے کہ عام ہندو جو بالکل تعلیم یافتہ نہین ہوتے، یا جو پنڈت بھاشا اور سنسکرت مین زیادہ توغل رکھتے ہین، وہ فارسی عربی الفاظ کے بجاے، زیادہ تر برج بھاشا یا سنسکرت کے الفاظ استعمال کرتے ہین، لیکن، عام تعلیمیافتہ ہندو جو ہندوستانی زبان مین مقالے اور آرٹکل اور رسالے لکھتے ہین، ان کی اردو اور مسلمانون کی اردو مین مطلق فرق نہین ہوتا، متعدد علمی میگزین جن کے مالک واڈیٹر ہندو ہین، مثلاً زمانہ کانپور، ادیب الٰہ آباد، زبان دہلی، ان مین ہندو انشاپرداز جو مضامین لکھتے ہین، ان کی زبان اور اعلیٰ درجہ کے مسلمان انشاپردازون کی زبان مین کچھ فرق نہین ہوتا، وہ عموماً عربی اور فارسی علمی الفاظ کثرت سے استعمال کرتے ہین، کیونکہ علمی خیالات کے لئے معمولی ہندی کے الفاظ کافی نہین ہوسکتے اور سنسکرت کے الفاظ کی نسبت وہ جانتے ہین، کہ اگر استعمال کئے جائین تو سمجھنے والون کی تعداد تھوڑی رہجائیگی،

مسٹر برن کی غالباً یہ مراد ہوگی کہ ان دونون زبانون کا ایک ہی نصاب بنانا چاہئے، اسکی مثال بھی موجود ہے، کیونکہ پرائمری اسکولون مین پانچوین درجہ تک جو کورس پڑھایا جاتا ہے اور جس مین سے جنرل ریڈر اس سلسلہ کی اخیر کتاب ہے، دونون زبانون کے کورس مین داخل ہے،

لیکن اس کے متعلق حسب ذیل امور قابلِ لحاظ ہین،

اس قسم کی مشترک زبان صرف اس حد تک کے لٹریچر کے لئے کافی ہوسکتی ہو جو نہایت معمولی مطالب اور خیالات کے ادا کرنے کے لئے کافی ہو جیسے کہ جنرل ریڈر کی زبان ہو لیکن جبکہ یہ مقصود ہے کہ ورنیکولر کا سلسلہ کالج کے اخیر کلاسون تک قائم رہے تو ایسے نصاب کے بنانے کی ضرورت ہوگی جسمین ہر طرح کے علمی مضامین اور علمی خیالات ادا کئے جائین، اس حالت مین ان مضامین اور خیالات اور اصطلاحات کے ادا کرنے کے لئے عام روزمرہ کے الفاظ کافی نہ ہون گے، بلکہ کسی علمی زبان سے مستعار لینے پڑین گے، یہ علمی زبان عربی یا سنسکرت ہوگی، اور یہان سخت کشمکش پیدا ہوگی، مسلمان ہرگز اس بات پر رضامند نہ ہونگے کہ بجاے ان عربی الفاظ کے جنکو ہر تعلیمیافتہ مسلمان نہایت آسانی سے خود سمجھ سکتا ہے سنسکرت کے الفاظ سیکھین جو ان کے لئے بالکل گوش ناآشنا ہین، ہندو بھی اگرچہ ان الفاظ سے درحقیقت گوش آشنا نہین ہونگے، لیکن وہ بطور ایثار کے اس محنت کو برداشت کرین گے بہرحال جنرل ریڈر، مروجہ حال سے آگے چل کر صاف فیصلہ کردینا ہوگا کہ ہندی اور اردو کے کورس الگ الگ ہوجائین، ورنہ ان دونون زبانون کے مخلوط کرنے سے حسب ذیل نقصانات ہونگے،

(۱) ہمیشہ ایک کشمکش رہیگی، نصاب بنانے مین ہندو اور مسلمان، دونون اپنی اپنی قومی زبان یعنی عربی اور سنسکرت کی طرفداری کرین گے، اور کبھی کوئی اور کبھی کوئی فریق کامیاب ہوگا،

(۲) دونون سے ملکر ایک نئی زبان پیدا ہوگی، جو نہ اردو ہوگی نہ ہندی، اردو اور ہندی دونون زبانون کو اس حد تک ترقی دینا چاہئے کہ وہ علمی زبانین بنجائین، اور ان مین ہر قسم کے خیالات اور مضامین ادا کئے جاسکین، اور یہ اسی وقت ہوسکتا ہو جب دونون کو علحدہ علحدہ آزادی کے ساتھ ترقی کا موقع دیا جائے، اور ایک دوسرے کی راہ مین حائل نہ ہو،

ہم کو اس بات پر بھی سب سے زیادہ نظر رکھنی چاہئے، کہ زبان کو اس حد تک ترقی دینی چاہئے کہ اس کی تصنیفات ہمارے صوبہ تک محدود نہ رہیں، بلکہ ہندوستان کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں مین رواج پا سکیں، یہ امر بالکل بدیہی ہو کہ ہندوستان کے تمام تعلیمیافتہ مسلمانون کی زبان اردو ہے، پنجاب بنگال، مدراس، بمبئی مین قابل اور لائق مسلمان جو تصنیفات انگریزی زبان کے علاوہ کرتے ہین، وہ اردو مین ہوتی ہین، اور یہ وہی اردو ہے، جو سنسکرت الفاظ سے بالکل خالی ہو، اس لئے اگر اس زبان کو سنسکرت الفاظ ملا کر ہندی اور اردو کی ایک بان بنائی جائے گی، تو ایک زبان جو تمام ہندوستان کی اور کم از کم یہ کہ تمام مسلمانون کی لینگوا فرنکا ہے گھٹ کر ایک صوبہ بلکہ ایک ضلع کی زبان رہجائے گی،

اب مین مسٹر برن کی اس منطق کی طرف متوجہ ہوتا ہون جو ان کی تمام تجویزون کا سنگ بنیاد ہو، یعنی یہ کہ ہندی اور اردو کی گرامر ایک ہین۔

دو زبانون کی گرامر کے متحد ہونے سے صرف یہ ثابت ہو سکتا ہو کہ وہ دونون ایک ہی خاندان کی زبان ہین، یا ایک دوسرے سے نکلی ہین، اسیرین زبانون مین گرامر کے اعتبار سے ایک عام اتحاد پایا جاتا ہو، اور یہ اتحاد بعض زبانون مین بہت زیادہ ہوتا ہے، تاہم وہ زبانین مختلف رہتی ہین، اور ان سے مشترک کورس نہین تیار ہو سکتا عبری زبان کی جو گرامر آج کل بیروت مین شائع ہوئی ہے، اور جو ایک قدیم مستند تصنیف ہے، وہ عربی کے نہایت قریب ہے، اور اس اتحاد سے کسی طرح کم نہین جسقدر کہ ہندی اور اردو مین اتحاد ہو، تاہم عبری اور عربی زبان کا کوئی مشترک کورس نہین بن سکتا،

اس کے علاوہ اگر دو زبانون کی گرامر ایک ہو، لیکن الفاظ بالکل مختلف ہون تو

ان کو ایک زبان نہین کہہ سکتے، مشرقی ہندوستان کی زبانون کی گرامر قریبًا بالکل متحد ہے، باوجود اس کے کہ نہ وہ ایک زبانین کہی جا سکتی ہین نہ ان کا کوئی مشترک کورس بن سکتا ہی،

مسٹر برن کا یہ دعویٰ اور سخت حیرت انگیز ہے کہ ہندی کی نظم کی ایک یہ خصوصیت ہے کہ اس کی گرامر، نثر کی گرامر سے مختلف ہے، نظم و نثر مین گرامر کا ایک خفیف فرق تمام زبانون مین اس لحاظ سے ہوتا ہی کہ نظم مین وزن کی ضرورت سے الفاظ آگے پیچھے کر دیے جاتے ہین لیکن اس کے لیے علحدہ گرامر بنانے کی ضرورت نہین ہوتی، متعلم خود سمجھ لیتا ہی کہ وزن کی ضرورت نے یہ تغیر کر دیا ہی، ہندی زبان کی نظم کی گرامر نثر سے مختلف ہوگی تو اسی قدر ہوگی، اس سے زیادہ اختلاف کی کوئی وجہ نہین ہو سکتی،

نظم کی گرامر کے مختلف ہونے سے جو استدلال کیا گیا ہی اسمین سخت منطقی مغالطہ ہی، راماین کی گرامر مختلف ہے، لیکن اسکی یہ وجہ ہی کہ آج سے تین سو برس پہلے کی زبان ہے، اس زمانہ کی اگر کوئی نثر ملے گی، تو آج کی نثر کی گرامر سے اسی قدر مختلف ہوگی جسقدر کہ نظم کی گرامر مختلف ہی،

راماین کی زبان آج کل کی ہندی نہین ہی، اسلئے اسکا کورس مین داخل کرنا اگر اس لحاظ سے ہی کہ زبان کی وسیع واقفیت کے لئے اسکی ابتدائی حالت اور عہد بعہد کی تبدیلیون سے واقفیت ضروری ہی تو یہ رائے بالکل بجا ہے، لیکن اس غرض کے لئے دو امر کا لحاظ ضروری ہے، ایک یہ کہ ایسا کورس اسکول کے لئے موزون نہین، بلکہ کالج کلاسون مین داخل ہونا چاہیے جس طرح کہ قدیم انگریزی زبان کی کوئی کتاب انٹرنس تک داخل نہین ہے، دوسرے یہ کہ اس قسم کا کورس خالص ہندی زبان کے لئے ہونا چاہئے جو صرف

ان لوگون کے لئے بنایا جائے جو ہندی بھاشا اور سنسکرت کی تحصیل کرنا چاہتے ہین، ایسا کورس عام ورنیکولر کے لئے بالکل موزون نہین ہو سکتا،

اخیر مین مین نہایت زور سے کہتا ہون کہ نہایت ابتدائی درجون تک ایک سادہ زبان جو عربی اور سنسکرت دونون سے قریباً آزاد ہو اختیار کیجا سکتی ہے، لیکن ہائر کلاسون کیلئے اردو اور ہندی زبانون کو بالکل الگ الگ قایم کرنا چاہئے، اور اسی صورت مین دونون اعلی درجہ تک ترقی کر سکتی ہین،

گرامرون کے معمولی اشتراک سے دونون زبانون کو ایک قرار دینا اور اس کی بنا پر اخیر درجہ تک دونون کا ایک نصاب بنانا سخت غلطی ہے جس سے دونون زبانین برباد ہو جائنگی

(معارف اکتوبر ۱۹۱۶ء)

بھاشازبان
اور
مسلمان

"ناظرین کو یاد ہوگا کہ ایک سربرآوردہ ہندو اڈیٹر نے ایک مضمون لکھا تھا جسمین دعوی کیا تھا کہ مسلمانون نے تعصب مذہبی کی وجہ سے ہندی علم ادب پر کبھی توجہ نہین کی، اور اگر اتفاقیہ کسی نے کچھ کی تو اس کو مسلمانون نے کافر کہکے پکارا" اس کا جواب الندوہ کے پرچہ مین "مسلمانون کی بےتعصبی" کے عنوان سے لکھا گیا تھا جسمین مسلمانون کی اُن فیاضیوت کو بہ تفصیل دکھایا گیا تھا، جو سنسکرت اور بھاشا کی تصنیفات کی حفاظت ترجمہ اور اشاعت کے متعلق ان سے ظہور مین آئین،

یہ مضمون اسی کا دوسرا حصہ ہے، جسمین یہ دکھایا ہی کہ ترجمہ اور اشاعت کے علاوہ مسلمانون نے خود بھاشا زبان مین کیا کیا تصنیفات کین، اور بھاشا کی شاعری مین کس درجہ کا کمال پیدا کیا،

یہ امر بھی اس موقع پر لحاظ کے قابل ہی کہ سنسکرت زبان ایک مدت سے متروک ہے، یعنی ایک زمانۂ دراز سے خود ہندو بھی اس زبان مین تصنیف و تالیف نہین کرتے، اور اسلام کے زمانہ سے تو غالبًا کوئی کتاب اس زبان مین نہین لکھی گئی، ہندوون کی تصنیفات

یا شاعری جو کچھ بھی بھاکھا زبان مین ہی اس لئے مسلمانون نے بھی جو کچھ لکھا اسی بھاشا زبان مین لکھا"

عام طور پر مشہور ہی کہ سب سے پہلے جس شخص نے بھاکھا زبان مین شعر و شاعری کی، وہ حضرت امیر خسرو ہین، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلہ کا پتہ آگے تک چلتا ہی، مسعود سعد سلمان جو سلطنت غزنویہ کا مشہور شاعر گذرا ہے، اور جو حضرت امیر خسرو سے تقریباً دو سو برس پہلے تھا، اسکی نسبت تمام تذکرے متفق اللفظ ہین کہ ہندی زبان مین بھی اس نے ایک دیوان لکھا تھا تذکرہ مجمع الفصحا مین لکھا ہی :-

"الحاصل وے را سہ دیوان بود تازی، ہندی، و پارسی"

اس واقعہ سے عرفی والہ داغستانی نے اس بنا پر انکار کیا ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے ملک کی زبان مین اس قدر کمال نہین پیدا کر سکتا کہ اسمین شاعری کر سکے لیکن مولوی غلام علی آزاد نے اس شبہہ کو اس طرح رفع کر دیا کہ مسعود سعد سلمان گو خاندان کے لحاظ سے ایرانی تھا لیکن پیدا لاہور مین ہوا تھا، اس لئے ایک ہندوستانی کا ہندی مین اس درجہ کا کمال پیدا کرنا کچھ بعید نہین،

حضرت امیر خسرو نے سنسکرت اور بھاکھا مین جو کمال پیدا کیا، وہ محتاج اظہار نہین مثنوی نہ سپہر مین انھون نے خود اپنی سنسکرت دانی کا ذکر کیا ہی، افسوس ہی کہ ان کے بھاکھا کے خالص اشعار آج ناپید ہین، عام زبانون پر صرف وہ اشعار ہین جنین انھون نے فارسی اور بھاکھا کو پیوند دیا ہی، مثلاً :-

چون شمع سوزان چو ذرہ حیران | ز مہر آن مہ بگشتم آخر
نہ نیند نینان نہ انگ چینان | نہ آپ آوین نہ بھیجین پتیان

آنکھ — بدن — آرام — خط

اس طرز کے اُن کے اشعار عام طور پر مشہور ہین، اس لئے ہم اُن کو قلم انداز کرتے ہین،
امیر خسرو کے بعد شیر شاہی عہد مین ملک محمد جائسی پیدا ہوئے وہ بھاکا زبان کے ایسے
بڑے زبردست شاعر تھے کہ خود ہندوون مین آج تک کوئی اُنکا ہمسر نہین پیدا ہوا، پدماوت
اُن کی مثنوی آج موجود ہے، اور گھر گھر پھیلی ہوئی ہو، ہندوون مین سب سے بڑا شاعر آخر زمانہ
کا کالیداس گذرا ہے جس نے راماین کا بھاکا مین ترجمہ کیا ہو، نکتہ شناسون کا بیان ہے، کہ
قدرت زبان کے لحاظ سے پدماوت کسی طرح راماین سے کم نہین، اور اس قدر تو ہر شخص دیکھ
سکتا ہے کہ پدماوت کے صفحے کے صفحے پڑھتے چلے جاؤ، عربی فارسی کے الفاظ مطلق نہین آتے اور یون
شاذو نادر تو راماین بھی ایسے الفاظ سے خالی نہین، ملاحظہ ہو،

راماین کے بعض اشعار،

رام انیک گریب نواجے — لوگ بربر برد برا جے
گنی، گریب، گرام، نرناگر — پنڈت موڑے ملین اوجاگر

(غریب نواز، غریب)

ملک محمد جائسی نے پدماوت کے سوا بھاکا مین اور بھی دو مثنویان لکھین جو ان کے
خاندان مین اب بھی موجود ہین، لیکن افسوس کہ ان کے چھپنے کی نوبت نہین آئی،
اکبر کے زمانہ مین ہندی زبان کو اور بھی قبول عام حاصل ہوا، نوبت یہان تک پہونچی
کہ امرا اور شہزادے تک ہندی زبان مین شاعری کرتے تھے، شہزادہ دانیال (پسر اکبر شاہ) کے
ضمنی تذکرہ مین جہانگیر اپنی تزک مین لکھتا ہے :-

"بہ نغمۂ ہندی مائل بود، گاہے بہ زبان اہل ہند و باصطلاح ایشان شعرے مگفت،
بد نبود ے"

عبدالرحیم خان خانان جو دربار اکبری کا گل سرسبد تھا ہندی شاعری مین کمال

کا درجہ رکھتا تھا، اسی کتاب مین خان خانان کے وفات کے ذکر مین لکھا ہو،

"خان خانان در قابلیت و استعداد یکتائے روزگار بود و بزبان عربی و ترکی و
فارسی و ہندی می دانست و از اقسام دانش عقلی و نقلی حتی علوم ہندی بہرہ وافی
داشت، و بہ زبان فارسی و ہندی شعر نیکو گفتہ"

جہانگیر کے زمانہ مین غواصی نام ایک شاعر تھا اس نے طوطی نامہ کو جو نثر مین تھا
اس طرح نظم کیا کہ ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی مین تھا، اس سے اس کی قدرت
زبان کا اندازہ ہو سکتا ہو، میر حسن[1] صاحب اپنے تذکرۂ شعرا مین لکھتے ہین: ۔

"غواصی تخلص در وقت جہانگیر بادشاہ بود، طوطی نامہ نخشبی را نظم نمودہ
است بزبان قدیم نصفے فارسی و نصفے ہندی بطور ریختہ کہانی، سرسری دیدہ
بودم شعر آن نظم بیاد نیست"

اسی زمانہ مین ملا نوری ایک بزرگ تھے جو قصبہ اعظم پور کے قاضی زادون مین
تھے، اور فیضی سے نہایت اتحاد رکھتے تھے، وہ اگرچہ فارسی کہتے تھے، لیکن کبھی کبھی ہندی
مین بھی طبع آزمائی کرتے تھے، ریختہ یعنی اردو زبان کی ترکیبین بھی ان کے کلام مین پائی
جاتی ہین، چنانچہ میر حسن صاحب نے اپنے تذکرہ مین انکا ایک شعر نقل کیا ہو،

ہر کس کہ خیانت کند البتہ بترسد بیچارۂ نوری نہ کرے ہے نہ ڈرے ہے

اکبری اور جہانگیری دور مین سب سے زیادہ جس نے اس فن مین نام پیدا کیا، وہ شیخ
شاہ محمد بن شیخ معروف فرملی تھے، یہ بلگرام کے رہنے والے تھے، اور حصار کی حکومت پر ممتاز
تھے، ایک دفعہ سفر مین ایک ہندو لڑکی کی حاضر جوابی ان کو بہت پسند آئی، اسکو ساتھ
لائے، اور تربیت کی، چنانچہ ان کے اکثر دوہے اور کبت، اسی کے ساتھ سوال و جواب مین ہین

[1] میر حسن مصنف بدر منیر کا تذکرۂ شعرا ہمارے کتب خانہ مین موجود ہے،

ایک دفعہ سفر سے آئے اُستے انکو مدت کے بعد دیکھا تو جوشِ محبت سے اسکی آنکھون سے آنسو نکل آئے، انھون نے کہا،

کم درگ دُھری سنار　　　　تم آیو سبھا یو نہیں

کیون تیری آنکھ آبدیدہ ہوئی اے نازنین　　　　کیا میرا آنا پسند نہین ہوا!

اس نے برجستہ کہا،

لیکھن نین بکھا رہ　　　　لن ہتی تو کو درس بن

آنکھ صاف کرنا　　　　گرد آلود تیرے دیدار کے بغیر

یعنی چونکہ میری آنکھین تمھاری جدائی مین گرد آلود ہو رہی تھین، اس لئے مین نے ان کو آنسوؤن سے دھو لیا،

شیخ محمدؒ کے اشعار نہایت کثرت سے سروآزاد کے دوسرے[1] حصہ مین نقل کئے ہین،

---

[1] یہ بات جتا دینے کے قابل ہو کہ مولوی غلام علی آزاد نے سروآزاد جو تذکرہ لکھا اس کے دو حصے کئے، ایک فارسی شعرا کے ذکر مین اور دوسرا ہندی یعنی بھاشا کہنے والون کے حالات مین، اُس دوسرے حصہ کی تمہید مین لکھتے ہین:

"فصل ثانی در ذکر قافیہ سنجان ہندی جزاہم اللہ بجائزۃ الحُسنیٰ بعید ان بازبان عربی و فارسی و ہندی آشنایم وازہر سہ میکدہ بقدر حوصلہ قدحے می پیمایم و مشق سخن ہندی ہرچند اتفاق نیفتادہ اما سامعہ را از نوائے طوطیان ہند حظے وافر است و ذائقہ را از چاشنی شکر فروشان این گل زمین نصیبے متکاثر، افسون خوانان ہند ہم درین وادی پاسے کمی ندارند بلکہ در فن نایکا بید قدم سحر سازی پیش می گذارند، موزونان زبان ہندی، در بلگرام فراوان جلوہ نمودہ اند لہذا فصل زین جامہ علٰحدہ بہ تحریر رسید و شمامہ معطرے بدست بو شناسان حوالہ گردید"

پھر اس حصہ کے خاتمہ مین لکھتے ہین:-

"بہ اقتضائے ترتیبے کہ درین تالیف اختیار افتادہ ختم کتاب بر نظم ہندی دست بہم دادہ چہ مضائقہ بعض الفاظ ہندی جزو عرفات عظیم است"

سروآزاد کا یہ حصہ، ہمارے دوست نواب نور الحسن خان خلف اکبر　(بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۵ پر ہے)

تیموری سلاطین بھاشا زبان کی شاعری کی اسی طرح قدردانی کرتے تھے جس طرح وہ اپنی شاہی زبان (فارسی) کے قدردان تھے اور یہ اس بات کا بڑا سبب تھا کہ ہندی شاعری بھی روز بروز ترقی کرتی جاتی تھی، راجہ سورج سنگھ نے جب ایک ہندو شاعر کو جہانگیر کے دربار میں پیش کیا اور اس نے ایک اچھوتے مضمون کی نظم پڑھی تو جہانگیر نے ایک ہاتھی انعام میں دیا، چنانچہ خود تزک میں لکھتا ہے:-

"این تازگی مضمون از شعرائے ہندکم بگوش رسیدہ بہ جلدوے این مدح فیلے بہ او مرحمت کردم"

جہانگیر کے حکم سے ان اشعار کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا گیا،

گر پسر داشتے جہان افروز | شب نہ گشتے ہمیشہ بودے روز
زان کہ چون او نہفت افسر زر | بہ نمودے کلاہ گوشہ پسر،
شکر کز بعد او چنان پدرے، | جانشین گشت این چنین پسرے
کہ ز شنقار گشتن آن شاہ | کس بہ ماتم نہ کرد جامہ سیاہ

ان اشعار کا حاصل یہ ہے کہ اگر آفتاب کے کوئی بیٹا ہوتا تو کبھی رات نہ ہوتی، کیونکہ جب آفتاب چھپ جاتا تو اس کا بیٹا اس کے بجائے عالم افروزی کرتا، خدا کا شکر ہے کہ آپ کے والد (اکبر شاہ) کو خدا نے ایسا بیٹا دیا کہ لوگوں نے ان کے انتقال کا غم نہ کیا،

(بقیہ حاشیہ صفحہ ماقبل) جناب نواب صدیق الحسن خان مرحوم نے اپنے تذکرہ طور کلیم میں تمامہ شامل کر لیا چنانچہ فروغ و دوم میں جہان سے ہندی شعرا کا تذکرہ ہے عبارت تمہیدی بھی وہی سرو آزاد کی ہے میں اس مضمون میں بلگرامی شعرائے بھاکا کا جو تذکرہ لکھونگا اور انکے اشعار نقل کرونگا وہ طور کلیم سے منقول ہونگے لیکن طور کلیم کا یہ حصہ در اصل سرو آزاد ہے طور کلیم چھپ گیا ہے اور ہر جگہ ملتا ہے اسلئے ناظرین کو وہ بآسانی ہاتھ آسکتا ہے، لئے تزک جہانگیری مطبوعہ علی گڈھ

ہندی تصنیفات کے ساتھ مسلمانون کی توجہ کی یہ نوبت پہونچی کہ لوگ ہندی کی مشہور کتابون کو زبانی یاد کرتے تھے، امین رازی تذکرہ ہفت اقلیم مین میر ہاشم محترم کے حال مین لکھتے ہین :-

" امروز در ہندست تمام کتاب مہابھارت را کہ مجمع اسامی غریبہ و حکایات عجیب است در ذکر دارد"

اس مسئلہ مین حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عالمگیر کو نہایت متعصب کہا جاتا ہی اور عام خیال ہے کہ وہ ہندؤن کے علوم اور زبان سے نہایت نفرت رکھتا تھا، لیکن مسلمانون نے بھاشا زبان پر جس قدر اُس کے زمانہ مین توجہ کی پہلے کبھی نہین کی تھی ضمیر ایران کا ایک مشہور شاعر تھا، وہ عالمگیر کے زمانہ مین ایران سے آیا اور شاہی منصب دارون مین مقرر ہوا، اُس نے بھاشا زبان مین انتہا درجہ کا کمال پیدا کیا، اگرچہ بھاشا و سنسکرت کے الفاظ کا وہ صحیح تلفظ نہین کرسکتا تھا، تاہم اس زبان مین نہایت برجستہ اشعار کہتا تھا، ہندی مین اُس کا تخلص پچھی تھا، پارجاتک جو موسیقی مین ہندی زبان کی مشہور کتاب ہے اس کا ترجمہ اُسی نے فارسی زبان مین کیا، مولوی غلام علی آزاد بلگرامی ید بیضا مین اُس کے حالات کے ذیل مین لکھتے ہین :-

" در عہد عالمگیر بادشاہ از ولایت ایران بہ ہند آمدہ و در سلک منصبداران شاہی انتظام داشت، با وجود آن کہ بہ ہند آمدہ زبان این ولایت آموخت، اما بہ اسطہ تیزی ذہن در نظم ہندی طبع او آن قدر دخیل شد کہ از جملہ استادان فن بر آمد، زبانش بہ تلفظ این زبان خوب نمی گردید، اما نظم بسیار ریختہ واقع می شد و در ہندی پچھی تخلص میکرد و ترجمہ پارجاتک در فن رقص و نغمات ہندی از وست"

عالمگیر ہی کے متوسلین مین ایک اور شاعر دانا تخلص تھا، اس کی نسبت مولوی غلام علی آزاد بلگرامی، یدبیضا مین لکھتے ہین،

"نظم ہندی بسیار خوب گفتہ"

بھاشا کی زبان دانی اور شاعری کا ذوق، اس زمانہ مین اس قدر عام ہوا کہ بڑے بڑے علما اور حضرات صوفیہ اسمین کمال پیدا کرتے تھے، شیخ غلام مصطفیٰ متخلص بہ انسان بہت بڑے پایہ کے شخص گذرے ہین، وہ قوم کے کنبو اور مرادآباد کے رہنے والے تھے معقولات کی تحصیل حضرت ملا قطب الدین شہید سہالوی (جد مولانا بحرالعلوم) کی خدمت مین کی، حدیث کا فن محدث دہلوی کے خاندان سے حاصل کیا، تصوف مین شیخ جان محمد شاہ جہان آبادی کے مرید تھے، طب، نجوم، خوشنویسی، فن جنگ، ان تمام چیزون مین کمال رکھتے تھے، عالمگیر کے زمانہ مین منصبداری کے عہدہ پر مامور ہوکر دکن گئے، لیکن چند روز کے بعد استعفا دیکر چلے آئے، ۱۱۴۲ھ مین بمقام ایلچپور وفات پائی ہندی زبان اور بھاشا کی شاعری مین انکا جو درجہ تھا، اسکا اندازہ مولوی غلام علی آزاد کی عبارت ذیل سے ہو سکتا ہے،

"علم ہندی بحیثیتے کہ اکثر براہمہ حل غوامض از خدمت شیخ میکردند و شعر ہندی نیز خوب میگفت، صنادید شعرائے ہندی بربہمن در حضور او سر فرود می آوردند و اصلاح کبت خود میگرفتند" (سرو آزاد)

عبدالجلیل بلگرامی (مولوی غلام علی آزاد کے نانا) جو عالمگیر کے درباری تھے ہندی زبان کے ممتاز شاعر تھے، فارسی قصیدون مین بھی کہین کہین بھاشا بول جاتے ہین چنانچہ ایک قصیدے مین لکھتے ہین:-

اسے ہیں دیکھا کہے ہندوی میں نو تحقیقات   رہے جگت میں اچل یاس ہیہ ذریسدا

یہ ذوق اس قدر ترقی کرتا گیا کہ محمد شاہ کے زمانہ میں جے راجہ جے سنگھ والی جے پور نے بتیس لاکھ کے صرف سے رصدخانہ قائم کیا، اور فن ریاضی کے ساتھ نہایت اہتمام کیا تو علماے اسلام نے اس کے حکم سے شرح چغمینی اور ہیئت کی اور کتابوں کا ترجمہ بھاشا زبان میں کیا، چنانچہ آزاد، سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں :-

وقد نقل العلماء الاعلام بامر جی سنگھ شرح الچغمنی وغیرہ من کتب الھیئۃ والھندسۃ من العربیۃ الی الھندیۃ (سبحۃ المرجان صفحہ ۱۰۳)

ہندوستان کے علما نے جے سنگھ کے حکم سے شرح چغمینی وغیرہ کتابوں کا جو علم ہیئت اور ہندسہ میں تھی عربی زبان سے ہندی زبان میں ترجمہ کیا،

شرح چغمینی اس درجہ کی مشکل کتاب ہے کہ اردو میں اس کا ترجمہ نہیں کیا جا سکتا، اس سے قیاس کرنا چاہیے کہ جو علما بھاشا زبان میں اس کا ترجمہ کر سکے، ان کی بھاشا دانی کا کیا رتبہ ہوگا،

اسی زمانہ میں سید نظام الدین بلگرامی نے سنسکرت اور بھاشا کے علم ادب میں نہایت شہرت حاصل کی سنسکرت کے حاصل کرنے کے لئے بنارس کا سفر کیا اور وہاں رہکر اس علم کی تکمیل کی، ہندی موسیقی میں اس درجہ کا کمال پیدا کیا کہ لوگ ان کو نایک کہتے تھے، چنانچہ اس فن کے متعلق بھاشا میں دو کتابیں تصنیف کیں ناو چندر کا اور مدھنایک سنگار، بھاشا میں مدھنایک تخلص کرتے تھے ۱۱۹۰ھ میں وفات پائی، کلام کا نمونہ یہ ہے،

جو چترا من جیت چاہت، نہ بڑھے بدھ بیدن اگر تھر نہ گاسے
(فرشتہ — دل — ترکیب صورت، عقلا کتیک تئی، قدیم کی میں)

بھارتی، بھوی کری، بھرین، جب، جوگن، جوگ، تھیہ گنا سئے
(گویائی — بچہ گروانی ریاضت — مرتاض)

جو کچھ جوت جگی، نہ تھگی مدھنا یک گھونگھٹ چنچل پیاسے
چہرہ روشنی نام شاعر شوخی

جھنین دو کول، تھے جھلکی انچھر براجت اچھو رچھاسے
باریک ڈوپٹہ زیر پینا نے شکل وفیقہ کرنا

مطلب یہ ہے کہ تیری آنکھیں نقاب کے اندر جس قدر خوش نما ہیں اسکی خوبی فرشتون کے خیال مین بھی نہیں آسکتی اور نہ آسمان کی کتابون مین ان کی توصیف پائی جاتی ہے،

قوتِ نطق خود محوِ حیرت ہے اور نہ ادہر متاض سمجھ گردانی سے بھی زیادہ، اس کا مدعا ہے نقاب ان آنکھون کی خوبی کو چھپا نہین سکتی، بلکہ باریک ڈوپٹہ اس کی خوبی اور بھی دوبالا کر دیتا ہے،

ان کا اور بہت سا کلام سرو آزاد مین نقل کیا ہے، لیکن چونکہ ناظرین کے لئے وہ نامانوس صدا ہوگی، اس لئے ہم اسکو قلم انداز کرتے ہین،

سید رحمت اللہ پسر سید خیر الدین بلگرامی بھاشا زبان کے مشہور استاد تھے سلطنت کی طرف سے دو صدی منصب اور جاگیر مقرر تھے، اس زمانہ مین بھاشا کا مشہور شاعر چنتامن ایک ہندو تھا، اس کا ایک شاگرد رحمت اللہ کا شہرہ سنکر ان کی خدمت مین حاضر ہوا، اور چنتامن کا دوہا ان کے سامنے پڑھا،

ہو ھرت ار کرت ات چنتامن چت چین
وامرگ نینی کی لکھی واہی کی سی نین،

سید رحمت اللہ نے اس دوہہ مین غلطی نکالی اور چنتامن نے سنا تو غلطی تسلیم کر کے اُس کی اصلاح کر دی، چنتامن نے سید رحمت اللہ کی مدح مین ایک دوہہ بھی لکھا، جس کا مطلع یہ ہے:-

گرب، گڑھ سنگ، جیون سبل گل گاج من، پدبل گج باج دل، ساج دھایو
غرور سیر اظہار دلیری قوی زبردست ہاتھی گھوڑا فوج آراستہ حملہ کیا

بجت اِک چمک گگن گھمک دِ بندھن کی ترنگ، گھر دھمک بھو تل ہلایو

ایک طرح پر گردون شگاف نقارہ گھوڑ یچا سم زمین

سید رحمت اللہ نے ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۸۰ھ مین وفات پائی، ان کے بہت دوہے سرو آزاد مین نقل کئے ہین، ہم صرف ایک پر اکتفا کرتے ہین،

کر اچاے جنبھاے تیسہ دھاری بنج یہ پھبا ہے،

ہاتھ بلند کرنا انگڑائی بازو خوشنما معلوم ہوئے

منو چپلا دوی چمک ہوے گری بھوم پر آ ئے،

گویا بجلی زمین

یعنی محبوب نے جمہائی لیتے ہوئے، جب دونون ہاتھ اٹھا کر نیچے کر لئے تو یہ معلوم ہوا کہ گویا دو بجلیان چمک کر زمین پر گر پڑین،

سید غلام نبی پسر سید محمد باقر، سید عبد الجلیل بلگرامی کے بھانجے تھے، ۲ محرم ۱۱۱۱ھ مین پیدا ہوئے، سید عبد الجلیل اس زمانہ مین **عالمگیر** کے ساتھ دکن کے مہم پر تھے، بھانجے کے پیدا ہونے کی خبر سنی تو سال تاریخ کی فکر ہوئی اسی حالت مین سو گئے، اور خواب مین یہ الہام آیا ع

نور چشم باقر عبد الحمید م

تفاول کے طور پر پیشین گوئی کی کہ یہ لڑکا شاعر ہوگا، خدا کی قدرت پیشین گوئی صحیح اتری، اگرچہ عربی و فارسی مین بھی مہارت رکھتے تھے لیکن **بھاشا** کی شاعری مین نہایت کمال پیدا کیا، ۱۱۶۳ھ مین نواب وزیر اور افاغنہ کی لڑائی مین، نواب کی ہمرکاب تھے، اور عین معرکہ جنگ مین مارے گئے، **مولوی غلام آزاد** سے نہایت درجہ کا اتحاد تھا، چنانچہ آزاد نے تاریخ کہی،

ع رقم کردہ ہے غلام نبی،

بھاشا زبان مین ایک دیوان لکھا ہے، جس مین دوہے ہین، اس کا نام **انگ درپن** رکھا، بھاشا مین انکا تخلص **رس لین** ہے، رس کے معنی بھاشا مین دیدار کے ہین، اور لین کے

معنی محو کے ہین، رسلین کا لفظی ترجمہ محو دیدار ہے، ان کے کلام کا نمونہ یہ ہے،

توحید

تیری منورتھ کو ہوت ہے سین، لوک توں ہی ہوئی اکاش کرت نکھت اُدوت ہے
توں ہی چار و تو سیل، تر بیس پنچھی ہوت توں ہی میگھ ہو جی، کوت اور اکوت ہے
توں ہی بن ناری بھرتا، کی رسلین ہوت توں ہی ہوئی کی ستر بیس اِن تن لوت ہے
جاگ پرین جھو نشوں جیوں سپن، لوگ ہوت تو نہیں اچنبھا ری لوک جاگت کو موہ ہے

یعنی تیرے ہی اشارہ سے دنیا پیدا ہوتی ہے، تو ہی آسمان بنکر ستارون کو روشن کرتا ہے، تو ہی اربعہ عناصر اور پہاڑ، درخت، چرند، اور پرند بنجاتا ہے، تو ہی بادل بنکر بیحساب بارش کرتا ہے، تو ہی عورت کے قالب مین اگر مرد کا راحت رسان ہے، تو ہی بالآخر موت کی صورت مین جان کا دشمن ہے، تو جس طرح کہ جاگنے کے بعد خواب بالکل وہم معلوم ہوتا ہے، اسی طرح خداشناسون کے نزدیک یہ دنیا تمامتر خواب ہے،

سید برکت اللہ بہت بڑے فقیہ تھے، بھاشا مین شعر کہتے تھے اور پیمی تخلص کرتے تھے بھاشا مین جو ان کے نظمون کا مجموعہ ہے اس کا نام خود پیم پرکاس رکھا تھا، مرزا مین ان کا بہت سا کلام نقل کیا ہے، ہم صرف ایک دوہے پر اکتفا کرتے ہین،

چکھ جوگی کنٹھا گرین ارن ہسیام اور سیت
آنسو بوند سمرن لین درسن بھچھیا ہیت

یعنی آنکھیں ایک ریاضت کش جوگی ہین جو سرخ، سیاہ اور سفید دانون کا مالا پہنے ہوئے اور آنسوون کی تسبیح لئے ہوئے دیدار کی بھیک کی طالب ہین،

ان بزرگون کے سوا اور بہت سے اہل کمال گذرے ہین جنھون نے بھاشا زبان کی

انشاپردازی اور شاعری مین ناموری حاصل کی اور جن کے حالات مختلف تذکرون مین مل سکتے ہین، کیا ان واقعات کے بعد بھی ہمارے ہندو دوست کا یہ بیان قابل تسلیم ہے کہ مسلمانون نے کبھی ہندو لٹریچر پر توجہ نہین کی اور جو کرنا چاہتا تھا وہ کافر قرار پاتا تھا، ہمارے ہندو دوستون کو یاد رکھنا چاہیے کہ مسلمانون سے زیادہ بے تعصب قوم، نہ صرف دنیا کی پچھلی تاریخ بلکہ موجودہ اور آیندہ زمانہ بھی قیامت تک نہ پیش کر سکے گا۔

(الندوہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ء)

"تحفۃ الہند"

مسلمانون کی توجہ برج بھاشا پر، برج بھاشا کا فن معانی و بیان۔

یاد ہوگا کہ ہمارے ایک معزز ہندو دوست نے اردوئے معلی مین ایک مضمون لکھا تھا جسمین اس پر معترضانہ افسوس ظاہر کیا تھا کہ مسلمانون نے ۸ سو برس تک اس ملک مین حاکم رہکر کبھی ملکی زبان کی طرف توجہ نہ کی ہم نے اس کا جواب الندوہ مین بہ تفصیل دو نمبرون مین لکھا تھا، جسمین بتایا تھا کہ مسلمانون نے ہندوٗون کی زبان کے ساتھ کس قدر اعتنا کیا، اور خود برج بھاشا مین کس درجہ کی قابلیت پیدا کی، یہ مضمون بھی اس سلسلہ کا گویا تتمہ ہے،

تحفۃ الہند جو ہمارے مضمون کا عنوان ہے، ایک کتاب کا نام ہے، جو اورنگزیب عالمگیر کے زمانہ مین تصنیف ہوئی، مصنف کا نام میرزا خان بن فخر الدین محمد ہے، دیباچہ مین لکھا ہے کہ مین نے یہ کتاب شہنشاہ عالمگیر کے زمانہ مین شہزادہ اعظم شاہ کے مطالعہ کے لئے تصنیف کی کتاب کا موضوع ہندوٗون کا فن بلاغت اور عروض و قافیہ وغیرہ ہے، اسمین ۷ باب ہین،

۱- پنگل یعنی علم عروض	۲- تک، یعنی قافیہ،
۳- النکار یعنی علم بدیع	۴- سرنگار رس یعنی عشق و محبت،
۵- سامدک یعنی علم قیافہ	۶- کوک، یعنی علم النساء،

۷- لغات ہندی، اس مین برج بھاشا کے ضروری کثیر الاستعمال الفاظ لکھے ہین

اور ان کے معنی بتائے ہین،

یہ کتاب عالمگیر کے زمانہ مین تصنیف ہوئی ہے، اور اس کے سب سے چہیتے اور منظور نظر فرزند کے مطالعہ کے لئے تصنیف ہوئی ہے، عالمگیر کی نسبت اس کے مخالفون کا دعویٰ ہے کہ وہ تعصب کا دیوتا تھا، اور اس نے ہندوؤن کی نہ صرف عمارات، بلکہ ان کے لٹریچر کو بھی مٹا دینا چاہا تھا، اور اس لئے ان کی تمام درسگاہین اور پاٹ شالے بند کرا دیئے تھے،

یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تاریخ کا مسلمہ مسئلہ ہے کہ عالمگیر ملک کے ایک ایک جزئی واقعہ سے اس قدر واقفیت رکھتا تھا کہ کسی حصۂ ملک کا ادنیٰ سا واقعہ بھی اسکی نگاہ تجسس سے مخفی نہیں رہ سکتا تھا، باوجود اس کے برج بھاشا کو جس قدر اس کے زمانہ مین ترقی ہوئی مسلمانون نے جس قدر اس کے زمانہ مین ہندی کتابون کے ترجمے کئے، اور خود جس قدر برج بھاشا مین نظم و نثر لکھی کسی زمانہ مین اس قدر ہندی کی طرف التفات نہین ظاہر کیا گیا تھا، چنانچہ اسکی تفصیل ہم ایک مستقل مضمون مین لکھ چکے ہین، یہ کتاب (تحفۃ الہند) اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے،

یہ ناممکن ہے کہ عالمگیر جو اپنے بیٹون کی ایک ایک حرکت سے خبر رکھتا تھا، اسکی نظر سے ایک ایسی کتاب جو اس کے محبوب ترین شہزادہ کے لئے لکھی جائے مخفی رہ جائے، نعمت خان عالی نے وقائع لکھی اور عالمگیر سے چھپانے کی بے انتہا کوشش کی، لیکن چھپ نہ سکی،

اس کتاب مین سے ہم صرف صنائع و بدائع کے حصہ کا اقتباس درج کرتے ہین، جس سے اندازہ ہوگا کہ ہندی زبان کے فن بدیع کو عربی سے کیا نسبت ہے؟ اس موقع پر یہ بات بھی اظہار کے قابل ہے کہ مصنف نے ہندی صنائع و بدائع کی تفصیل لکھ کر

چند صنعتین خود اضافہ کی ہین، ان کے خود نام رکھے ہین، اوران صنعتون مین خود ہندی اشعار لکھکر، درج کتاب کئے ہین، جس سے اندازہ ہو سکتا ہو کہ مصنف کو خود اس زبان مین کہان تک قدرت تھی، یہ صنائع اکثر بلکہ قریبًا کل عربی سے لئے ہین، اورعربی نامون کا ترجمہ بھاشا مین کردیا ہو،

بھاشا مین علم بدیع کو النکار کہتے ہین، چونکہ بلاغت کا اصلی کام جذبات اوراحساسات پراثر ڈالنا ہو، اس لیے النکار کی تین قسمین قرار دی ہین،

۱- نورس، اسمین تمام احساسات کا استقصا، کیا ہو اوران کی نو قسمین قرار دی ہین جنکی تفصیل حسب ذیل ہے،

سرنگار رس، اس کی دو قسمین ہین، سنجوک، بیوک سنجوک یعنی وصال وفراق،

ہاسیہ رس۔ مسرت وخوشی۔ کرنا رس رحم وہمدردی،

ویر رس۔ شجاعت وبہادری رودر رس۔ غیظ وغضب،

بھے رس۔ خوف وبیم۔ بی بھبس رس۔ نفرت وکراہت،

شانت رس سکون واطمینان۔ ادبھت رس۔ استعجاب،

عربی اورفارسی زبان مین اس قسم کی سائنٹفک تقسیم نہین ہو اوراس لحاظ سے ہندی کو فارسی اورعربی پر ترجیح ہے،

۲- سے نیگ کسی مضمون کو لطیف، نازک، اورشوخ پیرایہ مین ادا کرنے کو کہتے ہین، مثلاً عورت اپنے محبوب شوہر سے جو کسی اورعورت پر عاشق ہو کہتی ہے کہ پیارے تیری پیشانی پر جو سرخی ہے، یہ تیری سرخ ٹوپی کا عکس ہے، یا رقیب کی حنا کا اثر ہے،

سوال سے ظاہر صرف اس قدر مفہوم ہوتا ہی کہ عورت کو اپنے شوہر سے رقیبہ کے پاس جانے، اور اس سے ملنے کی شکایت ہی لیکن در پردہ وہ یہ بات ثابت کرنا چاہتی ہی کہ شوہر نے رقیبہ کے پاؤن پر پیشانی رگڑی ہے جس سے پیشانی مین سرخی آگئی ہی یہ وہ صنعت ہی جسکو عربی مین تعریض کہتے ہین،

سنسکرت کا انشا پرداز اس صنعت کو اس قدر وسعت دیتا ہی کہ الفاظ اور عبارت کی ضرورت نہین صرف حالت کا دکھا دینا بھی اس صنعت مین داخل ہے، مثلاً محبوب، رات بھر کا جاگا ہوا کسی صحبت سے آیا ہے، جس کی وجہ سے بال پریشان ہین، آنکھین مخمور ہین، انگڑائیون پر انگڑائیان آرہی ہین، عاشق زبان سے کچھ نہین کہتا، صرف آئینہ لاکر سامنے رکھ دیتا ہے کہ یہ سب کچھ کہدیگا، یہ بھی اسی صنعت مین داخل ہی،

۴- اُپمان اس کے معنی **تشبیہ** کے ہین، تشبیہ ایک نہایت لطیف صنعت ہے، عربی مین اسکو نہایت وسعت دی ہی، اور اس کی بہت سی قسمین کی ہین، بھاشا مین بعض باتین تو مشترک ہین مثلاً **مکہ اپمان** یعنی جب تشبیہ کے الفاظ مذکور ہون، مثل چون، مثل وغیرہ، **لُپت اپمان**، حرف تشبیہ مذکور نہین لیکن مقدر ہے جیسے "قند لب" یعنی لب چون قند، اسکو عربی مین استعارہ کہتے ہین،

لیکن بعض باتون مین جدت ہی، مثلاً،

مالُو اپمان، تشبیہ کا یہ طریقہ عربی اور فارسی مین نہین، یا ہی تو اس کا کوئی خاص نام نہین، یہ وہ صورت ہے کہ مشبّہ بہ کے اجزا اور عوارض سے تشبیہ دیتے ہین، مثلاً چاند کی تشبیہ مین کہا جائے کہ وہ ایک باغ ہی، اسمین جو سیاہی ہے، وہ درختون کی چھاؤن ہی اسکی کرنین درختون کی ٹہنیان ہین، اس کو تشبیہ مرکب کہہ سکتے ہین، لیکن کسی قدر اس سے

مختلف الصورۃ ہے،

شر نکھلا اپمان، اسمین سلسلہ بہ سلسلہ تشبیہ دیئے جاتے ہین، یعنی ایک چیز کو ایک چیز سے تشبیہ دی، پھر اسکو کسی اور چیز سے تشبیہ دی، پھر اسکو بھی کسی اور چیز سے تشبیہ دی،

اننیتی اپمان، یہ وہ صورت ہو جسکو فارسی مین تشبیہ الشی بنفسہ کہتے ہین یعنی کسی شے کو خود اسی شے سے تشبیہ دینا، مثلاً فارسی مین ع

چو تو گر کسے باشد آن ہم توئی

اردو مین آج کل کہتے ہین وہ شخص آپ اپنا نظیر ہے،

حقیقت مین یہ مبالغہ کی ایک صورت ہے یعنی جب یہ کہنا ہوتا ہو کہ اس شخص کی نظیر نہین، تو یون کہتے ہین کہ وہ اپنا آپ ہی نظیر ہے، اور کوئی اسکا نظیر نہین، اس صنعت کو فارسی مین اور بھی ترقی دی ہے یعنی یون کہتے ہین کہ وہ " خود بھی اپنا نظیر نہین " اردو مین کسی کا مصرع ہو، ع

تم سے جب تم ہی نہین پھر کوئی تم سا کیا ہو

النکار، یہ ایک عام لفظ ہو جس کے معنی صنعت و بدیع کے ہین سنسکرت مین اسکی بہت سی انواع ہین، ان مین سے، از یادہ متداول ہین، جنکی تفصیل حسب ذیل ہو،

وترکتا النکار یہ وہ صورت ہو کہ جس چیز سے ممدوح کو تشبیہ دیتے آئے ہین، اس مین عیب ثابت کیا جائے تاکہ ممدوح کی ترجیح ثابت ہو، مثلاً سخاوت اور فیاضی مین ممدوح کو بادل سے تشبیہ دیتے ہین، لیکن عنصری کہتا ہو ؎

او ہمی بخشد و ہمی گرید　　　تو ہمی بخشی و ہمی خندی

یعنی بادل برستا ہو تو روتا جاتا ہو اور تو برستا ہو تو ہنستا ہو،

درودّ ہا بھاس النکار یعنی عبارت کے معنی واقع مین صحیح ہون لیکن بظاہر غلط معلوم ہون جب ایک لفظ کے معنی مختلف ہوتے ہین، تو اس صنعت سے کام لیتے ہین مثلاً بھاشا مین سیام، سیاہ کو بھی کہتے ہین، اور معشوق کو بھی، اسی طرح لال، سرخ کو بھی کہتے ہین اور محبوب کو بھی، اب اگر یہ کہا جائے کہ سیام زرد ہے تو بظاہر غلط ہوگا کیونکہ سیاہ چیز زرد نہین ہو سکتی، لیکن اگر سام کے معنی محبوب کے لئے جائین تو یہ جملہ صحیح ہو سکتا ہے،

عربی مین اس صنعت کو نہایت وسعت دی ہے، مقامات حریری مین سو فقہی سوال اور جواب ہین، جوابات تمامتر غلط معلوم ہوتے ہین لیکن واقع مین صحیح ہین، مثلاً ایک سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص وضو کے بعد نعل کو چھوئے تو کیا حکم ہے، جواب دیا ہے کہ وضو ٹوٹ جائیگا نعل عربی مین جوتی کو کہتے ہین اور یہی معنی زیادہ متداول ہین لیکن نعل عورت کو بھی کہتے ہین اور شافعیون کے نزدیک عورت کے چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے،

سکارن ات بر یکھیا، حسن تعلیل کو کہتے ہین، یہ صنعت عربی اور فارسی مین بہت مستعمل ہے، بھاشا مین اس کے نہایت لطیف نئے نئے پیرایے ملتے ہین، مثلاً چاند معشوق کا حسن چرا کر آسمان پر بھاگ گیا، اسی وجہ سے ہمیشہ چورون کی طرح رات کو نکلتا ہے فارسی کا شاعر کہتا ہے، ؎

از شرم ابروانِ بلندِ تو ماہِ نو ۔۔۔ خود را چنان نمود کہ کس دید و کس ندید

یعنی معشوق کے ابرو کی شرم سے، ماہِ نو اس طرح چھپ کر نکلا کہ کسی نے دیکھا، کسی نے نہین دیکھا،

اکارن ات بر یکھیا، مبالغہ اور اغراق کو کہتے ہین،

انکرت النکار، لف ونشر کو کہتے ہین،

سندیھا النکار، یعنی دو چیزون مین جان بوجھکر شک کرنا مثلا یون کہین کہ یہ چہرہ ہے، یا چاند، زلف ہے، یا سانپ، عربی مین اسکو تجاہل عارفانہ کہتے ہین،

سیچمان النکار، یعنی الفاظ و عبارت کے بغیر کسی مطلب کو محض اشارے و کنایے سے ادا کرنا، مثلاً عاشق معشوق سے سوال کرتا ہو کہ مین کب آؤن؟ معشوق کچھ جواب نہین دیتا بلکہ اسکی بجائے ایک گورے چٹے آدمی کو نیلگون برقع پہنا کر بھیجتا ہو جس سے یہ اشارہ ہوتا ہو کہ جب چاند ڈوب جائے اور تاریکی چھا جائے تب آنا،

اپنا ایدلیسار النکار، کسی پر بات ڈھال کے کہنا، مثلاً ایک وفا کیش معشوقہ کا عاشق آیا ہے، وہ دوسرے شخص کی طرف مخاطب ہو کر کہتی ہو کہ آہ! آج میرا شوہر ایک کام کو گیا ہے ساس بھی کہین گئی ہو، گائے بھینس کا باندھنا مجھ پر کس قدر شاق ہو، اور اندھیری رات مین مجھکو سخت ڈر معلوم ہوتا ہو، لیکن ان باتون کا اصلی مخاطب درحقیقت عاشق ہو، اردو فارسی مین اس کی مثالین نہایت کثرت سے ملسکتی ہین، لیکن مصنف نے جو مثال دی ہے، اس سے ہندوستان کی قدیم طرز معاشرت کا اندازہ ہوتا ہو،

ات سیوکت النکار، اس کی چار قسمین ہین یعنی

نگر جادھوسان، یعنی مشبہ بہ کو ذکر کرکے مشبہ مراد لیتے ہین، مثلاً یہ کہ چاند، سانپ، ہرن، چیتا، میرا دل اوڑا لے گئے، رخسار، زلف، آنکھ، کمر کو چاند، سانپ ہرن اور چیتے سے تشبیہ دیتے ہین، لیکن اس جگہ خود ان چیزون کو بول کر رخسار وغیرہ مراد لیا ہو،

بزکتیسا تتھا بھان، اس مین تشبیہ کا شائبہ بھی باقی نہین رہتا، اور نہ مشبہ و مشبہ بہ کا ذکر ہوتا، بلکہ مشبہ کی نفی کرکے اسکو عین مشبہ بہ فرض کر لیتے ہین، مثلاً کہتے ہین، کہ اب تم وہ نہین رہے، بلکہ دوسری چیز ہو گئے،

کارن کالج پڑتجی، اس صنعت مین مسبب سبب سے پہلے واقع ہوتا ہی، مثلاً جرم مواخذہ کا سبب ہی لیکن یون کہتے ہین اس شہر مین عجیب رسم ہے کہ گناہ کرنے سے پہلے مواخذہ کرتے ہین،

جدّیارتھ، اس مین مشبہ کو مشبہ بہ پر ترجیح دیتے ہین، مثلاً چاند سے معشوق کو تشبیہ دیتے ہین، لیکن اگر یون کہین کہ چاند معشوق کے برابر اس وقت ہو سکتا ہی، کہ اس کے یاقوت کے مثل لب موتی کی طرح دانت، سانپ کی طرح زلف اور ہرن جیسی آنکھین ہون،

عربی و فارسی مین اسکی مثالین کثرت سے ہین،

اچھر جتھکا النکار، یعنی صنعت سوال وجواب، فارسی مین یہ صنعت نہایت کثرت سے مستعمل ہے، لیکن بھاشا مین یہ جدت ہو کہ مسلسل سوالات کئے جاتے ہین، اس کے بعد صرف ایک ایسا مفرد لفظ بولتے ہین، جو کل سوالون کا جواب ہوتا ہو، مثلاً ان سوالات کے جواب مین کہ زمین و زبان کی روشنی، بینائی، انسان کی معاش کا سبب کیا ہی، صرف عین کا لفظ کافی ہوگا کیونکہ عین آفتاب، آنکھ، سونا کو کہتے ہین، اور وہ ان سوالات پر حاوی ہی،

بھرمان النکار، مغالطہ مین پڑنا، مثلاً یہ کہ میرا دل معشوق کے تل کو دانہ سمجھکر اسکی زلف کے جال مین جا پھنسا، ایک ہندی شاعر نے اس مضمون کو عجیب لطیف پیرایے مین ادا کیا ہے، وہ کہتا ہی کہ ایک بھونرا طوطے کی چونچ کو ڈھاک کا پھول سمجھ کر رس چوسنے کے لئے اس پر جا بیٹھا، طوطے نے اس کو جامن کا پھل سمجھا اور نگل گیا،

ان صنائع مین سے ہم نے بہت سے چھوڑ دیئے، جس کی وجہ یہ ہے کہ اولاً تو ان مین سے بہت سے فارسی اور عربی مین بہ کثرت مستعمل ہین، دوسرے سنسکرت الفاظ کا تلفظ ہم سے صحیح ادا نہین ہوتا،

اس موقع پر یہ نکتہ خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اگرچہ ہمارے انشاپردازون نے سنسکرت اور برج بھاشا کے علم ادب کے نکتہ نکتہ کو سمجھا اور اس سے بہت فائدہ اٹھایا لیکن اسکے فیض سے وہی محروم رہگیا جو سب سے زیادہ حقدار تھا، یہ ظاہر ہے کہ اردو بھاشا سے نکلی اور اس کے دامن مین پلی لیکن بھاشا سے جو سرمایہ اسکو ملا، صرف الفاظ تھے مضامین اور خیالات سے اسکا دامن خالی رہا بخلاف اس کے عربی زبان جسکو بھاشا سے کسی قسم کا تعارف نہ تھا، وہ سنسکرت اور بھاشا دونون سے مستفید ہوئی (تفصیل اسکی آگے آئیگی)

اس کی وجہ یہ ہوئی کہ آج سے ۵۰ برس پہلے مسلمان، اردو کو کوئی علمی زبان نہین سمجھتے تھے، خط کتابت تک فارسی مین تھی، اردو شعرا جسقدر گذرے ان مین سے ایک بھی عربی کا فاضل نہ تھا، یا یون کہو کہ کوئی عالم اردو کو اس قابل نہین سمجھتا تھا کہ اسمین انشاپردازی یا شاعری کا کمال دکھائے، علمی زبان اس وقت صرف عربی تھی، اس لئے جہان سے جو سرمایہ ملتا تھا اسی کے خزانہ مین جمع کیا جاتا تھا، بہرحال ہندی شاعری کے مضامین، عربی زبان مین بعینہٖ نقل ہوئے یعنی علمائے ادب نے سنسکرت اور بھاشا کی نظمون کا بعینہٖ عربی مین ترجمہ کیا، ہم چند مثالین ذیل مین لکھتے ہین، یہ مثالین سبحۃ المرجان سے لی گئی ہین، مولوی غلام علی آزاد نے ہر جگہ تصریح کردی ہے کہ وہ ہندی سے ترجمہ کی گئی ہین،

الی ان هوی مرتاحاً مدیما نضارها	لقد نحلت فی یوم هجر حبیبها
علی ساعد الملاک ضاق سوارها	ولما اتاها مخبر عن قدومه

(یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ہندی مین عاشق، عورت ہوتی ہے، اور مرد معشوق ہوتا ہے)

یعنی جس دن معشوق نے سفر کیا مین اس قدر دبلی ہوگئی کہ ہاتھ کے کڑے ڈھیلے ہوکر گر پڑے لیکن جس دن قاصد نے آکر معشوق کے آنے کی خبر دی، اور مین نے کڑون کو پہننا چاہا

تواب وہ تنگ ہو گئے اور چڑھتے نہ تھے،

ما لاح فی شفتیک کحل سراق　　انی ابینہ بحسن بیان

ختمت علی شفتیک ذات تدللٍ　　کیلا تکلمنی علی الاحیان

واقعہ یہ ہے کہ شوہر کسی اور محبوبہ سے مل کر آیا ہے، اور چونکہ اس نے اس کی سرمگین آنکھوں کو چوما تھا، اس لئے اس کے ہونٹوں پر سیاہی لگ گئی ہے اب عورت شوہر سے کہنے آئی ہے کہ تیرے ہونٹوں پر جو سیاہی ہے میں بتاؤں کیوں ہے، اور کہاں سے آئی ہے کسی کافر ادا نے تیرے ہونٹوں پر مہر کر دی ہے، کہ تو کبھی مجھ سے بات نہ کرے،

رات المهاة العامرية صدره　　بالظفر مکلوما فقالت مرحبا

هذا الهلال تبتغيه طبعتي　　روحی فداءک لا العبا

ایک بھولی کمسن عورت نے اپنے شوہر کے سینہ پر ناخن کا خراش دیکھا جو ناخن کے مشابہ تھا، بھولے پن سے شوہر سے کہتی ہے کہ یہ تو نئی رات کا چاند ہے مجھکو بہت پیارا معلوم ہوتا ہے، مجھکو دیدو، میں اس سے کھیلوں گی،

بات الحبيب مع الحناء بارحة　　حتى بدت حاجب من احظر التهب

ومن اسرته وحبته فی الصبح فانقبضت　　لما رات طرفه المجمی کالسکب

قالت فتاه لها فی العین متعكس　　یاقوت سیمت النقر من لهب

تبسمت من سماع القول واضحة　　فضل الجمال علی ضوء من الشنب

فصار یغضب للصهباء کیف فدت　　تعلی رضابك وازدرت عن الادب

قالت له لا تکن غضبان مرحمة　　فحمت طرفك خمر عن الغضب

شوخی ادا، عارفانہ تجاہل اور نزاکت خیال کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی، او دصرف

ان اشعار سے اندازہ ہو سکتا ہی کہ بھاشا کی شاعری کس قدر لطیف اور نازک ہی،

صورتِ حال یہ ہے کہ شوہر رات بھر کا جاگا ہوا کہین سے آیا ہی، اور اسکی آنکھین سرخ ہین، عورت کو بدگمانی ہوتی ہی کہ کسی محبوبہ کے ہان رات گذاری ہے، اس لئے آنکھین سرخ ہین، ایک سہیلی بدگمانی کو مٹانا چاہتی ہی، اور کہتی ہی کہ نہین یہ تمھارے ہونٹون کی سرخی کا عکس ہے، عورت شرما کر آنچل کا گوشہ منہ پر رکھ لیتی ہے (اس سے اصل مین یہ غرض ہی کہ اگر ہونٹون کی سرخی تھی تو وہ آنچل مین چھپ گئی، اب کیون سرخی نظر آتی ہی) شوہر غصہ کی صورت بنا کر کہتا ہے کہ شراب کو کیا حق ہی جو تیرے آب دہن کا مقابلہ کرے، عورت کہتی ہی، آپ غصہ نہ ہون، مین سمجھی، آپ کی آنکھین غصہ کی وجہ سے سرخ ہین،

اردو زبان مین اگر اس لطافت کی کوئی نظیر ہے، تو یہ شعر ہے،

نہ مین سمجھا نہ آپ آئے کہین سے   پسینہ پونچھئے اپنی جبین سے

جس زمانہ مین مولوی غلام علی آزاد بلگرامی اورنگ آباد دکن مین تھے، ان کے ماموں مولانا طفیل احمد نے بلگرام سے ایک ہندی نظم عربی مین ترجمہ کرنے کے لئے بھیجی آزاد نے حسب ذیل اسکا ترجمہ کیا (سبحۃ المرجان صفحہ ۲۵)

زارت سعاد بلا وعد فقلت لها   یا مرحبا بك من الفلات فی التعب

قالت لقد جاءنی غیم و کلفنی   انی احوی الیک الارض بالهرب

فقلت کیف طویت الارض ماشیة   وقت الدجی و سکوب الدمع من سحب

قالت هدانی شعاع البرق حیرة   فمثله سرت فی القیعات والکثب

فقلت سرت فی جنح الدجی غلط   بلا رفیق شریك فی خطی الطلب

قالت خیالك طول السیر کان معی   فی حالة من تمادی العین لم یغب

یعنی معشوقہ میرے پاس اچانک آئی، مین نے کہا خیر ہے؟ اس وقت کیونکر تکلیف کی، بولی کہ بادل آگئے، انھون نے مجھکو آمادہ کیا کہ تیرے پاس آؤن، مین نے کہا رات اور بادل کی تاریکی مین راستہ کیونکر نظر پڑا، بولی کہ بجلی نے رہنما ساتھ کر دیا تھا، مین نے کہا لیکن رات کو اکیلے سفر کرنا کسی طرح مناسب نہین، بولی کہ مین تنہا نہین آئی تیرا خیال برابر میرے ساتھ رہا، اور ساتھ آیا،

واقعات مذکورۂ بالا کو پڑھکر ایک دفعہ اور ہمارے ہندو دوست کے وہ الفاظ یاد کرو کہ مسلمانون نے کبھی ہندوستان کے لٹریچر سے فائدہ نہین اٹھایا، ہم وہ لوگ ہین کہ، ـ

ہیچ گہ ذوقِ طلب از جستجو بازم نداشت　　دانہ می چیدم من آن روزے کہ خرمن داشتم

(الندوہ، فروری ۱۹۱۱ء)

مولنا شبلیؒ کے مجموعۂ مضامین کی پہلی جلد

فہرست مضامین

لکھائی چھپائی اعلیٰ قیمت:— عہ

منیجر

(طابع و ناشر محمد ادریس وارثی)

سلسلۂ دار المصنفین

(۴۰)

مقالاتِ شبلی

(تعلیمی)

جلد سوم

مولٰنا شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ

کے

تمام تعلیمی مضامین کا مجموعہ جن کو مختلف رسالوں سے یکجا کیا گیا ہے۔

باہتمام مسعود علی ندوی

سنہ ۱۳۵۱ھ
در مطبع معارف اعظم گڈھ طبع شد
سنہ ۱۹۳۲ء

فہرستِ مضامین

مقالاتِ شبلی جلد سوم (تعلیمی)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مسلمانون کی گذشتہ تعلیم

"مسلمانون کی گذشتہ تعلیم" میرے مضمون کا عنوان ہو یہ ایک ایسا وسیع مضمون ہو کہ اگر اسکے ذیل مین مسلمانون کے تمام علمی کارنامے بیان کئے جائین تو شاید ناموزون نہ ہو لیکن مین نے اپنے مضمون کے لئے ان مین سے صرف دو بحثین انتخاب کی ہین (۱) مسلمانون نے علوم و فنون کس طرح حاصل کئے، (۲) دنیا کی تمام قومون کو ان علوم کی کیونکر تعلیم دی، غالباً تعلیم کے خاص لفظ سے جو اس مضمون کا اصلی عنوان ہے، یہی دو بحثین قوی تعلق رکھتی ہین،

مسلمانون نے جن علوم کی اشاعت کی ان مین سے کچھ انکے ذاتی علوم ہین جو خود انھون نے ایجاد کئے، یا خاص طرح پر انکو ترتیب دیا، کچھ ایسے ہین جو دوسری قومون سے حاصل کئے اور پھر ایسی ترقی دی کہ گویا انھین کے ایجادات سے ہین، میرا مضمون گو ان دونون قسم کے علوم سے تعلق رکھتا ہی لیکن علوم کی ذاتی حیثیت سے نہین، بلکہ انکی طرز تعلیم کے اعتبار سے،

مین افسوس کے ساتھ اس بات کا اعتراف کرتا ہون کہ ان دو بحثون کی تفصیل کیلئے جس قسم کے ضروری حالات درکار ہین یعنی فلسفۂ یونانی وغیرہ کے ترجمے، ترجمون اور تصنیفات کے نام

اسلامی دارالعلوم اور مدرسون کی تفصیل، طریقۂ درس، نصابِ تعلیم غرض اس قسم کے حالات مجھ کو
کسی مستقل تصنیف مین نہین ملے، اور شاید لکھے بھی نہین گئے کشف الظنون جیسی بڑی فہرست مین
صرف ایک کتاب کا نام ملتا ہو لیکن غالبًا خود کشف الظنون کے مصنف کو بھی اسکا دیکھنا نصیب
نہین ہوا چند اجمالی حالات جو گبن کی رومن امپائر، ہسٹری آف فلاسفی مصنفہ ہنری لوئیس و
واقوام المسالک، چیمبرس انسائیکلوپیڈیا و برٹانیکا انسائیکلوپیڈیا وغیرہ مین ملتے ہین، وہ اس غرض کیلیے
بے شبہ مفید ہین، کہ جب مسلمانونکی پچھلی ترقی کے عام ذکر مین کسی پرجوش خطیب کی زبان سے ادا ہون تو سننے
دلون کو ہلا دین لیکن ان سے ایک مفصل تاریخی آرٹیکل کیونکر مرتب ہو سکتا ہو، مین نے مختلف تاریخون
اور دوسری قسم کی تصنیفون سے جستہ جستہ مقامات سے کچھ حالات بہم پہنچائے ہین، اور غالبًا یہ پہلی
تحریر ہے جسمین اس قدر واقعات جمع کیے گئے ہین اصل مضمون شروع کرنے سے پہلے مین ایک اجمالی نظر
پر مسلمانون کے خاص علوم، انکی ابتدائی تاریخ اور سبب ایجاد کا تذکرہ کرنا مناسب خیال کرتا ہون"

اسلام سے پہلے گو عرب کی قومین رسمی علوم و فنون سے بالکل بے بہرہ تھین، تاہم ان
خانہ بدوش صحرائیون مین علمی مذاق کی جان پائی جاتی تھی، نظم و نثر انکا مایۂ خمیر تھا لیکن وہ طوطی
و بلبل کیطرح محض نیچرل فصیح اللسان نہ تھے بلکہ فصاحت و بلاغت کے دقیق نکتون تک انکی
نگاہ پہنچتی تھی، بازار عکاظ کے پرجوش مشاعرے اور انکے باہمی مباحثے اور نکتہ چینیان بتاتی ہین کہ
جو کچھ وہ کہتے تھے جانتے تھے کہ کیا کہتے ہین اور کیا کہنا چاہیے، **امرؤالقیس** اور **علقمۃ الفحل** کی شاعرانہ
نزاع کا ایک عام عورت نے جس خوبی سے فیصلہ کیا آج فن انشا کے بڑے ماہر بھی اس سے عمدہ
ریمارک نہین کر سکتے اسکے سوا نسب کے فخر اور رشتہ و قرابت کی پابندیون کی وجہ سے اہل عرب

سلہ یہ ایک نہایت ضخیم کتاب کئی جلدون مین ہے، جسمین قریبًا پچاس ہزار اسلامی تصنیفون کے نام اور ان کے
حالات ہین، یہ سات ضخیم جلدون مین بمقام لندن ۱۸۵۸ء مین چھاپی گئی ہی۔

انگلے کارناموں کو ایک تاریخی ترتیب کے ساتھ محفوظ رکھتے تھے،

اسلام نے آکر مذہب و معاشرت کیساتھ انکی علمی زندگی بھی بالکل بدل دی **قرآن مجید** کی پرتاثیر آیتوں نے شعراء اور خطیبوں کی زبانیں بند کردیں، اور چونکہ دوستانہ یا مخالفانہ سرگرمی نے تمام عرب کی دماغی قوتوں کا رخ اسلام کیطرف پھیر دیا تھا، پچھلے قصے تھوڑے دنوں کے لئے بھلا دیئے گئے اور علم الانساب و ایام العرب کا زور بھی گھٹ گیا، لیکن اسلام نے جس قدر چھینا اس سے بہت زیادہ عطا کیا **قرآن** کی برابری کرنے کے حوصلے بہت جلد پست ہوگئے اب شعراء اور خطیبوں کے لئے قرآن خود رہنما بنا، اور فصاحت و بلاغت کے متعلق بہت سے نئے اصول سکھا دیئے، زبان نہایت شستہ اور صاف ہوگئی اور اونٹ بکری کے قصوں کے علاوہ شعرا کو اخلاق اور تربیت کے بہت سے مضامین ہاتھ آگئے، یہی وجہ ہے کہ حسان، حطیئہ، ذوالرمہ، جریر، فرزدق، احوص کے کلام میں جو ملاحت اور برجستگی ہے شعرائے جاہلیت کے رجز و قصائد میں اسکا سراغ نہیں ملتا[1]،

قرآن نے عرب کے حق انشاء پر کیا اثر پیدا کیا،

تمام مذہبی علوم گویا **اسلام** کیساتھ پیدا ہوئے، زمانہ مابعد میں گو وہ کسی حد تک پہنچ گئے ہوں، لیکن کچھ شبہ نہیں کہ انکے ابتدائی اصول تمامتر **قرآن** پاک سے ماخوذ ہیں، اس کے اوامر و نواہی نے **فقہ** کی طرف رہبری کی، آیت توریث نے فرائض کا ایک مستقل فن قائم کیا، انبیائے سابقین کے حالات سے **قصص** کی ترتیب ہوئی، اعتقادات اور معاد کے متعلق آیتوں سے علم کلام استنباط کیا گیا، اور گو ایک مدت تک کسی قسم کی تدوین و ترتیب نہیں ہوئی، لیکن پیغمبر صلعم کی وفات کے بعد ہی ان علوم کی ابتدائی بنیاد قائم ہوگئی، اور دوسری صدی کے آغاز تک ہزاروں مسائل کا رواج ہوچکا تھا،

فقہ، فرائض، قصص، علم کلام،

قرآن مجید میں فرائض اور اعمال کا بیان اجمالی طریقے پر تھا، طریق عمل کی خصوصیتیں

---

[1] دیکھو تاریخ ابن خلدون کا زمانہ فصل ۴۹ از فصل ۶ ۔ ۲،

آنحضرت صلعم کے طریقِ عمل پر منحصر تھین، اس ضرورت سے آنحضرت صلعم کے اقوال و افعال کو متعلق روایتوں کے جمع کرنے کی طرف خیال مائل ہوا اور رفتہ رفتہ **علم الحدیث و اسماء الرجال و علم الدرایہ** پیدا ہو گئے، ان تحقیقات مین گو کسی قدر نکتہ چینی کیجائے، مگر عموماً بہ نصفت یہ فیصلہ کریگا کہ جس بے انتہا کوشش اور تفتیش سے مسلمانون نے پیغمبر صلعم کے اقوال و افعال محفوظ رکھے، دنیا کی کسی قوم مین اسکی نظیر نہین مل سکتی اور یہ کہ انسانی سعی اور جستجو کی یہ آخری سرحد ہے جہانتک مسلمان پہنچ گئے تھے،

حدیث، اسماء الرجال، علم الدرایہ

علم نحو

علم نحو اگرچہ کوئی مذہبی فن نہ تھا لیکن مذہبی ہی ضرورت سے اسکی تدوین کیطرف خیال مائل ہوا، اسلام دور دور دراز ملکون مین پھیلتا جاتا تھا اور سینکڑون نئی قومین اسمین شامل ہوتی جاتی تھین، دوسری زبانون کے الفاظ عربی زبان مین بہت جلد جگہ پاگئے تھے جس سے اندیشہ تھا کہ مشتقات اور اصولِ اعراب مین بھی فرق آجائے، اس قسم کے تصرفات سے جو صدمہ زبان پر پڑتا اسکا بہت بڑا اثر قرآن اور حدیث پر ہوتا، چند واقعات نے اس احتمال کو قوی کر دیا، اور بالآخر ابو الاسود دوئلی المتوفی ۶۹ھ جس نے تے خود اس قسم کے تجربے حاصل کئے تھے، مسائل نحو کی تدوین کیطرف مائل ہوا، اس نے چند قاعدے منضبط کئے جو رفتہ رفتہ وسعت حاصل کرتے گئے، ہارون رشید کے زمانہ مین خلیل بن احمد بصری المتوفی ۱۷۰ھ و سیبویہ و کسائی وغیرہ کی توجہ سے وہ ایک مستقل فن بنگیا جسکو متاخرین نے بھی بہت کچھ ترقی دی،

غرض مذہب کے متعلق جس قدر ضروری اور مہتم بالشان علوم تھے گویا مذہب کیساتھ پیدا ہوئے اور مسجدون کے صحن یا عام مجلسون مین اُن کے مسائل رواج پانے لگے، خود صحابہ کے عہد مین ایسے متعدد اشخاص[1] موجود تھے جو کثرتِ معلومات کیساتھ طرزِ استدلال، طریقِ استنباط، تخریجِ احکام مین اجتہاد کا حق رکھتے تھے، اور زمانہ مابعد مین جب صحابہ کے حالاتِ زندگی قلمبند

[1] ابن حزم نے انکی تعداد دہیں تک خیال کی ہی، دیکھو فتح المغیث مطبوعہ لکھنؤ صفحہ ۴۰۰

ہوئے تو وہ مجتہدین کے لقب سے پکارے گئے، کچھ لوگ ایسے تھے جو حدیثوں کے یاد رکھنے میں مشہور تھے، چنانچہ حضرت ابوہریرہؓ سے ۵۳۷۴، ابن عمرؓ سے ۲۶۳۰، انسؓ سے ۲۲۸۶، ابن عباسؓ سے ۱۶۶۰، جابرؓ سے ۱۵۴۰ حدیثیں مروی ہیں[۱]، چودہ صحابی مفسر تھے جو قرآن پاک کی فقہی اور تاریخی آیتوں کے متعلق نہایت کافی معلومات رکھتے تھے، باوجودیکہ ایک مدت تک قدیم یونانیوں کیطرح تعلیم و تعلم جو کچھ تھا زبانی تھا تاہم سیکڑوں ہزاروں اشخاص ان مسائل کے سیکھنے سکھانے میں مصروف تھے اور تمام ممالک اسلامیہ میں حدیثیں اور فقہ کے مسائل اسی تیزی سے رواج پا رہے تھے جسطرح خود اسلام قائم ہو رہا تھا عرب کی بلند حوصلگی اور عظمت کے لیے حجاز و یمن کی وسعت کافی نہ تھی اسلئے ہزاروں صحابہ سرزمین عرب سے نکلکر تمام نئے فتح کئے ہوئے ملکوں میں پھیل گئے اور بعضوں نے وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی اس طرح شام میں دس ہزار کوفہ میں ایکہزار حمص میں پانسو مصر میں کم و بیش تین سو صحابہ موجود تھے[۲] یہ لوگ جہاں گئے حدیثوں اور عام مذہبی مسائل کا ذخیرہ بھی اپنے ساتھ لیتے گئے، جو انکی عظمت و قبول کا بہت بڑا قوی سبب ہوتا تھا چنانچہ صرف اُن صحابہ کی تعداد جن سے لوگوں نے حدیثیں سیکھیں یا روایت کی کم از کم ڈیڑھ ہزار بیان کی گئی ہے،

ایک مدت تک کچھ اس تقلیدی خیال سے کہ آنحضرت صلعم نے حدیثوں کے قلمبند کرنے کی طرف خود توجہ نہیں فرمائی، اور کچھ اس وجہ سے کہ اہل عرب کو اپنے حافظہ کے بھروسے پر تدوین اور تصنیف کی چنداں پروا بھی نہ تھی، کاغذ اور قلم سے کام نہیں لیا گیا، مگر جسقدر زمانہ کو امتداد ہوتا جاتا تھا ان روایتوں کے دفتر تیار ہوتے جاتے تھے، جنکو زبانی محفوظ رکھنا، انسانی قوت کا کام نہ تھا غرض سنہ ۱۴۳ھ میں تالیف و تدوین شروع ہوگئی، ابن جریج نے مکہ میں، امام مالک نے مدینہ میں،

عہد صحابہؓ کے علماء

---

[۱] دیکھو فتح المغیث صفحہ ۳۰۳۔ [۲] ایضاً صفحہ ۳۰۸، مصر کے صحابہ کے نام و نسب اور ان کی تعداد سیوطی نے ایک مستقل رسالے میں لکھی ہے جس کا نام در السحابۃ ہے، دیکھو حسن المحاضرۃ فی اخبار مصر و قاہرہ مطبوعہ مصر سنہ ۱۲۹۹ھ صفحہ ۹۹۔

تصنیف و تدوین شروع ہوئی۔

اوزاعی نے شام میں، ابن ابی عروبہ اور حماد نے بصرہ میں، معمر نے یمن میں، سفیان ثوری نے کوفہ میں **حدیث** اور تفسیر کی کتابیں لکھیں، امام ابوحنیفہ نے دلائل کے ساتھ **فقہ** کو ترتیب دیا، ابن اسحٰق نے **مغازی و سیر** کی تدوین کی[1] یہاں تک کہ جب فضل بن یحییٰ برمکی کے اہتمام اور توجہ سے **کاغذ** بنانے کا **کارخانہ** جاری ہو گیا[2] تو یہ علوم و فنون گھر گھر پھیل گئے۔ جس کثرت کے ساتھ مذہبی تصنیفیں ہوئیں اسکا اندازہ اس سے ہو سکتا ہی کہ صرف تفسیر کے متعلق سو سے زیادہ ایسے مضامین پیدا ہو گئے جنکو الگ الگ علم کا لقب دیا گیا اور ہر ایک پر متعدد اور بعض پر سیکڑوں بلکہ ہزاروں کتابیں لکھی گئیں[3]،

علم بیان

اس زمانہ میں اور دو علم مذہبی ضرورت سے ایجاد ہوئے علم البیان و کلام[4]۔ اسلام کا جو بڑا معجزہ اور جو ہمیشہ استعمال کیا جا سکتا ہے **قرآن** تھا، اسکے معجزہ ہونے کا دعویٰ جب اہل عرب کے سامنے پیش کیا جاتا تھا، تو کسی دلیل لانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، کفار عرب گو انکار کرنا چاہتے تھے مگر انکا مذاق زباندانی اس دعوی کے تسلیم کرنے پر انکو مجبور کرتا تھا، وہ منہ سے انکار کرتے تھے مگر **قرآن** پڑھے جانے کے وقت انکی بے اختیاری حالت، بے ساختہ تحسین، بے تابانہ تاثر انکے اظہار کے خلاف شہادت دیتے تھے لیکن اس طرح پر یہ دعویٰ صرف عرب کے سامنے چل سکتا تھا۔ اہل عجم اولاً تو زبان عربی سے ناواقف، اور واقف بھی ہوں تو عرب کا سا قدرتی ذوق کہاں سے لائیں، اسلئے ضرورت پڑی کہ فصاحت اور بلاغت کے اصول مرتب کئے جائیں تاکہ دوسری قومیں اگر مذاق سے نہیں تو علمی طور پر اس دعوی کے تسلیم کرنے پر مجبور ہوں۔ اول اول جعفر برمکی وزیر ہارون الرشید اور جاحظ نے کچھ قاعدے لکھے[5] پھر متاخرین نے کلام کے ہر ایک حصہ کے متعلق مسائل استنباط کئے اور علامہ سکاکی

---

[1] تاریخ الخلفاء سیوطی، خلافت منصور واقعات ۱۴۳ھ۔ [2] مقدمہ ابن خلدون فصل ۱۰ از فصل ۳

[3] اتقان فی علوم القرآن میں مختصراً ان علوم اور ان کے متعلق تصنیفات کا تذکرہ کیا گیا ہے،

[4] مقدمہ ابن خلدون ذکر علم بیان،

کی مفتاح پر اس فن کا خاتمہ ہوگیا، علم البیان یونانیون کے ہان بھی تھا لیکن ہمکو معلوم ہی کہ انکے
خیالات سے مسلمانون کو بہت کم آگہی ہوئی بلکہ بالکل نہین ہوئی، تاہم ہم یقین کرتے ہین کہ اگر
یونانی زندہ ہوتے تو ہمارے علما کی وقتِ نظر اور قوتِ استنباط کی داد دیتے۔

علم کلام

علم کلام[1] اس وقت پیدا
ہوا جب یونانی علوم کے شائع ہونے سے مذہب اسلام فلسفہ سے ٹکرا گیا، اور عام ظاہر بین آنکھین
مذہبی اعتقادات کو بے پروائی کی نگاہ سے دیکھنے لگین لیکن محققین اسلام کو پورا بھروسا تھا کہ
سچ کو کوئی چیز صدمہ نہین پہنچا سکتی انھون نے غلط خیالات اور انسانی راؤن کو جو مذہب مین داخل ہو گئی
تھین چھانٹکر الگ کردیا، اور بزور منطقی دلائل سے یہ بات ثابت کی کہ فلسفۂ یونانی جس قدر کہ
اسلام کے اصلی مسائل سے مختلف ہی، خود غلط اور باطل ہی، امام غزالی کی تہافۃ الفلاسفہ اس فن مین پہلی تصنیف
ہی جسکا تتبع امام رازی وغیرہ نے کیا، اور اس ترقی کو پہنچایا کہ تہافتہ تقویم پارینہ کے برابر ہوگئی،

الٰہیات اور قرآن

اسلام اگرچہ فلسفہ سکھانے نہین آیا تھا، تاہم ذات باری کے متعلق اس نے جو کچھ بتایا وہ
فلسفہ کے بڑے حصے یعنی الٰہیات کی جان ہی، گبن صاحب لکھتے ہین:-

"محمدؐ کا مذہب شبہ اور ابہام سے آزاد ہی، اور قرآن وحدانیت کا عمدہ ثبوت ہی، خدا تعالیٰ
کے باب مین آپکا عقلی جوش مذہبی یہ تسلیم کرتا ہو کہ قابلِ عبادت ایک ذات غیر محدود اور قدیم
بدون کسی صورت اور مکان اور بدون اولاد و مشابہت کے ہی، جو ہمارے نہایت پوشیدہ
خیالات مین حاضر ہے، اور خاص اپنی قوت کی ضرورت سے موجود ہی، مسلمانون کے ہر دلعزیز
مذہب مین حکیم موحد شریک ہو سکتا ہی، اور یہ دین زمانہ حال کے ادراکات سے شاید بہت عالی
ہے کیونکہ جب ہم ماہیت غیر محسوس سے تمام خیالات زمان اور مکان و حرکت و مادہ و حس
و تاہل کو علیحدہ کردین، تو کون چیز تصور اور فہم کے لئے باقی رہیگی"

[1] یہ اس علم کلام کے علاوہ ہی جس کا ذکر اوپر ہو چکا،

مسلمانون کے مذہبی علوم کا یہ ایک مختصر سا نا تمام تذکرہ ہی، مسلمانون نے جن علوم و
فنون پر کتابین لکھین انکی تعداد تقریباً دو سو ہی، کشف الظنون اور مدینۃ العلوم مین انکا بیان
مع تصنیفات کی تفصیل کے مل سکتا ہی، مگر مجھکو یہ بھولنا نہ چاہیے کہ میرے مضمون کا عنوان مسلمانون
کی گذشتہ تعلیم ہی، نہ گذشتہ علوم، مذہبی علوم جس طرز سے تعلیم دیئے جاتے تھے انکا تفصیلی بیان
آگے آئیگا، مسلمانون نے جو کچھ دوسری قومون سے سیکھا وہ منطق، الٰہی[1]، ہندسہ، طبیعی، ہیئت تھے حساب

مسلمانون نے دوسری قومون سے کیا سیکھا،

طب مین بھی انھون نے زیادہ تر دوسری قومون کی شاگردی کی، اس بات کی بہت کم مثالین ہین
کہ مسلمان عالمون نے خود یونانی و سریانی زبانون کی تحصیل کی ہو اور اصل کتابون سے یہ علوم
سیکھے ہون، بے شبہہ خلفاء کے دربارون مین **مترجمون** کا ایک گروہ موجود تھا، مگر مسٹری لوئیس
صاحب کے چبھتے ہوئے اعتراض کا کچھ جواب نہین ہو کہ ان مین اکثر **عیسائی** تھے حنین حبیش ثابت یوحنا
اسحٰق یعقوب کندی وغیرہ جو بہت بڑے مترجم مشہور ہین سب عیسائی تھے **حکماے اسلام** مین

فلسفہ یونانی کے مترجمین اکثر عیسائی تھے،

صرف فارابی ایک ایسا شخص ہی جو ان زبانون کا پورا ماہر تھا، اور اسنے خود ایک عیسائی عالم یوحنا
بن خیلان سے یہ علوم اور زبانین سیکھی تھین، ارسطو کی کتابون کی شرح اور توضیح مین بوعلی سینا
اور ابن رشد بہت زیادہ نامور ہین، اور یورپ نے بھی اسکا اعتراف کیا ہی، تاہم مجھکو شبہہ ہے
کہ ان دونون مین سے ایک کو بھی یونانی یا سریانی زبان آتی ہو،

ترجمے مختلف عہدون کی کوششین ترجمون کی صحت و غلطی عام رائے

عام مورخین کا بیان ہی کہ اول جسنے **ترجمون** کی بنیاد ڈالی وہ **دولت عباسیہ** کا
دوسرا خلیفہ ابوجعفر منصور تھا، لیکن میرا خیال یہ ہی کہ منصور کے حق مین مورخین کی یہ ایک بیجا فیاضی

[1] خاص فلسفیون کی الٰہی مراد ہی، ورنہ مسلمانون نے الٰہی کے عمدہ مسائل خود قرآن مجید سے حاصل کئے تھے،

سے ، ہمکو دولت بنی امیہ مین بھی فلسفہ کا پتہ ملتا ہے، اور اس کو تو اور زیادہ مدت گذری کہ عرب پر فلسفہ کا پرتو پڑنا شروع ہو چکا تھا، امیر معاویہ کے دربار مین ابن آثال نامی ایک عیسائی طبیب تھا، جس نے یونانی زبان کی بعض کتابین عربی مین ترجمہ کین[1]، اور ان کا پوتا خالد بن یزید المتوفی ۸۵ھ تو درحقیقت حکیم بنی امیہ کے لقب کا مستحق تھا، اُس نے مریانس نام ایک رومی راہب سے کیمیا اور طب پڑھی تھی، اس نے یونانی زباندانون کو جمع کیا اور ترجمے کی خدمت دی،

اُس کے عہد کا مشہور مترجم اصطفن تھا، جس نے چند اور مترجمون کی اعانت سے صنعت وغیرہ کی کتابین ترجمہ کین، جس اولیت کا تمغہ مورخون نے منصور کے لئے تجویز کیا ہے، انصاف یہ ہے کہ اس کا مستحق خالد[2] تھا، مروان بن الحکم کے زمانے مین ماسرجویہ ایک یہودی عالم نے جس کی مادری زبان سُریانی تھی، ہرون قس کی ایک کتاب کا ترجمہ عربی زبان مین کیا، عبدالملک کے بعد غالبًا فلسفہ پر کچھ توجہ نہین ہوئی، یہان تک کہ ۱۳۲ھ مین زمانے نے بنو امیہ کی حکومت کا ورق اُلٹ دیا،

منصور عباسی کا عہد

۱۳۶ھ مین جب منصور عباسی بغداد کے تخت پر بیٹھا تو ترجمہ و تصنیفات پر حوصلہ شاہانہ سے توجہ کی، قیصر روم کو خط لکھکر فلسفہ کی کتابین منگوائین، اور چونکہ اس وقت تک دارالخلافہ مین ان زبانون کے جاننے والے موجود نہ تھے یہ بھی فرمائش کی کہ جو کتابین آئین وہین سے عربی مین ترجمہ ہو کر آئین؛ چنانچہ اقلیدس اور کچھ طبیعیات کی کتابین مع ترجمہ کے بغداد مین پہنچین، علماے اسلام ان کو پڑھکر اور بھی مشتاق ہوئے[3]، منصور کا شوق علمی دیکھکر دور دور سے مترجمین اور حکما اس کے دربار مین آنا شروع ہوئے، جرجیورس، فرات بن سحنانا، عیسیٰ بطریق (یہ سب عیسائی عالم تھے)

---

[1] دیکھو نامۂ دانشوران ناصری مطبوعہ ایران حالات ابن آثال، [2] دیکھو ابن خلکان، حالات خالد، اور کشف الظنون جلد سوم صفحہ ۹۲، علامہ ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے مقدمہ مین خالد کے علم و فضل و واقفیت فلسفہ سے بیجا انکار کیا ہے، مگر ابن خلدون کے خلاف بہت سی معتمد شہادتین موجود ہین، [3] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۴۱۹، مطبوعہ بیروت،

نوبخت منجم، ابو سہل مجوسی تھے، ابن المقفع اس کے دربار کے مشہور مترجم اور حکیم[1] تھے، بطریق نے یونانی اور
اور ابن المقفع نے فارسی زبان سے ترجمے کیے، ۱۵۴ھ میں ہندوستان کا ایک بڑا ریاضی دان ہندو عالم منکہ
کی پایہ شناسی کا شہرہ سن کر دار الخلافہ میں داخل ہوا، اس نے ایک نہایت عمدہ زیج جس کو اس نے
ایک عمدہ اور جامع تصنیف سے جو ایک بادشاہ ہندوستان مسمی بہ فیغر کی طرف منسوب ہے، خلاصہ کیا تھا
منصور کی خدمت میں پیش کی، محمد بن ابراہیم فزاری نے منصور کے حکم سے عربی زبان میں اس کا ترجمہ کیا
اور اس سے ایک کتاب مرتب کی جو ریاضی دانوں میں سند ہند کے نام سے مشہور رہی، مامون الرشید کے
زمانے تک اعمال کواکب میں اسی زیج پر اعتماد کیا جاتا تھا[2]۔

منصور کے نامور فرزند مہدی نے اگرچہ اس طرف کچھ توجہ نہیں کی بلکہ ایک نظر تحقیقات زنادقہ قائم کر کے آزادی رائے کو بالکل روک دیا، لیکن خاندان برامکہ نے جو اس کے عہد میں سلطنت کا ایک بڑا رکن تھا، اس باب میں بڑی ناموری حاصل کی، ان کے اہتمام سے یونانی اور فارسی کی بہت سی کتابیں ترجمہ ہوئیں، ابن ناعمہ، سلام ابرش[3]، عبداللہ اہوازی ان کے عہد کے نامور مترجم تھے، ہارون الرشید اعظم نے جس کے نام سے یورپ ایشیا دونوں واقف ہیں، پچھلی کوششوں میں اور بہت کچھ اضافہ کر دیا، اس نے ترجمہ اور تصنیفات کا ایک بڑا محکمہ قائم کیا، جس میں ہر زبان کے بڑے بڑے ماہر تصنیف اور ترجمہ کے کام پر

ہارون الرشید کا عہد

[1] دیکھو مختصر الدول حالات حکما عہد منصور، یہ ایک مختصر اور مفید تاریخ ہے جو ابو الفرج ملطی ایک عیسائی عالم کی تصنیف ہے اور عربی زبان میں ہے، ڈاکٹر پوکاک پروفیسر آکسفورڈ کالج نے لیٹن میں اس کا ترجمہ کیا ہے، اصل کتاب مع ترجمہ لیٹن ۱۶۶۳ء میں بمقام لندن چھاپی گئی ہے، جہاں کہیں اس آرٹیکل میں مختصر الدول کا نام آئے اس سے یہی تاریخ مراد ہے، ابن البطریق و ابن المقفع کے لیے دیکھو کشف الظنون حرف حا ذکر حکمت۔ [2] یہ تفصیل مع حالات ماخوذ ہے التحقیق ما للہند سے جو ہندوستان کے حالات میں چند رسالوں کا ایک مجموعہ ہے اور فرانس میں بمقام پیرس ۱۸۴۳ء میں چھپا ہے،
[3] ابن ناعمہ اور سلام ابرش کا ذکر بحیثیت مترجمین برامکہ صاحب کشف الظنون نے حکمت کے ذکر میں کیا ہے، آگے فہرست میں چند کتابوں کے نام ملیں گے جو برامکہ کے لیے ترجمہ کی گئیں۔

مامور تھے[۱]، یوحنا بن ماسویہ، ایک عیسائی عالم جس کی مادری زبان سریانی تھی، قدیم یونانی طب کی تصنیفات کے ترجمے کے لئے انتخاب کیا گیا، اس محکمہ سے جس کو بیت الحکمۃ کہتے تھے، تدریجاً یونانی سنسکرت زبانوں کے ترجمے ہمیشہ تیار ہوتے تھے اور اشاعت پاتے تھے منکہ اور صالح دو ہندو حکیم اس کے دربار میں تھے جو ترجموں کے علاوہ صاحب تصانیف بھی تھے، شاناق ہندی کی کتاب السموم منکہ ہی نے فارسی میں ترجمہ کرائی تھی، چرک اور سشرت کی تصنیفات طبی جو عربی میں ترجمہ ہوئیں، غالباً اسی عہد میں اور انہیں ہندو حکیموں کے اہتمام میں ہوئیں[۲]،

مامون الرشید کا عہد

اب تک جو کچھ ہوا تھا گو بہت کچھ تھا، مگر مامون الرشید کے فیاضانہ حوصلوں کے سامنے تمام پچھلی کوششیں گمنامی کے پردے میں چھپ گئیں، مورخین نے مامون کے اس جوش التفات کی ایک عجیب و دلچسپ حکایت لکھی ہے یعنی ایک رات اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک محترم شخص تخت پر جلوہ فرما ہے، مامون نے بڑھکر پوچھا آپ کون بزرگ ہیں، تخت نشین نے کہا ارسطو، مامون پھڑک اٹھا اور عرض کی اے حکیم اچھی کیا چیز ہے، خیالی ارسطو نے جواب دیا کہ جسے عقل اچھا کہے، دوبارہ مامون نے درخواست کی کہ میرے لئے کچھ نصیحتیں ارشاد ہوں، جواب ملا کہ توحید، اور صحبت نیک، خواب کا کچھ اثر ہوا ہو یا نہیں، مگر اس واقعہ سے مامون کے شوق اور محویت کا ضرور اندازہ ہوتا ہے، غرض سبب جو کچھ ہو مامون نے قیصر روم کو نامہ لکھا کہ ارسطو کی کل تصانیف بہم پہنچائی جائیں،

حاشیہ

[۱] ان ترجموں کا ذکر آمر صاحب کی تاریخ ہارون الرشید صفحہ ۲۲۲ و چیمبرس انسائیکلوپیڈیا جلد اول مطبوعہ لندن صفحہ ۳۴۴ اور کشف الظنون میں صراحۃً اور ضمناً ملے گا، [۲] الفنسٹن صاحب نے تاریخ ہندوستان حصہ مسلمان میں لکھا ہے کہ منکہ و سالی دو ہندی طبیب ہارون الرشید کے دربار میں تھے، الفنسٹن صاحب نے صالح کو سالی پڑھا ہے اور غالباً یہی صحیح ہے، شاناق کا اصلی نام شاید سنگھ ہو جو عربی خرا در پڑھکر شاناق ہو گیا ہے، چرک حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کئی سو برس پہلے ایک طبیب تھا ۱۲

نامور حکیم اور مختلف زبان کا ماہر اور مترجم یعقوب کندی تھا جو خاص تصنیفات ارسطو کے ترجمہ پر مامور تھا،[1] وہ ایک عیسائی امیر تھا اور اس کا باپ کوفہ کا گورنر رہ چکا تھا، فارسی، ہندی، یونانی زبان جانتا تھا، اور مامون کا نہایت معتمد اور مقرب تھا، غالباً مامون نے خود بھی یونانی زبان سیکھی تھی، چنانچہ افسانہ [illegible] ہے[2] مامون نے یونان کے بادشاہ کو پانچ ٹن سونا دینا منظور کیا اور اس شرط پر عہد کیا کہ حکیم لیو کو اجازت دیجائے کہ وہ کچھ دنوں کے لئے آکر مامون کو فلسفہ سکھا جائے"

فلسفہ کے لئے اتنی قیمت صرف کرنے کی مثال بہت کم مل سکتی ہے،[3] شاکر منجم کے تینوں بیٹے محمد، احمد، حسن نے بھی جو ہندسہ و نجوم و موسیقی میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے، اور مامون کے خاص مقرب اور ندیم تھے اس کام پر بہت توجہ کی، اپنے ذاتی شوق سے روم کے اطراف میں قاصد بھیجا اور فلسفہ وغیرہ کی بہت سی کتابیں منگوائیں۔ دور دور از ملکوں میں قاصد بھیجکر مترجم بلوائے اور ان کتابوں کے ترجموں پر مامور کیا، مامون کی نیت کا پھل تھا کہ ان ناموروں کی کوشش بھی مامون کے کارنامہ میں لکھی گئی، اس عہد میں جن زبانوں سے ترجمے ہوئے وہ یونانی، فارسی، کالڈی، قبطی، شامی زبانیں تھیں،

ہارون الرشید کا پوتا متوکل بادشاہ ہوا، اسی قسم کی فیاضیوں میں نامور ہوا، مترجموں میں جس نے کثرت اور عمدگی تراجم کے باعث سب سے زیادہ شہرت حاصل کی ہے وہ متوکل ہی کے عہد کا نامور حکیم **حنین بن اسحاق** تھا، حنین نے بلاد روم میں دو برس مستقل رہکر یونانی زبان اور فلسفہ کامل طور سے سیکھا، روم سے واپس آکر وہ بصرہ چلا گیا، اور خلیل بن احمد بصری سے عربیت کی تحصیل کی، اور چونکہ دونوں زبانوں کا پورا ماہر ہو چکا تھا اپنے شوق سے فلسفہ کی کتابیں عربی میں ترجمہ کرنی

---

[1] ہسٹری آف فلاسفی مصنفہ ہنری لوئیس صاحب، فلسفہ عرب حالات یعقوب کندی، [2] کتاب مذکور ذکر عرب

[3] ابن خلکان ترجمہ محمد بن موسیٰ،

متوکل باللہ

شروع کیں، اس کی شہرت روز افزوں نے اس کو متوکل باللہ کے دربار میں پہنچایا، متوکل نے بیش قرار تنخواہ اور جاگیریں مقرر کر دیں، حنین کا ایک بیٹا اسحاق اور اس کا بھانجا حبیش یہ دونوں بھی یونانی و سریانی زبان کے بڑے ماہر تھے، اس لئے محکمۂ ترجمہ میں مقرر ہوئے، عربی میں جو ترجمے ہوئے، اکثر اسی اسحاق و حنین کی طرف منسوب ہیں۔[1]

مترجموں کی تنخواہیں۔

حنین بن اسحاق و ثابت بن قرہ و حبیش بن الحسن اور دوسرے نامور مترجموں میں سے ہر ایک کی ماہانہ تنخواہیں پانسو اشرفیاں تھیں۔[2] معتضد باللہ کے عہد کا مشہور مترجم ثابت بن قرہ حرانی ہے، ثابت نے محمد بن موسیٰ کے گھر میں پرورش پائی اور اس کی سفارش سے معتضد کے دربار میں داخل ہوا، معتضد اس کی نہایت عزت کرتا تھا، حتیٰ کہ وزراء اور خواص بھی اس کو رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔[3] ترجموں کا اہتمام اور بیت الحکمۃ کا انتظام غالباً دو سو برس سے زیادہ قائم نہ رہا، کیونکہ اتنی مدت کی پیہم تلاش اور جستجو میں روم و یونان کا کوئی علمی خزانہ ایسا باقی نہیں رہا جو اہل عرب کی آنکھوں سے چھپا رہ گیا ہو، اس کے علاوہ اس مدت میں مسلمان فلاسفروں کا ایک بڑا گروہ پیدا ہو چکا تھا، اسحاق، ابو معشر، محمد بن موسیٰ، احمد سرخسی، ابو نصر فارابی، وغیرہ حکماء کی تازہ اختراعات اور خاص تصنیفات نے فلسفہ کو افلاطون و ارسطو کی اطاعت سے آزاد کر دیا تھا،[4] تاہم خلفاء کا دربار ایک مدت تک ہر ملت اور مذہب کے فلاسفروں سے بھرا رہا جو اپنے ذاتی شوق یا بعض اوقات خلفاء کی فرمائش سے تصنیفات کے علاوہ دوسری زبانوں سے ترجمہ بھی کرتے تھے، راضی باللہ کے عہد خلافت قریباً ۳۲۰ھ میں متی بن یونس منطق کا بڑا عالم مشہور ہوا، اور ارسطو کی بعض کتابیں ترجمہ کیں،[5] ہنری کو

[1] یہ تمام تفصیل مختصر الدول عہد متوکل میں موجود ہے۔ [2] تاریخ التواریخ جلد اول حالات ارسطو۔ [3] مختصر الدول ص ۲۷۷۔ [4] گبن صاحب لکھتے ہیں کہ فلاسفۂ اسلام فارابی، رازی، ابن سینا کے نام حکمائے یونانی کے ہم پلہ کئے گئے ہیں، غالباً یہ یورپین شہادت زیادہ قابل اعتبار ہوگی۔ [5] مختصر الدول۔

ہسٹری آف فلاسفی مین لکھتے ہین "دسوین صدی عیسوی مین یحییٰ بن عدی اور عیسیٰ بن زرعہ نے نئے ترجمے کئے، اور پہلے ترجمون کی اصلاح کی، اسی طرح محمد بن یحییٰ جو زمانی جو ۲۴۸ھ مین تھا اور ابوالفرج المتوفی ۴۳۵ھ وغیرہ نے سریانی وغیرہ سے نئے ترجمے کئے، اور شرحین لکھین، ابوریحان بیرونی جو بوعلی سینا کا معاصر اور فلسفہ و ہیئت مین اس کا حریف مقابل تھا ہندوون کے علوم کے شوق مین ہندوستان گیا، اور برسون رہکر فلسفہ وغیرہ کی تحصیل کی، سنسکرت سے ایسی واقفیت حاصل کی تھی کہ ہندوون کو فلسفہ یونان کے مسائل ان کی زبان مین سکھائے اور اس طرح ہندوون کی شاگردی کے حق سے بھی ادا ہو گیا،[1] محمد بن اسمٰعیل تنوخی نے بھی ہیئت و نجوم سیکھنے کے لئے ہندوستان کا سفر اختیار کیا اور وہان رہکر علوم و فنون کی تحصیل کی،

بعض اتفاقی طریقون سے بھی مسلمانون کو دوسری قومون کے خیالات و مسائل معلوم ہوئے جس زمانہ مین فتوحات اسلامی کا سیلاب ہندوستان کی سرحد کے اونچے اونچے مقامات سے گذر رہا تھا، بنارس کا ایک صوفی عالم جسکا نام بھوجر برہمن تھا، مسلمانون سے مذہبی مباحثہ کے لئے روانہ ہوا، اور سلطان علی مردس کے زمانہ مین شہر لکھنوتی پہنچکر قاضی رکن الدین سمرقندی سے ملاقات کی، مباحثہ کا ارادہ تو جاتا رہا بجائے اس کے علوم عربیہ سیکھنے شروع کئے، اس نے قاضی صاحب کی خدمت مین ایک کتاب جسکا نام انبرت کنڈ تھا پیش کی اور اس کے مطالب بیان کئے، قاضی صاحب اس کے مسائل سے پوری آگہی حاصل کرنے کے ایسے شائق ہوئے کہ اس سے سنسکرت پڑھنی شروع کی، اور اصل زبان سے واقف ہو کر پہلے فارسی مین اور پھر عربی مین کتاب مذکور کا ترجمہ کیا، تاہم

[1] مختصر الدول ص ۳۱۲ دیکھو جامع القصص الہندیہ و مختصر الدول، بیرونی کی ایک کتاب جسمین سفر ہندوستان اور یہان کی معاشرت اور تمدن کا حال اس نے لکھا ہے، لندن مین نہایت اہتمام سے چھاپی گئی ہے، جسپر پروفیسر سخو نے جو جرمن کا مشہور عالم ہے ایک دیباچہ لکھا ہے، بیرونی کے شوق علمی اور تحقیقات کا اندازہ اس دیباچہ سے ہو سکتا ہے،

اس کے مشکل مقامات ہنوز شرح کے محتاج تھے، اتفاق سے بیرونی کا ایک شاگرد ابو ناتھ بلاد اسلام میں پہنچا، تو ایک سنسکرت دان عالم نے اس سے یہ کتاب پڑھی اور عربی زبان میں اس کا نہایت عمدہ ترجمہ کیا، جس کا نام مراۃ المعانی لادراک العالم الانسانی ہے [۱]

سلطان فیروز شاہ والی ہندوستان قریباً ۷۷۶ھ میں جب جوالا مکھی پہاڑ پر گیا تو لوگوں نے ظاہر کی کہ اس بتخانہ میں ۱۳۰۰ سو کتابیں قدیم زمانہ کی موجود ہیں، فیروز شاہ نے ان کے ترجمہ کئے جانے کا حکم دیا اور موسیقی و نجوم وغیرہ کی تصنیفات ترجمہ کی گئیں، نجوم کی ایک کتاب عز الدین نے نظم میں ترجمہ کی،

علوم و فنون کے تراجم کی یہ ایک مختصر سی تاریخ ہے، اب ہم کو دیکھنا ہے کہ کس قسم کی کتابیں ترجمہ ہوئیں اور اس انتخاب کے کیا اسباب تھے، ان ترجموں کو اسلامی تصنیفات سے کیا تعلق ہے، ان ترجموں کی صحت پر کہاں تک اعتبار ہو سکتا ہے، مسلمانوں نے اس کام میں دوسری قوموں کا احسان کیوں اٹھایا اور خود ترجمہ کرنے پر کیوں نہیں مائل ہوئے، جہاں تک ہم کو معلوم ہے طب اور فلسفہ کے سوا جس میں منطق، طبیعی، الٰہی، موسیقی، فلکیات، ہیئت، ہندسہ، حساب، جبر مقابلہ وغیرہ شامل ہیں، اور علوم کی تصنیفات کم ترجمہ ہوئیں،

فلسفہ اور طب کے سوا اور علوم کے ترجمے کیوں نہیں ہوئے،

اصل یہ ہے کہ عرب مسلمانوں کو اپنی زبان اور مذہب پر اس قدر ناز تھا کہ وہ دوسری قوموں کی ان تصنیفات کو ہمیشہ بے پروائی کی نگاہ سے دیکھتے رہے، اور واقعی جو شخص فصاحت و بلاغت کے متعلق جزئیات کے انضباط، قواعد کی ترتیب، مسائل کے استنباط میں ان کی موشگافیاں دیکھیگا

---

[۱] یہ پوری تفصیل جامع القصص الہندیہ میں مذکور ہے، یہ پہلی مثال ہے کہ ایک عربی دان مصنف نے سنسکرت یا بھاشا الفاظ کو صحیح اور پورا ادا کیا ہے، جس طرح یہ ہیں تے یہ سب پورے نام لکھے ہیں، اصل کتاب میں بھی اسی طرح ہیں،

[۲] دیکھو تاریخ بدایونی، حالات فیروز شاہ، ان کتابوں میں سے بعض کے ترجمے مثلاً رزم نامہ وغیرہ لاہور میں بدایونی نے خود بھی دیکھے،

مان جائیگا کہ ایسے نکتہ دانون کو علم انشاپردازی کسی قوم کا زلہ ربا ہونا نہین چاہیئے، علامہ ابن اثیر جس نے علم البیان کو بہت کچھ ترقی دی ہے، فخر کے ساتھ کہتا ہے کہ مین یونانی زبان مطلق نہین جانتا اور اس فن کے متعلق ان کے خیالات سے مین بالکل ناآشنا ہون" یونانی و رومی تصنیفات، فلسفہ و طب کے سوا زبان دانی یا مذہب سے متعلق تھین مسلمانون نے بے شبہہ، دانستہ ان دونون سے بے اعتنائی کی، اور افسوس ہے کہ اس غیر معتدل فخر نے ان کو دوسری قومون کے علم تاریخ سے بھی محروم رکھا،

مسلمان فلسفہ و طب کے پہلے مرحلے مین بے شبہہ یونان و روم کے احسانمند ہین، ان کی تصنیفات کے ہر صفحے سے اس احسانمندی کا اظہار ہوتا ہے اور سچ یہ ہے کہ افلاطون و ارسطو (وغیرہ) کے نامون کو عموماً اسلامی ممالک نے جو عزت دی یونان مین ان کو نصیب نہ ہوئی ہوگی لیکن مسلمانون نے ایک ذرہ پایا تھا اور اس کو آفتاب بنا دیا، ہیئت کو بہت کچھ ترقی دی، طبعیات کے متعلق ارسطو کی بہت سی غلطیان دریافت کین، منطق کو بالکل نئے طرز سے ترتیب دیا، اور چند اصول اضافہ کئے، نئے نئے آلات رصدیہ ایجاد کئے، نور کی رفتار دریافت کی، علم مناظر مین انعکاس کا قاعدہ معلوم کیا، جبر و مقابلہ جو چند جزئی مسئلون کا نام تھا انھین کی طباعی سے ایک علم کے رتبہ پر پہنچ گیا، دواسازی نسخون کی ترتیب، عرق کھینچنے کے آلے، موالید ثلاثہ کی تحلیل، ترازو کے فرق باہمی اور مشابہت کا امتحان، انھین کی ایجادات سے ہین کیمسٹری کی انھین نے بنیاد ڈالی علم نباتات مین اپنے تجربون سے دو ہزار پودے اور اضافہ کر دیئے[1]، غرض آج یونانی و عربی تصنیفات کا کوئی شخص اگر موازنہ کرے تو قطرہ و دریا کا فرق پائیگا،

عیسائی مترجمون کو بے شبہہ ترجمے کا فخر حاصل ہے، لیکن مسلمان دعوی کے ساتھ کہہ سکتے

[1] اگر زمانے نے مساعدت کی تو ان تمام باتون کی تفصیل اس طرح پر جس سے صاف ظاہر ہو جائے کہ مسلمان کو جب یہ علوم ملے تو کیا تھے، اور ان کی کوششون نے ہر ایک علم کو کس قدر آگے بڑھا دیا، ایک مستقل رسالہ مین لکھونگا اور شاید اسی انجمن کے کسی دوسرے جلسے مین اس کے پیش کرنے کا اتفاق ہو،

مین کرات کے مستقل مرتب جامع تصنیفات کے سامنے یہ ترجمے تقدیم یا حیثیت کچھ زیادہ رتبہ نہین
رکھتے یہی وجہ ہے کہ چند روز بعد ان ترجمون کا کسی کو خیال نہین رہا، اور دنیا مین جس چیز نے علوم
وفنون کو نابید ہونے سے بچالیا وہ خاص اسلامی تصنیفات تھین، آج مسلمانون کی بڑی بڑی لائبریریو
مین ترجمے کا پتہ بھی نہین ہے اور جن لوگون کی قسمت مین یورپ کا استاد بننا لکھا تھا مثلاً بوعلی سینا
ابن طفیل، محقق طوسی، امام غزالی وہ ان ترجمون کے کبھی احسانمند نہین ہوئے،

ترجمون کی صحت وغلطی

ترجمون کی صحت وغلطی کی نسبت ہم کوئی خاص فیصلہ نہین کرسکتے آج یورپ عربی ویونانی
دونون زبانون پر قابض ہے، قریباً دوسو برس تک اس نے عربی ہی کے ذریعہ سے فلسفہ کی تحصیل
کی ہے، اس وجہ سے اور نیز اس وجہ سے کہ بعض قدیم تصنیفات (مثلاً پانچوین وچھٹی اور ساتوین
جلدین تراشہائے مخروطی مصنفہ اپالونیس پرجیس (APOLO NIUS PERGE OUS
وغیرہ تک) عربی ہی زبان کے ذریعہ سے محفوظ ہین، ورنہ ان کی اصل جاتی رہتی، یورپ اسلامی
کوششون کا ممنون ہے، اور امید ہے کہ ان ترجمون کی نسبت اس کا فیصلہ [illegible] کی آلایش سے
خالی ہوگا، گبن صاحب لکھتے ہین، ان عربی ترجمون کی خوبی پر رناڈوٹ (RENAUDOT
نے خوب بحث کی ہے اور گسیرا (GASIRA) نے دیانت داری سے اسکی حمایت کی
ہے، ہسٹری آف فلاسفی مصنفہ ہنری لویس (G. HENERY LEWES
مین ہے، مسٹر کہتا ہے کہ بعض ترجمے نہایت خوبی سے کئے گئے، لیکن ایک فرانسیسی مصنف کا بیان
ہے کہ اکثر ترجمے اصل یونانی سے نہین بلکہ شامی ترجمون سے ہوئے اور ترجمہ در ترجمہ ہونے کی
وجہ سے بہت غلطیان رہ گئین، گو ہم اس امر کو کسی قدر تسلیم کرتے ہین، اور نہ صرف اسی بنا پر
بلکہ اس وجہ سے بھی کہ ترجمہ گو کتنا ہی عمدہ ہو، تاہم یہ دعوی نہین ہوسکتا ہے کہ اصل مطلب بالکل
پورا پورا ادا ہوگیا، لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس قسم کی غلطیون نے اسلامی تصنیفات پر

کوئی محسوس اثر پیدا نہیں کیا، مسلمان فلاسفر یونانی فلاسفروں کی اصلی غلطیوں کے درست کرنے والے
تھے، ان جزوی غلطیوں سے ان پر کچھ اثر نہیں ہو سکتا تھا،[1]

مسلمانوں نے ترجمہ کا کام دوسری قوم سے کیوں لیا،

مسلمانوں کا خود ترجمہ کرنے کی طرف مائل نہ ہونا گبن صاحب کے نزدیک اسی فخر اور غرور کا
اثر ہے جو عرب کا اصلی خاصہ ہے، وہ لکھتے ہیں کہ "اہل عرب اپنی ملکی زبان کی کثرت الفاظ پر فخر و
کرتے تھے اور غیر زبانوں کے محاورہ کو حقیر سمجھتے تھے، انھوں نے اپنی عیسائی رعایا میں سے یونانی مترجم
چھانٹے" عرب کی پر فخر طبیعت کا خاصہ ہم کو بھی معلوم ہے، لیکن افسوس ہے کہ گبن صاحب کی
بدگمانی نے اس کا اندازہ اعتدال سے زیادہ کیا ہے، اصل یہ ہے کہ عرب میں فلسفہ کا چرچا منصور
عباسی کے عہد سے اور اس کے ذاتی شوق سے شروع ہوا، یہ وہ وقت تھا کہ مذہبی بے شمار روایتوں
اور مسائل کے انبار کا لوگوں کی قوتِ حافظہ پر ایک بڑا بھاری بوجھ تھا، اور سب کو یہ پڑی تھی کہ
کاغذ کے حوالے کر کے ذرا سبکدوش ہوں، مذہبی علوم کے بہت سے مبادی اور مقدمات بھی مرتب
کرنے تھے، اسلام کا جوش ابھی شباب پر تھا، اور کم و بیش ہر مسلمان میں اس کا اثر پایا جاتا
تھا، یہ ظاہر ہے کہ ایک سرگرم مذہبی گروہ کو اپنے مذہبی علوم اور مسائل کے سامنے دوسری
باتوں پر کس قدر توجہ ہوگی، اس وقت تعلیم یافتہ گروہ حدیث، فقہ، تفسیر، اسماء الرجال وغیرہ کی
تدوین و ترتیب میں مصروف تھا، اس پر طرہ یہ ہوا کہ فلسفہ کا جو کچھ تھوڑا بہت رواج ہوا اس نے
طبیعتوں میں آزادی پیدا کر دی، اور بڑے بڑے نامور امام و مجتہد اس خیال سے اس کے
مخالف ہو گئے کہ فلسفہ و مذہب ایک ساتھ بسر نہیں کر سکتے،
خلفاء (وہ بھی سب نہیں) بے شبہ فلسفہ کے حامی تھے لیکن گبن صاحب خود فیصلہ کر سکتے

[1] طبعیات میں ارسطو اور موسیقیات میں فیثاغورث پر بوعلی سینا و فارابی نے جو قابل قدر نکتہ چینیاں کی ہیں وہ عام طرح سے مشہور ہیں، ہنری لوئیس صاحب نے بھی مانا ہے کہ فارابی نے فیثاغورث کی غلطیاں درست کر دیں، ۱۲

ہین کہ یونانی زبان سیکھنے سے ان کو مہمات ملکی مانع تھے، یا دوسری قومون کی زبانون کی حقارت کئی صدیون تک فلسفہ ایوانِ خلافت کا خاص مہمان رہا، تیسری صدی مین اسکو البتہ ترجمے سے قبولِ عام کی سند حاصل کی، لیکن اس وقت جیسا کہ ہم لکھ آئے ہین بے شمار ترجمے اور اسکی تصنیفین موجود تھین، اور فلسفہ حاصل کرنے کے لئے یونانی اور دوسری زبانون کا دریوزہ گر ہونا چندان ضروری نہ تھا، یہ خیال بھی کلیتہً صحیح نہین ہے، کہ ترجمہ کے کام مین مسلمان سرے سے شریک ہی نہین ہوئے، عبد الکریم شہرستانی نے ملل ونحل مین جہان مترجمون کے نام لئے ہین، ان مین ہم کو مسلمانون کے بھی نام ملتے ہین، مثلاً ابوسلیمان بن بکر مقدسی، یوسف بن محمد نیشاپوری، ابو زید احمد بلخی، ابوالحارث حسن بن سہیل قمی، احمد بن محمد اسفرائنی، طلحہ النسفی اور محمد بن ابراہیم فزاری سہل بن ہرون، ابوریحان بیرونی، محمد بن اسمٰعیل تنوخی، قاضی رکن الدین وغیرہ بھی تو آخر مسلمان ہی تھے، بہت سے اولوالعزم خلفا اور امرا کی پیہم کوششون نے ترجمون کی تعداد جسقدر کثیر کر دی ہے اس کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہے، تاہم نمونے کے طور پر مین چند ترجمون کی ایک فہرست ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہون، مین نے ان ترجمون کو مطلقاً چھوڑ دیا ہے، جنکے مترجمون کے نام یا ان کے زائد حالات مین نہین معلوم کرسکا ہون، جن حکما کی کتابون کے ترجمے ہوئے ان مین سے بعض کے نام یہ ہین:-

Ammonius, Themistius, Syrianus, Sanphei-
us, Philoponus, Pythagoras, Diogenes Dimo-
critus Hippocrates, Socrates. Arinkotle Archu-
medes Galen, Ptolemy.
Appollonius, Pangacaus. Plato

تاؤذوسیوس، مانالاوس، برقلس، ارسطیقوس، دیقوریدس، اوطولوقس، باربوتا، قسطوس، انقلاؤس،
ابلینوس، نیقولاوس، برلیس، نلاجانطی، دیوفنطوس،

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
الٰہیات	ارسطو	یحییٰ بن عدی وغیرہ	اسحاق بن حنین، ابن عدی، اسطاث، الکندی، ابو البشر متی ہر ایک نے اس کا پورا ترجمہ کیا، اور بعض مقالوں کا حنین بن اسحٰق نے بھی،
السماع الطبیعی	"		آٹھ مقالوں میں ہے، شیخ بو علی سینا اور دیگر علماے اسلام نے اس کی تفسیر کی ہے،
کتاب السماء والعالم	"	متی	یہ کتاب چار مقالوں میں ہے، قاضی ابو الولید ابن الرشد نے اسکا خلاصہ کیا، (عجب)
کتاب النیازک	"		حنین بن اسحاق نے اس کی شرح لکھی، اور خلاصہ کیا،
کتاب جرمی الشمس والقمر ولعبدھما	"		علامۂ نصیر الدین طوسی نے اس کی اصلاح کی،
کتاب النبات	"	اسحٰق	دو مقالے ہیں، ثابت بن قرہ نے اصلاح بھی کی،
کتاب المرآۃ	"	حجاج بن مطر	
کتاب الحس والمحسوس	"	متی بن یونس	قاضی ابو الولید نے اس کا خلاصہ کیا، اور شرح لکھی (عجب) ۳ مقالوں میں ہے،
سر الاسرار	"		مامون رشید کے حکم سے ترجمہ ہوئی، اس میں سکندر کیلئے ارسطو نے وصیتیں کی ہیں،

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب السیاسۃ	ارسطو		سات مقالون مین ہے اس کو ارسطو نے سکندر کے لئے لکھا تھا۔
کتاب الاخلاق	"	حنین بن اسحٰق ویحییٰ بن عدی	اس مین بارہ مقالے ہین، فرفوریوس نے اسکی تفسیر کی ہے،
کتاب النفس	"	" وغیرہ	حنین نے پوری کتاب کا ترجمہ سریانی مین کیا، اور بعض مقالون کا اسحٰق نے، ثامسطیوس نے اس کتاب کی جو مبسوط شرح لکھی تھی اسکا ترجمہ اسحٰق نے ایک خراب نسخہ سے کیا، اور پھر ایک عمدہ نسخہ سے مقابلہ کرکے صحیح کیا،
قاطیغوریاس	"	حنین بن اسحٰق	یعنی مقولات عشرہ، ابونصر فارابی، ابوبشر متی، ابن مقفع، وابن بہریز، وکندی، واسحٰق بن حنین، واحمد بن طیب درازی نے شرحین لکھین،
باریمنیاس	"	" واسحٰق	یعنی مباحث الفاظ، حنین نے سریانی مین اور اسحٰق نے عربی مین ترجمہ کیا، اور یحییٰ نحوی وابوبشر متی، وفارابی نے شرحین لکھین، اسحٰق بن مقفع کندی، ابن بہریز، رازی، ثابت بن قرۃ،

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			احمد بن طیب نے ملخص اور مختصر کیا،
انالوطیقا	ارسطو	ثیاوزوسس	یعنی تحلیل قیاس، حنین نے سریانی مین اور اسحق نے عربی مین اس کے بعض اجزاء ترجمہ کئے، یحییٰ نحوی و کندی نے اس کی شرح لکھی، ابو بشر متی نے دو مقالون کی شرح کی،
انولوطیقائے ثانی	"	اسحق وغیرہ	یعنی برہان حنین نے بعض اجزا سریانی مین ترجمہ کئے، اور متی نے اس ترجمہ کی عربی کی، یحییٰ نحوی، ابو یحییٰ مروزی نے اصل کتاب پر نکتہ چینیان کی ہین متی کندی، فارابی نے شرحین لکھین،
طوبیقا		یحییٰ بن عدی	یعنی جدل، اسحق نے سریانی مین ترجمہ کیا اور یحییٰ بن عدی نے اس ترجمہ کی عربی کی، دمشقی نے بھی سات مقالون کا ترجمہ کیا، اور ابراہیم بن عبد اللہ نے آٹھ مقالون کا یحییٰ بن عدی نے اس کی جو تفسیر لکھی وہ ہزار ورق مین ہے، فارابی، متی نے شرحین لکھین، اسکندراو۔ امپینوس نے جو شرحین

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			اس پر لکھی ہیں، ان کا ترجمہ اسحٰق نے عربی میں کیا،
سوفسطیقا	ارسطو	ابن ناعمہ وغیرہ	یعنی مغالطہ، ابن ناعمہ و ابوبشر متی نے سریانی میں ترجمہ کیا، اور یحییٰ بن عدی و تھوبری و ابراہیم نے عربی میں نقل کیا، اور شرح لکھی، کندی کی بھی اس پر شرح ہے،
ریطوریقا	"	اسحٰق و ابراہیم	یعنی خطابیات، فارابی نے شرح لکھی جو سو ورق میں ہے،
انوطیقا	"	ابوبشر متی، یحییٰ بن عدی	یعنی شعر، کندی نے اس کو مختصر کیا،
سماع طبیعی مشہور بہ سمع الکیان	"		یہ کتاب آٹھ مقالوں میں ہے، مقالہ اولیٰ کی تفسیر اسکندر افرودسی نے کی، جس کا ترجمہ ابو روح صابی نے عربی میں کیا، اور یحییٰ بن عدی نے اس کی اصلاح کی، دوسرا مقالہ حنین نے سریانی میں ترجمہ کیا، اور یحییٰ نے اسکو عربی میں نقل کیا، تیسرا مقالہ موجود نہیں ہے، چوتھے مقالہ کی تفسیر اسکندر افرودسی نے تین مقالوں میں کی ہے جنمیں سے دو مقالے کامل اور تیسرے کا

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			کچھ حصہ قسطا بن لوقا نے ترجمہ کیا، قسطا نے پانچوین اور ساتوین مقالے کا ترجمہ کیا، اور آٹھوین کی شرح لکھی، فرفوریوس یونانی نے اس کے چار مقالون کی جو شرح لکھی ہے، اس کا ترجمہ بسیل نے کیا، اور ابوالبشر متی نے دوبارہ نقل کیا، ثامسطیوس نے بھی اس پر شرح لکھی ہے، جس کا ترجمہ متی نے سریانی مین کیا، ابواحمد نے مقالۂ اولی وچہارم کی شرح لکھی، ثابت بن قرہ نے مقالہ اولی وثانیہ پر حاشیہ لکھا، ابراہیم بن الصلت نے مقالۂ اولی کی شرح کی، ابوالفرج بن قدامہ نے رومی زبان مین جو شرح لکھی ہے، عربی زبان مین اس کا بھی ترجمہ ہوا، اس کتاب پر علمائے اسلام نے بہت سی شرحین اور حاشیے لکھے،
سماع عالم	ارسطو	یحییٰ بن عدی وغیرہ	چار مقالون مین ہے، ابن البطریق متی نے اس کے بعض حصے ترجمے کیے، حنین بن اسحٰق نے اس کے سولہ مسئلون پر گفتگو کی ہے، ابوزید بلخی

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			نے ابوجعفر خازن کے لئے اس کی شرح لکھی، ابوہاشم نے اصل کتاب پر رد و قدح کیا، اور اعتراضات لکھے، جو تصفح کے نام سے مشہور ہیں،
کتاب الکون والفساد	ارسطو	حنین وغیرہ	حنین نے سریانی مین ترجمہ کیا، اور اسحٰق و دمشقی نے عربی مین، اسکندر نے اس کی شرح لکھی ہے، جس کا ترجمہ متی نے کیا، اور ابوزکریا یحیی بن عدی نے اس کی اصلاح کی، یحیی نحوی نے بھی اس کی شرح لکھی، مقالہ اولیٰ کا ترجمہ قسطا نے بھی کیا، ثامسطیوس نے بھی اس کی شرح لکھی ہے، اس کا ترجمہ بھی عربی زبان مین کیا گیا،
کتاب فی الآثار العلویۃ	"	یحیی بن البطریق وغیرہ	لاینذروس یونانی نے اسکی شرح لکھی ہے جسکو ابوبشر متی نے عربی مین نقل کیا، اسکندر افرودوسی کی بھی شرح ہے جسکا ترجمہ عربی زبان مین کیا گیا، ثامسطیوس کی شرح کا ترجمہ اسحٰق نے عربی مین کیا، یحیی بن عدی و حنین وغیرہ نے بھی اصل کتاب کے ترجمے سریانی و عبرانی مین کئے،
کتاب الحیوان	"	ابن البطریق	۱۹ مقالون مین ہے، نیقولاؤس نے اسکو مختصر کیا ہے جس کا ترجمہ ابوعلی بن زرعہ نے عربی مین کیا،

نقی الدین سپہر نے ناسخ التواریخ مین لکھا ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کے وقت ارسطو کی کتابون مین سے کتاب اثالوجیا و کتاب زبرجد و کتاب الیاقوت میری نظر سے گذرین۔

اقلیدس

حجاج ابن یوسف کوفی نے دو ترجمے کیے، پہلا ہارونی کے لقب سے مشہور ہے، اور دوسرا ماموقی کے نام سے، مگر یہ دوسرا ترجمہ عمدہ اور صحیح ہونے کی وجہ سے زیادہ شایع ہوا، حجاج کے نسخے مین کل شکلین ۴۶۸ ہین، مگر ثابت کے نسخے مین دس شکلین اور زیادہ ہین، کچھ مقالے ابوعثمان دمشقی نے بھی ترجمے کیے، عبد اللطیف طبیب نے جو رومی نسخہ دیکھا، اوسمین چار سو شکلین اور زائد تھین جنکا اس نے ترجمہ کرنا چاہا تھا، علماے اسلام نے نہایت کثرت سے اقلیدس پر شرحین اور حواشی لکھے، مثلاً یزیدی، جوہری، ہامانی، ابوحفص الحرث الخراسانی، ابوالوفا البوزجانی، ابوالقاسم انطاکی، احمد بن محمد الکرابیسی، ابویوسف الرازی، قاضی ابومحمد عبد الباقی البغدادی المشہور بہ قاضی بیمارستان (ہسپتال)، ابوعلی الحسن بن الحسین بن الہیثم البصری، ابوجعفر خازن اہوازی، ابوداؤد سلیمان بن عقبہ، محقق طوسی، ہامانی نے صرف پانچوین مقالے کا ترجمہ کیا اور ابویوسف رازی نے صرف دسوین مقالہ کا، قاضی عبد الباقی کی شرح نہایت بسیط ہے، اس نے اشکال کی مثالین عدد سے بھی دی ہین، ابن ہیثم نے اس کے مصادرات کی شرح لکھی، اور ایک کتاب اس پر اعتراض و جواب کی لکھی، ابوجعفر خازن و اہوازی کی شرح صرف دسوین مقالے پر ہے، ثابت بن قرہ نے ان علل کی تشریح کی جن پر اقلیدس نے شکلون کی ترتیب رکھی ہے، اس کتاب کی بہت سی اصلاحین بھی ہوئین جنکو تحریر کا لقب ملا، مثلاً تحریر تقی الدین، اس تحریر کا نام تہذیب الاصول ہے، اور تحریر محقق طوسی جو نہایت عمدہ تر اور شایع ہے، اور اسی وجہ سے بہت سے علما نے اس پر حواشی لکھے جنمین سے علامہ سید شریف قاضی زادہ رومی نامور ہین۔

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
المعطیات	اقلیدس	اسحق	اسحق نے عربی میں ترجمہ کیا، ثابت نے اصلاح کی، علامہ طوسی نے تحریر کی، ۹۵ شکلوں میں ہے۔
المناظر	"	"	۶۴ شکلوں میں ہے، علامۂ طوسی نے اس کی تحریر کی،
ظاہرات الفلک	"	"	۲۳ شکلیں ہیں، نصیر الدین طوسی نے تحریر کی، تبریزی نے اس کی شرح لکھی۔
کناشش	اہرون القس	ماسرجویہ	یہ حکیم ماسرجویہ بصرہ کا رہنے والا اور یہودی المذہب تھا، مروان کے زمانے میں (غالباً اس کی فرمائش سے) یہ ترجمہ اس نے عربی میں کیا،
کتاب الجبر والمقابلہ	ایوقسطیوس	"	محمد بن محمد یحییٰ ابن ابی البقا رالبوزجانی نے جو ۳۴۸ھ میں موجود تھا، اس کتاب کی تفسیر کی، (مختصر)
المطالع	اسبقلاوس	قسطا بن لوقا بعلبکی	کندی نے اصلاح کی اور علامہ طوسی نے تحریر کی، ۳ مقدمے اور دو شکلوں پر مشتمل ہے،
المنی	افلاطون	"	موفق الدین بغدادی نے اس کو مختصر کیا، اور ترتیب دی،
الفلاحۃ الرومیہ	قسطوس بن	سرجس بن	اس نے پہلا ترجمہ رومی سے عربی زبان میں کیا

نامِ کتاب	نامِ مصنف	نامِ مترجم	
	اسکوا السکینہ	ہلیا	پھر قسطا بن لوقا البعلبکی، ابوزکریا بن یحییٰ بن عدی، اسطاس نے عربی میں الگ الگ ترجمے کئے، فارسی میں بھی اس کا ترجمہ ہوا، جس کا نام ورزنامہ ہے،
الکرۃ المتحرکہ	اوطولوقس	ثابت	ثابت نے اصلاح کی، اور محقق طوسی نے تحریر کی، ایک مقالہ اور بارہ شکلیں ہیں،
کتاب اللیل و النہار	ثاودسیوس		دو مقالے ہیں، اور ۳۳ شکلیں، علامہ طوسی نے تحریر کی،
کتاب المساکن[1]	"	قسطا بن لوقا	۱۲ شکلیں ہیں، علامہ طوسی نے تحریر کی،
کتاب الحشائش	دیسقوریدس	اصطفن بن بسیل	اس کتاب میں نباتات کی تصویریں یونانی قدیم حرفوں میں بنی ہوئی تھیں،
کتاب السموم	پارہ بوقا نبطی من اہل بیروسایہ	ابوبکر احمد	یہ کتاب نبطی زبان میں تھی، ابوبکر احمد بن علی المعروف با بن وحشیہ نے عربی میں ترجمہ کیا،
کتاب الادویہ	دیسقوریدس		۵ مقالے ہیں، ابن بیطار شیخ عبداللہ بن احمد مالقی نے اس کی تفسیر کی،
کتاب تسطیح الکرہ المنبسطہ	بطلیموس جالینوس		ابوجعفر احمد بن محمد الطیب المتوفی سنہ ۲۸۶ھ نے اس کی شرح لکھی، جو کہ رجب ۲۴۲ھ میں تمام ہوئی

[1] اس کتاب کا ترجمہ میں نے خود دیکھا ہے،

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کتاب القوی الطبیعیہ	جالینوس	حنین بن اسحق	۳ مقالون مین ہے،
کتاب الحمیات	"		ابوجعفر احمد بن محمد الطبیب نے اس پر شرح لکھی
کتاب الکرۃ والاسطوانۃ	ارشمیدس مصری		ثابت بن قرۃ نے اصلاح کی مگر چونکہ اصل ترجمہ خراب تھا اصلاح مین بھی بعض مصادرات چھوٹ گئے اوطوقیوس عسقلانی نے اس کے مشکلات کی شرح لکھی جس کا ترجمہ عربی مین اسحٰق بن حنین نے کیا، علامہ طوسی نے اس کی تحریر کی، ثابت کے نسخے مین اس کی ۴۸ شکلین ہین اور اسحٰق کے نسخے مین صرف ۴۳،
الماخوذات فی الاصول	"	ثابت ابن قرہ	ابوالحسن علی ابن احمد النسوی نے اس کی تفسیر کی، ۱۵ شکلین ہین، علامہ طوسی نے اصلاح کی، ابوسہل نے بھی کچھ اس کی اصلاح کی، جس کا نام تزئین کتاب ارشمیدس ہے،
المخروطات فی اصول الخطوط المنحنیہ	ابلینوس النجار	احمد بن موسی الحمصی ثابت ابن قرہ	مامون رشید نے روم سے جو کتابین منگوا کر ترجمہ کرائین ان مین اسکا بھی ترجمہ ہوا، یہ سات مقالون مین تھی، مگر مقدمے کی عبارت سے معلوم ہوا کہ اصل کتاب آٹھ مقالون مین ہے اور اس آٹھوین مقالہ مین سب پہلے مقالون

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
			کے مطالب مع فوائد دیگر موجود ہین، لیکن آٹھوین مقالے کا باوجود تلاش کے پتہ نہ لگا' ابو موسی شاکر کا بیان ہے کہ اب جس قدر یہ کتاب موجود ہے اس مین سات مقالے اور کچھ حصہ آٹھوین کا موجود ہے، جسمین کہ صرف چار شکلین ہین، چار پہلے مقالون کا ترجمہ احمد بن موسی نے کیا، اور تین پچھلے مقالون کا ثابت ابن قرہ نے جسکو کہ حسن و احمد (دونون ابن موسی بن شاکر) نے اصلاح کرکے درست کیا، اہلِ یورپ نے اس کتاب کو صرف مشرقی ترجمون کے ذریعہ سے پایا، کیونکہ اس کی اصل بالکل جاتی رہی، (گبن رومن امپائر)
نسبۃ الجذور	ابلینوس النجار		دو مقالون مین ہے، پہلے مقالے کے ترجمہ کی تو ثابت نے اصلاح کی، مگر دوسرے مقالے کا ترجمہ بے معنی ہے،
مابعد الطبیعۃ	ثاوفرلیطوس	یحیی بن عدی	یہ مصنف ارسطو کا برادر زادہ تھا، اصل کتاب سریانی مین تھی (مختصر الدول)
کتاب الحس و المحسوس	"	ابراہیم بن بکوس	(از مختصر الدول)

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
اسباب النبات	ناوفرد یطوس	ابراہیم بن بکوش	(مختصر الدول)
کتاب من حل فلسفۃ ارسطو	نیقلاوس	حنین	حنین نے پوری کتاب کا ترجمہ سریانی میں کیا، مختصر الدول،
ثالوجیا	برقلس	ابوعثمان دمشقی	
الحدود	ارسطیقوس یونانی	ابوالوفا	ابوالوفا محمد بن محمد حاسب نے ترجمہ کیا، اور اصلاح کی، پھر اس پر شرح لکھی جس میں دلائل ہندسی قائم کئے،

مجسطی

اس کتاب کے ۳ ترجمے نہایت مقبول اور مشہور ہوئے پہلا حجاج ابن مطر کا، دوسرا اسحق کا جس کو ثابت نے صحیح کیا تیسرا خود ثابت کا، اول اس کا ترجمہ یحییٰ بن خالد برمکی کے لئے کیا گیا جس کی بعد سے لوگوں نے تعلیقات اور تفسیریں لکھیں، مگر وہ سب ترجمے اور تفسیریں مبہم اور مجمل تھیں ابوحسان وسلمان نے جنکو بیت الحکمۃ کا اہتمام سپرد تھا ان ترجموں کی خوب توضیح و تصحیح کی، چونکہ مامون رشید کو اس کتاب کے ساتھ نہایت شیفتگی تھی، تو اس کی فرمایش سے حنین بن اسحق نے بھی ترجمہ کیا اور حجاج ابن یوسف و ثابت بن قرہ نے زوائد سے پاک کرکے خلاصہ لکھا، ابوالریحان بیرونی نے اسکا اختصار کیا اور عمرو بن فرخان و ابراہیم بن الصلت و فضل ابن حاتم و شمس الدین سمرقندی، نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری و دیگر علما نے شرحیں لکھیں، شیخ یحییٰ بن محمد بن ابی الشکر المغربی الاندلسی نے مجسطی کا ملخص ملطیہ کے پوپ ابوالفرج غریغوریس بن ہارون کے اشارے سے لکھا،

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
فصول بقراط	بقراط	ابوعثمان سعید ابن یعقوب	یہ مترجم نہایت نامور حکیم اور مقتدر باللہ کے وزیر کا خاص طبیب تھا،
نموذار فی الاعمار	کنکہ ہندی	"	یہ حکیم ہندوستان کا رہنے والا ہارون الرشید کے دربار مین داخل تھا، اور علاوہ طبابت کے ترجمے کا کام بھی اس کے متعلق تھا، الفنسٹن نے تاریخ ہند مین اس کا نام منکا لکھا ہی،
اسرار الموالید	"	"	
والقرانات الکبیر	"	"	
والقرانات الصغیر	"	"	
کتاب حساب العدد			یہ کتاب سنسکرت زبان مین تھی جس کی توضیح و تفسیر ابوجعفر محمد بن موسیٰ خوارزمی نے کی، (جامع القصص العربیہ)
رسالۃ السر فی الکیمیا	ہرمس بود شیر قسطانس بن ارامیس		یہ رسالہ اخمیم مصر مین ایک قبہ مین پایا گیا، اس قبہ مین ایک عورت کی ممی تھی، اور اس کے بال پاؤن تک لٹک رہے تھے، سات نہایت عمدہ حلے اس کے بدن پر تھے اور اس کے ارد گرد چند تخت تھے جن پر چھوٹی چھوٹی لڑکیون کے میان تھین، یہ رسالہ سونے کی تختی پر لکھا ہوا تھا، اور اس عورت کے سر کے نیچے تھا، مامون الرشید جب مصر گیا تو اس نے اس رسالہ کا ترجمہ کرایا جس کو ایک حمیر کے شخص نے کیا تھا،

نام کتاب	نام مصنف	نام مترجم	
کلیلہ دمنہ		عبداللہ بن المقفع	یہ کتاب ہندی زبان سے نوشیروان کے لئے ترجمہ کی گئی پھر اس فارسی کا ترجمہ عبداللہ بن المقفع نے عربی میں کیا جو کہ ابوجعفر منصور کا منشی تھا، دوسرا ترجمہ عربی میں عبداللہ بن ہلال اہوازی نے یحییٰ بن خالد برمکی کے لئے کیا جو کہ ۱۶۵ھ میں تمام ہوا، پھر سہل بن نوبخت حکیم نے یحییٰ بن خالد کے لئے نظم کیا، جسکا صلہ اس کو ایکہزار دینار ملا، کلیلہ و دمنہ کے ڈھنگ پر سہل بن ہارون نے ایک کتاب مامون الرشید کے لئے لکھی، جس میں ہر ایک باب و فصل کلیلہ دمنہ کے معارضے کے طور پر لکھی،
کتاب الادویہ	دیسقوریدس		عبداللہ بالقی نے اس کی شرح لکھی،
کتاب سیرک ہندی	سیرک ہندی	عبداللہ بن علی	پہلے اس کتاب کا ترجمہ فارسی میں ہوا، پھر عبداللہ بن علی نے فارسی سے عربی میں ترجمہ کیا،
کتاب الطلوع والغروب	اوطولوقس		ثابت بن قرہ نے اصلاح کی، اور محقق طوسی نے تحریر، دو مقالے ہیں، اور ۳۶ شکلیں،
کتاب السموم	شاناق ہندی	ابوحاتم بلخی	یحییٰ بن خالد برمکی کے حکم سے منکہ ہندی نے باعانت ابوحاتم بلخی فارسی میں ترجمہ کیا، پھر مامون الرشید کے حکم سے علی بن العباس بن احمد نے عربی میں نقل کیا

نام کتاب	نام مصنف	نام مسترجم	
الاکر المتحرکہ	اوطوقولس		مامون الرشید کے عہد مین ترجمہ ہوا اور یعقوب کندی نے اصلاح کی،
اکر	ثاوذوسیوس	قسطا بن لوقا	یہ کتاب تین مقالون مین ہے، ثابت بن قرہ نے اصلاح کی اور محقق طوسی و تقی الدین الراصد نے تحریر کی،
اکر	مانالاوس		اس کتاب کے بہت سے ترجمے ہوئے، مہانی و ابو الفضل احمد بن سعید ہروی نے اصلاح کی، اس مین تین مقالے ہین،

یہ فہرست زیادہ تر کشف الظنون سے مرتب کی گئی ہے، خاص ارسطو کی تصانیف کے متعلق کسی قدر زائد تفصیل تاریخ التواریخ جلد اول حالات ارسطو سے لی گئی ہے،

ریمارک،

یہ فہرست نہایت مختصر ہے، ہم نے خود اختصار کی غرض سے بہت سے ترجمون کے نام نہین لکھے، گو عام طور پر ان مفصل واقعات سے لوگ بہت کم واقف ہین، تاہم ترجمون کی اجمالی تاریخ آج قوم کے ایک ایک ممبر کو معلوم ہے، انھین واقعات پر خیال کرنے سے بانیان سین ٹیفک سوسائٹی علی گڈھ کو دھوکا ہوا، اور وہ سمجھے کہ جس طرح ہمارے مورثون نے بذریعہ ترجمون کے علوم کو ترقی دی ہم بھی یورپ کے علوم و فنون کو اپنی زبان مین ترجمہ کرکے اپنے علوم اور اپنی قوم کو ترقی کے رتبے پر پہنچا ئین گے، مگر انکا یہ قیاس غلط اور قیاس مع الفارق تھا، اوّل تو ترجمون کا

اہتمام اور لاکھون روپیہ کا خرچ جو خلفائے عباسیہ کے زمانے مین ہوا اب غیر ممکن ہے۔ دوسرے اس زمانے مین علوم محدود تھے۔ اور ترقی کر چکی تھی جس قدر کتابین ترجمہ کر لی گئین یونانیون کے علوم پر گویا احاطہ کر لیا گیا اس زمانہ مین نہ علوم کی ترقی کی انتہا ہے نہ ان کتابون سے شمار کی کوئی حد ہے جن کی تصنیف کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ **تیسرے** بڑی غلطی اس قیاس مین یہ تھی کہ اُس زمانے مین عربی زبان جس مین ترجمے ہوئے تمام ممالک اسلامی مین حکومت کرنے والی زبان تھی، دنیا مین ایسی کوئی مثال موجود نہین ہے کہ قوم نے اُس زبان مین علوم و فنون کو ترقی دی ہو، جو ان پر حکومت کرنے والی نہین ہے۔ مگر ہم کو اس بات کے معلوم کرنے سے خوشی ہے کہ خود سید **احمد خان صاحب** نے جو سین ٹیفک سوسائٹی کے بانی ہین متعدد تحریرون مین اس غلطی کا اعتراف کیا ہے
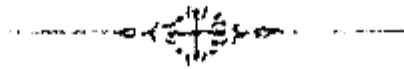
مدرسے اور دار العلوم

اگرچہ ۱۳۲ھ کے متصل ہی تمام ممالک اسلامی مین درس وتدریس کا ایک عظیم الشان سلسلہ قایم ہوگیا، اور انہین دو تین صدیون مین جس درجے کے سیکڑون ہزارون مجتہد، فقیہ، ادیب، شاعر، فلاسفر، مورخ پیدا ہوگئے، زمانے کو نو سو برس کی وسیع مدت مین بھی اس پایہ کے لوگ نصیب نہین ہوئے، لیکن تعجب ہے کہ تاریخ کے صفحون مین چوتھی صدی کے اخیر تک بھی کسی کالج یا اسکول کا نشان نہین ملتا، مسجدون کے صحن، خانقاہون کے حجرے، علما کے معمولی مکانات یہی اس وقت کے مدرسے یا دار العلوم تھے، چیمبرس انسائیکلوپیڈیا مین لکھا ہے کہ مامون الرشید کے زمانہ مین عمدہ عمدہ مدرسے بغداد، بصرہ، کوفہ، بخارا مین قائم ہوئے[1]، اس سے بھی زیادہ واضح انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی شہادت ہے کہ مامون نے اپنی ولیعہدی کے زمانے مین خراسان مین ایک کالج بنوایا جس مین مختلف ملکون سے نہایت لایق لایق استاد بلا کر مقرر کیے، اور میسوع ایک بڑے فاضل کو جو دمشق کا رہنے والا اور مذہبًا عیسائی تھا، کالج کا پرنسپل مقرر کیا[2]، اگر یہ روایتین صحیح ہون تو

مدرسون کی ابتدا

مدرسون کی ابتدائی تاریخ تصنیفات کے عہد سے بہت قریب ہو جاتی ہے، لیکن ہم کو معلوم ہے کہ ایشیائی وسیع النظر مورخ ان شہادتون کو بے پروائی کی نگاہ سے دیکھے گا، اور یہ کہکر ٹال دیگا کہ "اپنے گھر کا حال ہم تم سے زیادہ جانتے ہین"۔

عام خیال تو یہ ہے اور تعجب ہے کہ علامہ ابن خلکان بھی اس سے متفق ہین کہ اسلامی دنیا

---

[1] کتاب مذکور ذکر عرب،

[2] کتاب مذکور حالات مامون الرشید

میں اول جس نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی وہ دولت سلجوقیہ کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا، اولیت
کی تعیین تو ہم بھی نہیں کر سکتے مگر یہ بتا سکتے ہیں کہ نظام الملک سے پہلے بھی مدرسوں کے آثار
موجود تھے، سنہ ۳۹۵ھ میں حاکم مصر نے مصر میں ایک بڑا مدرسہ بنوایا، بہت سی کتابیں اس پر وقف کیں
اور فقہا و محدثین درس و تدریس کے لئے مقرر کئے،[1]

سلطان محمود غزنوی نے بھی ہندوستان کی بے انتہا دولت کا ایک حصہ اس عمدہ کام میں
صرف کیا، متھرا کی فتح سے واپس جا کر قریباً سنہ ۴۱۰ھ میں خاص دار السلطنت غزنین میں ایک نہایت
عالیشان مدرسہ بنوایا، ایک کتبخانہ بھی اس میں شامل تھا، جس میں مختلف زبانوں کی کتابیں نہایت
کثرت سے جمع کی گئی تھیں، مدرسہ کے مصارف کے لئے بہت سے دیہات اور مواضع وقف
کئے تھے، محمد قاسم فرشتہ کا بیان ہے کہ اس عمدہ نظیر کی تقلید تمام ارکان دولت اور امرا نے بھی
کی اور تھوڑے ہی دنوں میں غزنین علمی یادگاروں سے معمور ہو گیا،[2] دار السلام بغداد اس فخر
کے لئے ہنوز نظام الملک کا انتظار کر رہا تھا، لیکن نیشاپور میں بڑے بڑے کالج و اسکول قائم
ہو چکے تھے، سلطان محمود کے بھائی امیر نصر نے ایک مدرسہ بنوایا جو سعیدیہ کے نام سے مشہور
ہوا، مدرسہ بیہقیہ کے مدرس اعظم ابو القاسم اسکاف اسفرائنی تھے،

امام الحرمین نے جو امام غزالی کے استاد ہیں اسی مدرسہ میں تعلیم پائی تھی، استاد ابوبکر فورک
کو لوگوں نے خطوط بھیجکر بلایا، اور جب وہ تشریف لائے تو خاص ان کے درس کے لئے ایک
مدرسہ تعمیر ہوا، جس کی نسبت کہا جا سکتا ہے کہ تاریخ اسلام میں اگر کوئی مدرسہ عام قومی چندہ
سے بنا تو شاید یہی تھا، استاد ابوبکر نے سنہ ۴۰۶ھ میں وفات پائی، ان کی تصنیفات سو کے اندازہ

---

[1] حسن المحاضرہ علامہ سیوطی ذکر حوادث غریبہ سنہ ۳۹۵ھ و تاریخ کامل وقائع سنہ ۳۹۵ھ۔

[2] تاریخ فرشتہ فتح متھرا،

سوسے قریب بنا کیا گیا ہے، اسی طرح ایک اور مشہور مدرسہ علامہ ابو اسحٰق اسفرائنی المتوفی ۴۱۸ھ کیلئے قایم ہوا[1] حکیم ناصر خسرو سفر کرتا ہوا ۴۳۷ھ ہجری میں جب نیشاپور پہنچا تو اس نے ایک مدرسہ دیکھا جو طغرل بیگ سلجوقی کے حکم سے تعمیر ہو رہا تھا[2]، ایک اور مدرسہ تھا جو ابو سعد اسمٰعیل استرآبادی کی طرف منسوب ہے،

اور شاید سب سے اخیر وہ مدرسہ تھا جو نظام الملک کی علمی فیاضی کا پہلا دیباچہ تھا یہ مدرسہ بھی نظامیہ کے نام سے مشہور تھا لیکن جب بغداد کا مشہور دارالعلوم قائم ہوا، تو اسکی علمی شہرت دب گئی اور اب اگر اسکو نظامیہ کہتے ہیں تو ساتھ ہی نیشاپور کی قید لگانی پڑتی ہے، تاہم اس کا یہ فخر کوئی نہیں گھٹا سکتا کہ امام غزالی کے استاد علامہ ابو المعالی امام الحرمین اسکے مدرس اعظم تھے، اور امام غزالی سے فخر روزگار اسی مدرسہ کے ایک مستعد طالب العلم تھے[3] حقیقت یہ ہے کہ نظامیہ کی عزت کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ وہ دنیا میں سب سے پہلا مدرسہ تھا، بلکہ اس لئے ہے کہ اس کی عالمگیر شہرت نے تمام پچھلی یادگاروں کو اس طرح دلوں سے بھلا دیا کہ گویا اس سے پہلے کوئی دارالعلم بنا ہی نہ تھا، خود بغداد میں بھی تو اس سے کچھ پہلے الپ ارسلان سلجوقی کا ایک مدرسہ موجود تھا، جو زر خطیر کے صرف سے تیار ہوا تھا مگر آج کتنے آدمی ہیں، جو اسکا نام بھی بتا سکیں،

عرب کے سوا اسلامی ممالک میں جتنے خاندان فرمانروا ہوئے، ان سب میں پر عظمت اور قوی تر آل سلجوق تھے، الپ ارسلان و ملک شاہ جنکی شہرت نے یورپ و ایشیا دونوں کو

---

[1] اس مدرسہ اور مدرسہ بیہقیہ و مدرسہ سعیدیہ کے لئے دیکھو حسن المحاضرہ علامہ سیوطی ذکر امہات مدارس، باقی مدرسوں کے حالات ابن خلکان میں ان علماء کے تراجم میں ملیں گے جن کے لئے وہ قائم کئے گئے، ابن خلکان میں امام الحرمین کے حالات بھی دیکھو [2] سفرنامہ ناصر خسرو مطبوعہ دہلی صفحہ ۴۴، [3] دیکھو ابن خلکان ترجمہ امام الحرمین و امام غزالی،

برابر قبضہ کیا ہے، اسی خاندان کے یادگار تھے، اور نظام الملک طوسی جس کے مبارک ہاتھون نے نظامیہ بغداد کی بنیاد ڈالی انھین دونو کے دربار مین وزیر اعظم تھا[1]، وہ صرف وزیر نہ تھا، بلکہ سفید و سیاہ کا مالک تھا، اس نے چھ لاکھ دینار کی رقم خاص اس فیاضانہ کام کے لئے خزانہ شاہی سے مقرر کی تھی، اور تمام عملداری مین مکتب اور مدرسے قائم کئے تھے، خاص اپنی کل جاگیرات مین سے بھی دسوان حصہ مدرسون کے لئے وقف کر دیا تھا[2]، لیکن سب سے بڑا کام جو اس کے ہاتھو پورا ہوا نظامیہ کی تعمیر تھی، گبن صاحب اس کی نسبت لکھتے ہین کہ ایک سلطان کے وزیر نے بغداد مین مدرسہ قائم کرنے کے لئے دو لاکھ دینار[3] وقف کئے، اور پندرہ ہزار دینار سالانہ اس کے صرف کے لئے مقرر کئے، نتائج علمی سے چھ ہزار ہر درجہ کے طلبا مختلف فنون مین بہرہ اندوز ہوئے ان مین امرا کے لڑکے بھی تھے اور اہل حرفہ کے بھی، غریب طالب علمون کیلئے کافی آمدنی مقرر تھی اور مدرسون اور محققون کی تنخواہین بیش قرار تھین،

نظامیہ بغداد

سنہ ۴۵۷ھ مین اس کی تعمیر شروع ہوئی اور ۱۰ ذیقعدہ روز شنبہ سنہ ۴۵۹ھ کو بڑی شان و شوکت سے کھولا گیا، اگر مورخین کا یہ بیان صحیح ہے کہ رسم افتتاح کے وقت سارا بغداد امنڈ آیا تھا، اور دار الخلافہ کی کل عظمت اور قوت نظامیہ کے ہال مین مجتمع تھی۔ تو قوم کے علمی جوش اور سلسلہ عمارت کی وسعت کا بھی ہم صحیح اندازہ کر سکتے ہین، علامہ ابو اسحق شیرازی جو ان ممالک مین استاد کل تسلیم کئے جاتے تھے، مدرس اعظم منتخب ہوئے، لیکن انھون نے ایک شبہہ کی بنا پر اس عہد

[1] ملک شاہ کی سلطنت کا شہرہ بیت المقدس تک طول مین اور قسطنطنیہ سے بلاد خزر تک عرض مین پھیلی ہوئی تھی اس عہد مین گویا وہ تمام ممالک اسلامی کا مالک تھا، سنہ ۴۴۷ھ مین پیدا ہوا، اور سنہ ۴۸۵ھ مین وفات پائی نظام الملک نے تیس برس تک اس کے دربار مین وزارت کی (ابن خلکان ترجمہ ملک شاہ و نظام الملک) [2] آثار البلاد علامہ قزوینی ذکر طوس و روضتین فی اخبار الدولتین، [3] دینار کم از کم پانچ روپیہ کا ہوتا ہے، اگر اسی شرح سے حساب لگائین تو بھی دس لاکھ روپیہ ہوتے ہین،

کو ناپسند کیا، اس لئے سردست ابونصر مصنف شامل کو یہ خدمت سپرد ہوئی، اور بیس دن کے بعد علامہ ابو اسحٰق بڑے اصرار سے اس منصب کے قبول کرنے پر راضی کئے گئے، نظامیہ کی عمر میں خدا نے بڑی برکت دی اور جب تک بغداد کی حکومت قایم رہی، اس کی فیاضیان بھی دور دور دراز ملکوں تک اپنا اثر پہنچاتی رہین، ہمارے مخدوم سعدی شیرازی اُس کے اخیر زمانہ کے طالب العلم ہین[1] امام غزالی، امام طبری، ابن الخطیب، تبریزی شارح حماسہ، ابوالحسن فصیحی شاگرد امام عبدالقاہر جیلانی وغیرہ، مدرس اعظم اور امام احمد غزالی ابوالمعالی قطب الدین شافعی کیا ہراسی، وغیرہ وقتاً فوقتاً اس مین نائب مدرس رہ چکے ہین، ہر زمانے مین علما کے لئے نظامیہ کی پروفیسری سے بڑھکر کوئی بات اعزاز کی نہین ہوسکتی تھی، اور دوسو برس کی مدت مین کوئی ایسا شخص اس منصب پر نہین مقرر ہوا جو اپنے زمانے مین یکتائے فن و یگانہ دہر نہ سمجھا جاتا ہو، نظامیہ کے احاطہ مین ایک بڑا کتبخانہ بھی تھا، جو خود نظام الملک کے عہد مین تیار ہوا تھا، علامہ ابوزکریا تبریزی جو ایک مشہور مصنف عالم تھے کتبخانہ کے مہتمم تھے، (آثار البلاد قزوینی ذکر شہر تبریز)

۰۰۶ھ مین ناصرالدین اللہ خلیفہ عباسی کے حکم سے ایک اور کتبخانہ اُس کے احاطے مین تعمیر ہوا اور ہزارون نایاب کتابین شاہی کتبخانہ سے اس کے لئے عنایت ہوئین[2]، نظامیہ کی مخصوص فیاضیون مین یہ بات بھی شمار کی گئی ہے، کہ اس نے طلبا کے لئے وظیفے اور تنخواہین مقرر کین جس کا اس سے پہلے شاید کبھی رواج نہین تھا[3]، نظام الملک نے عام مدرسون کے علاوہ نیشاپور، ہرات، موصل،

---

[1] نظامیہ کے یہ حالات کامل ابن الاثیر واقعات ھ و ھ و ھ و اعلام تاریخ مکہ مطبوعہ جرمن صفحہ و تاریخ الخلفا سیوطی حالات ھ و تاریخ ابن خلکان ترجمہ ابو اسحٰق شیرازی و ابونصر صباغ و گبن صاحب کی دی ... حصہ سوم بیان آغاز دولت عباسیہ اور حسن المحاضرہ علامہ سیوطی ذکر مدارس مصر مین اجمالاً و تفصیلاً مل سکتے ہین،

[2] کامل ابن الاثیر واقعات ھ،

[3] حسن المحاضرہ بحوالہ طبقات سبکی فصل امہات مدارس،

اصفہان مین جو بڑے بڑے کالج قائم کئے تھے وہ بھی نظامیہ کہلاتے تھے، اور مدت تک نہایت مشہور فائق علما ان کے پروفیسر مقرر ہوتے رہے، مثلاً نظامیہ ہرات کے مدرس ابو سعد محمد بن یحییٰ شاگرد امام غزالی تھے، نظامیہ موصل مین ابو حامد محی الدین المتوفی [illegible] نے درس دیا، ارجانی المتوفی [illegible] نے نظامیہ اصفہان مین تحصیل کی، لیکن نظامیہ بغداد گویا یونیورسٹی تھی اور یہ تمام کالج اس کی شاخین تھین،

نظام الملک نے جو صرف کثیر مدارس وغیرہ کے لئے شاہی خزانہ سے مقرر کیا تھا اس پر **ملک شاہ** کو بھی خیال ہوا، اور اس نے نظام الملک کو بلا کر اپنے معمولی طریقے کے موافق کہا کہ "پیارے باپ اس قدر زر کثیر سے تو ایک فوج مرتب ہو سکتی ہے، جن لوگون پر آپ یہ فیاضیان کر رہے ہین ان سے ایسا بڑا کام کیا نکل سکتا ہے، نظام الملک نے کہا "جان پدر! مین تو بوڑھا ہون، لیکن تم جو ایک نوجوان ترک ہو، اگر بازار مین بیچنے کے لئے کھڑے کئے جاؤ تو امید نہین کہ تیس دینار سے زیادہ تمھاری قیمت اٹھے، اس پر خدا نے تم کو اتنا ملک عنایت کیا، کیا اس کا اتنا شکریہ بھی تم ادا نہین کر سکتے، تمھاری فوج کے تیر چند قدم پر کام دے سکتے ہین، لیکن مین جو فوج تیار کر رہا ہون انکی دعاؤن کے تیر آسمان کی سپر سے بھی نہین رک سکتے، ملک شاہ بیساختہ بول اٹھا کہ "مرحبا پیارے باپ ایسی فوجین جس قدر ممکن ہون اور تیار کرنی چاہئین"[1]،

مسلمانون کی علمی تاریخ مین یہ بات بھی نہایت عجیب اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب ماوراء النہر کے علماء کو نظامیہ کے قائم ہونے کے تمام حالات سے اطلاع ہوئی تو سب نے ایک مجلس ماتم منعقد کی اور اس بات پر روئے کہ اب علم علم کیلئے نہین، بلکہ جاہ و ثروت حاصل کرنے کے لئے سیکھا جائیگا، اس روایت سے آئندہ ہمکو ایک رائے قائم کرنے مین مدد ملیگی، نظامیہ نے اپنے اثر سے

---

[1] اعلام تاریخ مکہ ذکر مدرسہ نظامیہ،

ایک عجیب گرمجوشی تمام ملک میں پیدا کر دی اور پانچویں صدی میں قائم ہوا، اور چھٹی صدی تک اسلامی دنیا کا کوئی گوشہ بجز اسپین کے علمی عمارتوں سے خالی نہ رہا، خراسان کے بڑے بڑے صوبے مثلاً مرو، نیشاپور، ہرات، بلخ اور ایران کے علاقے گو پہلے سے علم و فضل کے مرکز تھے، مگر نظامیہ کے اثر نے اور بھی مالا مال کر دیا، یاقوت حموی قریباً چھٹی صدی میں جب مرو پہنچا تو وہاں بہت سے مدرسے اور کتبخانے موجود پائے جن مدرسوں کے متعلق بڑے بڑے کتبخانے تھے، ان کے یہ نام ہیں: مستوفیہ، شرف الملک ابوسعد محمد بن منصور المتوفی سنہ ۴۹۴ھ کا قائم کیا ہوا، عمیدیہ، خاتونیہ، آن میں چند کتبخانے تھے، نظامیہ، نظام الملک حسن بن اسحٰق کا قائم کیا ہوا،

یاقوت حموی معجم البلدان[1] جیسی عجیب اور جامع کتاب انہیں کتبخانوں کی مدد سے لکھ سکا،[2] خاص شہر نیشاپور کی کثرتِ مدارس کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے، کہ ۵۵۶ھ میں جب اندرونی فسادات نے اس کو غارت کیا تو عام عمارتوں کے ساتھ ۲۵ حنفیہ اور شافعیہ مدرسے بھی برباد ہوئے ان کے علاوہ بارہ کتب خانے بھی جل گئے یا لوٹ لئے گئے، یزد میں صرف علامہ حسین بن احمد ابوالفضل المتوفی سنہ ۴۹۱ھ کے اہتمام میں بارہ مدرسے تھے جن میں بارہ سو طلبہ تعلیم پاتے تھے،[3] خوارزم کا بڑا کالج امام فخرالدین رازی المتوفی سنہ ۶۰۶ھ کی پروفیسری سے ممتاز تھا، مسٹر شارڈن سیاح فرانس جنھوں نے دولت صفویہ کے زمانہ میں ایران کے اکثر مقامات کی سیر کی، اپنے سفرنامہ میں لکھتے ہیں کہ سلیمان صفویہ کے عہد میں خاص شہر اصفہان میں ۱۶۸ مدرسے موجود تھے۔"

(مرآت البلدان ناصری، جلد اول صفحہ ۹۵، مطبوعہ ایران)

---

[1] یہ عربی زبان میں ایک جغرافیہ کی کتاب ہے جو کم و بیش چار ہزار صفحوں میں ہے اور اس جامعیت سے لکھی گئی ہے، کہ عقل حیران ہوتی ہے، یورپ میں چھاپی گئی ہے،

[2] دیکھو معجم البلدان حالات مرو"

[3] حسن المحاضرہ جلد اول، صفحہ ۱۰۲، مطبوعہ مصر سنہ ۱۲۹۹ھ،

خود بغداد میں نظامیہ کے ہوتے تیس ۳۰ بڑے بڑے کالج موجود تھے، جن کے بلند ایوانات اور وسعتِ عمارت کی نسبت علامہ ابن جبیر کا بیان ہے کہ "ہر ایک بجائے خود ایک مستقل شہر معلوم ہوتا ہے"[1] علامہ موصوف نے ۵۸۰ھ میں بغداد کو دیکھا تھا، بغداد کے بعض مدرسوں کا ہم ایک مختصر سا نقشہ فہرست کے طور پر درج کرتے ہیں:-

بغداد کے مدرسے

مدرسہ	بانی	کیفیت
مدرسہ تاجیہ	تاج الملک مستوفی السلطان	غالباً ۴۸۲ھ میں تعمیر ہوا، امام ابوبکر شاشی مدرس اعظم مقرر ہوئے، (کامل ابن الاثیر واقعات ۴۸۲ھ)
مدرسہ مستوفیہ	شرف الملک ابوسعد محمد بن منصور	یہ سلطان ملک شاہ سلجوقی کا مستوفی تھا، ۴۹۴ھ میں وفات پائی، یہ مدرسہ باب الطاق کے پاس تھا، (کامل واقعات ۴۹۴ھ)
مدرسۂ کمالیہ	کمال الدین ابوالفتوح	صاحب المخزن تھا، یہ مدرسہ ۵۳۳ھ میں تیار ہوا، رسم افتتاح میں بغداد کے تمام اعیان شریک تھے، (کامل واقعات ۵۳۳ھ)
مدرسہ ابوالمظفر	ابوالمظفر عون الدین	۵۴۴ھ میں خلیفہ المقتفی بامر اللہ کے دربار میں منصب وزارت پر ممتاز ہوا، (ابن خلکان حالات وزیر مذکور)
مدرسہ ثقۃ الدولہ	علی بن محمد معروف بہ ثقۃ الدولہ	خلیفہ المقتفی کا مقرب تھا، یہ مدرسہ شافعیوں

[1] سفرنامہ علامہ ابن جبیر حالات بغداد بمقام لیڈن ۱۸۵۲ء میں چھاپا گیا ہے۔

مدرسہ	بانی	کیفیت
		کے لئے خاص تھا، دجلہ کے کنارے پر اس کی عمارت تھی، ثقۃ الدولہ نے ۵۷۴ھ میں وفات کی (ابن خلکان ترجمہ شہدۃ فخر النساء)
مدرسہ بہائیہ		نظامیہ کے متصل ہے ابو منصور محمد ہروی جن کی عظمت وشان ان کے حالات کے پڑھنے سے معلوم ہوتی ہے قریباً ۵۹۲ھ میں پروفیسر مقرر ہوئے، مدرسہ نظامیہ میں بھی وعظ کہا کرتے تھے نظامیہ کی پروفیسری کیلئے بھی امیدوار کئے گئے تھے، (ابن خلکان، حالات ابو منصور مذکور)
مدرسہ فخریہ	فخر الدولہ	ان کا باپ وزیر تھا، فخر الدولہ نے ۵۸۳ھ میں وفات پائی، (کامل ابن الاثیر واقعات ۵۸۳ھ)
مدرسۂ والدہ ناصر لدین اللہ	خلیفہ ناصر لدین اللہ کی والدہ،	
مستنصریہ	خلیفہ المستنصر باللہ	اس مدرسہ کا کسی قدر تفصیلی حال ہم لکھتے ہیں، ان مدرسوں کے علاوہ بغداد میں مشہد ابی حنیفہ، وقفیہ، زیرکیہ، مغیثیہ، عنابیہ، مدرسہ قدیمیہ، عباسیہ شہرت عام رکھتے تھے طبقات الحنفیہ وغیرہ میں انکے مدرسین وغیرہ کے حالات مل سکتے ہیں، بغداد کے اکثر مدرسے بغداد کے

		تباہ ہو جانے کے بعد بھی باقی رہے گی

دولت عباسیہ کی تاریخ میں یہ بات بڑے الزام کے قابل تھی کہ اُن تمام عالی عمارتوں
میں سے ایک بھی کسی عباسی خلیفہ کے نام سے نہ تھی، اور دار الخلافہ بغداد تمام حیثیت سے
بالکل دوسری نسلوں کا ممنون تھا، خلیفہ المستنصر باللہ نے جو رجب ۶۲۳ھ میں تخت نشین
ہوا، اس الزام کو اٹھانا چاہا، اتنی مدت کی غلطی کا کفارہ بھی اسی قدر درست ہونا چاہئے تھا، اور
انصاف یہ ہے کہ ایسا ہی ہوا، باتفاق تسلیم کیا گیا ہے کہ جس عظمت و شان کا یہ مدرسہ بنا اس کی
نظیر سے گذشتہ اور موجودہ دونوں زمانے خالی ہیں، ۶۲۵ھ میں دجلہ کے کنارے اس کی بنیاد
کا مبارک پتھر رکھا گیا، اور چھ برس کی مدت میں سلسلۂ عمارت پورا تیار ہوا، عمارت کا ایک حصہ جو
دجلہ میں تھا (مستنصریہ کے آثار اب بھی موجود ہیں، ناصر الدین بادشاہ حال ایران نے سفرنامہ
ایشیا میں اس کی گذشتہ شوکت یاد دلانے والی ٹوٹی ہوئی عمارت کا ذکر کیا ہے) اسی سنہ
میں ماہ رجب جمعرات کے دن اس کی رسم افتتاح بڑی شوکت و شان سے ادا ہوئی، جس میں
بغداد کے تمام اعیان و افسران فوج و علماء، مدرسین و قضاۃ و اہل منصب شریک تھے، مستنصر
نے تمام اعیان و امراء کو خلعتیں عنایت کیں، اور موید الدین علقمی جس کے اہتمام میں عمارت
تیار ہوئی تھی اس کی جاگیر مضاعف کر دی، مذاہب اربعہ کے فقہا، اور شیخ الحدیث، شیخ النحو،
شیخ الفرائض، شیخ الطب، درس کے لئے مقرر ہوئے، ایک سو ساٹھ اونٹ پر لاد کر عمدہ
عمدہ کتابیں کتبخانہ شاہی سے اس کے استعمال کے لئے آئیں، مدرسہ ہی کے احاطہ میں ایک
ہسپتال اور مزملہ بھی تھا، (جس سے گرمیوں میں پانی ٹھنڈا کرتے ہیں) دو سو اڑتالیس مستعد طلبا
مدرسہ کھلنے کے ساتھ بورڈنگ میں داخل ہوئے جنکو مکان، فرش، خوراک، روغن، کاغذ،
قلم وغیرہ مدرسہ کی طرف سے ملتا تھا، ان کے دسترخوان پر معمولی کھانے کے علاوہ شیرینی اور

میوسے بھی چنے جاتے تھے، ان سب کے علاوہ ایک اشرفی ماہوار اُنکے وظیفہ کے طور پر مقرر تھی سیکڑوں دیہات اور موضع مدرسہ کے سالانہ مصارف کے لئے وقف تھے جنکی مجموعی آمدنی ستر ہزار مثقال سونا یعنی آج کل کے حساب سے تقریبًا ساڑھے چار لاکھ سالانہ تھی[1] (علامہ ذہبی نے تاریخ دول الاسلام میں ان مواضع کی پوری فہرست دی ہے) حنفیوں کے مدرس اعظم شیخ عمر ملقب بہ رشید الدین فرغانی تھے، جو فقہ اصول حکمۃ کلام میں بڑے ماہر گنے جاتے تھے پہلے سنجار کے مدرسہ میں مدرس تھے پھر مستنصر باللہ نے فرمان بھیجکر بلا لیا تھا[2] مدرسے کے دروازے پر ایک ایوان تھا جسمیں ایک نہایت عجیب اور بیش قیمت گھڑی رکھی تھی[3] جس کو علی بن تغلب بن ابی الضیا بعلبکی ایک مشہور ہیئت دان و منجم نے تیار کیا تھا[4] جو بعد کو الساعاتی یعنی گھڑی ساز کے نام سے مشہور ہوا،

---

[1] دیکھو تاریخ الخلفاء سیوطی حالات مستنصر باللہ و اعلام تاریخ مکہ صفحہ ۱۴۴ و مرآۃ البلدان ناصری مطبوعہ ایران جلد اول صفحہ ۴۴۳ و دول الاسلام علامہ ذہبی و جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ ترجمہ عمر بن محمد بن الحسین بن ابی عمر محمد ابو حفص فرغانی مدرس اول مستنصریہ جواہر مضیہ میں مدرسین شافعیہ و مالکیہ و حنبلیہ کے نام بھی لکھے ہیں،

[2] آثار البلاد قزوینی ذکر شہر فرغانہ،

[3] شاید یہ دوسری گھڑی ہے جو دولت عباسیہ کے عہد میں تیار ہوئی اس سے بہت پہلے ہرون الرشید نے جو گھڑی شاہ فرانس کو بھیجی تھی، یورپ میں وہ تعجب کی نگاہ سے دیکھی گئی، فرانس کے مورخوں کا بیان ہے کہ ہمارے ملک میں پہلے گھڑی وہ ظاہر ہوئی، جو ہرون الرشید نے ۸۰۷ء میں شارل مین بادشاہ فرانس کو تحفہ کے طور پر بھیجی تھی، یہ گھڑی ایسی عجیب و غریب تھی کہ تمام دربار فرانس حیرت میں رہ گیا، اس گھڑی میں بارہ دروازے تھے، جب گھنٹہ پورا ہوتا تھا تو ایک دروازہ خود بخود کھل جاتا تھا اور ایک مونگری جو تانبے کی بنی ہوئی تھی وہ جرس پر پڑتی تھی، یہ دروازے کھلے رہتے تھے اور جب ایک دورہ پورا ہو جاتا تھا تو دروازوں سے بارہ سوار نکلتے تھے اور گھڑی کی پیشانی پر چکر لگاتے تھے، (دیکھو کشف المخبا عن فنون اوروپا مطبوعہ جوائب ۱۲۹۹ھ صفحہ ۲۱۸ و ۲۱۹) ایک انگریزی تصنیف میں بھی قریب قریب یہی تفصیل مذکور ہے،

[4] دیکھو جواہر مضیہ فی طبقات الحنفیہ ترجمہ احمد بن علی بن تغلب بن ابی الضیاء المذکور، کسی قدر اس گھڑی کے حالات آثار البلاد علامہ قزوینی میں بذیل عجائبات بغداد ملیں گے،

عبدالرزاق ابن الفوطی جو محقق طوسی کا شاگرد رشید تھا، اور دس برس تک مراغہ کی رصدگاہ میں محقق صاحب کے ساتھ خزانۃ الرصد کا مہتمم رہ چکا تھا، واقعۂ تاتار کے بعد کتبخانے کا افسر مقرر ہوا جہاں رہکر اس نے تاریخ کی ایک کتاب ۵۰ جلدوں میں لکھی[1]،

چھٹی صدی میں جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، ممالک اسلامیہ کا کوئی حصہ علمی یادگاروں سے خالی نہ رہا، عرب اور مصر بھی جہاں اب تک اس قسم کی ایک عمارت بھی موجود نہ تھی، اس صدی میں کالج اور اسکولوں سے معمور ہوگئے، مصر میں خلیفۂ عبیدی حاکم بامراللہ نے سنہ ۳۹۵ھ میں جو دارالعلم قایم کیا تھا سنہ ۴۰۰ھ میں خود اس کو برباد کردیا، اور اس وقت سے پھر کسی نے اس طرف توجہ نہیں کی، چھٹی صدی میں دو خاندان نوریہ و صلاحیہ اسلامی عظمت و شوکت کی اصلی مرکز تھے، نورالدین محمود زنگی المتوفی ۵۶۹ھ جو شوال ۵۴۱ھ میں تخت نشین ہوا، دولت **نوریہ** کا بانی اور مصر و شام کا مستقل فرمان روا تھا، اس نے قریباً پچاس شہر و قلعے یورپ کے پنجۂ غصب سے واپس لئے تھے، صلاح الدین المتوفی ۵۸۹ھ نے نورالدین ہی کے دامن فیض میں تربیت پائی تھی لیکن کروسیڈ کی لڑائیوں اور خصوصاً بیت المقدس کی فتح نے اس کو اپنے آقا سے بھی زیادہ شہرت اور عزت دی، یہ دونوں خاندان صرف اسی بات میں نامآور نہ تھے، کہ انھوں نے مسلمانوں کی بھولی ہوئی عظمت ایک بار اور یورپ کو یاد دلادی، بلکہ اس بات میں بھی کہ ان کی وجہ سے ممالک مصر و شام میں علم کا آوازہ نہایت بلند ہوگیا،

صلاح الدین و نورالدین کا عہد

نورالدین نے حلب، حماۃ، حمص، بعلبک، منبج، رحبہ میں بڑے بڑے مدرسے قائم کئے، خاص دمشق میں جو اس کا پایہ تخت تھا، ایک ایسا عظیم الشان مدرسہ بنایا کہ مدت تک بے نظیر خیال کیا جاتا تھا، یہ فخر بھی خاص نورالدین کی قسمت میں تھا کہ تمام دنیا میں جو پہلا دارالحدیث

---

[1] دیکھو تتمہ ابن خلکان ترجمہ ابن الفوطی،

قائم ہوا، اس کے نام سے ہوا، ورنہ اس سے پہلے خاص علم حدیث کے درس کے لئے کوئی مدرسہ نہین تعمیر ہوا تھا[1] علامہ ابن جبیر نے ۵۸۰ھ مین جب دمشق کو دیکھا تو خاص شہر مین ۲۰ کالج تھے، عام حکم تھا کہ جو شخص کوئی مدرسہ قایم کرے اس کو تمام مصارف خزانہ شاہی سے ملین گے، مغربی طلبا کے لئے خاصۃً سات باغ اور کچھ زمین وقف تھی جس کی سالانہ آمدنی پانسو[2] اشرفیان تھین، جو لڑکے قرآن ختم نہین کر سکتے تھے ان کو صرف سورہ کوثر سے اخیر تک پڑھایا جاتا تھا، ان مین سے پانسو لڑکون کا وظیفہ خزانۂ شاہی سے مقرر تھا[3] نور الدین نے خاص اپنے ذاتی مال سے مدارس اور مکاتب وغیرہ پر جو جاگیرین وقف کی تھین، اور جو اس کی وفات کے بعد بھی سیکڑون برس تک قائم رہین، ان کی آمدنی نو ہزار صوریہ اشرفیان تھین[4]،

اسی طرح سلطان صلاح الدین نے، اسکندریہ، قاہرہ، بیت المقدس، دمشق وغیرہ مین مدرسے قائم کئے، اور بے انتہا آمدنی ان پر وقف کی[5] علامہ ابن جبیر لکھتے ہین کہ اسکندریہ کے بورڈنگ مین اذن عام تھا کہ جو شخص کہین سے بطلب علم آئے، اس کو مکان، خوراک، حمام، ہسپتال سب کچھ سلطنت کی طرف سے مہیا ملے گا[6] صلاح الدین کے عہد مین علما کی جو تنخواہین مقرر تھین اُن کی تعداد تین لاکھ دینار سالانہ تھی جس کے آج کل کے حساب سے کم از کم پندرہ لاکھ روپیے ہوتے ہین، (روضتین فی اخبار الدولتین جلد ثانی صفحہ ۲۰۸ مطبوعہ مصر)

صلاح الدین کے عہد مین علماء کی تنخواہین،

صلاح الدین کا تمام خاندان اس قسم کی فیاضیون مین نامور تھا، عموماً امرا اور اعیانِ دولت بلکہ خواتین مین بھی یہ جوش پھیل گیا تھا، اور یہ بات نہایت ذلت کی سمجھی جاتی تھی کہ کوئی

---

[1] ابن خلکان ترجمہ نور الدین و حسن المحاضرۃ ذکر مدرسہ کاملیۃ، [2] یہ تمام حالات سفرنامہ علامہ ابن جبیر دمشق کے ذکر مین ملین گے، [3] روضتین فی اخبار الدولتین مطبوعہ مصر ۱۲۸۷ھ جلد اول صفحہ ۱۰، روضتین کے مصنف نے ایک عہدہ دار سے جو ان جاگیرون سے تعلق رکھتا تھا، ۶۰۸ھ مین یہ تعداد تحقیق کی تھی، [4] ابن خلکان ترجمہ صلاح الدین [5] سفرنامہ ابن جبیر صفحہ ۳۰،

دولتمند شخص مرے اور دنیا مین کوئی علمی یادگار نہ چھوڑ جائے،

سلطان صلاح الدین کا نامور فرزند الملک الظاہر ابو الفتح غازی جس زمانہ مین حلب کا فرمان روا تھا، قاضی ابو المحاسن بہاء الدین شافعی جو مدرسۂ نظامیہ مین نائب رہ چکے تھے اور نہایت مشہور و فاضل تھے، سنہ ۵۹۱ھ مین اس کی خدمت مین باریاب ہوئے، حلب مین اگرچہ اس وقت بھی چند مدرسے موجود تھے[1] لیکن قاضی صاحب نے ان کو کافی نہین سمجھا، ملک الظاہر سے کہکر بہت سی جاگیرین خاص ان مصارف کے لئے مقرر کرائین، خود بھی دو مدرسے، شافعیہ و دار الحدیث قائم کئے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہین کہ اس وقت سے حلب کی علمی شہرت نہایت عام ہوگئی، اور دور دور دراز ملکون سے اہل علم نے وہان آنا شروع کیا تھوڑے ہی دنون مین حلب بھی دمشق و مصر کی طرح علوم و فنون کا مرکز بن گیا،[2]

دولت صلاحیہ

اس زمانہ مین مصر، قاہرہ، دمشق، حلب، اربل کے تمام علاقون مین جو بے انتہا مدارس قائم ہوگئے، انکو کون شمار کرسکتا ہے، اگر کوئی شخص چاہے تو جواہر مضیئہ فی طبقات الحنفیۃ حسن المحاضرۃ فی تاریخ مصر و قاہرہ، وفیات الوفیات و ابن خلکان وغیرہ سے ایک بڑی فہرست تیار کرسکتا ہے، لیکن ہم اس موقع پر صرف ان بڑے بڑے مدرسون کا ایک نقشہ دیتے ہین جو خاصۃً صلاحیہ دولت و خاندان سے تعلق رکھتے ہین بعض مدرسین کے بھی ہم نام لکھین گے جس سے معلوم ہوگا کہ جو علماء اس زمانہ مین علم و فضل کے مامن تھے اکثر انھین مدرسون کے منصب درس پر ممتاز تھے،

---

[1] سنہ ۵۸۰ھ مین جب علامہ ابن جبیر نے حلب کو دیکھا تو وہان چند مدرسے موجود تھے، جنمین سے ایک مدرسہ نہایت عالیشان اور عمارت کی خوبی مین وہان کے مشہور جامع مسجد کا ہمسر تھا، اس کے بورڈنگ اور عام مکانات پر انگور کی بیلین چڑھادی تھین اور طالب العلم اپنی جگہ سے بیٹھے بیٹھے انگور کھا سکتے تھے، (سفرنامہ ابن جبیر ذکر حلب)

[2] ابن خلکان ترجمہ قاضی صاحب موصوف،

دولت صلاحیہ

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
شافعیہ یا صلاحیہ	صلاح الدین المتوفی ۵۸۹ھ	مصر	علامہ نجم الدین خبوشانی بنشا ہر وصیت دینا مدرس اعظم اور مہتمم مقرر ہوئے اور دس مدرس ان کے ماتحت تھے تقی الدین بن دقیق العید، سراج بلقینی، حافظ ابن حجر، بہاء الدین قاضی القضاۃ وغیرہ وقتاً فوقتاً اس میں مدرس مقرر ہوئے، نہایت کثیر آمدنی اس پر وقف تھی، علامہ ابن جبیر لکھتے ہیں کہ اس کی سلسلہ عمارات پر ایک مستقل آبادی کا گمان ہوتا ہے،
شافعیہ	"	"	شاید مصر میں صلاح الدین نے پہلا مدرسہ ۵۶۶ھ میں یہی قائم کیا، (روضتین، جلد اول صفحہ ۱۹۱)
مالکیہ یا قمحیہ،	"	"	محرم ۵۶۶ھ میں قائم ہوا، قریبا ۷۸۶ھ میں علامہ ابن خلدون نے بھی اس میں درس دیا (تاریخ ابن خلدون، حالات مصنف) و

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
			روضتین فی اخبار الدولتین،)
زین التجار (یا) شریفیہ	صلاح الدین المتوفی ۵۸۹ھ	مصر	عماد الدین عباسی، سراج الدین بلقینی، (استاد جلال الدین سیوطی) تقی الدین قاضی القضاۃ وغیرہم اس میں درس دیتے تھے،
مشہد	"	قاہرہ	یہ مدرسہ صلاح الدین کے نام سے مشہور ہے (ابن خلکان، حالات صلاح الدین)
سوفیہ	"	"	حنفیوں کے لئے خاص تھا،
صلاحیہ	"	بیت المقدس	اس کے مدرسین کی تنخواہیں بیش قرار تھیں، (انس الجلیل تاریخ بیت المقدس)
صلاحیہ	"	دمشق	
افضلیہ	الملک الافضل بن صلاح الدین	بیت المقدس	مالکیہ کے لئے خاص تھا،
ظاہریہ	الملک الظاہر بن صلاح الدین	حلب	ابو الحسن سیاح مدرس اعظم تھے،
عزیزیہ	الملک العزیز بن صلاح الدین	دمشق	نہایت مشہور اور عظیم الشان مدرسہ تھا علامہ سیف الدین آمدی المتوفی ۶۳۱ھ مدرس اعظم تھے
اسدیہ	اسد الدین شیرکوہ عم صلاح الدین	حلب	علامہ ابن الصلاح کے والد مدرس اعظم تھے،

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
ستیہ (یا) زمردیہ	زمرد ہمشیرہ صلاح الدین	دمشق	زمرد اور اس کے شوہر اور بھائی کی قبرین اسی مدرسہ مین ہین،
منازل العز (یا) تقویۃ	الملک المظفر تقی الدین المتوفی [illegible]ھ برادرزادہ صلاح الدین	مصر	جزیرۂ روضہ کا کل خراج، وحمام الذہب کی آمدنی اس پر وقف تھی، (روضتین جلد اول صفحہ ۱۹۱) شافعیون کے لئے خاص تھا، ۵۶۶ھ مین قایم ہوا تھا،
مالکیہ	〃	〃	مالکیون کے لئے خاص تھا،
تقویہ	〃	رہا	
عذرائیۃ	عذرا صلاح الدین کی بھتیجی تھی،	دمشق	
دار الحدیث	الملک الاشرف برادرزادہ صلاح الدین،	〃	علامہ ابن الصلاح المتوفی ۶۴۳ھ مدرس اعظم تھے، علامہ ابن خلکان نے ایک برس تک ان کی خدمت مین تحصیل علم کی،
معظمیہ	الملک المعظم برادرزادہ صلاح الدین	〃	الملک المعظم اور ان کے اکثر عزیز اسی مدرسہ مین مدفون ہین، ملک المعظم تصنیف اور فن ادب وفقہ مین نامور تھا، اس نے عام حکم دیا تھا کہ جس کو زمخشری کی مفصل زبانی یاد ہو سو اشرفیان اس کو انعام دیجاوین،

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
			اس تقریب سے اکثرون نے یہ مفید کتاب حفظ کر لی تھی،
معظمیہ	الملک المعظم برادرزادۂ صلاح الدین	بیت المقدس	اس مدرسہ پر بہت سے دیہات و مواضع وقف تھے، ۶۲۰ھ مین قائم ہوا،
دارالحدیث الکاملیہ	الملک الکامل برادرزادۂ صلاح الدین المتوفی ۶۳۵ھ	قاہرہ	یہ دوسرا دارالحدیث ہے، جو ممالک اسلامی مین دارالحدیث نوریہ کے بعد قایم ہوا، حافظ ابن دحیہ، زکی الدین منذری، قطب قسطلانی، ابن دقیق العید، ابن سید الناس حافظ زین الدین عراقی استاد حافظ ابن حجر، وقتاً فوقتاً اس کے مدرس مقرر ہوئے، یہ سب علما اپنے زمانہ مین بےمثل خیال کئے گئے ہین،
صالحیہ	الملک الصالح نجم الدین ایوب بن الملک الکامل	"	یہ مدرسہ چار مدرسون پر مشتمل تھا، مقریزی کا بیان ہے کہ وہ قاہرہ کے نامور اور عظیم الشان مدرسون مین گنا جاتا ہے، جب وہ کھولا گیا تو شعرائے نے قصائد و قطعے لکھے، حسن المحاضرہ مین چند اشعار نقل کئے ہین،

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
			سنہ ۶۳۹ھ مین قائم ہو،
معینیہ	معین الدین خسر سلطان صلاح الدین	دمشق	
شبلیہ	شبل الدولہ	"	نہایت مشہور مدرسہ ہے، شبل الدولہ زمرد خاتون (ہمشیرہ صلاح الدین) کا غلام تھا،
عزیہ	عز الدین ایبک	"	عز الدین الملک المعظم کا غلام اور صرخد کا حاکم تھا، یہ مدرسہ میدان اخضر مین واقع ہے،
شہابیہ	شہاب الدین طغرل	حلب	الملک العزیز اسی مدرسہ مین مدفون ہے،
مجیریہ	مجیر الدین	قاہرہ	مجیر الدین مشہور عالم اور سلطان صلاح الدین کا وزیر تھا، یہ مدرسہ درب ملوخیہ کے پاس ہے، محرم سنہ [illegible]ھ مین قائم ہوا،
بہائیہ	ابو المحاسن یوسف بہاء الدین	حلب	علامہ ابن خلکان اسی مدرسہ کی بورڈنگ مین مدت تک رہے ہین، اور علوم کی تحصیل کی ہے،
دار الحدیث	"	"	
فاضلیہ	قاضی فاضل المتوفی سنہ ۵۹۶ھ	قاہرہ	قاہرہ کا مشہور مدرسہ ہے، قاضی فاضل سلطان صلاح الدین کے دربار کا منشی اور نہایت نامور شخص تھا،
فلکیہ	فلک الدین برادر الملک العادل	دمشق	

خاندان نوریہ

کیفیت	مقام مدرسہ	بانی	مدرسہ
نور الدین کی تربت اسی مدرسہ مین ہے، عرقلہ ایک شاعر نے اسی مدرسہ کی شان مین لکھا ہے، ودمشق فی المدارس بیت ملک ونذی فی المدارس بیت ملک (روضتین)	دمشق	نور الدین محمود زنگی المتوفی ۵۶۹ھ	نوریہ حنفیہ،
ممالک اسلامی مین حدیث کے درس کے لئے پہلا مدرسہ یہی تعمیر ہوا،	"	"	دار الحدیث نوریہ
یہ مدرسہ خاص شافعیون کے لئے بڑی عظمت وشان سے تعمیر ہونا شروع ہوا مگر تیار ہونے سے پہلے نور الدین نے وفات کی پھر الملک العادل برادر صلاح الدین کے اہتمام سے اتمام کو پہنچا، حافظ ابو شامہ لکھتے ہین کہ تمام مدارس مین اس کا کوئی ہمسر نہین ہے، حافظ مذکور نے کتاب الروضتین اسی مدرسہ مین رہ کر لکھی ہے،	"	"	نوریہ شافعیہ
قطب الدین شافعی جو مدرسہ نظامیہ بغداد	حلب	"	نوریہ

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
			میں نائب مدرس رہ چکے تھے، اس مدرسہ کے مدرس اعظم مقرر ہوئے (ابن خلکان ترجمہ قطب الدین)
عمادیہ	نورالدین محمود زنگی المتوفی ۵۶۹ھ	حلب	نورالدین نے ۵۶۰ھ میں عماد کاتب کو اسکا مہتمم اور افسر مقرر کیا، اس وجہ سے یہ مدرسہ انھیں کے نام سے مشہور ہو گیا، ۵۶۷ھ میں نورالدین نے عماد کاتب کے پاس مدرسہ کے دروازہ پر میناکاری اور سنہری کام بنوانے کے لئے یاقوت وغیرہ اور سونا بھجوایا، (روضتین)
عزیہ	عزالدین نبیرۂ نورالدین المتوفی ۵۸۹ھ	موصل	یہ مدرسہ ایوان شاہی کے مقابل واقع ہے، شافعیہ وحنفیہ دونوں فرقوں کے لئے تھا، عمدہ اور مشہور مدرسہ ہے، عزالدین کی قبر بھی اسی کے احاطہ میں ہے، (ابن خلکان وروضتین)
سیفیہ عتیقیہ	سیف الدین غازی برادر نورالدین المتوفی ۵۴۴ھ	〃	عالیشان اور مشہور مدرسہ ہے، سیف الدین اسی کے احاطہ میں مدفون تھے، حنفیہ وشافعیہ کے لئے تھا،

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
ارسلانیۃ	ارسلان نور الدین شاہ ابن عز الدین مذکور،	موصل	عز الدین کے مدرسہ کے سامنے ہے، علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ حسن و خوبی میں یہ مدرسہ لاجواب کہا جا سکتا ہے،
مدرسۃ الملک القاہر	الملک القاہر ابن نور الدین ارسلان شاہ المتوفی ۶۱۵ھ	"	الملک القاہر اسی مدرسہ میں مدفون ہے،
مدرسہ ابو سعد	ابو سعد شرف الدین المتوفی ۵۸۵ھ	دمشق	نور الدین نے مساجد کے اوقات کا انتظام ان کے متعلق کیا تھا، اور ان کے ایما سے بہت سے مدرسے بنوائے،
قایمازیہ	ابو منصور قایماز	موصل	ابو منصور سیف الدین غازی کی طرف سے موصل کا حاکم تھا، علامہ ابن اثیر مصنف مثل السائر اسی کے دربار میں منشی تھے ۵۹۵ھ میں قائم ہوا،
قائمازیہ	"	اربل	اس مدرسہ پر بہت سے مواضع وقف تھے،
زینبیہ	زین الدین علی المتوفی ۵۶۳ھ	"	ابو منصور قایماز انہیں کا آزاد کردہ غلام تھا، زین الدین نے موصل اور بغداد میں بھی مدرسے بنوائے تھے، (روضتین)
مجاہدیہ	امیر مجاہد الدین	دمشق	مجاہد الدین امرائے نور الدین میں ایک

مدرسہ	بانی	مقام مدرسہ	کیفیت
	المتوفی ۵۵۵ھ		نامور شخص تھا، یہ مدرسہ باب الفرادیس کے پاس ہے، (روضتین)
مجاہدیہ	امیر مجاہد الدین المتوفی ۵۵۵ھ		یہ مدرسہ نور الدین کے مدرسہ کے پہلو میں ہے، (روضتین)

ان مدرسوں کے علاوہ اس زمانہ میں اور بہت سے نامور مدرسے شام و مصر میں موجود تھے، جنکا تذکرہ اکثر طبقات اور تاریخوں میں پایا جاتا ہے، دمشق میں رواحیہ، صادریہ، ریحانیہ، امینیہ، حلب میں حلاویہ، قلیجیہ، طرخانیہ، اربل میں منظفریہ، مدرستہ القلعتہ ایسے مشہور مدرسے تھے، جن کی شہرت عام کی وجہ سے مورخین اُن کے تذکرہ میں صرف نام پر اکتفا کر جاتے ہیں،

یہ مختصر فہرست جو ہم نے نمونہ کے طور پر پیش کی ہے، ابن خلکان، حسن المحاضرۃ علامہ سیوطی، روضتین فی اخبار الدولتین، جواہر مضیتہ فی طبقات الحنفیتہ، وانس الجلیل فی تاریخ القدس والخلیل، و ذیل ابن خلکان سے ماخوذ ہے، لیکن یہ حالات ایسے متفرق موقعوں پر مذکور ہیں، کہ خاص خاص حوالے نہیں دیئے جا سکتے تھے،

خاندان صلاحیہ کا سلسلہ ۶۴۸ھ میں منقطع ہوگیا، اور ۹۲۳ھ تک مصر و عرب کی قسمت اتراک و چراکسہ کے ہاتھ میں رہی، اتراک نے ۷۸۴ھ تک حکومت کی، پھر چراکسہ قابض ہوئے، یہ دونوں خاندان زرخرید غلام تھے، جو ترقی کر کے منصب حکومت تک پہنچے تھے، ان خاندانوں میں بھی حکومت خاندان کے سلسلہ سے نہیں چلتی تھی، ترک اور چرکس غلام جو فوج میں بھرتی ہونے کے لئے ہمیشہ خریدے جاتے تھے، ان میں سے اقبال نے جس کا ساتھ دیا تخت نشین

چراکسہ کے عہد مین مدرسون کی ترقی

ہوگیا، ان مین سے بعض بڑے جاہ و اقتدار کے حکمران ہوئے، اور علم و فن کی نہایت قدردانی کی، اس عہد مین مدرسون کو اور بھی ترقی ہوئی، جس کے چند اسباب تھے: مدارس کے تمام اخراجات اوقاف مین داخل ہوچکے تھے، اور اگر کوئی جانشین حکومت ان کو واپس لینا چاہتا تو گروہ علما جن کا ملک پر بہت اثر تھا عموماً مخالف ہوجاتا جیساکہ ایک بار سنہ [illegible] مین واقع ہوا، یہ ترکی غلام جنکو کل تک لوگ بازارون مین بکتے ہوئے دیکھ چکے تھے، اگر خود بھی اس قسم کی فیاضیان نہ دکھاتے اور اہل علم ان کا ساتھ نہ دیتے تو ان کو تخت حکومت پر بیٹھنا نصیب نہین ہوسکتا تھا، خاص کر حرمین مین اس خاندان نے جو علمی فیاضیان کین ان کی نظیر پچھلے زمانون مین نہین مل سکتی،

اس عہد سے پہلے مکہ معظمہ مین بہت کم مدرسے تھے، ۵۷۹ھ مین امیر فخرالدین زنجیلی نے مکہ معظمہ مین ایک مدرسہ بنوایا، ۵۸۰ھ مین خلیفہ المستضی باللہ کی کنیز خاص طاب الزمان نے ایک مدرسہ قائم کیا جس مین دس فقہاے شافعی مدرس تھے، ۶۴۱ھ مین ایک اور مدرسہ تعمیر ہوا جس کا بانی الملک المنصور عمر بن علی والی یمن تھا، مصر کے ترک بادشاہون سے پہلے حرمین مین جو قابل اعتداد مدرسے موجود تھے، غالباً یہی دو تین تھے، لیکن ان ترکون کے عہد سے مکہ معظمہ بھی دوسرے شہرون کی طرح ایک بڑا دارالعلم بن گیا،

عبدالباسط نے جو سلطان ظاہر ططر کی فوج مین ناظر تھا، مکہ معظمہ مین تین عمدہ مدرسے بنوائے، قاہرہ، غزہ، شام مین بھی اس نے بہت سے مدرسے قائم کئے تھے،

ملک اشرف قائتبائی سے جو خاندان چراکستہ مین سے تھا، اور ۸۷۲ھ مین تخت نشین ہوا، مکہ معظمہ مین چارون مذہب کے لئے نہایت عظیم الشان مدرسہ بنوایا جس مین بہتر[۲] کمرے تھے اور بیچ مین جو نہایت وسیع کمرہ تھا اس کی چھت سنگ مرمر کی تھی، اور سونے کا کام کیا ہوا تھا، قائتبائی جب مکہ معظمہ گیا تو فوج و حشم کے ساتھ اسی مدرسے مین ٹھہرا، اور طلبا، فراش، بواب،

اہل مطبخ، مہتمم، خزانچی، وغیرہ کی تنخواہیں مقرر کیں، قاتیبائی نے مدینہ منورہ میں بھی ایک عالیشان مدرسہ بنوایا، ابن الناصر محمد بن قلاؤن نے مصر میں جو مدرسہ قائم کیا، وہ رفعت و شان کے اعتبار سے تمام دنیا میں بے نظیر سمجھا گیا ہے، ۷۵۷ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی اور تین برس متصل روزانہ اس کی تعمیر میں بیس ہزار درہم صرف ہوئے، جس کی کل تعداد آج کل کے حساب سے کم و بیش چونتیس لاکھ روپیہ ہوتی ہے، اس کا بڑا کمرہ جس کو ایوان کہنا چاہیئے، ۵۷۶ گز در گز تھا، خود سلطان ابن الناصر بھی زمانہ تعمیر میں کثرت مصارف سے عاجز آگیا تھا، مگر یہ خیال ہمیشہ غیرت دلاتا رہا کہ مصر کا وسیع ملک کیا ایک مدرسہ کے صرف سے بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکتا، چاروں مذہب کے فقیہ درس کے لئے مقرر تھے، ابن الناصر نے یہ بھی ارادہ کیا تھا کہ چار بڑے بڑے منارے تعمیر کئے جائیں، تین بن بھی چکے تھے، مگر جب ۷۶۲ھ میں اتفاقاً ایک منارہ کے گرنے سے تین سو یتیم بچے جو مکتب السبیل میں پڑھ رہے تھے دب کر مر گئے، تو یہ ارادہ ترک کر دیا گیا،[1]

اس عہد میں یہ واقعہ بھی ایک عجیب یادگار ہے، کہ ہندوستان کے حکمرانوں میں سے بھی ایک بلند حوصلہ بادشاہ یعنی سلطان غیاث الدین نے مکہ معظمہ میں مدرسہ قائم کرنے کے لئے شریف مکہ کے پاس زر خطیر روانہ کیا، ہندوستان کا یہ پہلا بادشاہ ہے جس کے نام سے ایک مدرسہ منسوب کیا گیا ہے، ورنہ جیسا کہ ہم آگے چل کر لکھیں گے، اس سرزمین میں اس قسم کا خیال کبھی نہیں پیدا ہوا، رمضان ۸۱۳ھ میں اس کی تعمیر شروع ہوئی، اور صفر ۸۱۴ھ میں اتمام کو پہنچی، زمین بارہ ہزار مثقال کو خریدی گئی، اور مدرسے کے متعلق بہت سے ایوانات و مکانات تیار ہوئے، ۷ محرم ۸۱۴ھ میں بڑی شوکت و شان سے کھولا گیا، ساٹھ طالب العلم اسی وقت مدرسہ میں داخل ہوئے، اور سب کے لئے وظیفہ مقرر ہوا، چاروں مذہب کے مدرس مقرر

[illegible] جس کی تعمیر میں [illegible] لاکھ روپے صرف ہوئے

[1] یہ پوری تفصیل حسن المحاضرۃ مدرسہ سلطان حسین کے ذکر میں ہے،

ہوے تھے، اور ہر ایک کے درس کا الگ الگ وقت مقرر تھا، غیاث الدین نے اس کے سوا چار مدرسے اور وہان قائم کیے،[1]

نمونے کے طور پر ہم اتراک وچراکسہ کے عہد کے چند مدرسون کا ذکر کرتے ہین، جو خاص اسکندریہ وقاہرہ مین موجود تھے، اور یون تو بلادِ مصر وشام مین سیکڑون ہزارون مدرسے قایم ہوچکے تھے قاضی مجیر الدین حنبلی نے سنہ ۹۰۰ھ مین خاص شہر بیت المقدس کی جو تاریخ لکھی ہے اس مین وہان کے ۴۰ ایسے مدرسون کی فہرست مع تاریخ تعمیر واسماے بانیان درج کی ہے، جو اس کے عہد مین موجود تھے، یہ تاریخ جس کا نام انس الجلیل ہے سنہ ۱۲۸۳ھ مین بمقام مصر مطبع وہبیہ مین چھاپی گئی ہے

نام مدرسہ	سنہ تعمیر یا افتتاح	بانی مدرسہ	بعض مدرسون کا نام	کیفیت
ظاہریہ قدیمہ	سنہ ۶۶۲ھ	الملک الظاہر بیبرس بندقداری المتوفی سنہ ۶۷۶ھ	علامہ تقی الدین بن رزین للشافعیة محب الدین بن عبد الرحمن مدرس حنفی، حافظ شرف الدین دمیاطی، مدرس حدیث کمال الدین قرشی مدرس قرأت،	ایک کتبخانہ بھی اس پر وقف تھا، الملک الظاہر نے یورپ وتتار پر چند بار فتحین حاصل کین اس کی فتوحات اور بہت سی عالی شان تعمیرات ومصارف سلطنت کو تتمہ ابن خلکان مین تفصیل کے ساتھ لکھا ہے،

[1] حرمین شریفین کے مدرسون کا ذکر اعلام و شفاء الغرام تاریخ مکہ مین اجمالاً و تفصیلاً لکھا ہے، [2] مدرسہ عبد الباسط کے سوا اور باقی مدرسون کا ذکر علامہ سیوطی نے اجمالاً و تفصیلاً کیا ہے، لیکن بہت سے زائد حالات مین نے تتمہ ابن خلکان و خود حسن المحاضرہ کے مختلف مقامات سے لکھے ہین،

نام مدرسہ	سنہ تعمیر یا افتتاح	بانی مدرسہ	بعض مدرّسوں کا نام	کیفیت
منصوریہ		ملک منصور قلاؤن المتوفی ۶۸۹ھ	ابوحیان برہان الدین امین الدین شاگرد ابن الہمام،	یہ مدرسہ نہایت عظیم الشان تھا، علامہ کتبی مصنف تتمہ ابن خلکان نے لکھا ہے کہ یہ مدرسہ اور اس میں جو ہسپتال تھا، بے نظیر خیال کیے گئے ہیں، ملک منصور بڑی سطوت و جبروت کا بادشاہ تھا، اور اس کے خاندان نے اکثر یورپ پر فتحیں حاصل کیں،
ناصریہ	۷۰۳ھ	ناصر محمد ولد قلاؤن المتوفی ۷۴۱ھ		اسمین چاروں مذہب کا درس ہوتا تھا، یہ مدرسہ نہایت پرشوکت تھا، اور دروازے پر ہر وقت چوکی پہرہ رہتا تھا،
خانقاہ بیبرسیہ	۷۰۶ھ	امیر رکن الدین بیبرس		قاہرہ میں اس سے بڑی کوئی خانقاہ نہیں ہے، اسمین جو کنگرہ تھا وہ بغداد کے ایوان خلافت سے نکال کر لایا تھا اور بطور یادگار فتح اسمین لگایا گیا تھا،

کیفیت	بعض مدرسوں کے نام	بانی مدرسہ	سنہ تعمیر یا افتتاح	نام مدرسہ
علامہ سیوطی نے بہت سے مدرسین کے نام لکھے ہیں جو اس میں وقتاً فوقتاً فقہ و حدیث کے درس کے لئے مقرر ہوئے،	اکمل بن محمود بابرتی جنکا حاشیہ ہدایہ پر غایۃ کے نام سے مشہور ہے، مدرس حنفی تھے شیخ بہاء الدین بن علامہ تقی الدین سبکی مدرس شافعی، شیخ خلیل مصنف مختصر مدرس مالکی تھے قاضی القضاۃ موفق الدین مدرس حنبلی جمال الدین عبداللہ بن رومی مدرس حدیث،	امیر کبیر سیف الدین افسر امرائے جمداریہ،	سنہ ۷۵۶ھ	خانقاہ شیخو
اس کی عمارت نہایت بلند اور پر تکلف تھی،	قوام اتقانی مدرس حنفی،	صرغتمش افسر امرائے جمداریہ،	سنہ ۷۵۷ھ	مدرسہ صرغتمشیہ
۱۲ رجب کو کھولا گیا، شعرا نے اس کی شان میں قصیدے لکھے بادشاہ نے نہایت تکلف سے ایک عام دعوت کی جس میں تمام علما وغیرہ مدعو تھے علاء الدین سیرامی مدرس حنفی جب آئے	علاء الدین مدرس حنفی اوحد الدین رومی مدرس شافعی شمس الدین بن تکین مدرس مالکی، صلاح بن الاعمی مدرس حنبلی، احمد زادہ عجمی	۔	سنہ ۷۸۸ھ	ظاہریہ جدیدہ

نام مدرسہ	سنہ تعمیر یا افتتاح	بانی مدرسہ	بعض مدرسون کے نام	کیفیت
			مدرس حدیث فخر الدین ضریر مدرس قرأت.	تو بادشاہ نے ان کا فرش اپنے ہاتھ سے بچھایا، علامہ ابن حجر لکھتے ہین کہ جتنے مدرس اس مین مقرر ہوئے کوئی شخص اس زمانے مین انکا ہمسر نہ تھا
مدرسہ عبد الباسط	.	عبد الباسط بن خلیل بن ابراہیم الدمشقی		یہ سلطان ظاہر ططر المتوفی ۸۲۴ھ کا ناظر العساکر تھا
مویدیہ	۸۱۹ھ	الملک المؤید		اس کی عمارت پر چالیس ہزار اشرفیان صرف ہوئین،
اشرفیہ	۸۲۹ھ	ملک اشرف سیف الدین ابو نصر الدقماقی جس نے قبرس فتح کیا،		یہ مدرسہ نہایت زر خطیر کے صرف سے تیار کرایا، اور بہت سی آمدنی اوس پر وقف کی، (اعلام صفحہ ۲۰۰)

اسکندریہ و قاہرہ کے یہ وہ مدرسے ہین کہ ہر ایک کو کالج بلکہ یونیورسٹی کہنا چاہئے علامہ سیوطی نے ان کو (بجز اخیر مدرسہ کے) امہات مدارس مین لکھا ہے، اور مصر کے اور بہت سے

مدرسوں مثلاً فخریہ، فاضلیہ، سیفیہ، فخریہ، مشہد نفیسی، مدرسہ قایتبائی، جمالیہ، دار المامون، عاشوریہ، خشابیہ، کہاریہ وغیرہ کا ذکر چھوڑ دیا ہے، حالانکہ اکثر اُن کے مدرسین کے نام فقہائے مصر کے ذیل میں لکھے ہیں،

تعلیم کے سلسلۂ تاریخ میں سلاطین ترک کا زمانہ تمام پچھلے زمانوں سے زیادہ نمایاں اور تابندہ ہے، ترکی مدارس بہت سے خصوصیات میں اولیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں، اور اس بات کا جائز حق رکھتے ہیں کہ تاریخ کے صفحوں میں تمام پچھلے مدرسوں کے سلسلے سے الگ لیکن ممتاز موقع پر جگہ لیں، گذشتہ عہدوں میں مدرسے آپس میں کوئی انتظامی تعلق نہیں رکھتے تھے، بلکہ بعض حالتوں میں یہ کہنا چاہیئے کہ وہ باہمی اختلاف کی ایک تحریک دلانے والی مثال تھی، لیکن ترکی مدارس ایک انتظامی رشتہ میں منسلک تھے، اور یہ کہنا چاہیئے کہ ایک ہی خاندان کی اولاد تھے، پچھلے عہد میں تمام مدرسے محض مذہبی مدرسے تھے، اگرچہ اُن میں اور علوم بھی پڑھائے جاتے تھے، لیکن ترکوں کا سررشتۂ تعلیم پولیٹیکل حیثیت رکھتا تھا، وہ سلطنت کے لئے لائق لائق عہدہ دار پیدا کرتا تھا، تمام مدرسے ایک یونیورسٹی کے تابع تھے، اور طلبا و مدرسین درجہ بدرجہ ترقی حاصل کرتے تھے، مدرسین کے لئے پنشن کا حق جو ترکی حکومت میں نہایت فیاضانہ طور پر قائم کیا گیا تھا، اسلامی تاریخ میں غالباً پہلی ایجاد تھی، یہ تعجب ہے کہ اکثر حالتوں میں پنشن اصل تنخواہ کے برابر ہوتی تھی، ترکوں کے عہد میں تنخواہیں بھی اکثر بیش قرار تھیں[1]، بڑے بڑے مدرسوں میں مدرس کو اکثر ساٹھ یا اسی درہم روزانہ ملتے تھے، اور بعض حالتوں میں یہ تعداد دسو بلکہ دوسو درہم یومیہ تک پہنچ جاتی تھی، ہم اس موقع پر تاریخ اُوڈین کا کچھ انتخاب نقل کرتے ہیں،

---

[1] ٹرکی کے سفر میں مجھ کو اس رائے سے رجوع کرنا پڑا، درہم جس چیز کا نام ہے، اس سے مراد وہ سکہ ہے جسکو آج کل قرش کہتے ہیں، اور یہ کل ۲ کا ہوتا ہے، اس حساب سے یہ تنخواہیں بیش قرار نہیں رہتیں،

History of The ottomana Turks. By Sir Edward Creasy. M.A. Latechief Justice of Ceylon London - Richard Bently & son

جس سے ترکی مدرسون کی نسبت ایک معقول رائے قایم کیجا سکتی ہے، یہ مورخ ترکی خاندان کے آئین ملکی اور عام انتظامات کے ذیل مین لکھتا ہے، محمد ثانی سے جو بادشاہ پہلے ہوئے وہ اور اُن مین خاص کر اورخان کو مدرسے اور کالجون کے قیام کا از حد شوق تھا لیکن محمد ثانی ان سب سے بڑھکر نکلا اور اس کے زمانے مین تعلیم کا بڑا چرچا ہوا، اور عالم لوگ بڑے بڑے عہدے پانے لگے قسطنطنیہ کا فاتح بخوبی جانتا تھا کہ سلطنت کے قیام اور وسعت کے لئے علاوہ جوانمردی اور قواعددانی کے کچھ اور بھی ضروری ہے چونکہ وہ خود پڑھا لکھا تھا، اس لئے اس نے اپنی رعایا کی تعلیم مین کوئی دقیقہ اٹھا نہین رکھا، محمد نے علاوہ ابتدائی مدرسون کے جو مکتب کے نام سے مشہور ہین اور ہر گاؤن مین کثرت سے پائے جاتے ہین، بڑے بڑے مدرسون کی بنیاد ڈالی، طالب العلمون کو ذیل مختلف مضامین مین تعلیم ہوتی تھی، صرف، نحو، منطق، تاریخ، زبان، طرز تحریر، علم فصاحت و بلاغت، اقلیدس، ہیئت، جو طالب العلم ان دسون مضامین مین دستگاہ کامل حاصل کرتے تھے، دانشمند کا خطاب پاتے تھے، یہی سب مضامین مثل اور مولوی فاضلون کے چھوٹے لڑکون کو پڑھاتے تھے، دانشمندون کو ابتدائی مدرسون کی اعلی مدرسی ملتی تھی، لیکن جماعت علما مین داخل ہونے کے لئے ان کو بہت کچھ قانون (فقہ سے مراد ہے) پڑھنا اور متواتر امتحان دینے ہوتے تھے، اور درجہ بدرجہ سند پاتے تھے، یہ تعلیم بے شبہ اسی تعلیم کے مطابق ہے، جو پندرہوین صدی مین پیرس اور کیمبرج مین دیجاتی تھی، اور اس بات کا بہت خیال کیا جاتا تھا کہ علما مین صرف وہ لوگ داخل ہون جو ذی علم اور ذی لیاقت ہون، ان

لوگون کو بڑی عزت اور فیاضانہ مدد اور خاص حقوق ملتے تھے، اسی جماعت علما مین سے بڑے کالجون کے اعلیٰ مدرس، قاضی، مفتی اور جج مقرر ہوتے تھے، مسجدون کے امام اور واعظ علما کے بعد مین دنیا مین بجز ترکی کے کوئی ایسا ملک نہین جہان علماے مذہب ایسے ذی اختیار اور حکم شرع ایسا قوی ہو، عثمانی اس بات مین بڑے قابلِ عزت ہین کہ وہ لوگ مدرسون اور علما کی بڑی عزت کرتے ہین، جس کا نشان بھی عیسائی قومون مین نہین پایا جاتا۔"

ترکون مین ارخان (۷۲۶ھ) پہلا فرمانروا تھا جس نے مدرسون کی بنیاد ڈالی، اسکا ازنیق کا مدرسہ نہایت نامور ہوا، داؤد قیصری جنکی شرح فصوص الحکم مشہور ہے اور علاء الدین شارح وقایہ وغیرہ مدرس تھے، سلطان مراد کے زمانے مین اس کے مدرس اعظم کی تنخواہ ۱۳۰ درہم یومیہ تھی، ارخان کے جانشینون نے اس سلسلہ کو بہت ترقی دی، اور محمد خان فاتح کے عہد مین حدِ کمال کو پہنچ گیا، محمد خان نے بچپن مین عمدہ تعلیم حاصل کی تھی، لیکن اس کا علمی شوق اتنا بڑھا ہوا تھا کہ حکومت کے زمانے مین بھی وہ طالب العلمی کرتا رہا، اور علامہ خواجہ زادہ علامہ ابن الخطیب وغیرہ علما خاص اس کے پڑھانے پر مقرر تھے،

محمد فاتح نے ۸۶۵ھ مین بمقام قسطنطنیہ ایک بڑی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی جس کے ماتحت آٹھ کالج تھے، اور سب کے ساتھ جداگانہ بورڈنگ تھے، یہ عظیم الشان عمارت رجب ۸۷۵ھ مین تمام ہوئی علاء الدین طوسی، خواجہ زادہ، ملا عبد الکریم، محمد بن مصطفیٰ، اور بہت سے علما ء مدرس مقرر ہوئے جنین سے اکثر کی تنخواہ سو درہم یومیہ تھی، محمد خان خود بھی ان مدرسون مین درس کے وقت کبھی کبھی شریک ہوتا تھا، ایک بار علامہ علاء الدین طوسی کے درس مین حاضر ہوا، شرح عضدیہ، سید شریف کا درس ہو رہا تھا، علامہ کی حسن تقریر سے ایسا محظوظ ہوا کہ رہ رہکر کھڑا ہو جاتا تھا، سبق ختم ہوا تو دس ہزار درہم علامہ کو اور پان پانسو درہم طلبا کو صلہ دیا، علامہ علاء الدین

قوشجی کو مدرسہ ایا صوفیہ کا مدرس اعظم کیا، اور دو سو درہم یومیہ تنخواہ مقرر کی، علامہ قوشجی کی شرح تجرید و خواجہ زادہ کے محاکمۂ تہافۃ الفلاسفۂ امام غزالی نے شہرت عام حاصل کی ہے، یہ محاکمہ بھی محمد خان کی فرمایش سے لکھا گیا تھا جس کے صلے مین اس نے دس ہزار درہم عنایت کیے تھے

بایزید خان نے جو ۸۸۶ھ مین تخت نشین ہوا، بہت سے مدرسے قائم کئے اس زمانہ مین مدرسین کے علاوہ جتنے نامور علما تھے سب کی تنخواہین بشرح دس ہزار عثمانی سالانہ مقرر کر دین، او جو لوگ شرح مفتاح سکاکی کا درس دیتے تھے ان کی تنخواہ چار ہزار سالانہ مقرر کی، حرمین شریفین کے فقہا کے لئے چودہ ہزار اشرفی سالانہ کا حکم دیا، سلطان سلیمان نے جو ۹۲۶ھ مین سریر حکومت پر بیٹھا علاوہ اور مدارس کے ۹۷۲ھ مین مکہ معظمہ مین چار بڑے بڑے مدرسے تعمیر کرائے، قاضی مکہ نے بنیاد کا پتھر رکھا اور تمام علما نے ان کی متابعت کی، ہر مدرس کی تنخواہ اس وقت ۵۰ عثمانی یومیہ پھر سو عثمانی مقرر ہوئی، ان مدرسون مین طب و حدیث کا بھی درس ہوتا تھا، قسطنطنیہ مین بہت سے عمدہ مدرسے بنوائے اور چھ سو طلبہ کا وظیفہ مقرر کیا (عقد المنظوم فی افاضل الروم) سلطان سلیم نے پچھلی کوششون مین اور بہت کچھ اضافہ کیا، مراد نے جو ۹۸۲ھ مین تخت نشین ہوا، مکہ معظمہ مین بمقام صفا ایک مدرسہ بنوایا جسمین ایک مدرس ایک معید اور ۲۰ تیس دانش مند تھے،[1]

ترکون کی علمی تاریخ کا ہم نے نہایت چھوٹا حصہ اور وہ بھی نہایت اختصار کیساتھ ناظرین کے سامنے پیش کیا ہے، ترکون کی حکومت کو کم و بیش آج چھ سو برس ہوئے، اس وسیع مدت مین بیسیون سلاطین، سیکڑون وزرا، ہزارون اہل منصب نے نہایت حوصلہ مندی

[1] ترکی مدارس کے متعلق جو کچھ مین نے لکھا ہے، آثار الدول قرمانی و اعلام و شفاء الغرام ہر دو تاریخ مکہ و شقائق نعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ و عقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم سے لکھا ہے،

سے فیاضیاں دکھائیں، ایک مختصر سے آرٹیکل میں ان کی اجمالی صورت بھی نہیں دکھائی جا سکتی

شقائق نعمانیہ فی علماء الدولۃ العثمانیہ وعقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم ان دو تاریخون مین ارخان کے عہد سے ۹۶۵ھ تک کے علما مذکور ہین ان کے حالات مین ترکی مدارس کا ذکر بھی ضمناً آجاتا ہے، اگر کوئی چاہے تو انھین دو کتابون سے قریباً دو سو کالجون اور مدرسون کی فہرست بنا سکتا ہے جن مین تمام علوم درسیہ پڑھائے جاتے تھے، اور جن کے بانیون مدرسون اور شرح تنخواہ کا حال ان تاریخون مین کسی قدر تفصیل سے مل سکتا ہے، اس موقع پر ہم جریاً للعادۃ ایک مختصر سا نقشہ درج کرتے ہین جس مین چند بڑے بڑے نامور کالجون کا ذکر اور ان کے اجمالی حالات ہین،

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ مدرسین	کیفیت
مرادیہ	بروسہ	سلطان مراد بویع ۸۲۴ھ،	۳۰ روپیہ یعنی ۹۰۰ ماہوار	اسی طرح تمام مدرسین کی تنخواہین جو لکھی ہین یومیہ تعین ترکون مین تنخواہون کا حساب یوم سے ہوتا ہے،
سلطانیۃ	"	سلطان بایزید خان	۵۰ ر	
قاسمیہ	"	قاسم پاشا	۵۰ ر	
مناستر	"		۵۰ ر	
محمدیہ	"	سلطان محمد خان اول	۵۰ ر	
مرادیہ	قبلوجہ	سلطان مراد بن محمد خان	۶۰ ر	
مرادیہ	بروسہ	"	۵۰ الی ۸۰	ملا نعمت اللہ معروف بروشنی زادہ،

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ مدرسین	کیفیت
حلبیہ	اورنہ	•	ضہ ر	
محمودیہ	قسطنطنیہ	محمود پاشا وزیر اعظم	ضہ	عرب زادہ
مرادیہ	"	مراد پاشا	•	
قلندریہ	"	•	ضہ	
مدرسۂ ابی ایوب	"	•	لہ ر	
بایزیدیہ	"	بایزید خان	ما	
بایزیدیہ	اماسیہ	"	لہ	
ابراہیمیہ	قسطنطنیہ	ابراہیم پاشا	•	
مدرسہ علی پاشا	"	علی پاشا	ضہ	
مدرسہ مصطفٰے پاشا	"	مصطفٰے پاشا	ضہ	
رستمیہ	"	رستم پاشا وزیر کبیر	ضہ	شمس الدین خلف مفتی ابو السعود مفسر قرآن تھے یہ سترہ برس کے سن مین اس مدرسہ کے مدرس اعظم مقرر ہوئے ۹۸۰ھ مین وفات کی،
قاسمیہ	"	قاسم پاشا	ضہ ر	ملا محمد خلف مفتی ابو السعود متوفی ۹۷۱ھ
سلیمانیہ	"	سلطان سلیمان بن السلیم	نہ ر	

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ مدرسین	کیفیت
سلیمانیۃ	قسطنطنیہ	سلطان سلیمان	ثہ ر	
"	"	بن السلیم	"	
داؤدیہ	"	داؤد پاشا	خہ ر	
پیریہ	"	پیری پاشا	للشہ	
سنانیہ	"	سنان کنکچی	خہ ر	
سلیمیہ عتیقیہ	"	سلطان سلیم بن السلیمان	ثہ ر	
سلیمیہ جدیدیہ	"	"	خہ و ثہ	
مدرسہ ست خاتون	"	ست خاتون	للغہ ر	
خاصکیہ	"	زوجۂ السلیمان خان		
مدرسہ خانقاہ	"	"	خہ ر	
مدرسہ طرابزون	طرابزون	والدۂ سلطان سلیم خان۔	خہ ر	ملا نعمت افندی معروف بروشنی زادہ۔
دار الحدیث	قسطنطنیہ	سلطان سلیمان خان	ما ر	ملا کوسج امین۔
مدرسہ خسرویۃ	"	امیر الامراء خسرو	خہ ر	
سلیمانیہ	دمشق	سلطان سلیمان خان	لثہ ر	
مدرسہ اطنہ	اطنہ	پیری پاشا	خہ ر	
گکیوزہ		مصطفیٰ پاشا	"	

نام مدرسہ	مقام مدرسہ	بانی	شرح تنخواہ مدرسین	کیفیت
دار الحدیث	ادرنہ	•	ملار	ملا شمس الدین قاضی زادہ مدرس تھے،
احمدیہ	چورسے	احمد پاشا وزیر اعظم	صہ	ملا کوسج امین،
سلیمانیہ	ازنیق	سلیمان پاشا	صہ ر	
مدرسہ گکیوزہ	گکیوزہ	مصطفےٰ پاشا	•	
افضلیہ	قسطنطنیہ	•	صہ ر	

اخیر میں مجھ کو یہ بھی بتا دینا چاہیے کہ ترکی مدارس کو جو ترجیح ہے، اور جس کا میں اعتراف کر چکا ہوں، وہ زیادہ تر سلسلۂ انتظام، اصول ترقی، انضباط قواعد، کثرت مصارف کی رو سے ہے، اور سب سے زیادہ یہ کہ وہاں کے تعلیم یافتہ طلبا کو باقاعدہ ملکی عہدے ملتے تھے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ جس قدر پولٹیکل پلہ بھاری ہوا، کمال علمی کا وزن کم ہوتا گیا، یہی بات ہے کہ چھ سو برس کی مدت میں ان مدارس سے ایسے کم لوگ اٹھے جو حکیم یا محقق کا لقب حاصل کر سکے، علامہ ابن خلدون نے تو کلیتہً نفی کی ہے، لیکن اگر صاحب کشف الظنون کی فہرست حکما تسلیم بھی کر لیجائے تاہم اس کا اختصار ترکوں کے وسیع سلسلۂ حکومت سے موزون نسبت نہیں پیدا کر سکے گا، حقیقت یہ ہے کہ ایشیا کی تاریخ میں کمال کو دنیوی جاہ و منصب کی خواہش سے کم تعلق رہا ہے،

ہمارے آرٹیکل کا یہ حصہ جس میں خاص قسم کے مدارس اور دار العلوم سے بحث ہے ختم کے قریب ہے اور صرف دو ناموں کی جگہ اس میں اور خالی ہے یعنی اندلس (اسپین) و ہندوستان، اس بات کا ہم کو بھی افسوس ہے کہ اسپین جو تیغ و قلم دونوں میں خلافت بغداد کا حریف مقابل تھا، اس خاص سلسلہ میں سب سے اخیر نمبر پر ہے، ہم قرطبہ (کارڈوا) غرناطہ (گرینڈا) کی شہرت

اور عظمت کے منکر نہیں ہیں، قرطبہ کے نقشہ میں ہم ۴۷۴ مسجدیں، ۷۰۰ حمام، ۲۱۳۰۰۰ عام رعایا کے مکانات دیکھتے ہیں، قصر الزہراء کامل، مجدد قصر السحائر، روضہ مبارک، قصر السرور، رشیق تاج بدیع[1] کے بلند اور زیب و زینت سے معمور عمارتیں بھی ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں لیکن اس تمام وسعت میں کسی کالج یا اسکول کا ہم کو نشان نہیں ملتا، بے شبہہ قرطبہ کی علمی شہرت بغداد سے کم درجہ پر نہیں ہے، بے شبہہ یورپ کی استادی کا فخر اسپین ہی کا خاص حصہ ہے، لیکن اس وقت اصطلاحی مدارس سے بحث ہے، جس کے معنی اتنے ہی تک محدود ہیں کہ خاص درس و تدریس کی غرض سے کوئی عمارت تیار کی گئی ہو، اسپین کی بجا طرفداری علامہ مقری سے زیادہ کوئی شخص نہیں کر سکتا جو اسپین کی ایک ایک خوبی کو تمام اور ممالک اسلامیہ کے سامنے اس دعوی سے پیش کرتا ہے، کہ "تم ایک کا بھی جواب لا سکتے ہو" تاہم اس محقق اور وسیع النظر مورخ نے صاف صاف اقرار کیا ہے، کہ "تمام اسپین میں ایک بھی مدرسہ نہ تھا، صرف مسجدوں کے صحن تھے جن میں تمام علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے"[2]

فوسٹر صاحب کی تاریخ اسپین و نظم الممالک و چیمبرس انسائیکلوپیڈیا وغیرہ میں اسپین کے مدرسوں کا جہاں اجمالاً ذکر کیا گیا ہے، غالباً اس سے اسی قسم کی عام درس گاہیں مراد ہیں،

ہندوستان

ہندوستان[3] کے تذکرے میں ہم کو بے خطر کہنا چاہیے کہ اس سرزمین پر شاید ایک بھی علمی عمارت نہیں قایم ہوئی، لیکن اس ملک کی عام علمی فیاضیوں کا انکار نہیں ہو سکتا، اکبر، جہانگیر، شاہجہان، عالمگیر کے خزانۂ شاہی سے عموماً اُن لوگوں کے لئے جاگیریں اور وظیفے مقرر رہتے جو

---

[1] یہ سب قرطبہ کے عالیشان ایوانات و باغات کے نام ہیں ۱۲ دیکھو نفح الطیب تاریخ اندلس مطبوعہ فرانس جلد اول صفحہ ۳۴۷ ۱۲ [2] میں اس بات کا اعتراف کرتا ہوں کہ میری یہ تحقیق صحیح نہیں ثابت ہوئی، ہسپانیہ[3] میں بہت سے مدارس تعمیر ہوئے تھے، گو اب انکا نام و نشان باقی نہیں رہا،

بطور خود درس و تدریس کرتے رہتے تھے، دولت ترکیہ اس قدر بے انتہا صرف اور سعی و اہتمام کیساتھ بھی اصلی نتیجہ مین دولت تیموریہ سے کچھ فائق نہین ہے، شمس الدین فناری، قاضی زادہ، خواجہ زادہ، علامہ قوشجی، ابن المؤید وغیرہ کے مقابلہ مین جنکو صاحب کشف الظنون حکما کا لقب دیتے ہین، ہم ملا محمود جونپوری، ملا نظام الدین، محب اللہ بہاری، حمد اللہ، بحر العلوم، شاہ ولی اللہ صاحب کو کسی قدر ترجیح کے ساتھ پیش کر سکتے ہین،

جن مدرسون کے حالات ہم لکھ آئے ہین، اکثر مذہبی یا عقلی علوم کے درس کے لئے تھے، صنعتی مدارس کے متعلق ہماری واقفیت نہایت محدود ہے، اسلامی ملکون مین عمدہ صنعتون کے بہت سے آثار موجود ہین، مگر اُن کی تعلیم کے کسی مرتب سلسلہ کو ہم نہین معلوم کر سکے ہین، فنون جنگ مین مسلمانون کی ترقی اب بھی دنیا کی موجودہ حالت و صورت سے عیان ہے، اور مسٹر ایڈورڈ کریسی صاحب نے یورپ مین ترکون کی فتوحات کو اسی امر سے منسوب کیا ہے لیکن ہم عبد المومن سلطان مراکو کے مدرسہ حربیہ کے سوا اور کسی حربی تعلیم گاہ کے حالات سے نہین واقف ہین، چرکسہ کے عہد مین جو عمدہ فوجین تیار ہوئین اس کا یہ طریقہ تھا کہ ترک اور چرکس غلام جو خرید کر کے آتے تھے اُن کو پہلے قرآن اور معمولی خط و کتابت اور کسی قدر حساب سکھایا جاتا تھا، پھر فقہ کی تعلیم ہوتی تھی اور بعض تیز طبع نوجوان معتدبہ لیاقت تک پہنچ جاتے تھے، اس کے بعد نیزہ بازی اور تیر اندازی اور پھر شہسواری سکھائی جاتی تھی، جو ان کی تعلیم کا انتہائی زینہ تھا، لیکن یہ طریقہ بھی کسی باقاعدہ ہیئت اجتماعی کی صورت نہین رکھتا تھا، اور غالباً تمام ممالک اسلامیہ مین حربی تعلیم کا یہی انداز تھا، خلیفہ عبد المومن بن علی کا مدرسۂ حربیہ خاصۃً قابل ذکر ہے، جس کی تفصیل ہسٹری آف ڈومینین آف اسپین مصنفہ کانڈی[۱] سے قریب قریب اس کے لفظون مین نقل کرتے ہین

---

[۱] دیکھو تاریخ مذکور، جلد ثانی، صفحہ ۵۷ ہم، مطبوعہ لندن ۱۸۲۰ء؛

اس (عبدالمومن) نے ایک اسکول لڑکوں کے لئے بنایا جس میں صرف علوم نہیں بلکہ سپہ گری کے کام بھی سکھائے جاتے تھے، کیونکہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ صرف پڑھے لکھے قاضی تیار ہوں، بلکہ انکی خواہش تھی کہ لایق لائق گورنر ملکوں کیلئے اور لائق گردہ قضاۃ شہروں کے انتظام کے لئے پیدا ہوں، اور بڑے بڑے جنرل اور اچھے جنگ آور اس کے اسکول سے تعلیم پاکر نکلیں، ان کالج اور اسکولوں میں وہ مصامدہ اور دوسری قوموں کے شریف خاندانوں سے جو ان کے ملک میں رہتے تھے، لڑکے جمع کرتا تھا جن کی تعداد تین ہزار تھی اور جو قریب قریب ایک ہی عمر ہونے کی وجہ سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا ایک ہی دن کے پیدا ہیں، یہ لڑکے حافظ اور طالبین کہلاتے تھے، کیونکہ وہ موطا یا اصول المہدی حفظ یاد کرتے تھے، اور ایک دوسری کتاب بھی پڑھتے تھے، جس کا نام تا لطلبۃ القاضی تھا، حافظین کو بادشاہ جمعہ کے دن الکوزر میں جمع کیا کرتا تھا، جس دن کہ وہ ازالہ جایا کرتا تھا، وہ ان کو حکم دیتا تھا کہ ہفتے بھر کا پڑھا اس کے سامنے دوہرائیں، ہفتہ میں ایک دوسرے دن ان کو حکم دیتا تھا کہ شہسواری ہتھیاروں کے کرتب، نیزہ بازی گھوڑدوڑ، اور بہت سی مشقوں کا جو سپاہیوں کے لئے ضروری ہیں، تماشا دکھلائیں، تیسرے دن ان کی تیراندازی کی مشق دیکھتا تھا اور ایک اور دن ان کی شناوری کی استادیاں ملاحظہ کرتا تھا، جس کے لئے اس نے اپنے باغ میں ایک بڑا وسیع تالاب بنوایا تھا، جو تین سو قدم لمبا اور اتنا ہی چوڑا تھا، تالاب میں مختلف قسم کی کشتیاں اور اور قسم کی جو کہ خود اس نے ایجاد کی تھیں اور اس وضع کی اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھیں، پڑی رہتی تھیں، وہ ان کشتیوں پر حافظین کو سوار کراتا تھا، جنہیں پھیکر ایک دوسرے پر حملہ کرنے اور اپنے آپ کو بچانے میں وہ بڑی پھرتی اور چالاکیاں دکھلاتے تھے، عبدالمومن خود ان کو کشتیوں کے کھینے اور کسی خاص سمت لیجانے اور تمام ان اعمال کے طریقے بتاتا تھا جو سمندر میں جہازوں کے استعمال کے لئے ضروری ہیں، اس طرح ہر ہفتہ کا ہر ایک دن کام میں لایا جاتا تھا، اور ہم

علامہ حریری

کام کے لئے ایک خاص دن مقرر تھا، یہ لڑکے بڑے جوش سے اپنا کام کرتے تھے، بوجہ ان گران قدر انعامون کے جو کہ عبدالمومن کی طرف سے ان نوجوانون کو دیئے جاتے تھے، جنھون نے فتح حاصل کی ہے، یا اپنے فرائض مین زیادہ مشاق ہین، یہ سب خرچ عبدالمومن خود دیتا تھا، یہان تک کہ ہتھیار اور گھوڑے بھی اسی کے عنایت کئے ہوئے ہوتے تھے، ان حافظین مین ۳۰۰ لڑکے خود عبدالمومن کی اولاد تھے، جو ہتھیارون کے کام اور دوسری قسم کی مشاقیون مین نہایت چالاک تھے، اس کے علاوہ وہ ذاتی اخلاق مین بھی نہایت برگزیدہ اور ممتاز تھے،

یہ سب مدرسے وہ تھے جو ممالک اسلامیہ مین قائم ہوئے لیکن مسلمانون کی علمی فیاضی اس وسیع دائرے مین بھی محدود نہ تھی، انھون نے یورپ کے خاص شہرون مین بھی رصدخانے، صنعت گاہین، اور مدرسے قائم کئے جنمین سے مین ایک کا ذکر گبن صاحب کی تاریخ سے انھین کے الفاظ مین کرتا ہون، وہ روشن امپائر حصۂ مسلمانان فتح سلرنو کے ذیل مین لکھتے ہین :- "افریقہ اور ہسپانیہ اور سسلی مین جو عرب کی نوآبادیان تھین ان کو یونانی دواؤن سے واقفیت حاصل ہوئی اور بوجہ اجتماع جنگ و صلح علم کا پرتو سلرنو جیسے مشہور شہر مین چمکا ایک مدرسہ جو اول ہی اول فرنگستان کے زمانہ جہالت مین قائم ہوا وہ فن جراحی کے لئے مخصوص تھا، اس مفید اور صحت بخش پیشہ کے لئے پادریون اور راہبون کی منظوری لے لی گئی تھی، اور بہت سے نامی گرامی مریض دور دور مقامات سے سلرنو کے اطبا کے پاس رجوع کرتے تھے، یا ان کو طلب کرتے تھے، یہ اطبا نارمنڈی کی فتحمندیون کے ظل حمایت مین رہتے تھے، قسطنطین نام افریقہ کا ایک عیسائی انتیس[29] برس سفر حج مین رہکر اور زبان و علم عربی کی تحصیل کامل کرکے بغداد سے واپس آیا، اسطرح بوعلی سینا کے شاگرد کے مطب اور ہدایات اور تحریرات سے سلرنو مالا مال ہوگیا،

یورپ مین اسلامی مدارس

قدیم تعلیم

۱۳۵ھ اور تعلیم، تعلیم کی وسعت اور اس کے اسباب، طرز تعلیم، انقلابات،

مختلف ملکوں کی خصوصیتیں، تعلیم کا مذہبی تمدنی اثر

۱۳۵ھ تک یعنی جب تک تصنیف و تالیف نہیں شروع ہوئی تھی جو علم و تعلیم تھی وہ عرب کے [illegible] طرز زندگی کیلئے موزون تھی، علوم وہ تھے جنکو حافظے سے زیادہ تر تعلق تھا، بحث طلب مسائل بھی معمولی فہم کی دسترس سے باہر نہ تھے، اور طرز تعلیم تو بالکل وہی تھا (یعنی سند و روایت) جو قدیم زمانے سے ان میں رائج تھا، لیکن سو برس کی مدت میں تمدن بہت کچھ ترقی کر گیا، اور اسی نسبت سے تعلیم بھی زیادہ وسیع اور مرتب و باقاعدہ ہو چلی، اس دور میں جن علوم کو رواج عام حاصل ہوا، وہ نحو، معانی، لغت، فقہ، اصول، حدیث، تاریخ، اسماء الرجال، طبقات، اور ان کے متعلقات تھے عقلی علوم کا سرمایہ گو بہت کچھ جمع ہو گیا تھا، مگر رواج عام نہ حاصل کر سکا، جس کی وجہ یہ تھی کہ سلطنت نے اس کی اشاعت پر چنداں زور نہیں دیا، اور عام ملک کو کچھ ناواقفیت، کچھ مذہبی غلط فہمی کی وجہ سے فلسفہ و منطق کے ساتھ ہمدردی نہ تھی،

تعلیم کا دوسرا دور اور اسکی وسعت

تعلیم کا یہ دوسرا دور عجیب دلچسپیوں سے بھرا ہے، دیکھو، [illegible] سے دریائے سندھ کے کنارے تک اسلام حکومت کر رہا ہے، حجازی فتوحات کا سیلاب اب رکتا چلا ہے، مفتوحہ ممالک میں امن و انتظام کا عمل ہوتا جاتا ہے، سینکڑوں قبیلے ریگستان عرب سے نکل کر دور دور

دراز ملکون مین آباد ہوتے جاتے ہین بہت سی نئی قومین دلی ذوق سے اسلام کے حلقے مین داخل
ہو رہی ہین لیکن اب تک اس وسیع دنیا مین سلطنت کی طرف سے نہ کوئی سررشتۂ تعلیم ہے، نہ
یونیورسٹیان ہین، نہ مدرسے ہین، عرب کی نسلین حکمران ہین، گر حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری
ہے کہ ملک کے عام اخلاق، معاشرت، تمدن پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر چندان نہین پڑ سکتا
تمام علوم پر عربی زبان کی مہر لگی ہے، ان سب باتون پر دیکھو کہ علوم و فنون کس تیزی اور وسعت
سے بڑھتے جاتے ہین، مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا
ایک ایک شہر بلکہ ایک ایک گاؤن علمی صداؤن سے گونج اٹھا ہے، عام تعلیم کے لئے ہزارہا مین
مکتب قائم ہین، جنمین سلطنت کا کچھ بھی حصہ نہین ہے، اور جو آج کل کے تحصیلی مدارس سے زیادہ
مفید اور فیاض ہین، اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لئے مسجدون کے صحن، خانقاہون کے حجرے علما
کے ذاتی مکانات ہین لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارتون مین جس وسعت اور فیاضی کیسا تھ
علم کی تربیت ہو رہی ہے، بڑے بڑے عالیشان قصر و ایوان مین بھی جو پانچوین صدی کے آغاز
مین اس غرض سے تعمیر ہوئے، اس سے کچھ زیادہ نہ ہو سکی، اگرچہ اس وقت اس زمانہ کا کوئی رجسٹر
نہین موجود ہے، جس سے ہم حساب لگا سکین، کہ فیصدی کتنے آدمی تعلیم یافتہ تھے، لیکن تذکرے
تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی سیکڑون ہزارون کتابین موجود ہین، جن سے ہم صحیح اندازہ کے
قریب پہنچ سکتے ہین، اگرچہ متواتر انقلابات، تخت گاہون کی بربادی، ایشیا کی تباہی، تاتاری
عام غارت گری کے بعد ہمارے پاس جو کچھ رہ گیا ہے، وہ ہزار مین ایک بھی نہین ہے اور اسی
وجہ سے ہزارون لاکھون نامورون کی صورتین زمانہ کی تاریخی نگاہ سے چھپ گئی ہین، تاہم ہر عہد
مین ہم سیکڑون ماہرین و مجتہدین فن کا نشان دے سکتے ہین، صرف معاصر و ہم وطن اہل کمال
کی فہرست تیار کیجائے تو بھی بہت سی جلدین تیار ہو سکتی ہین، ڈاکٹر اسپرنگر صاحب تخمینہ کرتے

ہین، (شاید حسن ظن ہو) کہ مسلمانون کے اسماء الرجال مین پانچ لاکھ مشہور عالمون کا حال مل سکتا ہے"، اب اگر یہ قیاس لگایا جائے کہ تعلیمیافتہ گروہ مین کس نسبت سے ایک صاحب کمال پیدا ہوتا ہے، تو عام تعلیم کا ایک معقول اندازہ ہوسکتا ہے،

مشہور علماء کے تعلیمی حالات پڑھو، ایک ایک استاد کے حلقۂ درس مین سیکڑون بلکہ ہزارون طالب العلم مشغول درس نظر آئین گے، علامہ ذہبی طبقات مین ابوالبقی المتوفی ۴۲۵ھ کے ترجمے کے بعد لکھتے ہین کہ اس زمانے کے بعض حلقہ درس ایسے ہوتے تھے جن مین دس ہزار سے زائد دواتین رکھی جاتی تھین اور لوگ احادیث نبوی لکھتے تھے، اس بڑے مجمع مین دو سو امام حاضر ہوتے تھے، جو اجتہاد و فتوی دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے" خطیب مورخ بغداد علامہ ابوحامد اسفراینی کے حلقے مین خود شریک تھا، اس کا بیان ہے کہ سات سو طلبہ درس مین حاضر تھے، فراء نحوی نے کتاب المعانی کا جب لکچر دیا (جسکو عربی زبان مین املاء کہتے ہین) تو حاضرین مین سے ۸۰ صرف قاضی تھے[1]، رضی الدین نیشاپوری کے حلقۂ درس مین چار سو فارغ التحصیل اہل علم حاضر ہوتے تھے، بصرہ کی جامع مسجد مین امام بخاری نے جب مجلس املاء منعقد کی تو ہزار کے قریب محدثین، فقہاء، حفاظ، اہل مناظرہ شامل ہوئے، خود امام بخاری سے جن لوگون نے صحیح بخاری کی سند حاصل کی ان کی تعداد قریباً نوے ہزار تھی[2]، اس قسم کی سیکڑون مثالین ہین جنکا ہم استقصا نہین کر سکتے،

وسعت تعلیم

ہر قوم، ہر فرقہ، ہر طبقہ مین تعلیم کثرت سے جاری تھی، مصنفین و اہل فن کے حالات پڑھو، سیکڑون ہزارون اہل کمال ملین گے، جن کے باپ دادا، خیاط، اسکاف، جولاہے، حلوائی، طباخ، حداد، وغیرہ تھے، امراکا عیش پسند گروہ بھی تعلیم سے مالامال تھا، لوگ تعجب سے سنین گے کہ

---

[1] ان لوگون کے تراجم دیکھو، [2] دیکھو مقدمہ قسطلانی،

ابن المعتز عباسی المتوفی ۲۹۶ھ جو علم بدیع کا موجد اور شاعری مین ابونواس و بشار کا ہمسر تھا، اور ابو فراس جس پر عرب کی شاعری کا خاتمہ ہوگیا، والیان ملک تھے، اور حکیم بو علی سینا و محقق طوسی وزارت کے بلند منصب پر ممتاز تھے،

طرز تعلیم

اس دور مین تعلیم کا مستند طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکون مین جاری ہے یعنی املا جس کو اردو مین لکچر دینا کہتے ہین، استاد ایک بلند مقام مثلاً کرسی یا منبر پر بیٹھ جاتا تھا، اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا، طالب العلم جو ہمیشہ دوات و قلم لیکر بیٹھے تھے ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظون مین لکھتے جاتے تھے، اس طرح پر ایک مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی، اور امالی کے نام سے مشہور ہوتی تھی، امالی ابن درید و ثعلب وغیرہ اسی قسم کی تصنیفات ہین، جب معمول سے زیادہ طلبہ حلقۂ درس مین جمع ہوتے تھے تو استاد کے سامنے یا داہنے بائین چند فاضل کھڑے ہوتے تھے، جو دور والون کو استاد کے خاص الفاظ سنا سکتے تھے، یہ لوگ مستملی کہلاتے تھے، یہ طریقۂ تعلیم منقولی علوم کے ساتھ مخصوص نہین تھا، ابو بشر متی جو بغداد مین ارسطو کی کتاب المنطق کا درس دیتا تھا، اس کے لکچر مین سیکڑون طلبا شریک ہوتے تھے جن مین فارابی بھی تھا، اور اس نے کئی سو صفحے خود نقل کئے تھے،

اعلیٰ تعلیم کے شرائط

اعلیٰ تعلیم کے لئے دور و دراز مسافتون کا طے کرنا، اور متعدد اہل کمال کی خدمت مین پہنچکر فائدہ اٹھانا نہایت ضروری خیال کیا جاتا تھا، مشہور اہل فن کی لائف چھان ڈالو، ایک شخص بھی ایسا نہین ملیگا جس نے تکمیل تعلیم کے لئے دو چار سو میل کی مسافت نہ طے کی ہو، اس زمانے مین ایک مشہور فاضل جو سفر کی زحمت اٹھائے بغیر اپنے فن مین نامور ہوا، اس زمانے کے لوگ ہمیشہ اس کو حیرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، بغداد، نیشاپور، قرطبہ وغیرہ مین گو ہر فن کے کامل موجود تھے، مگر ان شہرون کے رہنے والے بھی مشرق و مغرب کی خاک چھانے بغیر نہین رہتے

علامہ مقری کی تاریخ کا ایک بڑا حصہ انھیں علماء کے حالات میں ہے جو اسپین سے مصر و شام و بغداد گئے، یا ان مقامات سے چل کر اسپین میں داخل ہوئے، جس کثرت اور جوش و سرگرمی سے تعلیم کے لئے مسلمان ہمیشہ سفر کرتے رہے ہیں، دنیا کی تاریخ میں اسکی نظیر موجود نہیں ہے،

مجالس مناظرہ

دوسری چیز جو اعلیٰ تعلیم کے لئے گویا لازمی تھی مناظرہ کی مجلسوں میں شریک ہونا تھا، مشہور شہروں میں بحث و مناظرہ کے لئے خاص وقت اور مقام مقرر تھے، بعض امراء اس قسم کی مجلسیں اپنے مکانوں پر منعقد کرتے تھے. فقہ، ادب، نحو وغیرہ ہر ایک علم کے لئے جداگانہ مجلسیں تھیں، ان میں علماء اور طلباء دونوں شریک ہوتے تھے، اور کوئی ممتاز عالم بحث کے تصفیہ کے لئے انتخاب کیا جاتا تھا، یہ جلسے جن میں زیادہ تر انصاف اور حق پسندی کا استعمال ہوتا تھا، معمولی نصاب تعلیم ختم کرنے کی بہ نسبت بہت زیادہ مفید اور پر اثر تھے، تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد استاد ایک تحریری سند عنایت کرتا تھا، جس میں اس کی تعلیم کی ایک اجمالی کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی، اس سند میں وہ طیلسان پہننے کی بھی اجازت دیتا تھا، جو علماء کا مخصوص لباس[1] تھا،

تعلیم کی وسعت کے متعدد اسباب تھے، (۱) تعلیم، مذہب کا ایک ضروری جزو بن گئی تھی، قرآن و حدیث، (جن پر مذہب کی بنیاد تھی) عربی زبان کے ساتھ خصوصیت رکھتے ہیں، اتنے تعلق سے، نحو، صرف، لغت، معانی، اسماء الرجال بھی گویا مذہبی تعلیم کے ضروری اجزاء سمجھے گئے، فلسفہ نے علم کلام کی صورت میں مذہبی علم ہونے کی عزت حاصل کی تھی، اس سلسلے نے بڑھتے

---

[1] علامہ ابن خلکان لکھتے ہیں کہ اول جس شخص نے علماء کے لئے خاص لباس قرار دیا وہ قاضی ابو یوسف تھا، یہی لباس اب بھی چلا آتا ہے، یہ لباس طیلسان کے علاوہ ایک جبہ ہوتا تھا، جو آج کل کی ایم اے کے گون سے بہت مشابہ تھا، اس میں بٹن بھی لگا ہوتا تھا، (دیکھو حسن المحاضرۃ، جلد ثانی، صفحہ ۲۲۷، مطبوعہ مصر)

بڑھتے قریباً علم و فن کو اپنے دائرہ مین لے لیا تھا، یہ خیال کرو کہ ایک قوم جس مین اسلام کا جوش ابھی تازہ ہے جسکی رگون مین ہنوز عرب کا لہو ہے، جس کی ہمتین بلند، ارادے مستقل، حوصلے وسیع ہین، اور پیہم ملکی کامیابیون نے اس کے جوش کو زیادہ تیز کر دیا ہے جب کسی کام پر پوری توجہ سے مائل ہو گی تو کس حد تک پہنچا کر رہیگی، عرب کے سوا دوسری قومین جو اسلام قبول کر چکی تھین، مذہب نے انکو بھی انھین سرگرم جذبات سے بھر دیا تھا، جو عرب کے ذاتی خاصے تھے، اور چونکہ وہ مدت سے تمدن و معاشرت کی آبادی مین بسر کرتے آئے تھے تعلیم کے معاملے مین انھون نے اپنے استاد (عرب) سے زیادہ کام دیا، یہی بات ہے کہ نحو، لغت، حدیث، اصول، فقہ، فلسفہ کے امام و پیشوا، قریباً کل عجمی ہین، علامہ ابن خلدون نے اس پر مقدمۂ تاریخ مین ایک مستقل مضمون لکھا ہے جس کی سرخی یہ ہے "حملة العلم فی الاسلام اکثرہم العجم" یعنی اسلام مین علم کے حاملین اکثر عجم ہین، ہمارے اکثر اخوان جو عرب کی نسل سے ہین اس بات کو رشک اور تعجب سے سنین گے، مگر ان کو ہشام[1] و عیسیٰ کی طرح صبر کرنا چاہئے،

(۲) تعلیم مسجدون اور علما کی خاص درسگاہون مین مقید نہ تھی، وزرا، حکام، فوجی افسر، اہل منصب، ہر طبقہ کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے، وزارت کے کثیر الاشتغال وقت مین بھی بوعلی سینا کی خدمت مین مستعد طلبا کا ایک گروہ حاضر رہتا تھا،

---

[1] ہشام بن عبد الملک دولت بنو امیہ کا نامور خلیفہ تھا، راوی کا بیان ہو کہ مجھ سے ہشام نے پوچھا کہ اس وقت مکہ مین علم کا سردار کون ہے، مین نے کہا عطا، (ہشام) وہ عربی الاصل ہے؟ (مین) نہین، اسی طرح اس نے شام، مصر، جزیرۃ، خراسان، بصرہ کی نسبت پوچھا مین نے مکحول، یزید، میمون، ضحاک کے نام لئے، ہر نام پر پوچھتا جاتا تھا کہ عربی الاصل ہے اور مجھ سے "نہین" کا لفظ سنکر پیچ و تاب کھاتا جاتا تھا، اخیر مین مین نے کہا کہ ابراہیم النخعی جو کوفہ کا امام ہے عربی الاصل ہے، اس پر اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کہ "خیر اس سے کچھ تسکین ہوئی"، (فتح المغیث صفحہ ۴۹۸) عیسیٰ کی نسبت بھی ایک اسی قسم کا واقعہ بیان کیا گیا ہے،

(۳) تعلیم مین نہایت آزادی تھی، کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضرور نہین تھی، جو شخص جس خاص فن کو چاہتا تھا حاصل کر سکتا تھا، اہلِ کمال کے زمرے مین سیکڑون گذرے ہین جو ایک فن مین امام تھے اور دوسرے فنون مین معمولی طالب العلم کا بھی درجہ نہین رکھتے تھے،

(۴) اُمرا اور اہلِ منصب کا گروہ جو شائقینِ علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا تعلیم کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا، سلاطین و وزرا تو ایک طرف معمولی سے معمولی رئیس کی خدمت مین سیکڑون ادیب و فاضل موجود ہوتے تھے، اور چونکہ ان کی تنخواہین کسی خدمت کے بدل نہ تھین بلکہ صرف ان کا ذاتی کمال اور قبولِ عام مہنگے دامون کو خریدا جاتا تھا، تمام ملک مین لیاقت اور شہرت پیدا کرنے کا ایک عام جوش پھیل گیا تھا، تصنیفات مین زورِ طبع کے ساتھ تحقیق و احتیاط کا لحاظ اس لئے زیادہ تر کرنا پڑتا تھا کہ جن قدردانون کے سامنے پیش کرنا ہے، وہ خود صاحب النظر اور نکتہ چین ہین،

مدرسون کا زمانہ

مدرسون کے قایم ہونے سے دفعۃً کوئی تبدیلی نہین پیدا کی، نصابِ تعلیم قریباً وہی رہا جو پہلے تھا، پرایویٹ تعلیم گاہین عموماً قائم رہین، اور حق یہ ہے کہ جب تک ان پر کچھ زوال نہین آیا تعلیم بھی نہایت وسعت سے جاری رہی، لیکن رفتہ رفتہ ان مدرسون مین خاص خاص قاعدون کی پابندیان شروع ہوئین، اور سلطنت عثمانیہ کے زمانے مین تو گویا تعلیم کا ایک جداگانہ قانون پاس کیا گیا، آٹھوین صدی سے پہلے فارغ التحصیل ہونے کے لئے ایک خاص مدت معین ہو چکی تھی، گو ملکون کے اعتبار سے مختلف تھی، مثلاً مغرب (مراکو وغیرہ) مین سولہ برس، اور ٹیونس مین پانچ برس طالب العلم کو تعلیم گاہ مین رہنا لازمی تھا، املا کا طریقہ بھی رفتہ رفتہ جاتا رہا،

املا کا طریقہ جاتا رہا۔

آٹھوین صدی مین حافظ زین الدین عراقی نے (حافظ ابن حجر کے استاد تھے) اس کو زندہ کرنا چاہا اور قریباً چار سو مجلسون مین اس طرح درس بھی دیا، حافظ ابن حجر و سخاوی نے بھی انکی

تقلید کی، مگر انھین بزرگون پر خاتمہ ہو گیا، جلال الدین سیوطی نے ارادہ کیا، مگر لوگون کی بے توجہی دیکھکر خود باز رہے،

مدرسون کا مذہبی اثر

یہ مدرسے اکثر مذہبی تھے اور کسی ایک مذہب کے ساتھ خصوصیت رکھتے تھے، دار العلوم نظامیہ صرف شافعیون کے لئے تھا، مستنصریہ وغیرہ مین چارون مذہب کا درس ہوتا، مگر مدرسین و نصاب تعلیم بالکل جدا گانہ تھے، اس خصوصیت نے مذہب پر ایک نمایان اثر ڈالا، چوتھی صدی مین بلکہ اس سے پہلے تقلید مذہبی کی بنیاد پڑ چکی تھی، مگر ان مدرسون نے جو نتیجہ اس کو محسوس صورت مین دکھایا، قوم مین اس کا عام رواج ہو گیا اور نہایت سختی کے ساتھ ہوا، شاہ ولی اللہ صاحب نے تقلید شخصی کی ابتدا چوتھی صدی کے بعد قرار دی ہے،[1] ہر شخص بہ آسانی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ ان مدرسون نے جو تقلید شخصی کے ہمزمان ہین، یا خود تقلید کو پیدا کیا ہوگا، یا کم سے کم اس کو ترقی اور استواری دی ہوگی، مدرسون کے ابتدائی زمانہ مین تو ایسے علما کثرت سے تھے جو اجتہاد کا حق رکھتے تھے، لیکن رفتہ رفتہ تقلید کے عام رواج نے علوم اور ایجاد کی قوت کو اس قدر گھٹا دیا کہ گویا قوم سے اجتہاد کی قابلیت ہی جاتی رہی، شاہ ولی اللہ صاحب نے کتاب الانصاف مین نہایت سچ لکھا ہے کہ اس زمانے مین (یعنی پانچوین چھٹی صدی مین) تقلید ہی ضروری تھی،

تنزل تعلیم

تیسرے دور مین اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کر دیا، کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے مثلاً نحو، صرف منطق و امثال ذلک ان کی تعلیم مین وہ اہتمام اور موشگافیان ہونے لگین کہ عمر کا ایک بڑا حصہ انھین کے نذر ہو گیا، اور اتنا وقت نہ مل سکا کہ جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی ان پر پوری توجہ ہو سکتی،

---

[1] دیکھو حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۵۸،

تصانیف کی کثرت اور ان کا درس میں داخل ہونا۔ اس[1] بات نے بھی نہایت ضرر پہنچایا، پہلے اور دوسرے دور میں زیادہ تر فن کی تعلیم ہوتی تھی لیکن تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی، ہمارے ہندوستان میں تو ضمیروں کی مرجع اور حیثیت تعلیلی و تقلیدی و لعدیت ذاتی و زمانی کی تنگ دائرے سے طلبا تو کیا اکثر علما بھی کبھی باہر نہیں نکلے،

ان مدرسوں میں (ترکی مدارس کے سوا) فلسفہ و منطق کی تعلیم کا بہت کم اہتمام تھا، اور اکثر نامور مدرسوں میں تو ان علوم نے رسائی ہی نہیں پائی لیکن اس کا الزام بانیان مدرسہ پر نہیں ہے، بلکہ قوم کے ان بزرگواروں پر ہے جو دینی یا دنیوی حیثیت سے قوم پر حکمران تھے، ہم لکھ آئے ہیں کہ مسلمانوں میں علوم کی بنیاد مذہب کی زمین پر رکھی گئی، اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مذہبی پیشواؤں کی اجتہادی رائیں جدھر رخ کریں علوم بھی ان کا ساتھ دیں، اسی وجہ سے مملکت اسلامی کے ہر گوشے میں رہ رہ کر فلسفہ کو صدمے اٹھانے پڑتے تھے،

معتضد باللہ خلیفہ عباسی نے جو ۲۷۹ھ میں تخت نشین ہوا، پہلے ہی سال فرمان نافذ کیا کہ کتب فروش فلسفہ کی کتابیں نہ بیچنے پائیں[2] حکیم ابن رشد کو اپنی فلسفی تصنیفات سے اس لئے خود انکار کرنا پڑا کہ خاندان عبد المومن (سلاطین مراکو) نے اس جرم پر اس کو قید کر دیا تھا اسی خاندان کے ایک فرمان روا نے جس کا نام مامون تھا حکیم بن حبیب کو قتل کرا دیا،[3] سلطنت عثمانیہ میں بھی ایک مفتی صاحب نے فلسفہ کا درس بند کرا دیا۔[4] حافظ جلال الدین سیوطی نے

---

[1] علامہ ابن خلدون نے ان دونوں باتوں پر نہایت عمدہ بحث لکھی ہے، دیکھو مقدمۂ تاریخ فصل ۶- کی فصل ۲۰ و فصل ۳۱،
[2] تاریخ الخلفاء خلافت معتضد باللہ، [3] نفح الطیب تاریخ اسپین مطبوعہ فرانس جلد ثانی صفحہ ۱۲۵، [4] کشف الظنون، ذکر علم حکمت،

علم منطق کے ناجائز ہونے پر ایک کتاب ہی تصنیف کر ڈالی جس کا نام "القول المشرق فی تحریم الاشتغال بالمنطق" ہے، علامہ ابن الصلاح نے بھی اس مضمون کا ایک فتویٰ لکھا، علامہ ابن تیمیہ مامون الرشید پر ہمیشہ ترس کھاتے رہے، کہ دیکھئے اس جرم پر (فلسفہ کا رواج دینا) خدا اس سے کیا مواخذہ کرتا ہو، اسپین میں امرا اور خواص فلسفہ کے حامی تھے، لیکن عوام کی برہمی کے خوف سے کبھی اس علم کو عام آزادی نہیں دی گئی[1] تاہم مجھ کو اقرار کرنا چاہئے کہ فلسفہ کے دوستوں کی تعداد (عوام کا ذکر نہیں) دشمنوں سے زیادہ تھی،

مذہب نے تعلیم پر جو بڑا نمایاں اثر دکھایا وہ یہ ہے کہ قدیم عربی زبان نہایت احتیاط سے محفوظ رہی، حالانکہ قدیم عربی ایک مدت سے نہ ملک کی زبان ہے، نہ حکومت کی، فارس و خراسان کی عام زبان فارسی تھی، عباسی جو بغداد میں خلیفہ کہلاتے تھے، انکا جاہ و جلال بغداد کی شہر پناہ تک محدود تھا، عنانِ حکومت دیلم یا سلجوق کے ہاتھ میں تھی جو زبان اور اصل دونوں اعتبار سے عجمی تھے، مصر و شام ایک مدت تک ایوبیہ، نوریہ، چرا کسہ کے قبضہ میں رہے، اور یہ سب عجمی تھے، ممالک مغربی (مراکو، تونس، وغیرہ) میں بربروز ناتہ کی عملداری تھی، خود عرب میں قدیم عربی کا رواج نہیں رہا تھا، غرض اس کے زندہ رہنے کا کوئی سہارا نہ تھا، لیکن صرف اس بات نے کہ قرآن پاک اور حدیث اسی زبان میں تھی، اس کہنہ زبان کو تیرہ سو برس (۱۳۰۰) کی عمر دی اور خدا سے امید ہے کہ قیامت تک اسکو قائم رکھے،

اس بات کا بے شبہہ افسوس ہے کہ اس یکطرفہ توجہ نے موجودہ زبان سے ہم کو بالکل محروم رکھا، آج چھ سو برس (۶۰۰) ہوئے کہ عرب کی زبان بالکل بدل گئی، سیکڑوں نئے الفاظ کا داخل ہو جانا، مختلف تصرفات و تبدیلیاں، نئے محاوروں کا استعمال، یہ سب ایک طرف

---

[1] حسن المحاضرۃ ترجمہ حافظ جلال الدین سیوطی، [2] نفح الطیب جلد اول صفحہ ۱۳۶،

خود اعراب و ترکیب کی وہ حالت نہین رہی، موجودہ علم نحو اب سرے سے بیکار ہوگیا ہے، تقریبًا پانچو برس سے عربی ایسی نئی زبان مین شعر و قصائد نکلتے ہین، اسی زبان مین ان کے فصیح و بلیغ خطبے پائے جاتے ہین، لوگون کو یہ سنکر تعجب ہوگا کہ یہ قصائد اگر اعراب کیسا تھ پڑھے جائین تو موزون نہین رہتے، افسوس ہے کہ اس جدید مستقل زبان پر کسی نے توجہ نہ کی، اور ان اشعار و خطب کے سمجھنے کے لئے ہمارے پاس کوئی لغت موجود نہین[1] کس قدر افسوس و شرم کی بات ہے کہ ان لغات عجیبہ کے لئے ہمکو عیسائی فاضلون کا دریوزہ گر ہونا پڑتا ہے، یعنی پروفیسر بطرس کا جس نے نہایت تحقیق سے محیط المحیط لکھی ہے، اور لین صاحب انگلشی کا جن کی کتاب مدالقاموس کی ۷ جلدین لندن مین چھپ چکی ہین،

اسلام جس وسیع دنیا پر حکومت کر رہا تھا، اس مین جغرافی تقسیم کی حیثیت سے مختلف ملک شامل تھے، اور متعدد قومین آباد تھین، اسلامی اتحاد سے اگرچہ ہر حصہ مین یکسان طور پر علوم کی روشنی پھیلائی مگر ملکی و قومی خصوصیتون نے مختلف صورتین پیدا کین،

ملکی خصوصیتین

ایران نے منقولی علوم کے علاوہ عقلیات کو معراج کمال تک پہنچایا، مصر و شام مین فقہ حدیث و اسماء الرجال پر زیادہ توجہ ہوئی، حافظ جلال الدین سیوطی، مصر کی فضیلت کی ایک بڑی وجہ یہ قرار دیتے ہین کہ "وہان فلسفہ کا زور نہین ہے" اسپین مین زباندانی، شاعری، تاریخ کو زیادہ فروغ ہوا، یہان تک کہ لڑکون کو قرآن پڑھنے کے زمانہ سے اشعار و امثال یاد کرائے جاتے تھے، یہ اختلافات انھین ملکی خصوصیتون کا اثر تھا، ایرانیون کے ذہن کی لطافت، موشگافی، دقیقہ سنجی، فلسفہ و منطق کے بالکل مناسب تھی، مصر و شام

---

[1] علامہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ مین اس بحث پر متعدد مضمون لکھے ہین جسکے اشعار بھی نقل کئے ہین، جو اس نئی زبان مین شعرائے عرب نے لکھے، اور جنمین اعراب کا مطلق پتہ نہین،

عرب کے دامن میں تھے، اور اس وجہ سے قوت حافظہ کی عمدگی اور متوسط ذہانت نے حدیث و اسماء الرجال کو زیادہ پسند کیا، اسپین عرب ہونے کی حیثیت سے مصر و شام کا ہمپایہ تھا لیکن اتنی خصوصیت نے کہ وہاں مدت تک عرب خاندان حکومت کرتے رہے، جو شعر و شاعری پر جان دیتے تھے، اسپین میں ادب و شاعری کو زیادہ چمکایا، شام میں بھی آل حمدان کے زمانے میں جو عموماً سخنور تھے، شاعری کا پایہ نہایت بلند ہو گیا تھا،

انقلابات حکومت کا اثر،

انقلابات حکومت جو کثرت سے ممالک اسلامی میں ہوا کئے، علمی مقاصد کے لئے اکثر مفید ثابت ہوئے، ایک خاندان گو کلیتہً برباد ہو جاتا تھا، مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے، جو مواضع اور علاقے مدرسوں پر پہلے وقف ہو چکے تھے، دوسری نئی حکومت اُن کو غصب نہیں کر سکتی تھی، ہلاکو خان نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالک اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کر دیا، تاہم اوقاف میں کچھ تصرف نکر سکا، اوس نے بغداد وغیرہ کے تمام اوقاف محقق طوسی کے ہاتھ میں دئے جسکا بہت بڑا حصہ محقق موصوف نے **رصدخانے** کی تعمیر میں صرف کیا، ممالک اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اس کو استحکام سلطنت اور عظمت و جلال قایم رکھنے کے لئے ضرور تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور علم کی اشاعت میں پچھلی حکومت سے زیادہ فیاضیاں دکھائے، اس بات سے تعجب اور افسوس دونوں ہوتا ہے کہ پچھلی تعلیم جس کا اثر

پلیٹیکل تعلیم نہیں تھی،

ہوا تھا کہ اب بھی ہندوستان میں موجود ہے، پولیٹیکل آوازسے بالکل خالی تھی، نصاب تعلیم میں ایسی کوئی کتاب داخل نہ تھی، تاریخ کی کتابیں اگر پڑھائی جاتی تھیں، تو تاریخی حیثیت سے نہیں بلکہ فن افتا کے اعتبار سے، طالب العلموں کی سادہ اور مفلسانہ طرز زندگی، دنیوی خواہشوں سے مبرا اور بے غرض شوق، کمالات علمی کے لئے جس قدر زیادہ مفید تھا، اسی قدر ان کو معاملات ملکی سے الگ رکھتا تھا، ہم کو تو جرأت نہیں ہو سکتی، مگر علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں کہ گو

بیان سبب مین ہم سے مختلف ہین کہ: ان العلماء من بین البشر ابعد الامم عن السیاسۃ[1] یعنی نوع بشر مین عالم لوگ انتظامات ملکی سے بہت دور ہین؛

ہم نے اس آرٹیکل مین کسی قدر تفصیل کے ساتھ مدرسون کے حالات لکھے ہین، مگر ہم بتادینا چاہتے ہین کہ اسلامی تعلیم کے اندازہ کرنے کا یہ نہایت چھوٹا پیمانہ ہے، ہماری علمی فیاضیون اور ایجادات وصنائع کو مدرسون کے احاطہ سے باہر ڈھونڈھنا چاہیے، مدرسون کی کثرت اور عالمگیر رواج نے بھی پرایویٹ تعلیم گاہون کی تعداد کو کم نہین کیا، سنہ ۷۴۹ھ مین جبکہ مصر مدرسون اور دار العلوم سے معمور تھا، خود مصر کی ایک جامع مسجد مین چالیس سے زائد حلقۂ درس تھے جنمین ہر قسم کے علوم وفنون پڑھائے جاتے تھے[2]،

مین نے اس آرٹکل مین اس بات سے قصداً پرہیز کیا ہے، کہ سلف کے کارنامے زیادہ آب وتاب سے لکھون، قوم کی آج یہ حالت ہے کہ جتنا لکھا گیا یہ بھی اس کے چہرے پر نہین کھلتا، سلف کے مفاخر کا ہم کیا ذکر کرسکتے ہین، ہم نے جب خود کچھ نہین کیا، تو اس سے کیا حاصل کہ سلف نے بہت کچھ کیا تھا،

مولف

گرفتم کز حریفان پیش یا کم بتوان گفتن ۔۔۔ ز دستت تا چہ آمد آخر اینہم بتوان گفتن

---

[1] دیکھو مقدمہ ابن خلدون فصل نوکی فصل ۳۵ ھ، [2] حسن المحاضرہ جلد ثانی ص ۱۰۱،

ملا نظام الدین علیہ الرحمۃ

بانی درسِ نظامیہ

آج تمام ہندوستان مین عربی تعلیم کا جو نصاب ہے، وہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے
لیکن سخت تعجب ہے کہ اکثر لوگون کو معلوم نہین کہ یہ نصاب کب بنا؟ اور کس نے بنایا؟ حال کی
ایک تصنیف مین اس کو نظام الملک وزیرِ دولتِ سلجوقیہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے، پرانے تعلیم یافتہ
اس قدر جانتے ہین کہ اس کے بانی ملا نظام الدین صاحب لکھنوی ہین، لیکن اس سے زیادہ
ان کو بھی واقفیت نہین،

ملا نظام الدین صاحب جس رتبہ کے شخص تھے، اور خصوصاً اس نصاب کے قائم کرنے
سے ان کو جو شہرت حاصل ہوئی، اس کے لحاظ سے مین ایک مدت سے اس بات کا آرزومند تھا
کہ ان کے مفصل حالات دریافت کرون، لیکن چونکہ ہمارے ملک مین بیوگرفی (سوانحعمری) لکھنے
کا طریقہ بہت کم تھا، اس لئے اس آرزو کے پوری ہونے کی بہت کم امید ہو سکتی تھی، میر غلام علی
آزاد نے سبحۃ المرجان مین مختصر طور پر ان کا تذکرہ کیا ہے، جو بالکل ناکافی ہے، بڑے تلاش سے ایک
رسالہ ہاتھ آیا جو مولانا ولی اللہ صاحب فرنگی محلی (محشی صدرا) کی تصنیف ہے، اور خاص ملا صاحب
مرحوم کے حالات مین ہے لیکن اس مین اصلی حالات نہایت کم ہین، البتہ ان کی کرامتون اور

خرق عادات کا ایک بڑا دفتر ہے، وہ اس زمانہ کے کام کا نہیں،

تاہم بمصداق مالا یدرک کلہ لا یترک کلہ، مین ایک مختصر سا خاکہ ان کی سوانحعمری کا ناظرین کے سامنے پیش کرتا ہون،

خاندان کا حال | لکھنؤ کے اطراف مین جو مردم خیز بستیان ہین، ان مین ایک مشہور قصبہ سہالی ہے، جو لکھنؤ سے اٹھائیس میل ہے، یہان مسلمانون کے دو مشہور خاندان آباد تھے، انصاری جو حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی اولاد سے تھے، عثمانی یعنی حضرت عثمانؓ کی اولاد سے، ملا صاحب اسی قصبہ کے رہنے والے تھے، اور انصاری خاندان سے تھے ان کے والد ملا قطب الدین بہت بڑے مستند عالم تھے، اور ان کا حلقۂ درس تمام مشرقی ممالک کا قبلہ گاہ تھا، عثمانیون اور انصاریون مین قدیم سے عداوت چلی آتی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن عثمانی ملا صاحب کے گھر پر چڑھ آئے، اور انکو قتل کر کے گھر مین آگ لگا دی، یہ واقعہ ۱۱۰۳ھ مین پیش آیا، چونکہ وہ بیگناہ قتل کئے گئے تھے، قوم نے ان کو شہید کا لقب دیا چنانچہ کتب علمیہ مین جہان انکا نام آتا ہے، اسی لقب کے ساتھ آتا ہے، ملا قطب الدین صاحب کے چار فرزند تھے، بڑے صاحبزادے اس وقت دلی مین عالمگیر بادشاہ کے دربار سے تعلق رکھتے تھے، شیخ محمد سعید، شیخ محمد اسعد اور ملا نظام الدین مکان پر تھے، ملا قطب الدین صاحب کی شہادت کے بعد یہ لوگ بیکسی کی وجہ سے سہالی سے نکل کر لکھنؤ چلے گئے، لیکن یہان رہنے کا کوئی ٹھکانا نہ تھا، سلطنت تیموریہ کے زمانے مین چونکہ واقعہ نگاری کا صیغہ نہایت وسعت کے ساتھ قائم تھا، اور ملک کا ایک ایک جزئی واقعہ دربار شاہی تک پہنچتا رہتا تھا، لکھنؤ کے واقعہ نگار نے فوراً دربار کو اطلاع دی، اور وہان سے فرمان صادر ہوا کہ ملا صاحب کے صاحبزادون کو فرنگی محل کے محلہ مین ایک قطعہ مکان مع عمارات متعلقہ عنایت کیا جائے، اطلاع کی تاریخ ۱۴ رشعبان ۴۷ جلوس والا مطابق ۱۱۰۵ھ اور فرمان صادر ہونے کی تاریخ

۱۱ شوال ۳۳؁ جلوس والا ہے، اس فرمان کی کچھ عبارت ہم آگے نقل کریں گے،

لکھنؤ میں آباد ہونے کا سبب

ملا نظام الدین صاحب جن کا ہم تذکرہ لکھ رہے ہیں، اس وقت پانزدہ سالہ تھے، اس لئے فرمان میں ان کا نام نہیں ہے، بلکہ ان کے دونوں بڑے بھائیوں کا ہے، یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے، اور میں نے ایک دفعہ لکھنؤ میں اس کی زیارت کی تھی، چنانچہ ہم اس کے ضروری الفاظ اس موقع پر درج کرتے ہیں، پیشانی پر عالمگیر کی مہر ہے،

عالمگیر کا فرمان

اس میں یہ عبارت ہے:-

"درین وقت بمنت اقتران فرمان والاشان واجب الاذعان صادر شد کہ کنجل حویلی فرنگی محل با متعلقات آن واقع بلدہ لکھنؤ مضافات بہ صوبہ اودھ کہ از امکنہ نزولی است برائے بودن شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم، باید کہ حکام و عمال و متصدیان مہمات حال و استقبال و جاگیرداران وکروریان آن را بنام مشار الیہما معاف و مرفوع القلم دانستہ بوجہ من الوجوہ مزاحم و متعرض نشوند، و اندرین باب سند مجدد نہ طلبند" مرقوم غرہ ذیقعدہ سال سی و ہفتم جلوس والا نوشتہ شد

فرمان کی پشت پر جو عبارت ہے، اس کا پہلا فقرہ یہ ہے:-

"شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنجشنبہ ۱۳ شعبان المعظم ۳۳؁ جلوس والا موافق [illegible] مطابق مرداد ماہ برسالہ صدارت و شیخیت پناہ فضیلت و کمالات دستگاہ سزاوار مرحمت و احسان صدر رفیع القدر فاضل خان و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلی میگردد کہ بعرض مقدس معلی رسید کہ شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادت پدر خود قصبہ مذکور را گذاشتہ علاقہ

گردیدند وکدام مکانہا سکونت ندارند الخ"

طالب علمی | جس وقت ملا قطب الدین کا خاندان لکھنؤ میں آباد ہوا، ملا نظام الدین صاحب کی عمر پندرہ برس کی تھی، اور شرح جامی پڑھتے تھے، اگرچہ اس وقت تک اطمینان کی معقول صورت نہیں پیدا ہوئی تھی، تاہم ملا صاحب نے فراغ خاطر کا انتظار نہ کیا اور علوم کی تحصیل جاری رکھی، غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ ملا صاحب نے پورب کا سفر کیا، اور مختلف شہروں میں تحصیل کی، اخیر میں لکھنؤ واپس آکر شیخ غلام نقشبند لکھنوی سے بقیہ کتابیں پڑھیں اور انھیں سے سند فضیلت حاصل کی، لیکن مولوی ولی اللہ صاحب نے جو مستقل رسالہ ان کی سوانحعمری میں لکھا ہے، اس میں لکھا ہے کہ "ابتدائی کتابیں دیوا میں اور اور قصبات میں جا کر پڑھیں لیکن انتہائی کتابیں بنارس میں جا کر حافظ امان اللہ بنارسی سے ختم کیں" فرنگی محل میں آج جو روایت مشہور ہے، وہ بھی اسی کی موید ہے،

فراغ تحصیل کے ساتھ ہی ملا صاحب اپنے والد بزرگوار کے مسند درس پر متمکن ہوئے اور تھوڑے ہی دنوں میں ان کا آستانہ تمام مشرقی ہندوستان کا مرجع بن گیا،

تصوف | علوم ظاہری کی تکمیل سے فارغ ہو کر ملا صاحب نے علوم باطنی کی طرف توجہ کی، اس وقت حضرت شاہ عبد الرزاق صاحب بانسوی کے فیوض و برکات کا تمام ہندوستان میں غلغلہ تھا، ملا صاحب ان کے آستانے پر حاضر ہوئے، اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی، شاہ صاحب موصوف علوم رسمیہ سے ناآشنا تھے، اس لئے تمام لوگوں کو استعجاب ہوا، یہاں تک کہ علمائے فرنگی محل نے علانیہ ملا صاحب سے شکایت کی، ملا صاحب کے تلامذہ میں سے ملا کمال علوم عقلیہ میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے، اور چونکہ بے انتہا ذہین اور طباع تھے، کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ملا صاحب کی بیعت پر دو بدو گستاخانہ عرض کیا، کہ آپ نے ایک جاہل کے ہاتھ

پر کیوں بیعت کی، اس پر بھی قناعت نہ کر کے شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے اور فلسفہ کے چند مشکل مسئلے سوچ کر گئے، کہ شاہ صاحب سے پوچھیں گے اور ان کو الزام دیں گے مشہور ہے کہ شاہ صاحب نے خود ان مسائل کو چھیڑا، اور ملا کمال کی خاطر خواہ تسکین کر دی، چنانچہ اسی وقت ملا کمال اور ان کے ساتھ بہت سے علماء شاہ صاحب کے قدموں پر گرے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی،

شاہ صاحب نے ۱۱۳۶ھ میں رحلت فرمائی، ان کی وفات کے بعد ملا نظام الدین نے ان کے خلیفہ سید اسمٰعیل بلگرامی سے باطنی فیوض حاصل کیے،

بیماری اور وفات، | ملا صاحب کو ابتدا سے قرحہ کا مرض تھا، لیکن کبھی معالجہ کی طرف توجہ نہ کی، اور آخیر عمر میں جبکہ سن شریف ۵۰ برس کو پہنچ گیا، نہایت ضعیف ہو کر صاحب فراش ہو گئے اور زنانخانہ میں رہنے لگے، لیکن چونکہ نہایت کثرت سے لوگ بیمار پرسی کو جاتے تھے، اور بار بار پردہ کرانے میں گھر والوں کو تکلیف ہوتی تھی، ملا احمد عبد الحق صاحب نے عرض کیا کہ حضور اگر دیوانخانہ میں تشریف رکھتے تو بہتر ہوتا، ملا صاحب نے کچھ جواب نہ دیا، دوسرے دن شاہ عبد الغنی صاحب عیادت کو آئے تو ملا صاحب نے یہ مصرعہ:-

"ہر روز بینم تنگ تر سوراخ این غربالہا"

پڑھکر فرمایا کہ اچھا میاں عبد الحق ہی کی مرضی پر عمل کرو، چنانچہ دیوانخانہ میں اٹھکر تشریف لائے اور وہیں وفات کی،

ملا صاحب کی دو بیویاں تھیں، دوسری شادی غالباً اس غرض سے کی تھی کہ پہلی سے اولاد نہیں ہوتی تھی، بیماری کی جب اشتداد ہوا تو زوجۂ اولیٰ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور کہا کہ مجھ سے جو تقصیر ہوئی ہو معاف فرمائیے، فرمایا تم نے کوئی تقصیر نہیں کی، البتہ مجھ سے

یہ گناہ ہوا کہ تمہارے ہوتے دوسری شادی کی، اس جرم کو معاف کردو، تھوڑی دیر کے بعد زوجۂ ثانیہ آئیں اور کہا کہ آپ تو تشریف لئے جاتے ہیں اولاد کو کس پر چھوڑے جاتے ہیں، ملا صاحب کو سخت رنج ہوا حاضرین سے کہا کہ مجھکو اٹھا کر بٹھادو، پھر فرمایا کہ "نظام الدین تو جاتا ہے، لیکن خدا ہمیشہ رہے گا"

تاریخ وفات۔ آخر نویں تاریخ جمادی الاولیٰ روز چہارشنبہ ۱۱۶۱ھ دوپہر دن چڑھے انتقال فرمایا تاریخ وفات یہ ہے، ع

ملک بود بیک حرکت ملک گشت،

عربی مادہ یہ ہے:۔

مال العاشق الی المعشوق

اخلاق وعادات۔ ملا صاحب ابتدا ہی سے نہایت غنی النفس اور متوکل تھے، ان کی علمی شہرت ان کی زندگی ہی میں اس درجہ تک پہنچ گئی تھی، کہ وہ ذرا سی خواہش کرتے تو ہر قسم کا جاہ ومنصب حاصل ہوسکتا تھا لیکن اس طرف توجہ نہ کی تین تین دن کے فاقے ہوتے تھے اور نہایت استقلال کے ساتھ برداشت کرتے تھے، امرا اور اہل دول سے بالکل نہیں ملتے تھے، بلکہ اس قسم کے لوگ خدمت میں حاضر ہوتے تو بے التفاتی ظاہر فرماتے، شیخ غلام مخدوم کا بیان ہے، کہ میں ایک دفعہ ملا صاحب کی خدمت میں حاضر تھا، اور بیماری کی وجہ سے پلنگ پر لیٹا ہوا تھا، اتفاقاً امرا میں سے ایک صاحب ملنے کے لئے آئے، میں نے ان کے لحاظ سے پلنگ پر سے اترنا چاہا، ملا صاحب نے فرمایا کہ "سفید پوشوں کو دیکھکر بدحواس کیوں ہوتے ہو آرام سے لیٹے رہو"

امرائے شاہی میں سے ایک رئیس جو ہفت ہزاری کا منصب رکھتا تھا، ملا صاحب کی خدمت میں اکثر حاضر ہوا کرتا تھا، ایک دفعہ جمعہ کے دن عین نماز کے وقت کہلا بھیجا کہ اگر آپ

ذرا انتظار فرمائیں تو میں بھی حاضر ہو کر حضور کی اقتدار کا شرف حاصل کر سکوں، ملا صاحب نے ایک ذرا دیر انتظار فرمایا، پھر کہا کہ "نماز خدا کے لئے ہے، اہل دنیا کے لئے نہیں ہے،" یہ کہہ کر نماز کے لئے کھڑے ہو گئے،

بے نفسی، لیکن یہ بے نیازی اور بدماغی امرا اور جاہ پرستوں کے لئے مخصوص تھی ورنہ مزاج میں مسکینی اور تواضع تھی، ایک دن ایک ایرانی ابو المعالی نام ملا صاحب کا شہرہ سنکر ملاقات کے لئے آیا، ملا صاحب درس گاہ میں چٹائی پر بیٹھے درس دے رہے تھے، اس نے ایرانی علماء کا جاہ و جلال دیکھا تھا، ملا صاحب کی طرف اس کا خیال نہ جا سکا، لوگوں سے پوچھا ملا نظام الدین کہاں تشریف رکھتے ہیں، آپ نے فرمایا مولانا کا حال تو میں نہیں جانتا، لیکن نظام الدین میرا ہی نام ہے، اس نے چند فقہی مسائل پیش کئے کہ اہل حق (یعنی شیعہ مذہب والوں) کے نزدیک اس کا کیا جواب ہے، ملا صاحب نے اس کا منشا سمجھ کر شیعوں کی روایتوں کے مطابق جواب دیا، نہایت پسند کیا اور کہا کہ انھیں مسئلوں کو اہل ضلالت (سنیوں) کے مذہب کے موافق بیان فرمائیے، ملا صاحب نے سنیوں کی روایتیں بیان کیں، وہ عش عش کر گیا، اور کہا کہ جس قدر سنا تھا اس سے زیادہ پایا،

علماء کی نسبت عام شکایت ہے کہ علمی مباحثات سے ہمیشہ ان کو فخر اور امتیاز مقصود ہوتا ہے، اور اس لئے وہ کبھی حریف کے مقابلہ میں سکوت اختیار نہیں کرتے، لیکن ملا صاحب اس عیب سے بالکل پاک تھے، ایک دفعہ ایک صاحب ان سے بحث کرنے کے لئے تشریف لائے، ملا صاحب نے مسئلہ کی تحقیق بیان فرمائی، انھوں نے اعتراض کیا، ملا صاحب چپ ہو گئے، انھوں نے مشہور کرنا شروع کیا کہ میں نے ملا نظام الدین کو بند کر دیا، ملا صاحب کے تلامذہ کو ناگوار گذرا اور ایک شاگرد نے جا کر ان صاحب کو زور تقریر سے بالکل ساکت کر دیا، ملا صاحب

کو خبر ہوئی تو اس قدر برہم ہوئے کہ اس شاگرد کو حلقۂ درس سے الگ کردیا، اور کہا کہ مین ہرگز یہ نہین پسند کرتا کہ میری وجہ سے کسی شخص کی شہرت اور عزت مین فرق آئے،

تصنیفات، ملا صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہین، مثلاً شرح مسلم الثبوت، شرح منار مسمّٰی بہ صبح صادق، حاشیۂ صدرا، حاشیۂ شمس بازغہ، حاشیہ بر حاشیۂ قدیمیہ یہ تمام کتابین بڑے پایہ کی ہین، اور نہایت دقیق تحقیقات پر مشتمل ہین، لیکن درحقیقت ملا صاحب کی شہرت ان تصنیفات کی وجہ سے نہین بلکہ ان کے طریقۂ درس کے بدولت ہے، ملا صاحب کے زمانہ مین ہندوستان کے تمام اطراف مین بڑے بڑے علما موجود تھے، اور ہر ایک کی الگ الگ درس گاہ قائم تھی، مثلاً ملا محب اللہ بہاری مصنف سلّم و مسلّم متوفی ۱۱۱۹ھ ملا جیون مصنف نور الانوار المتوفی ۱۱۳۰ھ سید عبد الجلیل بلگرامی استاذ غلام علی آزاد المتوفی ۱۱۳۸ھ میر غلام علی آزاد بلگرامی حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی المتوفی ۱۱۷۶ھ لیکن ملا صاحب کے حلقۂ درس سے جس رتبہ کے فضلا پیدا ہوئے، وہ خود ان بزرگون کی ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے، ملا صاحب کے فرزند مولانا عبد العلی کو تمام ملک نے بحر العلوم کا لقب دیا، جو آج تک مشہور ہے، اور درحقیقت ہندوستان کی خاک سے کوئی شخص اس جامعیت کا شروع اسلام سے آج تک نہین پیدا ہوا، ملا صاحب کے دوسرے شاگرد ملا کمال اس پایہ کے شخص تھے کہ مولوی حمد اللہ جنکی شرح سلّم آج نصاب تعلیم مین داخل ہے، انھین کے دامن فیض مین پلے تھے، ملا حسن کو بھی ملا صاحب کی شاگردی کا فخر حاصل تھا،

ملا صاحب کے درس نے اس قدر قبولیت حاصل کی، کہ ہندوستان مین ہر جگہ سلسلہ بہ سلسلہ انھین کے شاگرد نظر آتے تھے، اور لکھنؤ کا فرنگی محل تو علم و فن کا معدن بن گیا، جہان دو سو برس سے آج تک علمی سلسلہ منقطع نہین ہوا، اور سیکڑون اہل کمال پیدا ہو کر پیوند خاک ہو گئے،

ملا مبین، مولانا ظہور اللہ، مولانا ولی اللہ، مفتی محمد یوسف، مولانا عبد الحلیم، مولانا عبد الحی صاحب مرحوم جو ہمارے زمانہ میں موجود تھے، ان کی تصنیفیں تمام ملک میں پھیلی ہوئی ہیں، آج جہان جہان علوم عربیہ کا نام ونشان باقی ہے، اسی خاندان کا پرتو فیض ہے، ہندوستان کے کسی گوشہ میں جو شخص تحصیل علم کا احرام باندھتا ہے، اس کا رخ فرنگی محل کی طرف ہوتا ہے، میں نے ۱۸۹۶ء میں جب ملا نظام الدین کے آستانہ کی زیارت کی اور ان کی درس گاہ کو جو ایک مختصر سا بالاخانہ تھا، دیکھا تو عجب عبرت ہوئی، اللہ اکبر ہمارے ہندوستان کا کیمبرج یہی ہے، یہی خاک ہے جس سے عبد العلی بحر العلوم اور ملا کمال پیدا ہوئے، افسوس اب یہ کعبہ ویران ہوتا جاتا ہے، یادِ رفتگان صرف ایک مقدس بزرگ مولانا نعیم صاحب باقی ہیں، جو عبد العلی بحر العلوم کے پرپوتے ہیں، اور جن کو ہماری سرکار نے شمس العلماء کا خطاب دیا ہے،

درس نظامیہ کی خصوصیات ملا صاحب کے حالات میں سب سے زیادہ قابل توجہ انکا مقرر کردہ نصاب ہے جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، اس نصاب کے خصوصیات یہ ہیں ؛-

(۱) نصاب میں ہندوستان کے علماء کی متعدد کتابیں داخل ہیں، مثلاً نور الانوار، سلم، مسلم، رشیدیہ، شمس بازغہ حالانکہ اس سے پہلے یہاں کی ایک تصنیف بھی درس میں داخل نہ تھی،

(۲) ہر فن کی وہ کتابیں لی ہیں جن سے زیادہ مشکل اس فن میں کوئی کتاب نہ تھی،

(۳) منطق وفلسفہ کی کتابیں تمام علوم کی نسبت زیادہ ہیں،

(۴) حدیث کی صرف ایک کتاب ہے یعنی مشکوٰۃ،

(۵) ادب کا حصہ بہت کم ہے،

اس نصاب میں سب سے زیادہ مقدم خصوصیت جو ملا صاحب کو پیش نظر تھی

یہ تھی کہ قوتِ مطالعہ اس قدر قوی ہوجائے کہ نصاب کے ختم کرنے کے بعد طالب العلم جس فن کی جو کتاب چاہے سمجھ سکے، اس سے کوئی شخص انکار نہین کرسکتا کہ درس نظامیہ کی کتابین اگر اچھی طرح سمجھ کر پڑھ لیجائین تو عربی زبان کی کوئی کتاب لاینحل نہین رہ سکتی، بخلاف درس قدیم کے کہ اس سے یہ بات حاصل نہین ہوسکتی تھی،

اختصار کے لحاظ سے بھی اس نصاب کو نصاب قدیم پر ترجیح ہے، ایک متوسط الذہن طالب العلم سولہ سترہ برس کی عمر مین تمام کتب درسیہ سے فارغ ہوسکتا ہے، چنانچہ علمائے فرنگی محل مین اکثر اتنی ہی عمر مین فارغ ہوجاتے تھے،

اس نصاب کی بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ چونکہ اس مین فقہ کی کتابین بہت کم ہین اور جو ہین ان مین معقولی استدلال سے کام لیا گیا ہے، اس لئے اس نصاب سے وہ تقشف اور ظاہر پرستی اور مذہب کا بیجا تعصب نہین پیدا ہوتا تھا جو سطحی فقہا کا خاصہ ہے، اسی کا اثر ہے کہ فرنگی محل مین جو بڑے بڑے علما پیدا ہوئے، ان مین کسی نے مذہبی مناظرات کی کوئی کتاب نہین لکھی، شیعہ وسنی کا جھگڑا سب سے زیادہ لکھنؤ مین پیدا ہوا، یہان علمائے دین یہ صدا دلی سے بلند ہوئی، اور گو تمام ملک اس ہنگامہ مین مبتلا ہوگیا، اور تھوڑا تھوڑا اعتمد یہ سے قدرتے رجز کی طرح مذہبی پہلوانون کی زبانون پر چڑھ گئے، تاہم علمائے فرنگی محل اخیر تک اس شورش سے الگ رہے، اس نصاب سے اور بانون کے ساتھ ملا نظام الدین صاحب کی انصاف پرستی اور فراخ حوصلگی کا بڑا ثبوت ملتا ہے، علما مین یہ خصلت بہت کم پائی جاتی ہے، کہ ان کو معاصرین کے فضل وکمال کا اقرار ہو، لیکن ملا صاحب نے اپنے معاصر علما کی اس قدر عزت کی، کہ ان کی کتابین درس مین داخل کردین، نور الانوار، سلم، مسلم سب ان کے معاصرین کی تصنیفات ہین، اور درس نظامیہ مین داخل ہین، ملا صاحب کی کسر نفسی اس سے بڑھکر کیا ہوگی، کہ اپنی

کوئی تصنیف نصاب مین داخل نہین کی، حالانکہ ان کا کوئی معاصر ان کی ہمسری نہین کرسکتا،

اس موقع پر یہ بتادینا بھی ضرور ہے، کہ موجودہ درس جو نظامیہ کے نام سے مشہور ہے، دراصل درس نظامیہ نہین ہے، اس مین بہت سی کتابین ایسی اضافہ ہوگئی ہین جو ملا نظام الدین صاحب کے عہد مین موجود بھی نہ تھین، مثلاً ملا حسن، حمد اللہ، حاشیہ غلام یحییٰ، قاضی مبارک اگرچہ ہمارے نزدیک ضروریات زمانہ کے لحاظ سے درس نظامیہ مین بہت کچھ ترمیم و اضافہ کی ضرورت ہے، لیکن اس مضمون مین ہم اس بحث کو نہین چھیڑتے اور اسی تحریر پر بس کرتے ہین،

(معارف علی گڑھ فروری سنہ ۱۹۱۰ء)

درسِ نظامیہ[1]

فرنگی محل یا نظامیہ جنڈم

یا ہندوستان کا کیمبرج

ہماری قدیم طرزِ تعلیم اور آج کل کی مغربی تعلیم میں اس قدر فرق ہے کہ چند روز کے بعد لوگوں کو قدیم تعلیم کی صحیح تصویر ذہن نشین کرانی مشکل ہو گی، جس طرح آج سلطنتِ تیموریہ کے اصولِ حکمت اور طریقۂ انتظام کا خاکہ لوگوں کے ذہن میں نہیں آتا، ایک شاندار عظیم الشان عمارت، ماہرانِ فن کا ایک گروہ، لکچروں کا ایک سلسلہ، چند محدود گھنٹے (جس کے بعد وہ عمارت قالب بیجان رہجاتی ہے) یہ چیزیں یکجا ہو جائیں تو یہ ایک یونیورسٹی یا کالج ہے لیکن قدیم اصطلاح میں کالج ایک شخص کے وجود خاص کا نام تھا، وہ جہاں بیٹھ جاتا تھا کالج بن جاتا تھا، اس کے گرد مستفیدوں کی ایک جماعتِ کثیر جمع ہو جاتی تھی، اس کے فیض کا بادل ہر وقت برستا رہتا تھا، دن رات جس وقت جو کچھ بولتا تھا علمی لکچر ہوتا تھا، اس کے حرکات سکنات نشست برخاست، وضع قطع، طور طریقے سب خاموش عملی لکچر تھے

---

[1] اس مضمون کی ماخذ حسب ذیل کتابیں ہیں (۱) رسالہ قطبیہ در حال ملا قطب الدین شہید از ملا عبد الاعلی فرزند مولوی عبد العلی بحر العلوم (۲) اغصان اربعہ مولوی ولی اللہ فرنگی محلی (۳) عمدۃ الوسائل مولوی ولی اللہ صاحب موصوف (۴) العصد در حال ملا قطب الدین و شاہ عبد الرزاق بانسوی (۵) اغصان الانساب مصنفہ رضی الدین محمود انصاری تصنیف سنہ ۱۲۶ ہجری کی۔ اس موقع پر مجھ کو جناب مولوی عبد الباری کا شکریہ ادا کرنا بھی فرض ہے جنھوں نے یہ کتابیں مجھ کو دیکھنے کیلئے عنایت کیں

شاگردون کا سلسلہ درسلسلہ پھیلتا جاتا تھا یہانتک کہ چند دن کے بعد یہ ذی روح کالج یونیورسٹی یا جامعۂ اعظم بنجاتا تھا، آج لوگ کالج کی طرف منسوب ہوتے ہین مثلاً اکسن لیکن اس زمانہ مین شخص کی طرف منسوب ہوتے تھے نظامیۂ بغداد سے ہزارون ارباب کمال تعلیم پاکر نکلے لیکن اسماے رجال مین جہان کہین انکا حال لکھا جاتا ہے، نظامیہ کا نام نہین آتا بلکہ ان اساتذہ کا آتا ہے جن سے انھون نے تعلیم پائی تھی، آج کل کی یونیورسٹیان یا کالج صرف بڑے بڑے شہرون مین قائم کیے جا سکتے ہین، لیکن اس وقت کے ذی روح کالج ہر قصبہ، ہر گاؤن، ہر جھونپڑے مین قائم ہو سکتے تھے دلی اور لکھنؤ پایۂ تخت تھے لیکن علمی فیض رسانی مین سہالی دیوا گوپامئو بلگرام جیسے دیہات ان دارالسلطنتون سے ہمسری کا دعویٰ کر سکتے تھے۔ ملا نظام الدین جنکے پرتو فیض سے آج تمام ہندوستان روشن ہے، ملا محب اللہ بہاری جن کے سلم اور مسلم نے آدھا حصہ درس کا دبا لیا ہے قاضی مبارک جنکی تصنیف کا سمجھنا منتہاے استعداد سمجھا جاتا ہے، یہ اہل کمال انھین دیہات نے پیدا کیے تھے،

اس قسم کے زندہ کالج اگرچہ ہندوستان کے ہر گوشہ مین موجود تھے، لیکن نسبتہً اودھ کا صوبہ تمام اور صوبہ جات سے ممتاز تھا، اس صوبہ مین دس دس پانچ پانچ میل پر شرفا اور نجبا کے دیہات آباد تھے جنمین اچھے اچھے نامور فضلا درس دیتے تھے، اور دور دور سے تحصیل علم کے لئے طلبہ آتے تھے، سلاطین وقت کی طرف سے ان درسگاہون کے لئے دیہات معافی تھے، مولوی غلام علی آزاد نے مآثر الکرام مین اس واقعہ کو تفصیل سے لکھا ہے، ہم اس موقع کا اقتباس نقل کرتے ہین:۔

"اگرچہ جمیع صوبہ جات ہند بوجود علماے علم تفاخر دارند اما صوبہ اودھ والہ آباد خصوصیتے دارد کہ در ہیچ صوبہ نتوان یافت، چہ در تمام صوبہ اودھ واکثر صوبہ الہ آباد بفاصلہ پنج کروہ

نہایت دہ کردہ آبادی شرفا، و بجا رہست کہ از سلاطین و حکام، وظائف و زمین مدد معاش داشتہ اند و مساجد و مدارس و خانقاہات بنا نہادہ و مدرسان عصر در ہر جا ابواب علم بر روے دانش پژوہان کشادہ و طلبۂ علم خیل خیل میروند، و ہر جا موافقت دست بہم دادہ بتحصیل مشغول میشوند و صاحب توفیقان ہر معمورہ طلبۂ علم را نگاہ میدارند، و خدمت این جماعہ را سعادت عظمیٰ میدانند صاحبقران ثانی شاہجہان انار اللہ برہانہ می گفت پورب شیراز مملکت ماست[1]"

یہ نظام ۱۱۳۰ھ تک قایم رہا جب برہان الملک سعادت خان نیشاپوری اودھ کے صوبہ دار ہوئے، تو تمام معافیان ضبط کرلین، علماء و فضلاء کی اولاد کسب معاش کی ضرورت سے پڑھنا پڑھانا چھوڑ کر سپہگری مین مصروف ہوئی، مدرسے ویران ہوگئے اور علمی صحبتین درہم برہم ہوگئین ۱۱۵۹ھ مین الہ آباد کا صوبہ بھی اس خاندان کے قبضہ مین آگیا اور صفدر جنگ صوبہ دار مقرر ہوئے، انھون نے رہی سہی معافیان بھی ضبط کرلین، احمد شاہ کے زمانہ مین صفدر جنگ کو وزارت ملی، ان کے نائب نے وظیفہ دارون کو اور بھی زیادہ تنگ پکڑا اور اس طرح وہ تمام علمی بستیان اجڑ گئین[2]،

غرض انھین زندہ کا بجون مین ایک سہالی بھی تھی، جس نے آگے چل کر فرنگی محل کا قالب اختیار کیا، یہ لکھنؤ سے ۳۲ میل پر ایک چھوٹا سا گاؤن ہے جو کسی زمانہ مین بہت بڑا قصبہ تھا، درس نظامیہ کا سنگ بنیاد اسی سرزمین پر رکھا گیا،

درس نظامیہ ہندوستان کی علمی تاریخ اور علمی زبان کا سب سے زیادہ نمایان نقطہ ہے، ہندوستان مین آج کلکتہ سے پشاور تک جس قدر تعلیمی سلسلے پھیلے ہوئے ہین سب اسی درس کی شاخین

[1] کتاب مذکور تذکرہ ملا نظام الدین ص ۲ یہ پوری تفصیل مآثر الکرام مین ہے،

ہیں، کوئی عالم عالم نہیں مانا جا سکتا جب تک ثابت نہ ہو کہ اس نے اسی طریقہ درس کے موافق تعلیم حاصل کی ہے، جس طرح کھوٹا سکہ ٹکسال باہر کہلاتا ہے، اسی طرح کسی کتاب کا درس نظامیہ سے خارج ہونا اس بات کی شہادت ہے، کہ وہ نصابِ تعلیم میں داخل ہونے کی قابلیت کا دعوی نہیں کر سکتی، درس نظامیہ اگرچہ خاص ہندوستان کا کارنامۂ فخر ہے لیکن نظام الملک نے بغداد میں جو مدرسۂ عظیم نظامیہ کے نام سے قائم کیا تھا، اس کی عالمگیر شہرت نے اس قدر دست درازی کی کہ اس سلسلہ کو بھی اس کے فہرستِ اعمال میں داخل کرنا چاہا، چنانچہ ہمارے زمانہ کے اکثر ناواقفون کو دھوکا ہو گیا، یہان تک کہ ایک اردو تصنیف مین بصراحتہ یہ دعوی کیا گیا،

درس نظامیہ اگرچہ ملا نظام الدین صاحب کی طرف منسوب ہے، لیکن درحقیقت اسکی تاریخ ایک پشت اوپر سے شروع ہوتی ہے یعنی ملا نظام الدین کے والد جنکا نام ملا قطب الدین شہید تھا، اور اس لئے ان علمی لحون کے طغراوی قرار پا سکتے ہین، تمام ہندوستان مین بالکل انصاف یہ ہے کہ تمام دنیا ے اسلام مین یہ بات صرف اسی مقدس ذات کو حاصل ہو کہ پورے دو سو برس تک متواتر اور بلا فصل ان کی نسل سے علما پیدا ہوتے چلے آئے اور آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے، ہندوستان کی علمی تاریخ مین یہ بات بھی لحاظ کے قابل ہو کہ اس ملک مین تاریخ اور رجال کا مذاق کم تھا لیکن اس سلسلہ نے خاص اپنے خاندان کا حال اس استقلال کیساتھ لکھا کہ اس کی نظیر نہین مل سکتی، چنانچہ ہم کو اس مضمون کے لکھنے مین تاریخی معلومات کی حیثیت سے کوئی دقت نہین پیش آئی،

اسلام جب عرب سے نکل کر دور دور ممالک مین پھیلا تو اکثر عرب کے خاندان ہجرت کر کے ان ممالک مین چلے آئے، ان مین سے حضرت ابو ایوب انصاریؓ کی نسل سے ایک

بزرگ ہرات میں آئے اور یہاں سکونت کی، ان کے خاندان سے ایک بزرگ علاء الدین انصاری ہندوستان آئے، چنانچہ اُن کا مزار قصبہ برناوہ میں ہے جو دلّی اور متھرا کی راہ میں واقع ہے، ان کی نسل سے شیخ **نظام الدین** سہالی میں آئے، شیخ موصوف نے یہاں مستقل سکونت اختیار کی اور درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا،

شیخ نظام الدین کے پر پوتے شیخ حافظ نے علم و عمل میں زیادہ شہرت حاصل کی، یہ شہنشاہ اکبر کا زمانہ تھا، تیموری حکومت کی یہ خصوصیت اس کے کارناموں کا طغرائے زرین ہے کہ تمام ملک میں چپہ چپہ پر واقعہ نویس موجود تھے، جن کے متعلق یہ خدمت بھی تھی کہ ارباب کمال کے وجود سے بادشاہ کو اطلاع دیتے رہتے تھے، چنانچہ خبر ہونے کیساتھ ان لوگوں کی جاگیریں مقرر ہوجاتی تھیں، جن کی مالگذاری ان کے لئے معاف ہوجاتی تھی، اس قسم کے بیشمار فرامین شاہی خود ہماری نظر سے گذرے ہیں، غرض، شیخ حافظ کی بھی جاگیر مقرر ہوگئی، اور اس کے متعلق فرمان شاہی عطا ہوا، یہ فرمان اب تک اس خاندان میں موجود ہے، اور اس میں (جیسا کہ مولوی ولی اللہ صاحب نے اغصان اربعہ میں لکھا ہے) شیخ کی نسبت نہایت تعظیمی الفاظ مذکور ہیں، شیخ موصوف کی درسگاہ میں طلبہ کی سکونت کا انتظام تھا جن کے مصارف کا تکفل خود شیخ کی طرف سے کیا جاتا تھا،

ملا **قطب الدین شہید** انھیں شیخ حافظ کی نسل سے چوتھی پشت میں تھے، درس **نظامیہ** کی اصلی بنیاد انھیں سے شروع ہوتی ہے، ملا صاحب کے والد لاہور کے مدرسہ میں مدرس تھے، ملا صاحب نے اسی زمانہ میں ان سے تعلیم پائی، ان کے علاوہ

---

[1] یہ تین بھائی ساتھ آئے تھے ایک نے ان میں سے پانی پت میں قیام کیا، چنانچہ پانی پت کے انصاری انھیں کے خاندان میں سے ہیں، (رسالہ قطبیہ) اس بنا پر مولانا حالی، اور علماے فرنگی محل ہم نسب ہیں،

قاضی گھانسی سے علوم حاصل کئے جو بہت بڑے صوفی اور حضرت محب اللہ الہ آبادی کے خلیفہ اور جانشین تھے اس زمانہ میں قصبہ دیوا جو لکھنؤ کی نواح میں ہے مولانا عبدالسلام کے درس کی وجہ سے علم وفضل کا مرکز تھا، ملا صاحب نے وہاں بھی جاکر علم کی تحصیل کی، مولانا عبدالعلی بحرالعلوم کے خلف اکبر مولوی عبدالاعلیٰ اپنے رسالۂ قطبیہ میں لکھتے ہیں کہ "ان کی تصنیفات میں سے صرف شرح حکمۃ العین کا حاشیہ اور رسالۂ امور عامہ کے مسودہ کے کچھ اجزا میرے والد کے کتبخانہ میں موجود ہیں، تلویح کا حاشیہ بھی ملا نظام الدین کے زمانہ تک موجود تھا مگر اب مفقود ہے"

ملا صاحب کا معمول یہ تھا کہ دن کو درس دیتے تھے، شب کو عبادت میں مصروف ہوتے تھے، اور سہ شنبہ اور جمعہ کے دن تصنیف کرتے تھے[1]

ملا صاحب کے فضل وکمال کا شہرہ ہوا تو عالمگیر نے ان سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی لیکن ملا صاحب نے اپنے اسلاف کے طریقہ کے موافق گوشۂ عزلت کا چھوڑنا گوارا نہ کیا،[1]

ملا صاحب نے درس کا ایک خاص طریقہ اختیار کیا تھا جو خود ان کا قایم کردہ تھا، وہ ہر فن کی صرف ایک جامع اور مستند کتاب پڑھاتے تھے، کہ شاگرد کو تمام مسائل پر مجتہدانہ عبور ہوجاتا تھا، رسالۂ قطبیہ میں ہے،

"مولانا ے شہید (ملا قطب الدین) از ہر فن یک یک کتاب میخوانیدند و شاگردان محقق می شدند"

ملا نظام الدین اور مولانا بحرالعلوم نے اس پر اضافہ کیا، چنانچہ تفصیل آگے آتی ہے

---

[1] رسالۂ قطبیہ از مولانا عبدالاعلیٰ در حال ملا قطب الدین شہید سہالوی گلزار انوار ۲۰

ملا صاحب کے حلقۂ درس نے نہایت وسعت حاصل کی، اور سلسلۂ تلامذہ میں ایسے علما پیدا ہوئے جن کے الگ الگ حلقۂ درس ہو گئے اور تمام ہندوستان پر چھا گئے، ان میں سے چار شخص نہایت نامور ہیں، ملا نظام الدین جن کے نام سے درس نظامیہ مشہور ہے، ملا محب اللہ بہاری جو بیک واسطہ ملا صاحب کے شاگرد ہیں، اور جن کی تصنیف سلم اور مسلم اس قدر مقبول ہوئی کہ آج علما کا سرمایۂ کمال یہی کتابیں اور ان کی شرحیں ہیں، مولوی امان اللہ بنارسی جو ملا نظام الدین کے استاد تھے اور جن کی اصول فقہ میں ایک معرکہ آرا تصنیف ہے، قطب الدین شمس آبادی جو ملا محب اللہ بہاری کے استاد تھے،

ملا صاحب کی شہادت | ملا قطب الدین کی شہادت اگرچہ ایک اہم واقعہ ہے لیکن سخت تعجب ہے کہ رسالۂ قطبیہ، اغصان اربعہ اور سبحۃ المرجان ان سب کتابوں میں اس واقعہ کو نہایت اجمال سے لکھا ہے، اس لیے ہم عمدۃ الوسائل اور گلزار انصار سے اس کی تفصیل لکھتے ہیں، اگرچہ پچھلی کتاب ایک معمولی درجہ کی تصنیف ہے،

قصبہ سہالی کے آس پاس خانزادے رہتے تھے، ان سے اور چودھری محمد آصف سے جو سہالی کے زمیندار اور ملا صاحب کے ابن العم تھے ہمیشہ سرحدی جھگڑے رہتے تھے، ملا صاحب کی شادی چودھری محمد آصف کی لڑکی سے ہوئی تھی، اس تعلق سے خانزادوں کو ملا صاحب سے بھی عداوت ہو گئی، تاہم چونکہ ملا صاحب کی عزت دربار شاہی میں بھی تھی یہ لوگ کچھ جرات نہیں کر سکتے تھے، سوء اتفاق یہ کہ خود سہالی میں عثمانی خاندان کے جو شیخزادے تھے، ان سے اور چودھری محمد آصف سے، موضع بلہرن کی آبپاشی کے متعلق نزاع ہو گئی اہل شہر ان جزئیات کی وقعت نہیں کر سکتے، لیکن ہم دیہات والے ان مہمات کو ایران و توران کے معرکوں سے کم نہیں سمجھتے، غرض دونوں طرف سے بڑے زور کی تیاریاں

ہوئیں لیکن ملّا صاحب نے جاکر بیچ بچاؤ کیا، اور دونوں طرف کی فوجیں واپس گئیں،
موقع پاکر خانزادے کئی سو آدمی کے ساتھ سہالی میں آئے اور عثمانیوں کو جاکر بھڑکایا
کہ ہم ساتھ ہیں آپ حملہ کیجئے، سب ملکر چودھری محمد آصف کے گھر پر چڑھ آئے چودھری
صاحب ملّا صاحب کے مکان پر بتقریب ولادت کی مبارکباد دینے گئے تھے ظالموں نے
جاکر ملا صاحب کے گھر کا محاصرہ کرلیا، دیواروں میں نقب لگاکر گھس گئے، ایک نازک
اور کمزور جسم کے لئے ہلکا سا ایک وار کافی تھا، لیکن ظالموں نے تمام آلاتِ جنگ استعمال
کئے، پہلے تیر پھر بندوق، اور آخر تلوار کے ساتھ واروں نے مُکرر اس پیکر روحانی کو برباد
کرنا چاہا، اور اپنے اعتقاد کے مطابق کامیاب بھی ہوئے لیکن،

کشتگانِ خنجرِ تسلیم را ہر زمان از غیب جانے دیگر ست

اس واقعہ کی تاریخ روز دوشنبہ رجب ١١٠٣ھ ہے،

ملّا صاحب کے ساتھ چند طلباء نے بھی جو مشغولِ درس تھے وفات پائی، ظالموں
نے خونریزی سے فارغ ہوکر، گھر کا مال و اسباب لوٹا اور ملا صاحب کا ذخیرۂ علمی، جس میں
سات سو کتابیں تھیں جلاکر برباد کردیا، ملا صاحب کی لاش، اور چودھری آصف کا سر
ساتھ لے گئے، تین چار دن کے بعد ملا صاحب کے دونوں ہاتھ کاٹ کر رکھ لئے اور لاش
سہالی بھیجدی، چنانچہ ٢٧ رجب کو نمازِ جنازہ پڑھکر تجہیز و تکفین کی،

اس واقعہ میں ملا صاحب کے صاحبزادوں میں سے تین صاحب موجود تھے، ملا سعید

سلہ یہ تفصیل گلزار الضارت سے ماخوذ ہے، مختصر نامہ میں یہیں ہے بغض ان الالقاب اور رسالہ قطبیہ میں ہے کہ مخالفوں
نے پہلے چودھری آصف کے گھر پر حملہ کیا، وہ ملا صاحب کے پاس اعانت و مشورت کے لئے آگئے، مخالفین
نے تعاقب کیا اور ان کے ساتھ ملا صاحب کو بھی شہید کیا،

ملا نظام الدین، ملا رضا، ملا سعید زخمی ہوئے اور ملا نظام الدین کو اشقیا پکڑ کر بیتے پور لیگئے
لیکن فتحپور اور دیوا کے شرفا نے جاکر نہایت بجاجت اور الحاح سے ان کی رہائی کرائی،
صاحبزادوں نے ایک محضر لکھا جسمین تمام واقعات کی تفصیل لکھی، یہ محضر اب تک موجود ہے
اور اس پر تمام مشہور علما اور رؤسا اور عمال شاہی کے تصدیقی دستخط ثبت ہین، چونکہ اس
محضر مین تمام واقعات اور قاتلون کے نام تفصیل سے درج ہین، اس لئے ہم اسکو بعینہ
نقل کرتے ہین :-

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بحکم آیہ کریمہ لا تکتموا الشہادۃ ومن یکتمھا فانہ آثم قلبہ، سوال میکنیم و گواہی
میخواہیم، باجماعۂ ستم رسیدگان محمد سعید و نظام الدین، و محمد رضا پسران مولوی قطب الدین ساکن
قصبہ سہالی سرکار لکھنؤ صوبہ اودھ از قضاۃ اسلام و مشایخ کرام و جمہور انام برین معنیٰ
کہ بر اصاغر و اکابر این دیار روشن و ہویداست کہ مولوی مذکور موصوف بکمالات نفسانیہ و فضائل
علمیہ و عملیہ و حافظ قرآن مجید بودند و غیر اشتغال تدریس و تکرار با طلبۂ علوم دینیہ و عبادت
و طاعت کارے نداشتند، و در اوقات فراغ از درس و عبادت، بہ تصنیف در علم تفسیر
و حدیث و فقہ و اصول می پرداختند، بتاریخ رجب المرجب سنہ ۱۱۱۵ھ مطابق روز دوشنبہ
بر عادت قدیمہ از نماز فجر و وظائف فراغ اندوختہ در مدرسہ آمدہ بدرس جمیعے از فضلائے حاضر مجلس
مشغول شدند، چون دو گھڑی روز برآمد اسد اللہ و باقر و پیر محمد سکنۂ روضہ محلہ پرگنہ سہالی
و نور و غلام محی الدین بساون و سہاون ساکنان قصبہ سہالی و فقیر اللہ متوطن قصبہ دیوا و انور ساکن استی معمولہ
پرگنہ بجنور وغیرہ زمینداران گرد و پیش خانۂ مولوی را محاصرہ نمودند و از ہر چہار طرف دیوار
نقبہا زدہ اندرون در آمدند و مولوی را یک زخم تیر و یک زخم تفنگ و ہفت ضرب شمشیر بر

رو رسانیده شهید ساختند و شیخ غلام محمد نبیره زبدة الاولیا ربندگی شیخ نظام الدین ساکن
امیٹھی و دیگر شیخ شرف الله ساکن سندیله که بخواندن فاتحة الفراغ درخدمت بودند نیز از دست
ظلمه مذکورین شهید شدند و محمد آصف چودهری پرگنه سهالی که برلے مدد مولوی رسیده با همراهیان
خود شهید شدند، بنده محمد سعید و جمع از طلبه و شیخ فضل الله برادر نائب قاضی عبد الله
قاضی پرگنه سهالی وغیره زخمی شدند پس از آنکه ظلمه مذکورین از قتل و نکل فارغ شدند به نهب بر
اموال دامتعه که در حویلی بود پرداختند چنانچه اثرے ازان نگذاشتند و کتب مولوی وغیره از
مردم که قریب بهصد جلد مجتمع بود اکثرے ازان آتش داده سوختند و در آن میان مصحف مجید
چهار جلد و مشکوة وغیره از کتب حدیث و مصنفات مولوی حاشیه تلویح و شرح عقائد نسفیه
و تعلیقات بزدوی و حاشیه مطول وغیره کتب که کثیر الحجم مشتمل بر فوائد جمیله بودند همه سوخته شد
و مهر را برداشته بردند با مستوران مولوی و برادران با نواع هتک حرمت پیش آمدند از ان
بر رضا نیز شیخ حسام الدین برادر عمزاد حقیقی مولوی وغیره برادران و مردم غربا سکنه قصبه سهالی
بر ریختند، مال و متاع هرچه بود بغارت بردند، چون وقت دو پهر از کار بائے مسطور فارغ شدند
و مراجعت بمسکن خود که موضع بینتے پور محموله پرگنه فتحپور دلوا وغیره باشد نمودند، بنده نظام الدین
پسر خورد مولوی را اسیر کرده همراه گرفتند، و نعش مولوی و سر محمد آصف چودهری نیز با خود با
بموضع مذکور بردند، بعد از سه چهار روز از الحاح و عجز بعضے شرفا فتحپور و دیوانیده نظام الدین
را خلاص نمودند، و سر محمد آصف دادند و نعش مولوی را جا بجا مدفون میکردند و می بر آوردند،
آخر بعد شدرو زیر دو دست بریده گرفتند و نعش به قصبه سهالی فرستادند، چنانچه جمهور مسلمین نماز جنازه
خوانده بتاریخ بست و هفتم شهر مذکور در قصبه سهالی مدفون ساختند،"

تذکرون مین دشمنون کی مخالفت کی کوئی خاص وجه ملا صاحب سے نہین ہے، اگر

صرف آصف جودھری کی پناہ گزینی، ایسی بیرحمی اور سفاکی کا سبب نہین ہو سکتی، عمدۃ الوسائل مین لکھا ہے کہ مخالفین اپنی زمینداری مین نہایت ظلم کرتے تھے، اور چونکہ عالمگیر ملا قطب الدین سے بہت راہ و رسم رکھتا تھا، اور امراے دربار کو ان کی خدمت مین بھیجا رہتا تھا، اس لئے انھون نے سمجھا کہ ہمارے مظالم، بادشاہ تک پہنچ جائین گے، ملا سعید یہ محضر لیکر عالمگیر کے پاس دکن گئے، عالمگیر نے عمال کے نام فرمان بھیجا کہ قاتلون سے قصاص لیا جائے اور ان کا خانمان برباد کر دیا جائے[1]، چنانچہ صوبہ دار لکھنؤ نے سرکاری سپاہ بھیجکر ان کا گھر بار غارت کر دیا، مخالفین بھاگ کر جلا وطن ہو گئے، اور بالآخر خاندان والون نے جعلی فوتی نامہ بنا کر عالمگیر کے دربار مین پیش کیا کہ قاتل مر گئے، اصل قاتل اسد اللہ تھا، جو موضع بنتی پور کا رہنے والا تھا، وہ گو روپوش ہو کر بچ گیا، لیکن مدت تک زندہ رہا، چنانچہ ملا نظام الدین (پسر ملا قطب الدین شہید) کی خدمت مین حاضر ہوا کرتا تھا، اس نے ملا صاحب کی خدمت مین خون بہا بھی پیش کیا، لیکن انھون نے قبول کرنے سے انکار کیا، بلکہ اپنا حصہ معاف کر دیا، تاہم خون کا یہ اثر تھا کہ جب وہ ملا صاحب کی خدمت مین حاضر ہوتا تھا، تو آپ اس کی طرف سے منہ پھیر لیتے تھے[2]، مولوی ولی اللہ صاحب عمدۃ الوسائل مین لکھتے ہین کہ مین نے ۱۲۰۹ھ مین بنتی پور جا کر دیکھا تو ویران اور تباہ تھا، اور گاؤن والے کہتے تھے کہ یہ اسی خون ناحق کی سزا ہے،

عالمگیر نے ملا قطب الدین کے صاحبزادون کے رہنے کے لئے فرمان کے ذریعہ سے لکھنؤ مین دو مکان عنایت کئے، یہ فرمان اب تک اس خاندان مین موجود ہے اور ہم اس کے جستہ جستہ حصے نقل کرتے ہین :-

---

[1] اغصان اربعہ مطبوعہ مطبع کارنامہ لکھنؤ، [2] رسالہ قطبیہ،

"درین وقت میمنت اقتران والا شان واجب الاذعان صادر شد که کمیز ل حویلی فرنگی محل باستعلقهٔ آن واقع بلدهٔ لکھنؤ مضاف بصوبہ اودھ که از امکنۂ نزولی ست برائے بودن شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید حسب الضمن مقرر فرمودیم باید که حکام و عمال و متصدیان مہمات حال واستقبال وجاگیر داران وکرودیان آنرا بنام مشارٌ الیہما معاف و مرفوع القلم دانسته بوجہ من الوجوہ مزاحم ومتعرض نشوند و درین باب سند مجدد نہ طلبند۔ مرقوم غرہ ذیقعدہ سال سی وہفتم جلوس والا نوشتہ شد۔"

فرمان کے پشت پر جو عبارت ہے، اس کا پہلا فقرہ یہ ہے:۔

"شرح یادداشت واقع بتاریخ روز پنجشنبہ ۱۴ ر شعبان المعظم ۳۷ جلوس والا موافق ۱۱۰۵ھ مطابق فرداد ماہ برسالہ صدارت و مشیخت پناہ فضیلت وکمالات دستگاہ سزاوار مرحمت واحسان صدر رفیع القدر فاضل خان و نوبت واقعہ نویسی کمترین بندگان درگاہ خلائق پناہ حسام الدین حسین قلمی می گردد، که بعرض مقدس ومعلی رسید که شیخ محمد اسعد و محمد سعید پسران ملا قطب الدین شہید ساکن قصبہ سہالی بسبب شہادت پدر خود قصبہ مذکور را گذاشته جلاء وطن گردیدند و کدام مکان ہا سکونت ندارند الخ۔"

ملا صاحب کی شہادت ۱۱۰۳ھ میں ہوئی اور فرمان کی تاریخ تحریر شعبان ۱۱۰۵ھ ہے چونکہ عالمگیر اس زمانہ میں دکن میں تھا، اس لئے ملا سعید کو وہاں پہنچنے اور حکم صادر ہوتے ہوتے دو برس کا زمانہ گذرا، غرض فرمان کے بعد سارا خاندان لکھنؤ میں آگیا، اور فرنگی محل دار العلم والعمل بن گیا،

اس محلہ کی وجہ تسمیہ یہ مشہور ہے کہ فرانس کا ایک سوداگر اس محلہ میں اکثر تجارت کے تعلق سے رہا تھا، وہ وطن چلا گیا، تو اس کے مکانات سرکاری قبضہ میں آگئے اور

ڈہی اسلامی علوم کی یونیورسٹی بن گئی،

بہ بین کرامت تبخانۂ مرا اے شیخ
کہ چون خراب شود خانۂ خدا گردد

ملا صاحب کے چار صاحبزادے تھے، ملا اسعد، ملا سعید، ملا نظام الدین، ملا رضا،

ملا اسعد سب مین بڑے تھے اور بہت بڑے عالم تھے، حاشیہ قدیمہ پر حاشیہ لکھا تھا، ملا جیون سے مناظرہ مین فتح حاصل کی، مزاج امیرانہ تھا، اس لئے دربار مین توسل پیدا کیا، اور ہمیشہ عالمگیر کے ہمرکاب رہتے تھے، شاہ عالم کے زمانہ مین وفات پائی[1]، ملا حسن جو مشہور عالم گذرے ہین، انھین کے پوتے تھے،

دوسرے صاحبزادے ملا سعید باپ کے ساتھ زخمی ہوئے تھے، اچھے ہو کر دکن گئے اور فرنگی محل کی معافی کا فرمان لائے، عنفوان شباب مین وفات کی، ملا احمد عبد الحق جو مشہور صوفی اور مصنف گذرے ہین، انھین کے صاحبزادے ہین، مولوی مبین شارح سلم انھین کے فرزند تھے،

تیسرے صاحبزادے ملا نظام الدین تھے، ان کا حال تفصیل سے آتا ہے،

چوتھے صاحبزادے ملا محمد رضا ملا نظام الدین سے سات برس چھوٹے تھے، یہ بھی بڑے عالم تھے، مسلم پر شرح لکھی، لیکن اخیر مین درس و تدریس کا سلسلہ چھوڑ کر شاہ عبد الرزاق بانسوی کے ہاتھ پر مرید ہوئے اور تارک الدنیا ہو گئے،

ملا نظام الدین کی عمر باپ کی شہادت کے وقت ۱۴ برس کی تھی، اور شرح ملا جامی تک پڑھ چکے تھے، لکھنؤ مین آ کر طالب العلمی مین مشغول ہوئے، ابتدائی کتابین دیوا مین جا کر پڑھین، جو آج حاجی وارث علی صاحب مرحوم کے انتساب سے مشہور ہے،

---

[1] رسالہ قطبیہ،

اور اس زمانہ میں مولانا عبد السلام کا درس گاہ تھا، پھر اکثر کتابیں جا مس میں جا کر ملا علی قلی سے پڑھیں، امور عامہ مولانا امان اللہ بنارسی سے پڑھا، تو شیح کی تحصیل ملا نقشبند گھر گھیورے کی، مولوی غلام علی آزاد سبحۃ المرجان میں لکھتے ہیں کہ آخری کتابیں ملا غلام علی نقشبند سے لکھنؤ میں پڑھیں، یا ند کا انقلاب دیکھو آج جائس اور دیوا معولی دیہات میں ایک زمانہ تھا کہ وہ ملا نظام الدین کے قبلہ مقصد تھے، غرض ملا صاحب نے ۱۴ برس کی عمر میں تمام علوم و فنون سے فراغت حاصل کی،

سلسلۂ تعلیم میں یوں تو سیکڑوں علما پیدا ہوگئے لیکن ملا نظام الدین کے نام کو خدا نے وہ عزت دی کہ آج سب کا نام انھیں کے نام سے روشن ہے، اور ہندوستان کا تمام سلسلۂ درس انھیں کے نام سے منسوب ہے، مولوی غلام علی آزاد مآثر الکرام میں لکھتے ہیں "امروز علمائے اکثر قطر ہندوستان نسبت تلمذ بہ مولوی دارند و کلاہ گوشہ تفاخر می شکنند و کسیکہ سلسلۂ تلمذ بہ او رساند بین الفضلاء بعلم امتیاز می افرازد" وہ علم و فضل کے ساتھ زہد و قناعت، صبر و رضا، تقدس اور ایثار نفس کے مجسم تھے، ان کی تصنیفات بھی کثرت سے ہیں، لیکن یہ بھی ان کا ایثار نفس ہے کہ سلسلۂ درس میں اپنی ایک تصنیف بھی نہیں رکھی، بلکہ اپنے استاد بھائی، ملا محب اللہ بہاری کی کتابیں سلم و مسلم درس میں داخل کیں، جس کی بدولت آج ان کتابوں کا نام آفتاب و ماہتاب کی طرح روشن ہے،

ملا صاحب نے چالیس برس کی عمر میں شاہ عبد الرزاق بانسوی کے ہاتھ پر بیعت کی، اور پھر تصوف کا رنگ ان پر غالب آگیا، ملا صاحب کا بالاخانہ جس پر بیٹھکر درس دیا کرتے تھے آج بھی موجود ہے، میں نے ۱۹۰۹ء میں اسکی زیارت کی تھی، ۹ جمادی الاولی ۱۱۶۱ھ میں سنگ مثانہ کی بیماری میں وفات پائی،

سلہ یہ تفصیل اغصان الانساب میں ہے،

عبد الباسط امیٹھوی نے تاریخ لکھی :-

نظام الدین محمد واصل حق — چو از روے زمین سوے فلک شد
وصال سال تاریخش فلک گفت — ملک بود و بیک حرکت ملک شد[۱]

تصنیفات حسب ذیل ہین :-

شرح منار، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ حاشیہ قدیمیہ، شرح عقائد جلالیہ، شرح مسلم، شرح تحریر الاصول، حاشیہ صدرا،

ملا صاحب نے نہایت زہد و قناعت کی زندگی بسر کی، کبھی کبھی تین تین دن کا فاقہ گذر جاتا تھا، اکثر چنے چاب کر رہجاتے تھے، کبھی اہل دنیا کی طرف توجہ نہ کی، مناظرہ اور مجادلہ جو علمار کا عام طریقہ ہے، اس سے پرہیز کرتے تھے، ان کے طلبہ مین اگر کوئی کسی کو بحث مین الزام دیتا تھا تو اس سے ناراض ہوتے تھے، چونکہ مین نے ملا صاحب کا حال معارف مین تفصیل سے لکھا ہے، اس لئے یہان قلم انداز کرتا ہون،

مولانا عبد العلی بحر العلوم:- ملا صاحب کی پہلی شادی سے کوئی اولاد نہ تھی، لوگ کہتے تھے کہ دوسری شادی کیجئے، فرماتے تھے کہ مین بکھیڑے مین پڑنا نہین چاہتا، ہان کسی بزرگ کا ارشاد ہوگا تو مجبوری ہے، میر اسمٰعیل بلگرامی سے ملا صاحب نے فیض باطنی حاصل کیا تھا، انھون نے کہلا بھیجا کہ مجھ کو الہام سے معلوم ہوا ہے کہ دوسری شادی سے تمھارے اولاد ہوگی، غرض اخیر سن مین قصبہ سنرکھ مین شادی کی جس سے وہ گوہر شاہوار پیدا ہوا جو آج بحر العلوم کے نام سے مشہور ہے،

بحر العلوم نے جنکا اصلی نام عبد العلی ہے، تمام کتابین ملا صاحب ہی سے پڑھین،

---

[۱] رباعی عمدۃ الوسائل مین نقل کی ہے اور شاعر کا نام اغصان الانساب مین لکھا ہے،

اس وقت ان کا سن ۱۷ سال کا تھا، اسی زمانہ مین ملا صاحب نے ان کی شادی قصبہ کاکوری مین کر دی، ملا صاحب کی وفات کے بعد بحر العلوم نے ملا کمال سے استفادہ کیا، جو ملا نظام الدین کے شاگردون مین سب سے ممتاز تھے،

آغاز شباب تھا کہ ایک ناگوار واقعہ پیش آیا، جس کی وجہ سے ان کو وطن چھوڑنا پڑا، تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ سید نور الحسن خان صاحب بلگرامی ایک بزرگ شیعی مذہب تھے، وہ اس زمانہ مین بیمار تھے، اور مولوی محب اللہ صاحب کے مکان پر جو مولوی مبین شارح سلّم کے والد تھے، مقیم تھے، محرم کا زمانہ آیا، تو بیماری کی وجہ سے خود تعزیہ کی زیارت کو نہ جا سکے، اور کہلا بھیجا کہ تعزیہ کو اسی طرف سے لیجائین، تاکہ مین یہین سے زیارت کر لون، مولانا بحر العلوم کا مدرسہ سرِ راہ تھا، اور اتفاق یہ کہ اس وقت مولانا محرم کے تربت پر فاتحہ دے رہے تھے، ان کو معلوم نہ تھا کہ بلگرامی صاحب کے حسب طلب تعزیہ آیا ہے، چونکہ فاتحہ مین مصروف تھے، زبان سے نہ بولے، ہاتھ سے اشارہ کیا کہ ادھر سے راستہ نہین، طلبہ موجود تھے، سمجھے تعزیہ کے توڑنے کا حکم دیا، اٹھ کر تعزیہ توڑ پھوڑ ڈالا، یہ نوابانِ اودھ کا زمانہ اور شیعیت کا زور تھا، غل پڑ گیا کہ مولانا نے بغاوت کی، قاضی غلام مصطفےٰ جو شیعی مذہب تھے، بلوہ عام کر کے مولانا کے گھر پر چڑھ آئے، مولانا نے بھی سیکڑون ہزارون آدمی جمع کر لئے اور مقابلہ کی تیاری کی، یہ سامان دیکھکر قاضی صاحب نے صلح کی درخواست کی اور معاملہ رفع دفع ہو گیا، لیکن یہ محض دفع الوقتی تھی، قاضی صاحب چاہتے تھے کہ بے خبری مین مولانا کو قتل کرا دین، مولانا نے اہلِ خاندان سے مشورت کی، حکومت سے مقابلہ کون کر سکتا تھا، لوگون نے کہا مصلحت یہ ہے کہ آپ کچھ دنون کے لئے ٹل جائین، لیکن مولانا کے احباب نے کہا کہ ملا نظام الدین صاحب کی نشستگاہ سے نکلنا ٹھیک نہین،

آپ یہین رہین ہم لوگ سینہ سپر ہون گے لیکن خاندان کے لوگ خود مولانا کا عروج نہین دیکھ سکتے تھے، اور چاہتے تھے کہ یہ پتھر سینہ سے ٹل جائے، ان لوگون نے کہا آپ اپنے ساتھ ہم کو نہ برباد کرایئے، مولانا کے رفقا اب بھی راضی نہ تھے لیکن مولانا چھپکر گھر سے نکلے، اور شاہجہان پور چلے آئے، یہان حافظ رحمت خان کی حکومت تھی، اس نے بڑی تعظیم و تکریم کی، مولانا نے ۲۰ سال تک یہان قیام کیا[1]،

حافظ رحمت خان نے مولانا کے مصارف کے لئے معقول رقم مقرر کر دی، اور ان کے طلبہ کے وظائف مقرر کرا دیئے، نواب عبد اللہ خان رئیس شاہجہان پور نے قلعہ مین لیجا کر اپنے مکان مین اتارا، دور دور سے طلبہ مولانا کا نام سنکر آنے لگے، اور بہت بڑی درسگاہ قائم ہو گئی، بہت سے لوگ فارغ التحصیل ہو کر نکلے، یہان مولانا نے بہت سی کتابین تصنیف کین،

حافظ رحمت خان نے جب شہادت پائی تو یہ اطراف نواب شجاع الدولہ کی حکومت مین آگئے تو مولانا نے یہان سے نکلنے کا ارادہ کیا، اس زمانہ مین رامپور کی ریاست پر نواب فیض اللہ خان حکمران تھے، وہ خود آکر مولانا کو ساتھ لے گئے، چند روز تک مولانا نے یہان قیام کیا، لیکن نواب موصوف مولانا کے گروہ طلبہ کی کفالت نہ کر سکے، اور مولانا نے یہان سے بھی نکلنے کا ارادہ کیا، اس زمانہ مین منشی صدر الدین خان نے بوہار مین جو کلکتہ کے نواح مین ہے ایک مدرسہ قائم کیا تھا، مولانا کے پاس زاد راہ بھیجکر تشریف لانے کی درخواست کی، مولانا تو شاگردون کے ساتھ بوہار کو روانہ ہوئے، قریب پہنچے تو منشی صدر الدین خان خود استقبال کر کے لائے، چار سو تنخواہ مقرر کی اور مولانا کے تمام شاگردون کے وظائف مقرر کر دیئے،

یہ واقعات اغصان اربعہ سے منقول ہین، لیکن رسالۂ قطبیہ مین ہے، کہ مولانا کو رامپور مین کچھ شکایت کی وجہ نہین پیدا ہوئی تھی، لیکن منشی صدر الدین خان کے سخت اصرار کیوجہ سے

[1] یہ پوری تفصیل رسالۂ قطبیہ مین ہے، اور چونکہ یہ خود مولانا کے خلف اکبر کی تحریر ہے، اسلئے اسکے زیادہ قابل اعتماد اور کوئی شہادت نہین ہو سکتا

مجبور ہوگئے، قطبیہ میں یہ بھی لکھا ہے، کہ منشی صدر الدین خان نے افسران انگریزی کی سفارش بھی نواب فیض اللہ خان کے پاس بھجوائیں کہ وہ مولانا کو ادھر روانہ کر دیں،

بہرحال مولانا نے بوہار میں کچھ زمانہ تک قیام کیا، یہ وہ زمانہ ہے کہ مدراس میں نواب والاجاہ محمد علی خان والی ارکاٹ کی حکومت تھی، وہ خاص قصبۂ گوپامئو کے رہنے والے تھے، اس تعلق سے مولانا کے ہم وطن تھے، مولانا بعض اسباب کی وجہ سے بوہار سے دل برداشتہ ہوگئے تھے، یہ خبر نواب کو پہنچی، فوراً درخواست بھیجی، مولانا بوہار سے روانہ ہوئے، مدراس کے قریب پہنچے تو نواب نے، اعزہ خاندان اور امرائے دربار کو ایک منزل آگے استقبال کے لئے بھیجا، شہر میں داخل ہوئے، تو سب امرا رجلو میں ساتھ ساتھ تھے، ڈیوڑھی کے قریب پالکی پہنچی تو نواب مع تمام مقربین کے پیادہ پا نکلا، مولانا نے پالکی سے اترنا چاہا، نواب نے دوڑ کر پالکی میں کاندھا دیا، اور اسی طرح مکان کے صحن تک لایا، دربار میں جہاں خود اس کی نشست تھی مولانا کو اس جگہ بٹھایا اور مولانا کے قدم چومے اور کہا اللہ اکبر یہ نصیب کہاں تھے کہ حضور کا قدم میرے گھر میں آتا،[1]

اغصان الانساب میں لکھا ہے کہ مولانا بوہار سے اٹھکر پہلے کلکتہ میں آئے یہاں نظام حیدرآباد اور سلطان حیدر (ٹیپو سلطان کا باپ) کی متعدد عرضیاں آئیں کہ یہاں قدم رنجہ فرمائیے لیکن چونکہ ہموطنی کا واسطہ تھا، اس لئے مولانا نے مدراس کو ترجیح دی،

نواب محمد علی خان نے مولانا کو ایک نہایت عمدہ محل رہنے کو دیا، اور روزانہ اپنے باورچیخانہ سے کھانا بھجواتا تھا، جب کبھی مولانا اس کے ملنے کو جاتے تھے تو اسی پہلے دستور کے موافق استقبال اور تعظیم کرتا، چند روز کے بعد ایک بڑا مدرسہ تعمیر کرایا، مولانا کی تنخواہ قرار

[1] یہ پوری تفصیل اغصان اربعہ میں ہے؛

تنخواہ مقرر کی، طلبہ کے وظیفے مقرر کئے، مولانا اب اسی مدرسہ میں طلبہ کے ساتھ رہنے لگے،

نواب محمد علی خان کے مرنے کے بعد ان کے بیٹے عمدۃ الامراء مسند نشین ہوئے خاندان میں مسند نشینی کے متعلق نزاع کا احتمال تھا، لیکن مولانا نے جب ان کو لیجا کر مسند پر بٹھایا تو سب نے گردن اطاعت خم کر دی، عمدۃ الامراء نے باپ سے بھی زیادہ عزت و حرمت کی، مولانا کے علاوہ ان کے خاندان کے لئے الگ ماہوار یں مقرر کیں، عمدۃ الامراء کے مرنے کے بعد لوگوں نے ان کے بیٹے کو مسند نشین کیا، لیکن چونکہ مولانا اس کے عقائد اور مذہب کی طرف سے مطمئن نہ تھے، خود اس رسم میں شریک نہ ہوئے، چونکہ اس نے اہل خاندان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا، لوگوں نے شکایت کی، بالآخر چھ مہینے کے بعد انگریزوں نے اسکو معزول کر دیا اور عظیم الدولہ کو جو نواب محمد علی خان کے بڑے بیٹے تھے، مسند نشین کیا، عظیم الدولہ مولانا کے شاگرد خاص تھے، عظیم الدولہ کی نوابی برائے نام تھی، کیونکہ گورنمنٹ انگریزی نے ملک اس کے قبضہ سے نکال کر روزینہ مقرر کر دیا تھا، لیکن عظیم الدولہ نے مولینا کی ماہوار جاری رکھی،

اب مولانا کی عمر ۹۳ برس کی ہو چکی تھی، اور ضعف غالب آتا جاتا تھا، یہاں تک کہ ۸ رجب ۱۲۳۵ھ میں مرض الموت میں گرفتار ہوئے، چار دن تک یہ حالت رہی کہ کبھی کبھی ہوش آجاتا تھا، پھر غشی طاری ہو جاتی تھی، ہوش کی حالت میں چند بار فرمایا کہ نفی و اثبات کی حقیقت اب معلوم ہوئی، خدا کے سوا کوئی چیز موجود نہیں، ۱۲ رجب کو انتقال کیا،[1]

مولانا کے اخلاق و عادات کی سب سے نمایاں صفت، فیاضی اور دریا دلی تھی،

---

[1] انصاف اربعہ،

ہمیشہ نہایت فارغ البال رہے، لیکن جو کچھ آتا تھا، احباب اور فقرا کو تقسیم کر دیتے تھے، اس وجہ سے اہل و عیال نہایت تنگی سے بسر کرتے تھے، لکھنؤ سے بار بار اپنی عسرت اور تنگ حالی کی شکایت لکھتے تھے، لیکن مولانا کچھ خیال نہیں کرتے تھے، کبھی کبھی نواب کو خبر ہو جاتی تھی تو وہ براہ راست بھیجدیتا تھا،

مزاج میں اپنے والد کے خلاف ادعا اور تمکنت تھی، کسی سے دبتے نہ تھے، مناظرہ کے بہت شایق تھے، ان سے زیادہ سن و سال کے جو علما رہتے تھے، ان سے مباحثہ کرتے تھے لکھنؤ میں جب شیعو ں نے ان کے مقابلہ میں بلوہ کرنا چاہا تو ایک گروہ کثیر ساتھ لے کر مقابل ہوئے، اور آخر حریف کو ہٹ جانا پڑا، تصنیفات میں بھی انداز طبیعت کی جھلک نظر آتی ہے،

مولانا کے تین صاحبزادے تھے، ان کے حالات تفصیل سے لکھے جا سکتے ہیں لیکن یہ مضمون ایک کتاب بنجائیگی،

سلسلۂ نظامیہ کی علمی حالت ایک عام اجمالی نظر

اس خاندان نے علم و فن کے ترقی دینے میں جو جو کام کئے ان کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہے، میں مختصراً بعض اہم باتیں لکھتا ہوں :۔

۱۔ سب سے پہلے یہ کہ اتفاق سے یہ خاندان کثیر الافراد تھا، ملا قطب الدین شہید کے چار صاحبزادے تھے، ان سب سے خاندان پھیلے، اور ہر طبقہ میں کثرت اولاد رہی، مولوی عبد الباری صاحب نے ایک رسالہ آثار الاول نام لکھا ہے، جو شایع ہو چکا ہے، وہ گویا اس خاندان کی انسائکلوپیڈیا ہے، اس میں سیکڑوں بزرگون کے نام اور مختصر حالات لکھے ہیں، ان بزرگون میں اکثر صاحب علم اور صاحب تصنیفات تھے، یہان تک کہ اگر

ان سب کی تصنیفات جمع کیجائین تو ایک کتبخانہ نہ بجائیگا، میرے زمانہ تک جو مشاہیر تلامذہ تھے، ان کے یہ نام ہین، مولانا مفتی محمد یوسف، مولانا نعمۃ اللہ ریاضی دان، مولانا عبد الحلیم مولانا محمد نعیم، مولانا عبد الحی، مولوی فضل اللہ، ان بزرگون کے تلامذہ سیکڑون اور ہزارون سے متجاوز تھے، جنمین بہت سے خود بڑے بڑے سلسلۂ درس کے مالک تھے، خاکسار کو بھی اس سلسلۂ شاگردی کا فخر حاصل ہے،

ہندوستان مین جس قدر اور جہان جہان بڑے بڑے سلسلۂ درس قائم ہوئے اکثر اسی خاندان کا فیض ہے، مثلاً پورب مین محب اللہ بہاری اور غلام یحیٰی بہاری سے علم پھیلا، وہ دونون اسی خاندان کے شاگرد ہین، رام پور ایک زمانہ تک درس گاہ عام تھا، یہ مولانا بحر العلوم اور ملا حسن کا فیض تھا، کیونکہ یہ دونون بزرگ ایک مدت تک یہان رہے تھے، اور ملا حسن نے رام پور ہی مین وفات پائی، نجیب الدولہ نے دارانگر مین جو امروہہ کے قریب ہے، ایک مدرسہ قایم کیا تھا جسمین نہایت کثرت سے طلبہ نے تعلیم پائی، اس مدرسہ کے اکثر مدرسین اسی خاندان کے شاگرد تھے،

بنگال اور مدراس مین جو کچھ علم پھیلا وہ مولانا بحر العلوم کا فیض ہے، کہ ان مقامات مین آپ نے قیام فرمایا تھا، یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ یہ خاندان اگر دنیا کی طرف متوجہ ہوتا، تو جاہ و منصب کی کمی نہ تھی، چنانچہ بعض بعض نے اتفاقاً ادھر کا رخ کیا تو بڑے بڑے عہدے حاصل کئے، مثلاً مولوی غلام یحیٰی اور مولوی غلام محمد صدر الصدور تھے، نور یہ سلسلہ نے حیدر آباد مین نہایت عظمت حاصل کی، لیکن من حیث الاغلب اس خاندان نے علم و فن کو مقصد زندگی قرار دیا، فقر و فاقہ مین بسر کی اور اس مین عمرین گذار دین،

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ہندوستان مین اور جو علمی خاندان تھے، مثلاً دلی مین شاہ ولی اللہ

الہ آباد میں شاہ محمد افضل صاحب کا دائرہ بہار میں ملا محب اللہ جونپور میں ملا محمود جونپوری
بلگرام میں عبدالجلیل بلگرامی غلام علی آزاد یہ سب خاندان دو دو تین تین پشت بیے یاد
نہ چلے، یعنی وہ علمی حیثیت قائم نہ رہی، لیکن فرنگی محل کا خاندان دو سو برس تک ایک حیثیت
سے قائم رہا، اور سیکڑوں علما و فضلا پیدا ہوئے،

۲- آج تمام ہندوستان میں جو نصاب تعلیم جاری ہے، اس میں اکثر کتابیں اسی علمی
سلسلہ کی تصنیفات ہیں، سلم ملا محب اللہ بہاری کی تصنیف ہے، جو ملا قطب الدین کے شاگرد
تھے، اس کی تین شرحیں داخل درس ہیں اور وہ سب اسی خاندان کی یا ان کے شاگردوں کی تصنیف
ہیں، میر زاہد پر غلام یحییٰ کا حاشیہ درس میں داخل ہے، وہ بیک واسطہ ملا کمال کے
شاگرد تھے،

۳- ایک مدت سے درس کا جو طریقہ چلا آتا تھا اس خاندان نے اس کو بدل دیا
اور اس میں مناسب اصلاح کی، اس خاندان سے پہلے ہر فن میں متعدد اور کثرت سے
کتابیں درس میں داخل تھیں، ملا قطب الدین شہید نے یہ طریقہ قائم کیا کہ ہر فن کی صرف
ایک مختصر اور جامع کتاب مقرر کی، ملا نظام الدین نے ایک ایک کتاب کا اضافہ کیا،
یعنی ہر فن کی دو دو کتابیں لیں، اس طرح ایک بڑا طومار کم ہوگیا، مثلاً پہلے منطق میں شرح
مطالع پڑھاتے تھے ملا صاحب نے بجائے اس کے قطبی رکھی جو اس سے بہت مختصر ہے، خاتم
قدیمہ و جدیدہ وغیرہ جس کو ملا فتح اللہ نے ہندوستان میں رواج دیا تھا اب اٹھا دیا،
یہ امر خاص طور پر اظہار کے قابل ہے کہ آج جس چیز کو لوگ درس **نظامیہ** کہتے
ہیں، اور اس نام کی وجہ سے نہایت سختی کے ساتھ اس پر اڑے ہوئے ہیں، اس کا بڑا حصہ
درس نظامیہ سے کوئی تعلق نہیں رکھتا، مثلاً حمد اللہ ملا حسن آج درس میں داخل ہیں،

یہ کتابین ملا نظام الدین صاحب کے زمانہ مین تصنیف بھی نہین ہوئی تھین، قاضی مبارک بھی درس مین داخل نہ تھی، غلام یحیی کا منطق پتہ نہ تھا، اس کے علاوہ متعدد کتابین جو اس وقت درس مین داخل تھین، اب اڑا دی گئین، مولوی عبد العلی خلف اکبر مولانا بحر العلوم نے اپنے زمانہ کا جو سلسلۂ درس بتایا ہے، اس مین شرح حکمۃ العین داخل ہے، حالانکہ آج کل بالکل متروک ہے، اسی طرح انھون نے فن موسیقی کو بھی داخلِ درس رکھا ہے، حالانکہ آج اس فن کا نام لینا بھی گناہ ہے،

درس نظامیہ کا اصول کیا تھا، درسِ نظامیہ مین اصولِ ذیل ملحوظ رکھے گئے،

۱۔ اختصار یعنی ہر فن کی ایک دو مختصر کتابین لے لی گئین،

۲۔ اختصار کے اصول پر اکثر کتابین، ناتمام درس مین رکھی گئین یعنی صرف اس قدر حصہ لیا گیا جو ضروری خیال کیا گیا، مثلاً میر زاہد ملا جلال، صدرا، شمس بازغہ، مسلم، توضیح، ان سب کتابون کے کچھ کچھ حصے درس مین داخل ہین،

۳۔ ہر فن مین وہی کتاب رکھی ہے جو اس فن کی سب سے مشکل کتاب ہے، اس سے مقصد یہ تھا کہ غور کی قوت پیدا ہو جائے کہ پھر جس کتاب کو چاہے دیکھ کر سمجھ سکے،

۴۔ منطق جو پہلے بالکل سادہ تھی، یعنی اس مین کسی اور فن کی آمیزش نہ تھی، ملا محب نے اس مین فلسفہ کے مسائل ملا دیئے، اور اس کا عام انداز بدل دیا، یہ کتاب ملا نظام الدین صاحب نے درس مین داخل کی، پھر ملا صاحب کے شاگردون نے اس پر شرحین لکھین، اور ان مین فلسفہ کا اور زیادہ اضافہ ہوتا گیا، یہ سب کتابین درس مین داخل ہوتی گئین، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج منطق کی بہت سی کتابین پڑھکر بھی منطق نہین آتی، کیونکہ جس کو منطق سمجھتے ہین، وہ منطق نہین بلکہ فلسفہ ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دو عالم جو باہم بحث کرتے ہین، تو انکی

تقریر منطقی قواعد سے بالکل الگ رہتی ہو، اسی طرح اصول فقہ کا فن فلسفہ سے بالکل الگ تھا، ملا محب اللہ نے اسمین بھی فلسفہ کا رنگ پیدا کیا، اور اب اصول بھی گویا فلسفہ ہے،

ہندوستان مین علم و فن کا رواج گو چھ سو برس سے ہے لیکن زیادہ تر منقولات کا رواج تھا، منطق و فلسفہ صرف قطبی تک پڑھاتے تھے، سب سے پہلے مولانا عبد اللہ تلنبی المتوفی سنہ ۹۲۲ھ نے معقولات کی ترویج کی[1] ان کے بعد قطب الدین شہید، اور ان کے خاندان نے معقولات کو ترقی دی، اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ علما مین وہ سختی کم ہو گئی جو فقہا مین عموماً ہوتی ہے، فتاوی عالمگیری مین تکفیر کا باب اٹھا کر دیکھو، اس کے مقابلہ مین مولانا بحر العلوم نے ارکان اربعہ مین امامت کی بحث مین جو کچھ لکھا ہے اس کا مقابلہ کرو، تو زمین و آسمان کا فرق نظر آئیگا،

(الندوہ ج ۷ نمبر ۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۰ء)

---

[1] مآثر الکرام،

ندوہ اور نصابِ تعلیم

ندوہ کے قایم ہونے کی سب سے بڑی ضرورت جو ظاہر کی گئی اور واقعی تھی بھی وہ نصابِ تعلیم کی اصلاح تھی، ندوہ کے مقاصد میں یہ اہم المقاصد تھا اور آج تک ندوہ کے جتنے اجلاس ہوئے اس مقصد کو ہمیشہ نہایت بلند آہنگی سے بیان کیا گیا، لیکن یہ امر بظاہر نہایت تعجب انگیز ہے، کہ پارسال تک جو نصاب جاری تھا، وہ قریبًا وہی قدیم نصاب تھا جو دیوبند وغیرہ میں جاری ہے،

اس کی وجہ بہت بڑی یہ ہے کہ اصلاحِ نصاب کا خیال صرف چند روشن خیال علما کے دل میں پیدا ہوا ہے، باقی تمام لوگ اُسی لکیر کے فقیر ہیں، اور چونکہ فیصلہ عمومًا کثرتِ راے پر ہوتا ہے، اس لئے انھیں بزرگوں کا پلہ بھاری رہتا ہے،

اس سے بڑھکر یہ مشکل ہے کہ مدرسین جو ہاتھ آسکتے ہیں، اسی قدیم نصاب کے تعلیم یافتہ ہیں، اس لئے وہ جدید نصاب (جسمیں قدما کی تصنیفات داخل کی گئی ہیں) کے پڑھانے سے عاجز ہیں، مثلاً مختصر المعانی و مطول ہزاروں دفعہ کی پڑھی پڑھائی ہیں، ان کے بیسیوں حاشیے موجود ہیں، اس لئے ان کا پڑھا لینا ہر کس و ناکس کو آسان ہے، لیکن جدید نصاب میں ان کے بجاے دلائل الاعجاز عبد القاہر جرجانی رکھی گئی ہے، یہ کتاب اگرچہ فنِ بلاغت کی جان ہے، اور مطول وغیرہ سب اس کے خوشہ چین ہیں، لیکن نہ ہمارے مدرسین نے کبھی اس کتاب کو دیکھا تھا، نہ اس پر شرحیں اور حاشیے موجود ہیں؛

اس لئے یہ لوگ اس کے پڑھانے سے عاجز ہین، اور چونکہ اپنی عجز کا تسلیم کرنا کسر شان ہے اسلئے یہ کہتے پھرتے ہین کہ اس قسم کی کتابون سے کافی استعداد پیدا نہین ہوتی، بہرحال سال حال مین یہ قطعی فیصلہ کیا گیا کہ جو کچھ ہو جدید نصاب جاری کر دیا جائے، اس کے اجرا کیساتھ فوراً ایک مدرس صاحب نے استعفا دیا، اور اب اخبارات وغیرہ مین مضامین شایع کئے جارہے ہین کہ جدید نصاب، درس کے قابل نہین، بے شبہہ اس نئے راستہ کے اختیار کرنے مین نہایت مشکلات پیش آئین گی، لیکن اگر ندوہ مین اس قدر بھی ہمت اور حوصلہ نہین کہ وہ ان مشکلات کا مقابلہ کرے، تو اس کو سرے سے اصلاحِ نصاب کا نام لینا نہ چاہئے، یہ سخت بدو یانتی ہے کہ تمام دنیا مین اصلاحِ نصاب کا غل مچایا جائے، اور ایک ذرہ اصلاح نہ کیجائے،

ہم نے اسی خیال سے اصلاحِ نصاب کے متعلق، ایک سلسلہ وار مضمون شروع کیا ہے، جس کا پہلا نمبر آج کے پرچے مین درج ہے؛

نصابِ تعلیم

یہ ایک نہایت اہم سوال ہے کہ ہندوستان مین ہمارے علمی تنزل کا اصلی سبب کیا ہے اس کے مختلف جواب دئیے جاتے ہین،

عام جواب تو یہ ہے کہ تقدیر، لیکن یہ جواب صرف اسی سوال کا نہین، بلکہ دنیا کے تمام سوالون کا جواب ہے، اور ہم کو ایسے جواب کی ضرورت ہے، جس کو اس سوال سے بھی کوئی خاص خصوصیت ہو، بعضوں کا خیال ہے کہ انقلابِ سلطنت لیکن اسلامی سلطنتون کی نسبت کیا کہا جائیگا، خاص قسطنطنیہ مین کم سے کم بیس ہزار طلبا علوم عربیہ کی تعلیم

پاتے ہیں لیکن مدتوں سے ایک شخص بھی صاحبِ کمال نہیں پیدا ہوا، اور سچ یہ ہے کہ مصر و شام و روم کا علمی معیار ہندوستان سے بھی گھٹا ہوا ہے، اس سوال کا صحیح جواب صرف یہ ہے کہ نصابِ تعلیم کا نقص، اس کی تفصیل آگے آئیگی لیکن تفصیل سے پہلے بعض ظاہر اور زود اعتراضات کا ذکر کرنا اور ان کا جواب دینا ضرور ہے،

اس جواب پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اسی نصاب نے عبدالعلی بحرالعلوم حمداللہ محب اللہ بہاری، قاضی مبارک شاہ ولی اللہ، ملا حسن جیسے اشخاص پیدا کئے تھے، اس لئے اگر نصابِ تعلیم کا قصور ہوتا تو اس سے اس درجہ کے کامل الفن کیونکر پیدا ہوسکتے،

اس اعتراض کا سرسری جواب تو یہ ہے کہ جو نصاب اب ہے وہ ان بزرگوں کے زمانہ میں کہاں تھا، شرح سلم حمداللہ، شرح سلم ملاحسن، حاشیہ بحرالعلوم، قاضی غلام یحییٰ، ہدیہ سعیدیہ، وغیرہ یہ کتابیں اس زمانہ میں کہاں تھیں لیکن اس اعتراض کا حقیقی جواب یہ ہے کہ کسی چیز کی خرابی کا اثر عموماً ابتدا میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ یہ اثر پہلے پیدا ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، یہاں تک کہ بالآخر علانیہ ظاہر ہو جاتا ہے، موجودہ نصاب کی خرابی کا اثر پہلے ہی دن شروع ہو گیا تھا جس کی بدیہی دلیل یہ ہے کہ جس دن سے یہ نصاب جاری ہوا عین اسی وقت سے علم کا تنزل شروع ہو گیا جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے یعنی جس درجہ کے علما اس وقت تھے ان کے شاگرد ان سے کم درجہ کے نکلے، شاگردوں کے شاگرد ان سے بھی کم پھر ان سے بھی کم یہاں تک کہ یہ زمانہ آگیا جس میں کمال کا نام و نشان بھی نہ رہا' پہلے طبقوں کا تنزل ہم کو اس لئے محسوس نہیں ہوتا کہ گو وہ لوگ علم و فضل میں اگلوں سے کم تھے، تاہم آج کی حالت کے لحاظ سے نہایت بلند رتبہ تھے، لیکن جب تنزل کی رفتار روز بروز تیز ہوتی گئی اور اب یہ نوبت پہنچی کہ تمام ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے

تک ایک بھی صاحب فن نظر نہیں آتا تو کون شبہہ کر سکتا ہے، کہ یہ نتیجہ اسی تخم کا ثمرہ ہے
جو سو برس پہلے بویا گیا تھا ہم اس دعوی کے ثابت کرنے کے لئے امارات و قراین پر اکتفا
نہیں کرتے، بلکہ قطعی طریقہ سے ثابت کرتے ہیں، کہ موجودہ نصاب تعلیم، نہایت ناقص
اور ابتر ہے، سب سے پہلے ہم کو چند مقدمات اصول موضوعہ کے طور پر ذہن نشین کر لینے چاہئیں
اور وہ یہ ہیں:-

۱۔ تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ نفس فن حاصل کیا جائے،

۲۔ ہر فن کے حاصل کرنے کا یہ عمدہ طریقہ ہے کہ اس کے مسائل کو منفرداً، اور مستقلاً
حاصل کیا جائے تاکہ اس فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے، بجائے اس کے اگر چند فنون کے مسائل
کو مخلوط کر کے حاصل کیا جائے گا، تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہوگی،

۳۔ متعدد علوم و فنون کی تحصیل میں الاقدم فالاقدم کا خیال ضرور ہے یعنی کہ جو فنون
مقصود بالذات ہیں، ان کے حاصل کرنے میں زیادہ وقت صرف کیا جائے، جو مقصود بالعرض
ہیں، ان میں کم، اسی طرح علوم مقصود بالذات میں بھی بلحاظ اہمیت کے فرق مراتب کرنا
چاہئے، یعنی جو علوم زیادہ مہتم بالشان اور ضروری ہیں، وہ زیادہ توجہ کے قابل ہیں،

۴۔ ہر علم کی تحصیل میں سب سے مقدم یہ پیش نظر رکھنا چاہئے، کہ اس فن کی جو غایت
ہے، وہ حاصل ہو،

مذکورۂ بالا اصول کی صحت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا، اب ان اصول کی بناء پر
ہم موجودہ نصاب سے بحث کرتے ہیں،

۱۔ موجودہ نصاب میں اکثر کتابیں ایسی ہیں جنمیں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت
سے لفظی مباحث ہوتے ہیں جنکا مدار کسی کتاب کے خاص الفاظ پر ہوتا ہے، یعنی اگر اصل

مسئلہ کو دوسرے الفاظ مین بیان کیا جائے تو وہ تمام مباحث بیکار ہو جائین، مثلاً شمسیہ کی یہ عبارت تھی کہ العلوم اما تصور فقط وھو الخ قطبی مین اس کے متعلق ایک بڑی بحث اسکا بنا پر چھیڑ دی گئی کہ ھو کی ضمیر تصور کی طرف پھرتی ہے، یا تصور فقط کی طرف، اس بحث مین قطبی اور میر کے کئی صفحے صرف ہوگئے لیکن اگر مصنف ضمیر کے بجائے خود مرجع کو ذکر کر دیتا تو یہ تمام بحثین رائگان جاتین، اس طرح بجائے اس کے کہ اصل مسئلہ پر وقت صرف کیا جائے، مصنف کے ایک خاص لفظ، اور اس کے منشا پر بے فائدہ وقت صرف کرنا پڑتا ہے،

نصاب موجودہ کی اکثر کتابون کی یہی حالت ہے، یعنی جس قدر اصل فن کے مسائل ہین، ان کے قریب بلکہ ان سے زیادہ یہ فضول لفظی مسائل ہین،

اس موقع پر یہ بات بتا دینا بھی ضروری ہے کہ قدما کے زمانہ مین شرح اور حاشیہ کا طریقہ نہ تھا، بوعلی سینا کے بعد سے یہ طریقہ پیدا ہوا لیکن اس وقت تک شرح مین بھی مصنف کی خاص عبارت اور الفاظ سے بحث نہین کرتے تھے، بلکہ اصل مسئلہ کی توضیح اور تشریح کرتے تھے، اس کے بعد یہ طریقہ پیدا ہوا کہ اصل فن سے چندان غرض نہین رہی بلکہ تمام توجہ اس پر صرف ہوتی تھی کہ مصنف کی عبارت کا کیا مطلب ہے، کس لفظ سے کیا خاص فائدہ ہے؟ کون سی ضمیر کس طرف پھرتی ہے، مصنف کی عبارت کا اوروں نے جو مطلب سمجھا ہے غلط ہے، فلان جگہ مصنف نے دفع دخل مقدر کیا ہے، مصنف کی عبارت پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے، وغیرہ وغیرہ، جس وقت سے یہ طریقہ جاری ہوا وہ علمی تنزل کا پہلا دن تھا،

علامہ ابن خلدون نے مقدمۂ تاریخ مین ایک مضمون لکھا ہے، جس کی سرخی یہ ہے فی ان کثرۃ التالیف فی العلوم عائقۃ عن التحصیل، اس مضمون کا ماحصل یہ ہے کہ چنانچہ

وہ مثلاً فن فقہ کی بہت سی کتابوں کا نام لکھکر لکھتے ہیں:-

وهي كلها متكررة والمعنى واحد والمتعلم مطالب باستحضار جميعها وتمييز ما بينها والعمر ينقضي في واحد منها ولو اقتصر المعلمون بالمتعلمين على المسائل المذهبية فقط لكان الأمر دون ذلك بكثير وكان التعليم سهلاً،

یہ تمام عبارتیں مکرر ہیں، اور مطلب ایک ہے، اور شاگرد پر لازم کیا جاتا ہے کہ وہ تمام عبارتوں کو یاد کرے، اور عمر ایک ہی کے محفوظ رکھنے میں صرف ہو جاتی ہے، اس لئے اگر مدرسین صرف مسائل مذہبی پر اکتفا کرتے تو تعلیم نہایت سہل ہوتی اور بہت کم زمانہ صرف ہوتا،

عجیب بات یہ ہے کہ علامہ ابن خلدون کے زمانہ میں بھی وہی حالت تھی، اجواب ہز یعنی باوجود اس طریقے کی خرابی کے لوگ اس کو ترک نہیں کر سکتے تھے، کیونکہ یہ طریقہ لوگوں کے لئے بجائے طبیعت ثانیہ کے ہو گیا تھا، چنانچہ علامہ موصوف عبارت مذکورہ کے بعد لکھتے ہیں:

ولكنه داء لا يرتفع لاستقرار العوائد عليه فصارت كالطبيعة،

لیکن یہ ایک مرض بن گیا ہے، جو دفع نہیں ہو سکتا، کیونکہ معمول عام ہو جانے کی وجہ سے وہ بجائے طبیعت کے ہو گیا ہے،

۲۔ سب سے بڑی خرابی نصاب موجودہ کی یہ ہے کہ اس میں اکثر ایسی کتابیں داخل ہیں، جن میں متعدد فن مخلوط ہیں، اس خلط مبحث کی وجہ سے طالب العلم کا ذہن پریشان ہوتا ہے، یہاں تک کہ اس کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوتا ہے کہ وہ کون سا فن حاصل کر رہا ہے، ملا حسن، حمد اللہ، قاضی مبارک، منطق کی کتابیں ہیں، لیکن ان میں اکثر مباحث الٰہیات اور مابعد الطبیعہ کے ہیں، مثلاً علم باری، جعل بسیط و جعل مرکب، کلی طبعی کا وجود فی الخارج، وجود ذہنی وغیرہ وغیرہ،

ملا جلال فن منطق مین بڑے معرکہ کی کتاب سمجھی جاتی ہے؛ لیکن جس قدر درس مین ہے اسکا بڑا حصہ دیباچہ کی شرح مین ہے، جو صرف اس خاص عبارت سے متعلق ہے، جو مصنف نے حمد و نعت مین لکھی ہے، ان کتابون کے درس کا جو زمانہ رکھا گیا ہے اس وقت تک میبذی کے سوا فلسفہ کی اور کوئی کتاب پڑھائی نہین جاتی، اس لئے الٰہیات کے مباحث طالب العلم کو بالکل اجنبی اور سخت نامانوس معلوم ہوتے ہین۔

۳- بہت بڑی غلطی یہ ہے کہ جو علوم مقصود بالعرض ہین ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے، اور زمانہ تحصیل کا بڑا حصہ انھین کے حاصل کرنے مین صرف کر دیا جاتا ہے، مثلاً نحو، صرف، منطق مقصود بالعرض ہین، لیکن کتب درسیہ زیادہ تر انہی فنون کے متعلق ہین، منطق کا مقصود یہ ہے کہ فلسفہ مین کام آئے لیکن منطق کی درسی کتابین فلسفہ کے اعتبار سے اضعافاً مضاعفہ ہین، صغریٰ، کبریٰ، میزان منطق، تہذیب شرح تہذیب، قطبی، میر قطبی، ملا حسن، ملا جلال، میر زاہد، ملا جلال، حمد اللہ، قاضی مبارک، یہ انبار کا انبار منطق مین ہے، اور درس مین داخل ہے لیکن فلسفہ کی صرف تین کتابین درس مین داخل ہین، جن مین سے میبذی پوری پڑھائی جاتی ہے؛ باقی کے جستہ جستہ مقامات،

اسی طرح نحو و صرف مین برسون اوقات صرف کیجاتی ہے؛ اور جو اس کی غرض و غایت ہے یعنی علم ادب اس مین بہت کم زمانہ صرف ہوتا ہے، اسی کا نتیجہ ہے کہ سیکڑون ہزارون طلبا مین سے ایک بھی صاحب فن نہین پیدا ہوتا۔

علامہ ابن خلدون نے اس خرابی پر نہایت تفصیل سے بحث کی ہے، چنانچہ لکھتے ہین:

واما العلوم التی ھی آلۃ لغیرھا مثل	باقی وہ علوم جو دوسرے علمون کا آلہ ہین مثلاً
العربیۃ والمنطق وامثالھا فلا ینبغی	عربیت اور منطق وغیرہ تو ان کو صرف اسی حیثیت

ان ينظر فيها الا من حيث هي آلة
لذلك الغير فقط ولا يوسع فيها
الكلام ولا تفرع المسائل لان ذلك
مخرج لها عن المقصود . . . . .
فيكون الاشتغال بهذه العلوم
الآلية تضييعا للعمر وشغلا بما لا
يعني وهذا كما فعل المتأخرون في صناعة
النحو وصناعة المنطق واصول الفقه
لانهم اوسعوا دائرة الكلام فيها . . .
فهي من نوع اللغو وهي ايضا مضرة
بالمتعلمين على الاطلاق . . . . . .
فاذا قطعوا العمر في تحصيل الوسائل
فمتى يظفرون بالمقاصد . . . .

سے دیکھنا چاہیے، کہ وہ فلان علم کا آلہ ہیں، ان
مین نہ کلام کو وسعت دینی چاہیے، نہ مسائل کی تفریع
کرنی چاہیے، کیونکہ ایسا کرنا اس کو اصل مقصد سے
خارج کر دیتا ہے،
تو ان علوم آلیہ مین مشغول ہونا عمر کا ضایع کرنا
ہے، اور لایعنی کام مین مشغول ہونا ہے، جیساکہ
متاخرین نے نحو اور منطق اور اصول فقہ کے متعلق
کیا یعنی کلام کے دائرہ کو بہت وسیع کر دیا،
یہ تو ایک قسم کی لغویت ہے، اور وہ طالب العلمون
کو بھی عموماً مضر ہے،
کیونکہ جب وہ وسائل مین عمر ضایع کر دینگے
تو اصل مقصد تک کب پہنچین گے،

(الندوہ ج ۱ نمبر ۷ جمادی الثانی ۱۳۲۲ھ)

فنِ نحو کی مروجہ کتابین

ابن حاجب نے کافیہ مین مسائل نحویہ کو جس طریقہ سے مدوّن کیا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بعد جس قدر کتابین اس فن مین لکھی گئین، گویا اسی کی عکسی تصویرین تھین، ایک مدت کی ممارست اور انس کی وجہ سے اب یہ خیال بھی نہین آتا کہ اس طریقہ مین کوئی نقص ہوگا، لیکن آؤ تقلید کے دائرہ سے نکل کر دیکھین کہ کیا ایسا ہی ہے،

علوم فنون کی تدوین مین عمدگی کا جو معیار قرار دیا جاسکتا ہے، وہ حسب ذیل ہے

۱۔ مسائل کی ترتیب اصول عقلی کے بنا پر ہو،

۲۔ جو اصطلاحات قائم کئے جائین ان کے لغوی اور مصطلح معنی مین نمایان تناسب ہو، تاکہ لغوی معنی سے اصطلاحی معنی کی طرف خیال جلد منتقل ہوسکے،

۳۔ قواعد کلیہ کی تعداد اس قدر کم ہو کہ اس سے کم نہ ہوسکتی ہو،

سب سے پہلے ہم اس پر بحث کرتے ہین کہ موجودہ ترتیب کہان تک اصول عقلی پر مبنی ہے، اس کے لئے پہلے ہم کو نحو کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرنا چاہئے،

نحو کی تعریف متاخرین نے یہ کی ہے، علم باصول یعرف بھا احوال اواخر الکلم لیکن اگر نحو کی یہی حقیقت ہے، تو جن زبانون مین اعراب نہین ہے، ان کے لئے نحو کا فن بالکل بیکار ہوگا، کیونکہ اس تعریف کی رو سے نحو کا یہ مقصد ہے کہ ۱: الفاظ کا اعراب معلوم کیا جائے اس لئے جن زبانون مین سرے سے اعراب نہین، مثلاً موجودہ فارسی

یا اہلِ زبان کی عربی جس میں تمام الفاظ ساکن الاواخر ہوتے ہیں، اور عوامل کے آنے سے
ان میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا، وہ نحو کے دائرہ سے باہر ہوگی،
حقیقت یہ ہے کہ ہر زبان میں اداے مطلب کے لیے الفاظ کی ترتیب کا خاص طریقہ
ہے، یہ طریقے بعض مشترک ہوتے ہیں بعض اور کسی دوسری زبان میں بھی پائے جاتے ہیں،
اور بعض غیر مشترک جو خاص ایک ہی زبان کے ساتھ مخصوص ہیں، انھیں طریقوں کے
جزئیات کا نام نحو ہے اور نحو کی تدوین کے یہ معنی ہیں کہ ان تمام جزئیات کا استقصا کرکے
ان کو کلیات کے تحت میں لایا جائے،
علامہ ابن خلدون نے نحو کی تعریف ان جامع الفاظ میں کی ہے، یتبیین اصول
المقاصد بالدلالۃ اس تعریف سے ثابت ہوگا کہ نحو کا اصلی مقصد اداے معانی سے متعلق ہے
یعنی جب ہم ایک مطلب اداکرنا چاہیں تو ہم کو فاعل، مفعول، متعلقاتِ فعل وغیرہ کو کس
ترتیب سے لانا چاہیے، باقی یہ امر کہ الفاظ پر ان تراکیب کا کیا اثر پڑتا ہے، اور اواخر
حروف کو کس حالت میں کون سا اعراب ہوتا ہے، یہ ایک ضمنی مسئلہ ہے، البتہ چونکہ نحو
کی تدوین اصل میں علماے عجم نے کی، اور ان کے لئے اعراب کی صحت بھی ایک امر اہم تھی
اس لئے رفتہ رفتہ اعراب کی حیثیت اس قدر اہم ہوگئی کہ متاخرین نے اس کو عین نحو سمجھ لیا
جب یہ امر ثابت ہوگیا کہ نحو کا اصلی تعلق الفاظ کی ترتیب، اور تقدیم و تاخیر سے ہے
تو نحو کی ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ کلام کے جو اجزا سب سے مقدم ہیں، ان کا حال پہلے بیان
کیا جائے، پھر ان سے کم درجہ کے اجزا کا حال پھر ان سے کم کا، اس لحاظ سے پہلے مسند الیہ
کا حال بیان کرنا چاہیے، پھر مسند کا، پھر متعلقات کا، پھر توابع کا، اس بنا پر مبتدا، فاعل،
حروف مشبہ کے اسما، افعال ناقصہ کی خبر، و امثال ہذا کا حال ایک عنوان کے نیچے لکھنا

چاہئے، لیکن متاخرین نے اس معنوی حیثیت کو چھوڑ کر، صرف اعراب کا لحاظ رکھا، اور مرفوعات، منصوبات اور مجرورات کے لحاظ سے ترتیب قایم کی، اس اعراب پرستی کی وجہ سے بہت سے مسائل کی حیثیت بدل گئی، اور ان کے موقع ترتیب مین فرق آگیا، چنانچہ ہم چند مثالین ذیل مین درج کرتے ہین :-

۱- مفعول لہ معنی کے لحاظ سے مجرور باللام ہے : ضربتہ تادیباً اور ضربتہ للتادیب مین معنا کسی طرح کا فرق نہین، لیکن صرف اس وجہ سے کہ اس کو فتحہ ہوتا ہے، اس کے لئے زبردستی ایک نیا نام ایجاد کیا گیا، اور اس کو مفعول کے اقسام مین شمار کیا گیا،

یہی کیفیت مفعول معہ کی ہے، خوب غور سے دیکھو معنی کے اعتبار سے مفعول معہ اور معطوف بالکل ایک ہین، صرف اعراب کی بنا پر اس کو مفعول کا لقب دیا گیا، حالانکہ یہ نہایت آسان بات تھی کہ اس کو واؤ عاطفہ کے تحت مین بیان کیا جاتا، اور اس قدر اضافہ کر دیا جاتا کہ بعض موقعون پر معطوف کو فتحہ ہوتا ہے، اس کے ساتھ مفعول معہ کے خصوصیات بیان کر دیے جاتے،

۲- حروف مشبہ کی اسماء مسند الیہ ہین اور اس لحاظ سے ان کو فاعل اور مبتدا کیساتھ بیان کرنا چاہئے، لیکن اعراب کے لحاظ سے وہ منصوبات مین داخل کئے گئے، اس قسم کی اور بہت سی مثالین ہین،

ایک بڑا نقص موجودہ نحو مین یہ ہے کہ کلمات کے بہت سے اقسام اور اصطلاحات بے فائدہ بنائے گئے ہین، چنانچہ ہم چند مثالین درج ذیل کرتے ہین :-

۱- مفعول مالم یسم فاعلہ کو ایک خاص اصطلاح قرار دینا اور اس کے مسائل جداگانہ لکھنا محض بیکار ہے، مفعول مالم یسم فاعلہ کوئی الگ چیز نہین، بلکہ فعل مجہول کے فاعل

کا نام ہے، فاعل کے لئے یہ ضرور نہیں کہ اس سے فعل کا ارتکاب ہوا ہو، بلکہ اصطلاح نحو میں فاعل کے لئے صرف اس قدر کافی ہے کہ وہ فعل یا شبہ فعل کا مسند الیہ ہو، یہ ظاہر ہے کہ ضُرِبَ زَیْدٌ میں مضروبیت کی اسناد زید کی طرف ہے، اس بنا پر وہ بھی اسی طرح فاعل ہے، جس طرح "ضرب زیدٌ" میں زیدٌ،

۲- افعال ناقصہ کو تمام افعال سے جداگانہ قرار دینا اور اس کے معمول کے لئے بالکل ایک نئی اصطلاح اسم و خبر کے نام سے قایم کرنا محض لغو ہے، یہ غلطی اس وجہ سے پیدا ہوئی کہ افعال ناقصہ کو فعل لازم سمجھا ہے، حالانکہ وہ درحقیقت متعدی ہیں، چنانچہ اس کا بیان آگے آئیگا،

۳- افعال مقاربت کی جداگانہ اصطلاح قایم کرنا بے فائدہ ہے، افعالِ مقاربت میں جس چیز کو اسم کہتے ہیں، وہ درحقیقت فاعل ہے، اور جس کو خبر کہتے ہیں وہ مفعول ہے، ان افعال میں بھی فعل تنہا فاعل پر تمام نہیں ہوتا، بلکہ ایک اور چیز کا محتاج رہتا ہے، اور وہی مفعول ہے،

۴- اسی طرح افعال مدح و ذم کی اصطلاح کی بھی ضرورت نہیں نعم الرجل زید میں الرجل فاعل ہے اور زید بدل اور یہ معمولی ترکیب ہے،

متعدی کی تعریف کافیہ وغیرہ میں یہ کی ہے، ما یتوقف فہمہ علی متعلق اس بنا پر افعال ناقصہ عموماً متعدی ہیں کیونکہ انکا مفہوم تنہا فاعل سے سمجھ میں نہیں آتا، علامہ رضی نے تصریح کی ہے کہ اس تعریف کی بنا پر قرب وغیرہ متعدی ہیں، چنانچہ لازم و متعدی کی بحث میں لکھتے ہیں، دعلی ما حد ینبغی ان یکون نحو قرب و بعد وخرج و دخل متعدیاً اذ لا یفہم معانیہا الا بمتعلق اس بنا پر افعال ناقصہ کے اسم و خبر درحقیقت فاعل اور مفعول ہیں،

(الندوہ ج ۱ نمبر ۲ شوال ۱۳۲۲ھ)

تعلیم قدیم و جدید

کیا ان میں سے کوئی غیر ضروری ہے؟ کیا ان دونوں میں تعارض ہے؟ کیا ان میں کسی اصلاح کی ضرورت ہے؟ دونوں مل کر کیونکر کام کر سکتے ہیں؟

اگرچہ یہ سوالات قومی مسئلہ کے متعلق اہم اور ضروری سوالات ہیں، لیکن قوم نے کبھی ان سوالات پر مستقل حیثیت سے بحث نہیں کی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت جو دنیوی اور دینی درسگاہیں یا انجمنیں ملک میں قائم ہیں ان کو جو کامیابی اس وقت حاصل ہے، وہ اسپر قانع تھیں، اس لئے ان مسائل کے حل کرنے کی ان کو ضرورت معلوم نہیں ہوئی، مثلاً اسلامی کالجوں میں سیکڑوں ہزاروں بچے تعلیم پاتے ہیں، ہر سال سیکڑوں ایم اے اور بی اے ہو کر نکلتے ہیں، سیکڑوں فارغ شدہ طلبہ نے معقول نوکریاں حاصل کیں، سیکڑوں وکالت کر رہے ہیں، سیکڑوں ایڈیٹرس اور امیدوار ہیں، ان باتوں کے ہوتے ان کو اس بات کی کیا ضرورت ہے، کہ وہ قدیم تعلیم کی ضرورت اور اس کے نتائج اور ترمیم و اصلاح کا سودا مول لیں،

کار دنیا کسے تمام نہ کرد
ہر چہ گیرید مختصر گیرید

اس کے مقابلہ میں عربی مدارس دیکھ رہے ہیں کہ ان کے تعلیم یافتہ مساجد میں

پھیلے ہوسے ہین، ہزارون مولوی تیار ہوگئے ہین، ہر ہر ضلع مین عربی کے چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہوتے جاتے ہین، ہر جگہ واعظون کی مانگ ہے، ان باتون کے ساتھ انکو کیا غرض ہے کہ وہ جدید تعلیم کی ضرورت اور نتائج پر غور کرنے کی زحمت اٹھائین،

لیکن اب اس سکون مین کچھ جنبش پیدا ہو چلی ہے، کیونکہ اب ہر گروہ جس قسم کی تعلیم کا حامی ہے، چاہتا ہے کہ تمام ملک مین وہی تعلیم پھیل جائے، اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ دونون گروہون مین تقابل، مسابقت اور مجاسدہ پیدا ہو، چنانچہ ایسا ہوا، صرف یہ نہین باقی رہا کہ بسبت متوسط لوگون نے علانیہ اپنے حریف مدارس اور انجمنون کی برائی شروع کی، اور تہذیب حضرات نے دل آزاری اور بدگوئی سے احتراز کیا،

اگرچہ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانون سے دونون کو بہ قدر کافی اپنے کام کے لئے مدد مل سکتی ہے، لیکن واقعی اب اس کا وقت آگیا ہے کہ تمام قوم ملکر ایک وسیع خاکہ تیار کرے، جسمین تمام درسگاہون اور انجمنون کی نسبت طے کر دیا جائے کہ کون کون ضروری ہین ؟ کس حد تک ضروری ہین ؟ اور مجوزہ نقشہ مین ہر ایک کی جگہ کہان ہے ؟ تاکہ جو کام ہو رہے ہین، سب مل کر ایک کام بنجائین، اور ایک کام دوسرے کام مین خلل انداز نہ ہونے پائے، ورنہ دو طرفہ کشمکش مین ہزارون لاکھون مسلمان یہ فیصلہ نہ کر سکین گے کہ وہ کس رخ اور کدھر جائین،

اس غرض سے سوالات ذیل پر نظر ڈالنی چاہیے،

جدید تعلیم ضروری ہے یا نہین ؟

قدیم تعلیم ضروری ہے یا نہین ؟

دونون مین اصلاح کی ضرورت ہے، یا نہین ؟

اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟

علیگڈھ دیوبند ندوہ کے کیا حدود ہین، اور کون کون کام کس کس کے حدِ عمل مین چھوڑ دینے چاہئین،

پہلے سوال کے جواب مین اب اختلاف نہین رہا، اور اگر کسی کو ہو تو ہم کو اس سے خطاب کرنے کی ضرورت نہین،

دوسرے سوال کا جواب جدید گروہ کے ذہن مین دفعۃً نفی کی صورت مین آئیگا، لیکن انکو ذرا غور سے کام لینا چاہئے، اور پہلے ان سوالات کا جواب دینا چاہئے،

کیا مسلمانون کی قومیت مذہب کے سوا اور کچھ ہے؟

اگر نہین ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیونکر قایم رہیگی،؟

اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم، قدیم تعلیم کے بغیر کیونکر ممکن ہے؟

شاید یہ کہا جائے کہ انگریزی کے ساتھ مذہبی تعلیم بہ قدر ضرورت ممکن ہے، اور اسی قدر کافی ہے، لیکن کیا صرف اس قدر تعلیم سے قرآن وحدیث کی حفاظت ہو سکتی ہے، کیا اس درجہ کے تعلیم یافتہ اسلامی مشکل مسائل کی تشریح کر سکتے ہین، کیا غیر مذہب والے مذہب اسلام اور تاریخ اسلام پر جو اعتراضات کرتے ہین، ان کے مقابلہ کے لئے اتنی تعلیم کافی ہے؟ کیا اس قدر تعلیم پائے ہوئے لوگ مذہبی خدمات مثلاً وعظ، امامت، فتویٰ وغیرہ انجام دیسکتے ہین،؟ کیا عوام پر ان لوگون کا کوئی مذہبی اثر قائم ہو سکتا ہے؟

تیسرا سوال یعنی یہ کہ دونون طریقۂ تعلیم مین اصلاح کی ضرورت ہے یا نہین، ایک معرکہ کا سوال ہے، نہ اس لئے کہ درحقیقت وہ ایسا ہے، بلکہ اس لئے کہ دونون فریق ایک مدت سے اسی حالت پر قایم ہین، اور چونکہ دونون اپنے اپنے حوصلہ کے مطابق کامیاب

ہین اس لئے انکو علانیہ نظر آتا ہو کہ اصلاح کی ضرورت نہین، تاہم جدید گروہ بہ آسانی اپنے خلاف نکتہ چینی سننے پر آمادہ ہوسکتا ہو، اس لئے پہلے ہم انھین سے خطاب کرتے ہین،

اس قدر تسلیم ہونے کے بعد کہ تعلیم جدید کے ساتھ کسی قدر مذہبی تعلیم ضروری ہو، یہ سوال باقی رہتا ہے کہ اس ضرورت کی مقدار کیا ہے؟ اور اس کا کیا طریقہ ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ انگریزی تعلیم یافتہ لوگون سے ہکو مذہبی خدمات یعنی امامت، وعظ، افتا کا کام لینا نہین ہے، بلکہ غرض یہ ہے کہ وہ خود بہ قدر ضرورت مسائل اسلام اور تاریخ اسلام سے واقف ہون، اس کیلئے صرف ایک مختصر اور جامع و مانع سلسلہ کتب دینیات کی ضرورت ہے، جسمین سلسلہ بسلسلہ اسکول سے کالج کلاسون تک کے قابل کتابین ہون، اس سلسلہ مین تین قسم کی کتابین ہونی چاہئین، فقہ، عقائد، تاریخ اسلام، فقہ اور تاریخ کے متعلق مصر مین عمدہ کتابین تیار ہو گئی ہین، ان کا ترجمہ کافی ہوگا، عقائد کی نسبت البتہ مشکل ہے، کیونکہ ہندوستان مین جو کتابین آجکل لکھی گئی ہین، ان پر ابھی تمام لوگون کا اتفاق نہین ہوسکتا، اور مصر وغیرہ کی جدید تصانیف ناکافی اور ناقابل درس ہین، اس لئے یہ بہتر ہوگا کہ اسکول کلاسون مین صرف فقہ، اور تاریخ اسلام اور سادہ عقائد کی تعلیم ہو، اور کالج کلاسون مین امام غزالی اور ابن رشد اور شاہ ولی اللہ صاحب کی چیدہ تصنیفات خود عربی ہی زبان مین پڑھائی جائین، اور ان سب کی مجموعی ضخامت سو دو سو صفحون سے زیادہ نہ ہو،

لیکن نہایت مقدم امر یہ ہے کہ کالجون مین صرف کتابی تعلیم سے مذہبی اثر نہین پیدا ہوسکتا، بلکہ اس بات کی ضرورت ہے کہ طلبہ کے چارون طرف، مذہبی عظمت کی تصویر نظر آئے، دینیات کے نتائج امتحان کو انگریزی تعلیم کے نتائج کی طرح لازمی قرار دیا جائے، مذہبی علما و پیش قرار مشاہرہ کے مقرر کئے جائین، وعظ کے موقعون پر اکثر ارکان کالج تا

امکان شریک ہوں، مذہبی پابندی کی بنا پر طلبہ کی خاص توقیر و تحسین کیجائے اور سب سے مقدم یہ کہ دو چار طلبہ کو گران بہا وظایف دیکر ڈگری حاصل کرنے کے بعد مذہبی اعلیٰ درجہ کی تعلیم دلائی جائے۔

یہ امر اگرچہ بدیہی ہے کہ قدیم تعلیم پر [illegible] کی ضرورت ہے، لیکن افسوس ہے کہ بڑے بڑے مقدس علما اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں، اس لئے ہم ان سے سوالات ذیل کے جواب چاہتے ہیں۔

(۱) یورپ کے مصنفین مذہب پر جو حملے کر رہے ہیں ان سے واقف ہونے کی ضرورت ہے یا نہیں؟

۲۔ اگر علما خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خوان مسلمانوں میں ان خیالات کا شایع ہونا کوئی روک سکتا ہے؟

۳۔ مذہب پر عموماً اور مذہب اسلام پر جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے؟

۴۔ علما جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے، جواب کیونکر دے سکیں گے؟

۵۔ کیا علماے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیے تھے؟

۶۔ اگر اس وقت اس زمانے کے فلسفہ کا سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں؟

ان سوالات کا اگرچہ خود بخود یہ جواب ہوگا کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے واقف ہونے اور انگریزی زبان اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے، لیکن بایں ہمہ اس بات کی ضرورت نہیں کہ ہم ان علما کو جو کسی قسم کی اصلاح کی ضرورت نہیں خیال

کرنے اصلاح پر مجبور کریں، اس کی وجہ ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں،

مذہبی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہے، مثلاً دیہات کے جاہل مسلمانوں میں احکام اسلام کا پھیلانا اتنا بڑا وسیع کام ہے، جس کے لئے سیکڑوں ہزاروں مولویوں اور واعظوں کی ضرورت ہے، اسی طرح مساجد کی امامت اور فتویٰ وغیرہ بہت سے کام ہیں، جو محض خالص قدیم تعلیم یافتہ حضرات انجام دے سکتے ہیں، اس لئے اس تقسیم عمل کی رو سے یہ کام اس گروہ کے ہاتھ میں دیدینے چاہئیں اور ہر طرح پر ان کی تائید و اعانت اور احترام کرنا چاہئے، اس نقطۂ خیال کو اگر پیش نظر رکھا جائے، تو جو لوگ قدیم عربی مدارس کو بیکار بتاتے ہیں، وہ بھی تسلیم کرلیں گے کہ دنیا میں کوئی چیز بیکار نہیں ہے، صرف ہم کو ان کا استعمال صحیح طور سے کرنا چاہئے، صحابہ میں حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ بھی تھے جو لاکھوں روپئے کے مالک تھے، اور حضرت ابوذرؓ بھی تھے جن کا قول تھا کہ صاحب المال کافر (جس کے پاس روپیہ [illegible] کافر ہے) یا [illegible] اسلام کو دونوں کی ذات سے نفع پہنچتا تھا، کیونکہ دونوں سے مختلف کام لئے جاتے [illegible] اس قسم کے قدیم [illegible] میں اس قسم کی تربیت پر اصرار کرنا چاہئے جس سے تعصب، سخت دلی، تنگ خیالی نہ پیدا ہو جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ پرانے مولوی اور جدید تعلیم یافتہ ایک صحبت میں بسر نہیں کرسکتے، اور ہر موقع پر دونوں دو حریف کی صورت میں نظر آتے ہیں، ان لوگوں کو دربار نبوی کا نمونہ پیش نظر رکھنا چاہئے جہاں کافروں اور منافقوں تک کو بار ملتا تھا، اور ان کی بھی خاطر داری کیجاتی تھی، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی ہدایت کے لئے بھیجے گئے، تو ان کو حکم ہوا کہ قولا لہ قولا لینا یعنی فرعون سے نرمی سے بات کرنا،

دونون گروہ اب قوم کے ضروری اجزا ہین، اس لئے دونون کو آپس مین دست و بازو ہوکر کام کرنا چاہیے،

لیکن علما کے جس گروہ نے جدید ضرورتون کا اندازہ کیا ہے، اور اس کے موافق ہو نظام تعلیم مین اصلاح و اضافہ کرنا چاہتے ہین، وہ ان اصول کے سوا اور کیا اختیار کرسکتے ہین جو ندوہ نے اختیار کیا ہے، اور جو عملی صورت مین ظاہر ہورہا ہے،

اگر قوم ان واقعات کو پیش نظر رکھے، تو آج کل قوم کی کوششون کی پراگندگی کا جو منظر ہے، وہ اٹھ جائے، اور لوگ اطمینان اور سکون اور بے تعصبی کے ساتھ اپنی اپنی حدود مین محدود رہکر اپنے کامون کو انجام دین،

(الندوہ ج، نمبر ۹)

ستمبر ۱۹۱۰ء

ہوا کا رُخ دُوسری طرف

مشرقی کانفرنس

ندوۃ العلماء کے متعلق ایک غزر تذکرہ ہے جس کی منفصلہ رائے یہ ہے کہ یہ ایک بے معنی بلکہ مضر کام ہے، لیکن جو لوگ اس کو اصولاً مفید بھی سمجھتے تھے، وہ بھی ہمیشہ مجھ سے کہتے تھے کہ ہوا کا رخ دوسری طرف ہے اس لئے ندوہ کامیاب نہیں ہوسکتا،

میرا اصول عمل یہ ہے کہ اگر ایک کام قوم اور مذہب کے لئے ضروری ہے، تو ہمارا فرض اس کے لئے کوشش کرنا ہے، کامیابی یا ناکامیابی سے ہم کو بحث نہیں، ہم ان لوگوں میں ہیں جن کا قومی نعرہ یہ تھا،

اذا ھم القی بین عینیہ عزمہ — و نکب عن ذکر العواقب جانبا

جب قصد کرتا ہے تو اپنے عزم کو آنکھوں کے سامنے رکھ لیتا — اور اس سے کچھ بحث نہیں کرتا کہ انجام کیا ہوگا؟

سمندر میں جب کوئی کشتی شکستہ ڈوبنے لگتا ہے تو اس کو نظر آتا ہے کہ کوسوں تک کنارہ کا پتہ نہیں کوئی سہارا نہیں، اس کی شناوری، سمندر کے عرض و طول کا مقابلہ نہیں کرسکتی، تاہم کیا وہ دیدہ و دانستہ ہاتھ پاؤں مارنا چھوڑ دیتا ہے، اور قصداً ڈوب جاتا ہے؟

ہمارا اسی قدر فرض ہے، فرض کا ادا کرنا ہی کامیابی ہے، کسی اور کامیابی کی ہم کو ضرورت نہیں، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہمیشہ ہاتف غیب کی دھیمی اور آہستہ آواز بھی میرے کانوں میں آیا کرتی تھی کہ ممکن ہے کہ خود ہوا کا رخ بدل جائے، مشرقی کانفرنس اسی خواب کی تعبیر ہے،

مشرقی تعلیم کی تحریکیں اس سے پہلے بھی ہوئیں، ڈاکٹر لائیٹنر کی سرگرم کوششوں سے پنجاب میں تعلیم مشرقی کی ایک شاخ یونیورسٹی میں قائم ہوئی، الہ آباد یونیورسٹی میں ملا اور فاضل کے امتحانات اسی خیال کے ناتمام خاکے ہیں، سرسید مرحوم نے ہمیشہ ان کوششوں کی سخت مخالفت کی، پنجاب یونیورسٹی پر ان کے تین پرزور آرٹیکل، قلعہ شکن توپیں تھیں جنکے صدمہ نے مشرقی تعلیم کو چکنا چور کر دیا، الہ آباد یونیورسٹی جب بن رہی تھی، اور بظاہر نظر آتا تھا کہ اس میں بھی مشرقی تعلیم کی شاخ کھولی جائیگی، تو سرسید نے متعدد آرٹیکل اس زور کے لکھے کہ اس تجویز کے پرخچے اڑ گئے، سرسید کی مخالفت اس پر مبنی تھی، کہ وہ سمجھتے تھے کہ مشرقی تعلیم کی یہ کوشش، مغربی تعلیم کی ترقی کو روک دیگی، جو ملک کے لئے نہایت ضرررساں کام ہے،

اس میں ایک ذرہ شبہہ نہیں کہ اگر ہم کو یہ یقین ہو کہ مشرقی تعلیم کی کسی تجویز سے، مغربی تعلیم میں ذرہ بھر بھی کمی ہوگی تو ہمارا فرض ہے کہ اس تجویز سے علانیہ نفرت کا اظہار کر دیں،

مسلمان، اس وقت کشمکش زندگی کے میدان میں ہیں، ان کی ہمسایہ قومیں مغربی تعلیم ہی کی بدولت ان سے اس میدان میں بڑھ رہی ہیں، اگر خدانخواستہ مسلمان مغربی تعلیم کی کوشش میں ذرا بھی پیچھے رہجائیں، تو ان کی ملکی اور قومی زندگی، دفعتہً

برباد ہو جائے گی،

لیکن اب وہ حالت نہین ہے، مسلمانون نے اچھی طرح سمجھ لیا ہے، کہ ان کی دنیوی
ترقی صرف اس بات پر موقوف ہے کہ ان کا ایک ایک بچہ انگریزی مین تعلیم یافتہ ہو جائے
لیکن باوجود اس کے یہ ٹھیک نہین ہے کہ مذہبی تعلیم کے لئے کوئی جگہ نہ نکلے، ترقی یافتہ قومون
کی مثال ہمارے سامنے موجود ہے، یورپ سب کچھ کر رہا ہے، تاہم ان مین ایک وسیع
گروہ موجود ہے جو اپنی مذہبی تعلیم اور مذہبی لٹریچر کا محافظ ہے، تو ہمارے ہمسایہ قومون کا کیا
حال ہے، آریہ انگریزی تعلیم مین اس تیزی سے ترقی کر رہے ہین کہ مسلمان ان کی گرد کو
بھی نہین پہنچتے، تاہم وہ گروکل بھی قائم کر رہے ہین، جو سنسکرت کی تعلیم کے لئے
مخصوص ہے، اور جس کا مقصد صرف اپنے مذہب اور اپنے لٹریچر کی اشاعت ہے، اس گروکل
مین جو لڑکے داخل ہوتے ہین، ان سے عہد لیا جاتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام نہین کرینگے
۲۴ برس کی عمر تک ان کو تعلیم دیجاتی ہے، ان کو نہایت سادی اور خشک غذا دیجاتی
ہے، سونے کو لکڑی کا تختہ ملتا ہے، اپنے ہاتھ سے سب کام کرنا پڑتا ہے، اس جفا کشی
اور دنیاوی بے تعلقی کے ساتھ تین سو دولتمندون نے اپنے بچے اس مین بھیجدیئے ہین
اور ۲۴ روپیہ ماہوار ایک ایک بچہ کا خرچ دیتے ہین، ہر سال اس مدرسہ کے لئے لاکھون
کا چندہ جمع ہو جاتا ہے اور اس کی شاخین جابجا قائم ہوتی جاتی ہین،

کیا اس مدرسہ نے آریون مین انگریزی تعلیم کو کم کر دیا ہے؟ کیا انگریزی تعلیم پر
کوئی برا اثر ڈالا ہے؟ بلکہ سچ یہ ہے کہ اس کے تعلیم یافتہ مدرسہ سے نکل کر تمام قوم مین
انگریزی تعلیم اور دنیاوی ترقی کی روح پھونک دینگے، تیر انداز اپنی جگہ پر رہتا ہے
لیکن تیر کوسون نکل جاتا ہے، رجز خوان خود نہین لڑتے، لیکن ہزارون لڑنے والے

پیدا کر دیتے ہین،

غرض، اگر یورپ کو بہ این دنیا طلبی، پادریون کی حاجت ہے، اگر آریون کو با این انگریزی خوانی گروکل کی ضرورت ہے، تو مسلمانون کو بھی عربی تعلیم اور مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے، اور یہ ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جب تک مسلمانون کی قوم کا باقی رہنا ضرور ہے،

انھین اسباب سے باوجود تمام مخالفتون کے ندوہ قائم ہوا، اور باوجود تمام مزاحمتون کے اس نے اپنا وجود قائم رکھا، یہ سوال پہلے ہی دن پیدا ہوا کہ ندوہ کے تعلیم یافتہ کیا کھائین گے؟ اس کا جواب آسان تو یہ تھا کہ اب تک عام مولوی کسی نہ کسی طرح اپنی زندگی بسر کر رہے ہین، اور علم الاعداد سے نظر آتا ہے کہ عربی مدرسون کی تعداد گھٹتی نہین بلکہ بڑھتی جاتی ہے، جب ہم اس کو روک نہین سکتے، تو اس مین کیا ہرج ہے کہ اس گروہ کو زیادہ بکارآمد بنا دیا جائے،

لیکن اس کا اصلی اور صحیح جواب یہ ہے کہ مسلمان بہت جلد اس بات کا احساس کرین گے کہ ان کو اپنی قومیت اور مذہب کے بقا کے لئے مشنری (یعنی مبلغین اسلام) قایم کرنے کی ضرورت ہے، یورپ اس قدر دنیوی تعلیم مین منہمک ہے، تاہم صرف لندن مین مشنری پر ڈو کرور روپیہ سالانہ خرچ کر رہا ہے، جب اسلامی مشنری قائم ہوگی، تو اس کے موزون اور صحیح کارکن صرف ندوہ مہیا کر سکے گا،

لیکن چونکہ ابھی تک اسلامی مشنری کا باقاعدہ طریقہ نہین قائم ہوا اس لئے اس سوال کے جواب دینے کے لئے اور اور پہلوون پر بھی نظر پڑتی تھی، انھین مین ایک یہ بھی تھا، کہ ندوہ کے تعلیم یافتہ، کیا گورنمنٹ کے بھی کچھ کام آ سکتے ہین،

گورنمنٹ کی تعلیمی پالیسی آج تک یہ تھی کہ وہ مذہبی تعلیم سے بالکل الگ تھی، اور مشرقی تعلیم بھی اس میں محض برائے نام تھی، لیکن ملک کی عام رائے یہ تھی کہ مذہبی تعلیم کے بغیر اخلاق اور تربیت کا شیرازہ قائم نہیں رہ سکتا، اس کے ساتھ یہ بھی خیال تھا کہ عربی اور سنسکرت زبانوں کی اعلیٰ تعلیم بھی سلسلۂ تعلیم کا ایک ضروری حصہ ہے، یہ کہنا مشکل ہے کہ گورنمنٹ نے بھی مذہبی تعلیم کی ضرورت کا احساس کیا یا نہیں، لیکن یہ صاف نظر آتا ہے کہ گورنمنٹ نے اس بات کو ضروری خیال کیا کہ مشرقی تعلیم کو قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے، حال میں گورنمنٹ نے جو مشرقی کانفرنس شملہ میں قائم کی، اس کے مقاصد میں سے بعض مقاصد یہ تھے :-

(۱) مشرقی و مغربی تعلیم میں اتحاد پیدا کرنا،

(۲) علم الآثار (ارکیالوجی) کی تعلیم دینا، اور جدید طریقۂ تحقیقات آثار قدیمہ سے واقف کرنا"

(۳) اعلیٰ طریقہ پر قدیم و قلمی کتبخانوں کی فہرست سازی (کیٹلوگنگ) کی تعلیم دینا"

(۴) اعلیٰ مشرقی تعلیم کے لئے بیش قرار وظائف مقرر کرنا،

(۵) دیسی زبانوں کو ترقی دینا، اور ان کے لئے امتحانات قائم کرنا،

(۶) علمی مشرقی تعلیم یا فنون کے لئے کالجوں میں پروفیسری، مدرسوں میں ٹیچری، عجائب خانوں میں تحقیقات آثار قدیمہ، اور قدیم کتب خانوں میں ترتیب فہرست کیلئے عہدے قائم کرنا،

(۷) کلکتہ کی مشرقی درسگاہوں کو متفق و متحد کرنا،

(۸) افسروں کی زباندانی کا امتحان لینا،

(۹) کلکتہ میں اغراض بالا کے لئے ایک عظیم الشان مشرقی درسگاہ قائم کرنا،

یہ ظاہر بات ہے کہ علماء کا گروہ مسلمانون کی جماعت کا ایک ضروری جز رہے، انکی
تعداد کثیر ملک مین موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہیگی، ان کا قوم پر نہایت قوی اثر ہے، عربی
زبان ایک علمی زبان ہے، ان اسباب سے یہ مناسب نہین کہ مشرقی تعلیم سے بالکل بے اعتنائی
اختیار کیجائے، البتہ اس کی ضرورت ہے کہ اس کو زیادہ بکار آمد بنایا جائے، اور مذہبی حصہ
کو چھوڑکر باقی چیزون مین ایسی ترقی اور اصلاح کیجائے کہ مشرقی تعلیم یافتہ لوگون کی معاش
کے لئے کچھ وسائل پیدا ہوسکین،

کانفرنس نے جو کچھ طے کیا ہے، ابھی اس کی باضابطہ منظوری نہین ہوئی ہے، اس لئے
اس کی تفصیل ابھی غیر ضروری ہے، لیکن بظاہر حسب ذیل نتائج کی توقع کیجاسکتی ہے،

(۱) گورنمنٹ کی طرف سے ایک انسپکٹر ہوگا جو قدیم عربی مدارس کا معائنہ کرسکے گا، اگر
مدرسہ کے مہتمم ایسی نگرانی کو پسند کرین گے،

(۲) جن مدرسون کو گورنمنٹ اس قابل سمجھے گی ان کو کچھ ماہوار امداد دیگی،

(۳) کلکتہ مین بہت بڑے وسیع پیمانہ پر ایک مشرقی درس گاہ قایم ہوگی، مدارس
عربیہ کے فارغ شدہ اگر چاہین گے تو اس درسگاہ مین تعلیم حاصل کرین گے،

(۴) اس درس گاہ کے تعلیم پانے والون کو بیش قرار وظیفے دیئے جائین گے،

(۵) اس درسگاہ سے سند لینے کے بعد ان کو متعدد اسامیان مل سکین گی، جو مشرقی
تحقیقات سے متعلق ہونگی،

(۶) مدارس عربیہ جن کو گورنمنٹ تسلیم کریگی، اور جس کے تعلیمیافتہ کم سے کم انگریزی
زبان جانتے ہونگے، ان کو کالجون اور اسکولون کی پروفیسری اور مدرسی مل سکے گی،

ان واقعات کے بیان کرنے سے غرض یہ ہے کہ جو فرقہ اب تک بغیر کسی معاوضہ

کے عربی علوم کی تحصیل مین مشغول تھا، اب کسی قدر ذریعۂ معاش حاصل ہونے کی صورت مین امید ہے کہ اپنا کام زیادہ مستعدی اور زیادہ وسعت حوصلہ سے انجام دے، ہم لوگ اگر عربی علوم اور مذہبی علوم کے جان دادہ اور جان نثار ہین، تو اس قدر معاوضہ ہمارے لئے بالکل کافی ہے، اور کوئی غیر گورنمنٹ اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے،

(الندوہ، جلد ۸ نمبر ۸)
اگست ۱۹۱۱ء

ریاست حیدرآباد
کی
مشرقی یونیورسٹی

معلوم نہین مسلمانون مین کون سی مبارک ساعت مین تقلید کی بنیاد پڑی تھی کہ
زمانے کے سیکڑون ہزارون انقلابات کے ساتھ بھی اس کی بندشین اب تک کمزور نہین
ہوئین، تعجب اور سخت تعجب یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ فرقہ جو اجتہاد اور جدت کا دعویدار ہے
اور در حقیقت جدید تعلیم کا یہی اثر ہونا چاہئے تھا، وہ بھی اسی طرح بے سمجھے بوجھے، ایک عام
راستے پر پڑ لیا ہے اور کچھ نظر نہین آتا کہ ہم کہان جا رہے ہین، جس تعلیم اور نتائج تعلیم کا
اس قدر شور و غل ہے، وہ کیا ہے؟ کالجون کی ڈگریان اور نوکریان و دگر ہیچ، شاید کہا جائے
کہ اس کے سوا ہم اور کیا کر سکتے ہین، اور اسی لئے تو ہم اپنی خاص یونیورسٹی چاہتے ہین کہ
اپنی ضرورتون کے موافق اپنی تعلیم کا سامان بہم پہنچائین، لیکن مجبوری یہ ہے کہ اس قدر
روپیہ بہم نہین پہنچتا کہ یونیورسٹی بن سکے، لیکن سوال یہ ہے کہ جہان یونیورسٹی بن سکتی ہے
وہان کیا ہو رہا ہے؟ حیدرآباد مین عنان تعلیم انھین لوگون کے ہاتھ مین رہی ہے جو ہندوستان
مین یونیورسٹی بنانے کے محرک در جان داده ہین، یونیورسٹی کے لئے دس لاکھ روپیہ مانگا
جا رہا ہے، حیدرآباد مین ایک منٹ مین یہ رقم مل سکتی ہے، حیدرآباد مین صرف ایک کالج

ڈیڑھ سو لاکھ روپیہ صرف ہو رہا ہے، حیدرآباد کو اس بات کی کچھ پروا نہیں ہوسکتی کہ اگر وہ اپنی یونیورسٹی بنائے، تو اس کے تعلیم یافتہ انگریزی گورنمنٹ میں نوکریاں نہ پائیں گے، کیونکہ حیدرآباد، خود ایسی وسیع ریاست ہے کہ وہاں کے تعلیم یافتہ دوسری جگہ نوکری کرنے کے محتاج نہیں، لیکن تقلید پرستی کی یہ حالت ہے کہ انگریزی تعلیم میں کسی قسم کی اصلاح درکنار ایک طرف، خاص مشرقی تعلیم میں بھی جس کے لئے وہاں ایک دارالعلوم ہے، پنجاب یونیورسٹی کے مشرقی امتحانات کے بیہودہ نصاب کی آج تک، تقلید کی گئی، پنجاب نے مولوی فاضل اور مولوی عالم وغیرہ کے جو امتحانات مقرر کئے ہیں، وہ دنیا کے کام کے ہیں نہ دین کے، تاہم آج تک اسی کی محکومی کی گئی، اور اس وقت تک آزادی کا خیال نہ آیا جب تک خود یونیورسٹی نے یہ قاعدہ نہیں بنایا کہ ہم دوسرے ممالک کے لوگوں کو اپنے امتحانات میں شریک نہیں کرسکتے

دوسہ بار بار توگفتم کہ مرا بہیچ بستان   نشد اتفاق، شاید کہ بدین بہانہ گرانم

بہرحال خوبی تقدیر سے پنجاب یونیورسٹی نے حیدرآباد کے طلبا، کو اپنے امتحانات میں شامل کرنے سے روکا۔ اب اگر یہ ممکن ہوتا کہ یہ سب طلبہ، وہاں کے انگریزی اسکولوں میں داخل ہوجاتے تو پھر اسی تقلید پرستی کے دام میں گرفتار ہوجاتے، ع

از دام جستہ باز سوے دام میرود

لیکن سات سو طلبہ جو انگریزی کے ایک حرف سے واقف نہ تھے، اور جن میں سے اکثر انگریزی پڑھنا بھی نہیں چاہتے تھے، وہ کیونکر ایک نئی زندگی اختیار کرسکتے تھے؟ غرض اب یہ خیال ہوا کہ دارالعلوم کا نصاب یہاں کی ضرورتوں کے لحاظ سے خود تیار کیا جائے، نواب عماد الملک بہادر بلگرامی سی، ایس، آئی، ممبر انڈیا کونسل اس وقت ناظم تعلیمات تھے، انھوں نے سرکار میں یہ تجویز پیش کی، اور منظور ہوئی، اس کے بعد نواب صاحب موصوف

نے میرے نام ایک سرکاری مراسلہ بھیجا جس کا اقتباس حسب ذیل ہے:-

"اس وقت باعث تصدیع یہ امر ہوا کہ میں نے اس حادثہ (میرے پاؤں کے زخمی ہونے کی طرف اشارہ ہے) کے چند ہی روز پہلے سرکار میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ چونکہ ہمارے دارالعلوم کا تعلق اب پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہو گیا ہے، پس مناسب ہوگا کہ ہم اپنے لئے خود ہی مناسب انتظام کریں یعنی عربی و فارسی نصاب تعلیم مرتب کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی جلد مقرر کی جائے جس میں ایک رکن آپ ہوں، اور نصاب تعلیم زمانہ حال کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب ہو تاکہ جو لوگ اس مدرسہ میں تعلیم پا کر امتحان میں کامیابی حاصل کریں، وہ سرکاری خدمات ادا کرنے کے اہل پائے جائیں۔

اس امر کے اطلاع دینے سے میرا یہ منشا نہیں کہ آپ سے فوراً تکلیف گوارا کرنے کی خواہش کروں بلکہ محض اس قدر اطمینان حاصل کرنا منظور ہے کہ کامل صحت کے بعد آیا یہ امر ممکن ہوگا کہ آپ یہاں تشریف لائیں، ایسے قومی کاموں میں آپ ہمیشہ تکلیف گوارا کرتے رہے ہیں، اگر آپ کا تشریف لانا ممکن نہ ہو، تو کیا آپ نصاب تعلیم پنجاب یونیورسٹی پر نظر غائر ڈال کر ایک جدید نصاب وہیں مرتب فرما سکتے ہیں، تو ہم نصاب میں چند ابواب مدنظر رہیں تو بہتر ہے،

(۱) اصلاح نصاب موجودہ پنجاب یونیورسٹی بہ لحاظ مقتضائے وقت و زمانہ و ضروریات خدمات حکومتی؛

(۲) تکمیل تحصیل علوم شرقیہ،

مد دوم کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ پنجاب کی اورینٹل تعلیم ناقص ہے بہت سے علوم جن سے تکمیل فضیلت کی ہوتی ہے، اس تعلیم میں متروک ہیں، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے

کہ جماعت مولوی فاضل سے بالائے اعلیٰ مرتبہ دو جماعتین ہون جنمین تحصیل کی تکمیل ہوسکے۔
میری رائے ناقص مین اگرچہ سلسلۂ نظامیہ کی پابندی ضرور نہین ہو، مگر تکمیل تحصیل کے لئے
بہت کچھ اضافہ کتب درسیہ کی ضرورت ہو۔"

نواب صاحب موصوف کا یہ خط اس وقت پہنچا جب مجھ پر پاؤن کے زخمی ہونے کا واقعہ گذر چکا تھا، اور مین صاحب فراش تھا، جب اس سے صحت ہوئی، تو مولوی عزیز مرزا صاحب ہوم سکریٹری حیدرآباد نے نواب عماد الملک بہادر کی تحریر کی بنا پر مجھ کو پھر طلب کیا، اور مین جون ۱۹۰۱ء مین حیدرآباد گیا، وہان چند روز رکھر ایک نصاب تیار کیا، اور اس کے متعلق ایک یادداشت لکھی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصاب کن اصول پر تیار کیا گیا ہے، یادداشت مذکور کی نقل درج ذیل ہے،

رپورٹ

متعلق

اصلاح نصاب دار العلوم حیدرآباد،

بموجب مراسلہ ناظم صاحب سابق نواب عماد الملک بہادر و مراسلہ ناظم صاحب حال مورخہ ۳۰ ماہ الٰہی ۱۳۱۸ھ ہجری نشان (۲۳۰۲) دار العلوم کی نصاب اور مدت تعلیم مین جو تغیر اور اصلاح مین نے کی ہے، اور جس کا نقشہ اس یادداشت کے ساتھ منسلک ہے، اس کی نسبت مین ایک علحدہ مفصل یادداشت پیش کرتا ضروری سمجھتا ہون، جس سے یہ ظاہر ہوگا کہ ترمیم اور اصلاح کن اصولون پر کی گئی ہی، اور ترمیم اور اصلاح کی جہات کیا کیا ہین؛

نصابِ دار العلوم کی ترتیب دینے کے وقت سب سے پہلے یہ امر پیش نظر ہونا چاہئے
کہ دار العلوم کا اصلی مقصد کیا ہے، اور کس قسم کے لوگ اس سے پیدا کرنے مقصود ہیں،
دار العلوم جب تک پنجاب یونیورسٹی سے متعلق رہا، اس کی غرض صرف ایسے لوگون
کا پیدا کرنا تھا، جو سرکاری دفاترمین کام کرنے کے لایق ہون، اور اس مقصد مین دار العلوم
نمایان طور پر کامیاب رہا، لیکن اب جبکہ دار العلوم خود مختار اور آزاد ہوگیا ہے، اس کے
مقاصد زیادہ وسیع ہوگئے ہین، اس کی غرض اب ایسے اشخاص کو پیدا کرنا ہے، جو نہ صرف سرکاری
دفاتر مین کام کرنے کے قابل ہون، بلکہ اس سے ایسے اشخاص بھی پیدا ہون جو شرعی خدمات
انجام دینے کے قابل ہون، جو علوم دینیہ مثلاً تفسیر، حدیث، فقہ، ادب مین کمال رکھتے ہون،
جو ملک مین مذہبی عالم کی حیثیت سے تسلیم کئے جاسکتے ہون اور اس بنا پر ان کی ہدایت اور
تلقین کا عامۂ اہل اسلام پر اثر پڑسکے، اور وہ عوام مین عمدہ اخلاق اور مذہبی خیالات پھیلا
سکین، جو علوم قدیمہ کے ساتھ جدید علوم و فنون اور جدید خیالات سے بھی آشنا ہون تاکہ
جدید تعلیم یافتہ گروہ پر اُن کا اثر پڑ سکے،

یہ امر بھی خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ اس وقت تک جو تعلیم جدید تمام ہندوستان
مین جاری ہے، اس کی نسبت تمام اہل الرائے نے تسلیم کرلیا ہے کہ وہ ہماری ضرورتون
کے لئے کافی نہین، لیکن چونکہ بغیر اس طریقۂ تعلیم کے سرکاری نوکریان حاصل نہین ہوسکتین
اس لئے چار ناچار، اسی طریقہ کو اختیار کرنا پڑتا ہے، لیکن یہ ظاہر ہے کہ اس طریقۂ تعلیم
مین ہماری مذہبی اور قومی خصوصیات کا کوئی انتظام نہین، اس مین نہ مذہبی تعلیم ہے،
نہ قومی تاریخ سے کچھ واقفیت ہوسکتی ہے، نہ اسلامی اخلاق، اور مسائل اخلاق کا علم ہوسکتا
ہے، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ ایک شخص گو بی اے اور ایم اے کی ڈگری حاصل کرلے لیکن اسلامی

مسائل اسلامی تاریخ، اسلامی اخلاق کے متعلق، اس کی واقفیت، اور اس کا پوزیشن اس سے کچھ زیادہ نہیں ہو سکتا، جو ایک عامی مسلمان کا ہو سکتا ہے،

بااین ہمہ ہندوستان میں اس مشکل کا کچھ علاج نہیں ہو سکتا، اس لئے کہ یونیورسٹی کا نصاب تعلیم، اس قدر وقت اور فرصت نہیں دے سکتا، کہ دوسری چیزوں کے حاصل کرنے کیلئے موقع ہاتھ آئے،

لیکن چونکہ ریاست نظام ایک وسیع مملکت ہے، اور اس وقت تک اس نے سرکاری نوکریوں کے لئے یونیورسٹی کی ڈگریوں کی قید لازمی نہیں قرار دی ہے، اس لئے اس کو موقع ہے، کہ موجودہ طریقۂ تعلیم کے علاوہ، ایک ایسا خاص سلسلۂ تعلیم بھی قائم کرے جس میں انگریزی تعلیم کے ساتھ اسلامی علوم اور اسلامی تاریخ بھی شامل ہو اور جس کا نتیجہ گویا دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں، اس قسم کی تعلیم کا انتظام دار العلوم میں ہو سکتا ہے، اور ہم کو موجودہ نصاب کے مرتب کرنے میں اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھنا چاہئے،

اغراض مذکورۂ بالا کے لحاظ سے نصاب موجودہ میں، جو تغیر اور اضافہ کیا گیا ہے اس کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

(۱) ہر فن کی تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی کتابیں درس میں رکھی جائیں جنمیں تمام مسائل نہایت سادہ، صاف اور واضح طریقے سے بیان کئے گئے ہوں تاکہ طالب العلم بہ آسانی تمام مسائل پر حاوی ہو جائے، اس بنا پر وہ کتابیں جو معما اور چیستان کے طور پر اس قدر مختصر اور مغلق لکھی گئی ہیں کہ ایک ایک سطر میں ایک ایک صفحے کے مطالب لکھ دیئے گئے ہیں، وہ خارج کر دی گئیں،

(۲) قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں ہیں جنمیں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کر دیئے گئے

ہین، اس لئے خلط بحث کی وجہ سے طالب العلم، اس فن کے مسائل سے دور پڑجاتا ہے، مثلاً ملاحسن، میر زاہد، قاضی مبارک وغیرہ کہ یہ کتابین در اصل منطق مین ہین لیکن ان مین فلسفہ اور امور عامہ کے دقیق مسائل اس قدر شامل کر دیے ہین کہ اصل فن کے مسائل پر گویا پردہ پڑ گیا ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہ تمام کتابین پڑھ کر بھی طالب العلم کو خاص منطقی مسائل کی مشق نہین ہوتی اور یہ نہین کر سکتا کہ تقریر اور مناظرے مین اپنے دعوٰن کو اشکال منطقی کے ذریعے سے ثابت کر سکے،

اس بنا پر نصاب حال مین ہر فن مین وہی کتابین رکھی گئی ہین جنمین خالص اسی فن کے مسائل استیعاب کے ساتھ مذکور ہین،

(۳) قدیم نصاب مین، قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ نہایت کم ہے، قرآن مجید کا متن تک درس مین نہین، تفسیرون مین صرف دو تفسیرین درس مین داخل ہین، ایک جلالین جس کے الفاظ اور قرآن مجید کے الفاظ عدد مین برابر برابر ہین اور دوسری بیضاوی جس کے صرف ڈھائی پارے پڑھائے جاتے ہین، جو کتاب کا پندرھوان حصہ بھی نہین، اس لئے قرآن مجید کی تعلیم کا حصہ زیادہ وسیع کیا گیا ہے،

(۴) قدیم نصاب مین ادب اور لٹریچر کا حصہ نہایت کم ہے، حالانکہ ادب کے بغیر تفسیر، حدیث، اصول فقہ کسی چیز مین کمال نہین حاصل ہو سکتا، اس بنا پر، ادب کا نصاب بہت بڑھا دیا گیا ہے،

(۵) یہ عام شکایت ہے کہ عربی خوان، سب کچھ پڑھ جاتے ہین، لیکن چند سطرین صحیح عربی نہین لکھ سکتے، اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ادب کی تعلیم کم تھی، دوسری یہ کہ انشاپردازی اور مضمون نگاری کی مشق نہین کرائی جاتی تھی، اس لیے نصاب حال مین انشاپردازی

کے لئے خاص گھنٹے مقرر کئے گئے،

(۶) عقائد و علم کلام مین صرف ایک کتاب اور وہ بھی معمولی درجہ کی درس مین تھی یعنی شرح عقائد نسفی، حالانکہ یہ فن تمام اسلامی فنون پر مقدم اور سب کا اصل الاصول ہے، اس لئے اس فن مین متعدد اور بلند پایہ کتابین نصاب مین رکھی گئین،

(۷) تاریخ اسلام اور عام تاریخ کی ایک کتاب بھی نہ تھی، اس لئے اس فن کی کتابین بھی داخل کی گئین،

(۸) علوم جدیدہ کی بعض کتابین جو عربی مین ترجمہ ہو گئی ہین نصاب مین شامل کی گئین لیکن اس موقع پر یہ ظاہر کر دینا ضرور ہے کہ ان کے پڑھانے کا انتظام مشکل ہے ہمارے علما ان کتابون کو پڑھا نہین سکتے، اور انگریزی خوان عربی زبان سے آشنا نہین، یہ ہو سکتا تھا کہ اردو مین جو کتابین موجود ہین، وہ داخل نصاب کر دی جائین، لیکن جہان تک مجھ کو معلوم ہے طبیعیات کی جو کتابین اردو مین موجود ہین، وہ مڈل کے رتبہ سے زیادہ نہین، اس کے سوا عربی خوان طلبا اردو زبان کی کتاب کو وقعت کی نظر سے نہین دیکھ سکتے، اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ ایسے پروفیسر مقرر کئے جائین جنھون نے بی اے مین سائنس لیا ہو اور عربی زبان ان کی سکنڈ لینگویج رہی ہو،

(۱۰) انگریزی زبان بطور سکنڈ لینگویج کے لازمی قرار دی گئی ہے، مین انگریزی زبان سے واقف نہین ہون، اس لئے مین نے انگریزی کتابون کا نام نہین لکھا ہے لیکن اس قدر تجویز کیا جاتا ہے کہ موجودہ نصاب مین اس قدر گنجائش ہے کہ انگریزی زبان دانی کی کتابین انٹرنس تک کی اس مین شامل کیجا سکتی ہین، اور درجۂ فاضل کے بعد، دو برس اس غرض سے رکھے گئے ہین کہ جو شخص چاہے دو برس تک صرف انگریزی زباندانی کی تعلیم

حاصل کرے جس سے وہ انگریزی زبان پر بخوبی قادر ہو سکتا ہے،

(۱۰) نصاب سابق مین ابتدا سے اخیر تک مدت تعلیم ۱۹ برس تھی، لیکن یہ مدت بہت زیادہ تھی، اس لیے گھٹا کر کل مدت ۱۴ برس قرار دی گئی ہی،

(۱۱) نصاب مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت ۵ سال قرار دی گئی ہے، اور یہ فرض کیا گیا ہے کہ لڑکا ساتوین برس کے سن سے دار العلوم کی ابتدائی جماعتون مین لیا جائیگا، یہ تعلیم پانچ برس مین تمام ہوگی، اور اس مین اُردو اور ابتدائی فارسی اور حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہوگی،

اس درجہ کے بعد دو الگ شاخین شروع ہون گی یعنی منشی اور عالم اور طالب العلم کو اختیار ہوگا کہ ان دونون شاخون مین سے جس شاخ کو چاہے اختیار کرے،

منشی کے ۳ سال، اور منشی عالم کے ۲ سال اور منشی فاضل کا ایک سال مقرر کیا گیا ہے، منشی فاضل تک طالب العلم کو فارسی زبان مین عمدہ مہارت اور عربی کی سواد خوانی اور انگریزی بقدر عام ضرورت آجائیگی،

عربی کے دو درجے قرار دیئے گئے،

عالم، اس کی مدت تعلیم ۶ برس ہے، یہ درجہ بی اے کے برابر ہے، اس مین تمام علوم متداولہ عربی اور بعض علوم جدیدہ اور انگریزی زباندانی انٹرنس کے درجہ تک آجائیگی، یہ میری خاص رائے ہے لیکن اگر یہان کے حالات کے لحاظ سے ضروری ہو تو بیچ مین ایک اور درجہ مولوی یا ملا کے نام سے قائم کیا جائے، اور یہ درجہ پانچوین سال تک تمام ہو جائے، اس کے بعد تین برس عالم کے لئے رکھے جائین،

فاضل، اس کی مدت تعلیم دو برس ہے، اور یہ درجہ ایم اے کے برابر ہے، اسمین

کسی ایک خاص فن کی پوری تعلیم ہوگی، اور طالب العلم اس خاص فن کی تکمیل کریگا، اور اسی فن کے انتساب سے موسوم ہوگا، مثلاً مفسر، ادیب، فقیہ وغیرہ،

عالم یا فاضل کے درجے کے بعد ضرور ہے کہ چند طلبا کو دو برس تک خالص انگریزی زبان سکھائی جائے تاکہ انگریزی زبان مین تحریر اور تقریر کا ملکہ ہو، اور ایسے علما پیدا ہون کہ یورپ کی علمی تحقیقات کو اسلامی علوم مین اضافہ کرسکین، اور انگریزی دان جماعت کے مجمع مین انھین کی زبان اور خیالات مین اسلامی عقائد اور مسائل پر تقریر کرسکین،

(۱۲) نصاب تعلیم کے نقشے کے ملاحظے سے چونکہ ہر فن کی کتابین یکجائی طور پر پیش نظر نہ ہون گی، اس لئے اس موقع پر ہر فن کی الگ الگ کتابین یکجا لکھدی جاتی ہین جس سے بیک نظر اس بات کے اندازہ کرنے کا موقع ملے گا، کہ ہر فن مین کس پایہ کی، اور کس قدر کتابین نصاب مین تجویز کی گئی ہین،

ادب ومعانی وبیان

اخوان الصفا، اطباق الذہب عبد المؤمن اصفہانی، سبعہ معلقہ، مجموع الادب، حسن التوسل الی صناعۃ الترسل، مختصر المعانی، متنبی، یتیمۃ، ابن المقفع، مقامات حریری، حماسہ، نقد الشعر ابن قدامہ، نہج البلاغۃ، اسرار البلاغۃ عبد القاہر الجرجانی، کتاب الصناعتین ابو ہلال عسکری،

فقہ واصول فقہ

قدوری، سراجی، در مختار، ارکان اربعہ مولانا بحر العلوم، ہدایہ، نور الانوار، تحریر ابن الہمام، مسلم الثبوت، توضیح وتلویح، رسالہ امام شافعی،

قرآن مجید وتفسیر

الہدایہ الی الصراط المستقیم، فوز الکبیر فی اصول التفسیر، جلالین، بیضاوی، احکام القرآن

ابوبکر رازی،

فلسفہ

ہدیہ سعیدیہ، شرح ہدایۃ الحکمت از خیرآبادی، شرح اشارات رازی وطوسی، شرح حکمۃ الاشراق، شمس بازغہ، دروس الاولیہ فی العلوم الجدیدہ، ہیأت جدیدہ،

کلام و اسرار الدین

رسالۃ التوحید، معالم امام رازی، حجۃ اللہ البالغہ،

اس یادداشت اور نصاب پر غور کرنے کے لئے ایک کمیٹی قرار پائی، جس کا اجلاس شعبان ۱۳۲۶ھ مین قرار پایا، لیکن چونکہ عین اسی زمانہ مین ندوہ کی خاص ضرورت سے مجھکو لکھنؤ واپس آنا پڑا، اس لئے وہ اجلاس ملتوی ہو گیا، اس کے بعد مین ۲۳ جنوری ۱۹۰۹ء کو پھر حیدرآباد آ گیا، اور ایک کمیٹی مین نصاب مرتبہ پیش کیا گیا، اس کمیٹی مین مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت و افسر تعلیمات شمس العلماء مولوی سید علی صاحب بلگرامی، مولوی انوار اللہ صاحب استاد حضور نظام، سید ابوبکر شہاب یمنی، مولوی عبد الحلیم صاحب شرر مددگار ناظم تعلیمات اور دیگر اصحاب شریک تھے، لیکن چونکہ اس کمیٹی مین کچھ مراتب باقی رہ گئے تھے، اس لئے ۱۰ فروری ۱۹۰۹ء کو اس کا پھر ایک اجلاس ہوا جس کے پریسیڈنٹ جناب نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت تھے، اور جس مین نواب عماد الملک بہادر، اور ڈاکٹر سید سراج الحسن ناظم تعلیمات بھی بحیثیت رکن کے شریک تھے،

دونون کمیٹیون مین آزادی سے ہر پہلو پر بحث ہوئی اور کسی قدر تغیر اور ترمیم کیساتھ نصاب مرتبہ منظور کیا گیا،

نواب عماد الملک بہادر کی رائے تھی کہ علوم عربیہ کے ساتھ انگریزی کی تعلیم نہین

ہو سکتی، اس لئے اس کو نصاب سے خارج کر دینا چاہئے، لیکن یہ جب ظاہر کیا گیا کہ علوم عربیہ مین بہت سی فضول کتابین جو منطق و فلسفہ کی شامل تھین خارج کر دی گئی ہین، اس لئے کافی گنجایش ہو سکتی ہے، تو نواب صاحب موصوف نے بھی اتفاق ظاہر کیا،

ہم کو اس پر کسی قدر تعجب ہوا کہ اس کیٹی مین نہایت متقشف اور پرانے خیال کے علما بھی شریک تھے تاہم انگریزی کے داخل کرنے سے کسی نے انکار نہین کیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حیدر آباد مین، ہندوستان کی بہ نسبت، روشنخیالی کا اثر زیادہ ہوتا ہے،

نصاب کے طے پانے کے بعد، اسی کے موافق، دار العلوم مین جدید اسٹاف قایم ہوگا اس کے ساتھ ایک مجلس بطور سینٹ کے قائم ہوگی اور اسی کے لئے فیلوز منتخب ہون گے اس طرح ایک مشرقی یونیورسٹی کی بنیاد قائم ہو جائیگی،

نہایت مسرت کی بات ہے کہ اس وقت افسران تعلیم، نواب فخر الملک بہادر وزیر عدالت اور مولوی عزیز مرزا صاحب معتمد عدالت اور سید سراج الحسن صاحب ناظم تعلیمات ہین، اس لئے ہر طرح پر امید ہے کہ یونیورسٹی عمدہ اور مستحکم اصول پر قایم ہوگی،

یہ ہم نے بار بار کہا ہے اور اب پھر کہتے ہین کہ ہم مسلمانون کے لئے نہ صرف انگریزی مدرسون کی تعلیم کافی ہے، نہ قدیم عربی مدرسون کی، ہمارے درد کا علاج ایک معجون مرکب ہے جس کا ایک جزء مشرقی اور دوسرا مغربی ہے،

درکفے جام شریعت در کفے سندان عشق ہر ہوسناکے نداند جام و سندان باختن

(الندوہ ج ۹ نمبر ۲، مارچ ۱۹۱۲ء)

احیارِ علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل

ضبط کرون مین کب تک آہ — چل رے خامہ بسم اللہ

جدید تعلیم کے فرزندانِ رشید مین سے ایک صاحب نے جو اپنے آپ کو "ریڈیکل" کہتے ہین، علی گڈھ منتھلی مین ایک مضمون "احیار علوم عربیہ" کے عنوان سے لکھا ہے، مضمون کا شانِ نزول وہ تحریک ہے جس کا منشا یہ ہے، کہ علی گڈھ مین علوم عربیہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے، یہ تحریک ایک انگریزی پروفیسر کی طرف سے پیش ہوئی تھی، جس کی نسبت یہ کہا جاتا ہے، کہ خود گورنمنٹ کے ایما کا بھی اس مین شائبہ تھا،

ہمارے قومی لیڈرون نے نہایت دلیری، نہایت آزادی، نہایت استقلال سے اس تجویز کی مخالفت کی، اور دنیا پر ثابت کر دیا، کہ ایسے ضروری موقع پر جب کہ احتمال تھا کہ مسلمانون کی قوم اس تجویز سے دفعۃً بربادہو جائے، نکتہ چینون کو یہ اعتراض واپس لینا پڑیگا کہ ہمارے لیڈر کسی انگریز افسر کی تحریک کی مخالفت نہین کر سکتے،

لیکن اس وقت تک مخالفت کی جو وجہ ارکانِ کالج یعنی نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد صاحب نے اپنے پرزور آرٹیکلون مین ظاہر کی، وہ صرف یہ تھی کہ ابھی یہ وقت نہین آیا کہ مسلمانون کو انگریزی تعلیم سے ایک منٹ کے لئے بھی دوسری چیزون

کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دیجائے،

اگرچہ یہ امر کچھ کم تعجب انگیز نہ تھا، کہ ایسا کالج جس کے نام کے ساتھ اورنٹیل کا لفظ شامل ہے، جو ہمیشہ تحریرون اور تقریرون کے ذریعہ سے مسلمانون کی قومی اور مذہبی تعلیم کے مرکز ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، جو اپنے سماعت کو ایران تک وسیع کرکے وہان کے لوگون کو اپنے دائرۂ اثر مین لانا چاہتا ہے، جس کی مجوزہ یونیورسٹی کی ایک بڑی خصوصیت علوم مذہبی کا احیاء ہے، عربی تعلیم کی طرف سے صریح ایسی بے اعتنائی کا اعلان کرے کیونکہ یہ بالکل ممکن تھا کہ انگریزی تعلیم کو بغیر کسی قسم کے نقصان پہنچانے کے عربی تعلیم کا بھی بقدر ضرورت انتظام کیا جاتا، تاہم ان بزرگون نے نفس علوم عربیہ پر کوئی حملہ نہین کیا تھا، جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ علوم عربیہ کے پڑھنے سے (جیسا کہ ریڈیکل صاحب نے بیان کیا ہے) طبیعت مین آزادی اور دلیری نہین پیدا ہوتی، اور بزرگان ممدوح علوم عربیہ ہی کے تعلیمیافتہ ہین،

لیکن ریڈیکل صاحب تعلیم جدید کے یادگار ہین، اس لئے وہ نہایت آزادی اور دلیری سے آگے بڑھے اور اصل راز کا پردہ اٹھا دیا یعنی یہ کہ علوم عربیہ خود اس قابل نہین کہ ان کی تعلیم پر وقت ضائع کیا جائے، ان کے مقتبس فقرے بعینہ حسب ذیل ہین :-

"بہر صورت ہمین اس رائے سے بالکل اختلاف ہے کہ عربی مین ایسے علوم موجود ہین جن کی تعلیم ہمارے دماغون مین روشنی، دلون مین صفائی، خیالات مین پاکیزگی، ارادون مین بلندی اور طبیعتون مین استقلال پیدا کریگی"

ہم جہان تک سمجھتے ہین، عرب ہمیشہ ایک نہایت جاہل اور وحشی قوم رہے ہین شائستگی اور تہذیب سے ان کو بہت کم حصہ ملا ہے، لہذا ان کی زبان مین علوم و فنون کے کسی عمدہ

ذخیرہ کا موجود ہونا بعید از قیاس ہے" ۱۱

(صدق قناد آمنا)

ایسی حالت مین جبکہ رسول کا نواسہ تشنہ لب کربلا مین شہید کیا جائے صحابہؓ کی داڑھیان نوچی جائین، اور مسجد نبوی مین گھوڑے کی لید ڈالی جائے، علوم و فنون کی کیا خاک اشاعت و تدوین ہوسکتی ہے"

"زمانۂ جاہلیت کا کل نظم کا ذخیرہ عربون کی خانہ جنگیون اور خونریزی کے قصص یا اونٹنی کی لمبی اور کھجور کی خاردار شاخ کی تعریف اور توصیف سے پر ہے کسی قسم کے علمی مضامین کا اس مین پتہ نہین"

"پچھلے زمانہ کے کلام مین سوائے عیش پرست خلفاء اور ان کے مرحین معشوقوں کی تعریف اور شراب و کباب کی توصیف کے کیا رکھا ہے؟ ایسی گندہ اور بیکار نظم کو پڑھنے سے بجز تخریب اخلاق کے کیا فائدہ ہوسکتا ہے؟"

"کہا جاتا ہے کہ فن تاریخ مین عربون نے بہت ترقی کی تھی، وہ تاریخین بیشتر تو عمدہ دیباچون اور حواشی کے اضافہ کے ساتھ یورپ کی زبانون مین ترجمہ ہوگئی ہین، ان کا مطالعہ اصل عربی کتابون سے بہت زیادہ مفید ہے"

(یہان تک ریڈیکل صاحب کے فقرون کا اقتباس تھا)

سب سے پہلے قابل لحاظ یہ امر ہے کہ احیاء علوم عربی کے مسئلہ پر ریڈیکل صاحب کو اس پہلو سے بحث کرنے کی کوئی ضرورت بھی تھی یا نہین؟

ہم ریڈیکل صاحب اور تمام مخالفین عربی سے پوچھتے ہین کہ اگر تھوڑی دیر کیلئے بفرض محال یہ تسلیم کر لیا جائے کہ عربی مین قابل قدر ذخیرۂ علمی موجود ہے، تو وہ کیا عربی تعلیم

کو جائز رکھیں گے؟ مسٹر مارین نے عربی کے ساتھ ساتھ جدید سائنس کی تعلیم کی اسکیم بھی پیش کی تھی، کیا مخالفین عربی نے اس اسکیم کی تائید کی؟ کیا سائنس بھی عربی کی طرح قابل التفات نہیں ہے؟ یہ امر قابل لحاظ ہے کہ کیا جدید گروہ علم کو علم کے لئے پڑھتا ہے، کیا اگر انگلش تعلیم سرکاری ملازمت کا ذریعہ نہ ہے، تو ایک شخص بھی کسی کالج کے احاطہ میں نظر آئیگا؟ کیا کالج سے نکلنے کے بعد بھی انگریزی کے ذخائر علمی کو اس گروہ کے دربار میں باریابی کی عزت ملتی ہے؟

جب یہ حالت ہے تو احیاء عربی کی تجویز سے انکار کے لئے صرف یہ وجوہ کافی تھے کہ ہماری زندگی اور ہماری تعلیم کا مقصد سرکاری ملازمت اور نوکری ہے، اور یہ عربی علوم سے حاصل نہیں ہو سکتی، یہ بالکل سچا استدلال تھا جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا تھا،

رینڈیکل صاحب کی غرض اگر بالذات علوم عربیہ کی تنقیص اور تحقیر تھی، تو اس کیلئے مستقل عنوان اختیار کرنا تھا، احیاء علوم عربیہ کے مسئلہ سے اس کو کوئی تعلق نہ تھا،

شاید رینڈیکل صاحب کو یہ خیال ہو کہ اگر علوم عربی کی فضیلت ثابت ہو گی، تو ممکن ہے کہ کچھ طلبا اس طرف بھی متوجہ ہو جائیں لیکن ہم اُن کو پورا اطمینان دلاتے ہیں، کہ جدید گروہ ایک عاقبت اندیش اور عملی گروہ ہے، اس نے اپنا راستہ متعین کر لیا ہے اور وہ ہرگز اس فریب میں نہیں آسکتا، کہ علم کو علم کے لئے سیکھنا چاہیئے،

اب ہم رینڈیکل صاحب کے ان جملوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو انھوں نے علوم عربی کی نسبت ارشاد فرمائے ہیں، لیکن ہم حیران ہیں کہ اُن کے مقابلہ میں طریقۂ استدلال کیا ہوگا، یورپ کے اہل فن جو زبان عربی سے ماہر ہونے کی وجہ سے اس مسئلہ کے

فیصلہ کرنے کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہین، مثلاً پروفیسر سیدیو، پروفیسر لیبان، پروفیسر رینان، پروفیسر مونک (فرنچ کے مشہور مصنف ہین) پروفیسر براؤن، ہنری لوئس، پروفیسر زخاؤ (جرمن کا مشہور عربی دان فاضل ہے) وغیرہ وغیرہ، ان کی نسبت ریڈیکل صاحب کو بدگمانی ہے، کہ وہ قصداً مسلمانون کو نشۂ غفلت مین مخمور رکھنے کے لئے مداح ہین۔

ہم خود اگر مسلمانون کے علمی کمالات اور ایجادات کی مثالین پیش کرین تو مشکل یہ ہے کہ ریڈیکل صاحب عربی نہین جانتے، اور تاریخ دانی کا یہ حال ہے، کہ فرماتے ہین کہ "خلیفہ اول و دوم کے وقت تک قرآن مجید بھی مرتب نہین ہوا تھا"!!

ریڈیکل صاحب کے استدلال کا سنگ بنیاد یہ ہے کہ "عرب ایک وحشی قوم ہے، اسلئے ان کی زبان مین علمی ذخیرہ کا ہونا بعید از قیاس ہے" لیکن اگر عرب کا وحشی ہونا تسلیم بھی کرلیا جائے تو اس سے اس دعوی کو کچھ مدد نہین پہنچتی، عربی زبان مین جن لوگون نے علمی ذخیرے مہیا کئے، وہ عجمی تھے، مثلاً فارابی، بوعلی سینا، رازی، غزالی، محقق طوسی، قطب الدین شیرازی وغیرہ اور عجم کو غالباً ریڈیکل صاحب بھی وحشی کا خطاب دینا پسند نہین کرتے۔

پروفیسر رینان نے جو اسلام کے ساتھ تعصب رکھنے مین مشہور ہے، فرانس کے اکاڈمی مین ایک لکچر دیا تھا جس کا موضوع یہ تھا کہ "اسلام اور علم دونون جمع نہین ہوسکتے" اس لکچر مین جہان مجبوراً اس کو مسلمانون کی علمی اور فلسفی تحقیقات کا ذکر کرنا پڑا، اس نے یہ کہا "ہان فلسفہ عربی زبان مین ہے لیکن عربون مین نہین ہے"۔

رینان نے اگرچہ اہل عرب کے فلسفہ دانی سے انکار کیا، لیکن اس سے انکار نہ کر سکا، کہ عربی زبان فلسفہ کا مخزن ہے، لیکن ریڈیکل صاحب یہ بھی گوارا نہین کر سکتے

کہ عربی مین علوم و فنون کا ذخیرہ موجود ہو،

"ریڈیکل" صاحب فرماتے ہین کہ "لٹریچر مین عربون کے پاس نثر مین تو کوئی عمدہ ذخیرہ ہی نہین، اور نظم کی یہ کیفیت ہے کہ زمانہ جاہلیت کی نظم، اونٹنی کی لمبی گردن اور زمانہ اسلام کے مہ جبین معشوقون کی توصیف پر محدود ہے"، یہ بالکل اسی قسم کی بات ہے کہ پرانے مولوی یورپ کے علوم و فنون کی نسبت کہتے ہین کہ "یہ لوگ بجز اس کے کہ لوہارون اور نجارون کی طرح کچھ کلین بنا لین، یا جراحون کی طرح کچھ چیر پھاڑ لین، اور کیا جانتے ہین"

افسوس!

از رہ وہم قبول تو فارغ نشستہ ایم   اے آنکہ خوب مانہ شناسی ز زشت ما

عرب کے فلسفہ اور علوم و فنون کی تحقیر کا تو کوئی ضعیف پہلو نکل بھی سکتا تھا، لیکن عرب کی فصاحت و بلاغت شاعری اور زبان آوری سے انکار کرنا، آفتاب کی روشنی سے انکار کرنا ہے، شاعری کی جو اصل حقیقت ہے یعنی مناظر قدرت، اور جذبات انسانی کو اس طرح ادا کرنا، کہ دلون پر اصلی حالت کا اثر چھا جائے، صرف عرب کی شاعری مین پائی جاتی ہے، عرب کا ایک ایک بدوی یہ قدرت رکھتا تھا، کہ اپنے زور کلام سے جم غفیر کو جس ارادہ سے چاہتا تھا روک لیتا تھا، اور جدھر چاہتا تھا جھونک دیتا تھا، خلفاء بنو امیہ دمشق مین نہایت جاہ و جلال سے سلطنت کرتے تھے، لیکن اپنے بچون کو صرف اس لئے عرب کے صحرا مین بھیج دیتے تھے، کہ بدؤن مین رہ کر ان کو قوت تقریر اور زبان آوری کا ملکہ حاصل ہو جائے، عرب کا ایک ایک شعر قوم کی قوم مین جوش پیدا کر دیتا تھا، آج گلیڈاسٹون اور برک کی اسپیچین وہ کام نہین کر سکتین جو عمرو بن کلثوم کے ایک قصیدہ نے قبیلہ تغلب مین سیکڑون برس تک شرافت اور نوبلٹی کا جوہر قایم رکھا، چنانچہ یہ قصیدہ اس قبیلہ کے

ایک ایک بچہ کو یاد کرایا جاتا تھا، اس قصیدہ کا ایک شعر یہ تھا: ؎

اذا بلغ الفطام لنا صبی　　تخر له الجبابر ساجدینا

جس دن ہمارے خاندان کا بچہ دودھ چھوڑ دیتا ہے　　تو بڑے بڑے جبار اس کے سجدہ کو گر پڑتے ہیں

عرب ہی کو شاعری میں یہ فخر حاصل تھا، کہ وہ جو کہتے تھے سچ کہتے تھے، عرب ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ کسی کی مدح کرنا عار اور ننگ سمجھا جاتا تھا، اور جب اخیر زمانۂ جاہلیت میں مدح کی ابتدا ہوئی، تو یہ التزام تھا کہ سچی اور واقعی باتون کے سوا اور کچھ نہین کہتے تھے، ایک بادشاہ نے جب ایک شاعر سے کہا کہ میری مدح کرو تو اس نے صاف کہا کہ "افعل حتی اقول" یعنی "پہلے تم کچھ کر دکھاؤ تو مین کہون" زہیر بن ابی سلمی کو جب ہرم بن سنان نے ایک قصیدہ پر صلہ دیا، تو اس نے معمول کر لیا، کہ جب دربار مین آتا تھا تو کہتا تھا کہ "مین سب کو سلام کرتا ہون بہ استثنا ہرم بن سنان کے" یعنی بادشاہ کو سلام کرنا بھی ایک قسم کی خوشامد ہے، جو عرب کے شاعر کو زیبا نہین،

افسوس ہے کہ ریڈیکل صاحب اور اکثر ان کے ہم فن عربی زبان نہین جانتے، ورنہ ہم ان کو عربی زبان مین شاعری کے تمام انواع کے ایسے اعلیٰ درجہ کے نمونے دکھاتے جس کی نظیر ان کو بہت مشکل سے مل سکتی، مناظرِ قدرت مثلاً سبزہ زار، کوہستان، دریا، جنگل، گرمی کی شدت، جاڑون کی ٹھنڈ، ابر و باران وغیرہ، یا جذباتِ انسانی، مثلاً رنج و غم، غیظ و غضب، فخر و جوش، شجاعت و دلیری، ذوق و محبت وغیرہ کو جس خوبی سے عرب نے ادا کیا، ایشیا مین کون قوم اس کی مثال پیش کر سکتی ہے،؟

اخلاق کے متعلق ہم دو چار مثالین صرف ایک کتاب (حماسہ) سے سرسری طور پر انتخاب کر کے پیش کرتے ہین، اگر ریڈیکل صاحب کے نزدیک یہ شاعری کا عمدہ نمونہ

ہو تو ہم اس قسم کے اشعار کا دریا بہا دینے کو موجود ہیں[1]،

(۱) اذا ما اتت من صاحب لك زلة   فكن انت محتالاً لزلته عذرا

---

(۲) وللكف عن شتم اللئيم تكرماً   اضر له من شتمه حين يشتم

---

(۳) انّ من الحلم ذُلّاً انت عارفه   والحلم عن قدرة فضلٌ من الكرم

---

(۴) لهم جل مالي ان تتابع لي غنى   وان قلّ مالي لم اكلفهم رفدا

(۵) واني لعبد الضيف ما دام ثاوياً   وما شيمة لي غيرها تشبه العبدا

---

(۶) انا لنرخص يوم الروع انفسنا   ولو نسام بها في الامن أُغلينا

---

[1] چونکہ ہمارے دوست مسٹر ریڈیکل زبان عربی سے نابلد ہیں لہذا ان کی آسانی کی غرض سے ان اشعار کا ترجمہ نمبروار درج ذیل کیا جاتا ہی، لیکن ہمیں ڈر ہے کہ چونکہ ان اشعار میں گھوڑی کی خاردار شاخ اور دشمن کی لمبی گردن کی طرف اشارہ نہیں ہو اسلئے کہیں وہ یہ دعویٰ نہ کر بیٹھیں کہ ترجمہ غلط ہی،

(۱) اگر تمھارے دوست سے کوئی خطا ہو جائے تو تم کو خود اسکی طرف سے کوئی عذر گڑھ لینا چاہئے،

(۲) ذلیل آدمی کے برا کہنے سے باز رہنا اسکو گالی دینے سے زیادہ تکلیف دہ ہی،

(۳) بعض موقع پر بردباری ذلت ہی، لیکن قدرت کے ہوتے بردباری کرنا شرافت ہی،

(۴) میرا مال میرے بھائیوں کا مال ہی، اور اگر میں غریب ہو جاؤں تو میں انکو تکلیف نہ دونگا،

(۵) میں مہمان کا غلام ہوں، لیکن اس معاملہ کے سوا مجھ میں غلامی کی کوئی ادا نہیں،

(۶) ہم لڑائی کے دن اپنی جانیں ارزان کر دیتے ہیں، لیکن امن کی حالت میں ہماری جانوں کی قیمت بہت گراں ہی،

(۷) انی لمن معشرٍ أفنی اوائلھم — قول الکماۃ الا أین المحامونا"

(۸) لو کان فی الالف منا واحدٌ فدعوا — من فارس؟ خالھم ایاہ یعنونا

(۹) اذا الکماۃ تنحوا ان یصیبھم — حدّ انظباۃ وصلناھا بایدینا

---

(۱۰) اذا المرء لم یدنس من اللؤم عرضہ — فکل رداءٍ یرتدیہ جمیل

(۱۱) تعیّرنا أنا قلیل عدیدنا — فقلت لھا انّ الکرام قلیل"

(۱۲) تسیل علی حد انظبات نفوسنا — ولیست علی غیر انظبات تسیل

(۱۳) اذا سید منا خلا قام سید — قؤول لما قال الکرام فعول

---

(۷) مین اُس قبیلہ کا آدمی ہون جن کے اسلاف کو اس آواز نے فنا کر دیا کہ "آج کون پناہ دینے والا ہے"

(۸) اگر ہمارے قبیلہ کا ایک آدمی ہزارون کے مجمع مین ہو اور کوئی شخص پکارے کہ شہ سوار کون ہے؟ تو ہمارے قبیلہ کا آدمی سمجھ جائیگا کہ میری ہی طرف اشارہ ہے،

(۹) جب بہادر لوگ تلوار کی دھار سے کترا جاتے ہین، تو ہم بڑھکر تلوار کو اُن تک پہنچا دیتے ہین،

(۱۰) اگر آدمی دنارت سے اپنی آبرو مین داغ نہ لگائے، تو جو لباس وہ پہنے گا اسکو زیب دیگا،

(۱۱) وہ ہمکو عیب لگاتی ہے، کہ ہمارے آدمی کم ہین، مین نے اس سے کہا کہ "شرفا تھوڑے ہی ہوتے ہین"

(۱۲) ہماری جان تلوارون کے دھار پر بہتی ہے، لیکن اور کسی چیز پر نہین بہتی،

(۱۳) ہم مین کا جب ایک سردار اٹھ جاتا ہے تو دوسرا پیدا ہوتا ہے جو وہی کہتا ہے اور کرتا ہے جو اور سردارون نے کہا تھا اور کیا تھا

(۱۴) معوّدۃ ان لاتسل نصالہا فتغمد حتّیٰ یُستباح قبیل

"ریڈیکل" صاحب فرماتے ہین کہ عربی تاریخین، مفید حواشی کے ساتھ یورپ کی زبانون مین ترجمہ ہوگئی ہین، ان کا مطالعہ اصل عربی کتابون سے زیادہ مفید ہے،

ہم "ریڈیکل" صاحب سے پوچھتے ہین کہ یورپ کی زبانون سے کیا مراد ہے؟ اگر انگریزی مراد ہے تو مدعی سست ...... کی مثال ہے، تمام انگریزی مصنفین تسلیم کرتے ہین کہ عربی زبان کا سرمایہ انگریزی مین بہت کم ہے، دوچار معمولی اور متداول کتابون کے سوا انگریزی مین اس قسم کے تراجم بالکل ناپید ہین، ہم ایک نقشہ درج کرتے ہین جس سے ظاہر ہوگا کہ یورپ کی زبانون مین عربی تاریخ کی کس قدر کتابین ترجمہ ہوچکی ہین، اور ان مین انگریزی کا کس قدر حصہ ہے،

نمبر	نام کتاب	کس زبان مین ترجمہ ہوا	سنہ ومقام طبع
۱	تاریخ حمزہ اصفہانی	لاطینی	لیپزگ سنہ ۱۸۴۰ء
۲	مسعودی	فرنچ	پیرس سنہ ۱۸۷۷ء
۳	ابوالفدا	لاطینی	کانپگن سنہ ۱۷۹۴ء
۴	تاریخ الدول الاسلامیہ	"	اپسلا سنہ ۱۸۴۶ء
۵	رسالہ افادۃ والاعتبار	فرنچ	پیرس سنہ ۱۸۱۰ء
۶	سیرۃ سلطان صلاح الدین	لاطینی	لیڈن سنہ ۱۸۵۵ء
۷	تاریخ ابن خلکان	انگریزی	
۸	کتاب الاعتبار لاسامۃ بن منقذ	فرنچ	
۹	تاریخ کلبی	جرمن	ڈسٹین فیلڈ سنہ ۱۸۵۷ء

(۱۴) ہماری تلوارون کو عادت ہے کہ جب میان سے باہر آئین تو جب تک ایک قبیلہ برباد نہ ہوجائے وہ میان مین نہین آتین

مختصر الدول اور تاریخ المکین وابن البطریق کا ترجمہ بھی یورپ کی زبانون مین ہوگیا ہے، لیکن ان کتابون کے مصنف عیسائی تھے، اس لئے ہم ان کتابون کو عرب مورخین کے تصنیفات مین شمار نہین کرتے،

اس نقشہ سے واضح ہوا ہوگا کہ ایک دو کتابون کے سوا باقی کا ترجمہ انگریزی مین نہین ہوا، بلکہ لاطینی وغیرہ مین ہوا ہے، ان سے متمتع ہونے کا طریقہ رینڈیکل صاحب کیا قرار دیتے ہین؟ کیا وہ اس بات پر راضی ہین، کہ علیگڈھ کالج مین لاطینی اور فرنچ وغیرہ کی تعلیم کی شاخ کھولی جائے؟ اگر ان کا ایسا ارادہ ہو، تو ہم خوشی سے عربی تعلیم کی تحریک کو واپس لیتے ہین،

لیکن اصلی سوال یہ ہے کہ کیا مذکورہ بالا کتابون کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ عربی تاریخ کا سرمایہ یورپ کی زبانون مین منتقل ہوگیا ہے، عربی کی نایاب اور غیر مطبوعہ تاریخین تو ایک طرف مشہور متداول کتابون کا بھی ترجمہ نہین ہوا، ابن خلدون، ابن اثیر، طبری کو بچہ بچہ جانتا ہے، ان کا ترجمہ کس زبان مین ہوا، ؟ اور کیا ان کتابون کے ترجمہ کے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے، کہ یورپین زبانون مین عربی کا سرمایہ منتقل ہوگیا ہے، کشف الظنون مین جس قدر عربی تاریخون کے نام مذکور ہین، ان کی تعداد تیرہ سو ہے، کیا اس خزانہ مین سے پانچ سات تاریخی کتابون کے ترجمہ کی بنا پر عربی سے بے نیازی کا دعوی کیا جا سکتا ہے؟

عربی تاریخ کا جو اصلی خزانہ ہے، یعنی محدثین کی تصنیفات، اس تک ابھی یورپ کی نگاہ ہی نہین پہنچی، تا بہ ترجمہ چہ رسد، رجال و تراجم کی سیکڑون ہزارون کتابون مین سے کس کتاب کا یورپین زبانون مین ترجمہ ہوا ہے، ؟

یورپ مین عربی تاریخ کی کتابین نہایت کثرت سے شایع ہوئی ہین، لیکن ترجمہ

نہیں، بلکہ یورپ نے ان کو اصل زبان ہی میں پڑھنا پسند کیا، اور ریڈیکل صاحب کی اس رائے پر عمل نہیں کیا، کہ ترجموں کے ذریعہ سے ان پر نظر ڈالنی چاہیے، ریڈیکل صاحب فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں ایسے معلومات نہیں جن سے ارادوں میں بلندی اور طبائع میں استقلال پیدا ہو"

آزادی اور استقلال زیادہ تر تاریخی معلومات کا خاصہ ہے، جب ہم کسی ملک کی تاریخ میں آزادی اور استقلال کی مثالیں پڑھتے ہیں، تو طبیعت میں خود بخود ان جذبات کی تحریک ہوتی ہے، عرب کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے لبریز ہے، آزادی عرب کا مایۂ خمیر ہے، بلند خیالی، دلیری، آزادی، حوصلہ مندی کی جو مثالیں تاریخ عرب کے ہر صفحہ میں ملتی ہیں، آج بھی یورپ اس قسم کے واقعات پیش نہیں کر سکتا،

آزادی کی اس سے بڑھکر کیا مثال ہو گی، کہ صحابہ جس قدر آنحضرت صلعم کا ادب و احترام کرتے تھے، اس سے زیادہ امکان میں نہ تھا، تاہم ہر موقع پر اس آزادی سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے، کہ آج ہم کو ان کے بیان کرنے میں تامل ہوتا ہے، ہند (امیر معاویہ کی ماں) جب اسلام قبول کرنے کے لئے آنحضرت صلعم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اور آپ نے اس سے بیعت لینے کے وقت یہ فرمایا، کہ "عہد کرو کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کرو گی" تو اس نے یہ الفاظ کہے، "یا محمد انا ربیناهم صغیرا وقتلتهم کبیرا یوم بدر فانت وهم اعلم" اے محمد! ہم نے تو اپنے بچوں کو پال پوس کر بڑا کیا تھا، اور تم نے بدر کی لڑائی میں ان کو قتل کر دیا، تو تم اور وہ سمجھ لو"

حضرت عمرؓ کا رعب و جلال دنیا کو معلوم ہے، لیکن ایک عام عرب سر دربار ان سے اس طرح خطاب کرتا تھا، کہ کوئی شخص اپنے برابر والے کے ساتھ بھی نہیں

کر سکتا، خالد سیف اللہ نے روم کی غارت مین فخر یہ اظہار کیا تھا کہ ہم نے جس کو بادشاہ بنا رکھا ہے، (یعنی حضرت عمر فاروق) وہ کسی بات مین ہم سے ترجیح کا برتاؤ نہیں کر سکتا وہ اگر غلط بولے، تو ہم اسکو ٹوک دین، چوری کرے، تو اس کے ہاتھ کاٹ ڈالین، خلاف انصاف کرے تو معزول کر دین،

امیر معاویہ کے حکم سے جب ان کے عامل نے مدینہ منورہ کی مسجد مین یزید کی خلافت کا اعلان کیا اور یہ کہا کہ سنۃ ابی بکر و عمر یعنی جانشین سلطنت کرنا ابوبکر و عمر کا طریقہ ہے، تو وہین ایک شخص نے کھڑے ہو کر کہا:- کذبت لا بل سنۃ کسریٰ و قیصر " تو جھوٹ بولتا ہے، یہ کسریٰ اور قیصر کا طریقہ ہے"

اس قسم کے سیکڑون ہزارون واقعات ہین، کیا ان مثالون سے آزادی اور استقلال کے جذبات کو تحریک نہین ہوتی؟

حقیقت یہ ہے کہ جو گروہ علم کو صرف نوکری کی غرض سے پڑھتا ہے، جس نے معاش کے سیکڑون اسباب (تجارت، حرفت، صنعت) مین سے صرف نوکری پر قناعت کر لی ہے، جو یورپ مین علوم و فنون مین سے بجز چند سطحی باتون کے کچھ نہین جانتا، جس کو ذوق علمی سے کچھ مس نہین، جس نے اعلیٰ تعلیم کے لفظ کو بالکل بیجا استعمال کیا ہے، اس کو اس بحث مین پڑنے سے کیا فائدہ کہ عربی زبان مین علوم و فنون ہین یا نہین، اگر علوم و فنون ہوتے بھی تو اس گروہ کے کس کام کے تھے، ارکان کالج سے ایک بڑا نکتہ جو فرو گذاشت ہوا اور ہو رہا ہے، وہ یہ ہے کہ موجودہ طریقہ سے وہ صرف ان لوگون کو انگریزی تعلیم کی طرف متوجہ کر سکے، اور کر سکتے ہین، جنکو معاش کی ضرورت نے انگریزی تعلیم پر مجبور کر رکھا ہے، اور امرا اور رؤسا جنکو معاش کی فکر نہین، وہ انگریزی کے واسطے آنکھ

اٹھاکر بھی نہیں دیکھتے لیکن اگر انگریزی تعلیم کے ساتھ پورے طور سے عربی اور مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست ہوتا، تو علی گڈھ کالج کے احاطہ میں تعلقہ دارانِ اودھ اور والیانِ ملک کے خاندان کی یادگار بھی نظر آتیں،

خاتمۂ سخن میں یہ کہنا ضرور ہے کہ میری ہرگز یہ رائے نہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ہٹاکر عربی کی طرف متوجہ کیا جائے، ایسا کرنا بے شبہہ قوم کے ساتھ دشمنی ہے، لیکن اس بحث میں خواہ مخواہ علوم عربیہ کی تحقیر، اور کان کالج کا اس قسم کے فقرے استعمال کرنا کہ "ہم سے ہرگز یہ توقع نہیں رکھنی چاہئے کہ ہم عربی تعلیم پر ایک حبہ بھی صرف کریں گے" نہایت ظلم اور ناانصافی ہے، اور اس سے ظاہر ہوسکتا ہے کہ ان لوگوں کے دل میں کیا جذبات پوشیدہ ہیں؟

یہ کہنا کہ عربی زبان ہماری مذہبی زبان نہیں ہے، اور ہے تو صرف قرآن پڑھ لینا کافی ہے، ایک عامیانہ فریب دہی بلکہ بے ہودہ ڈپلومیسی ہے، صاف کہنا چاہئے کہ ہم کو قرآن کی بھی ضرورت نہیں، یا یہ تسلیم کرنا چاہئے کہ قرآن کا سمجھنا بغیر عربی کی اعلیٰ تعلیم کے ممکن نہیں،

بہرحال عربی کی مخالفت جس طریقہ سے کی گئی وہ جس حد تک صحیح بھی ہو لیکن اسکی نسبت یہ مصرعہ صادق آتا ہے، ع،

کہتے تو ہیں بھلے کی ولیکن بری طرح

عربی کی تحقیر نے ثابت کردیا کہ قوم واقعی ذلت کے اخیر درجہ پر پہنچ گئی ہے، کیونکہ کوئی قوم اس وقت تک ذلیل نہیں ہوتی جب تک وہ خود اپنے آپ کو ذلیل نہ سمجھے اور یہ درجہ اب قوم نے حاصل کرلیا۔ دکن ریویو۔ مئی ۱۹۰۶ء

مولانا شبلیؒ کے مجموعہ مضامین کی دوسری جلد

فہرست مضامین

لکھائی چھپائی اعلیٰ، قیمت: ۱۲/ "منیجر"

(طابع و ناشر محمد اویس وارثی)